اسلام کی بیٹیاں
محمد اسحاق بھٹی
www.KitaboSunnat.com
مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور

اسلام کی بیٹیاں

محمد اسحاق بھٹی

فہرست

حرفِ چند

کسی زمانے میں "امروز" پاکستان کا مشہور اخبار تھا۔ اس اخبار میں لکھنے والوں کی وسیع فہرست میں ان سطور کے راقم کا نام بھی شامل تھا۔ آج سے سینتیس اڑتیس برس قبل (۱۹۶۵ء) میں میں نے اس میں ایک سلسلۂ مضامین "بنات اسلام" کے عنوان سے شروع کیا تھا۔ اس سلسلۂ مضامین میں جن نہایت لائق تکریم خواتین کے بارے میں لکھا گیا تھا' وہ تھیں

- امہات المومنین'
- نبی ﷺ کی عظیم المرتبت صاحب زادیاں
- بہت سی عالی قدر صحابیات
- تابعات و تبع تابعات
- مغل دور کے برصغیر کی بعض عورتیں
- اسلامی عہد کے اندلس کی چند بیبیاں ۔۔۔ اور
- الجزائر کی کچھ مجاہد خواتین۔

ان قابل احترام خواتین میں وہ بھی ہیں جنھوں نے جنگ و جہاد میں حصہ لیا' وہ بھی ہیں جنھوں نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کو اپنا مطمح نظر ٹھہرایا' وہ بھی ہیں جنھوں نے شعر و شاعری اور ادب و انشا میں دلچسپی لی' وہ بھی ہیں جنھوں نے تمام امور دنیا سے الگ رہ کر اپنے آپ کو اللہ کی عبادت اور ذکر الٰہی کے لیے وقف کر دیا اور وہ بھی ہیں جنھوں نے اپنے وطن کی سیاست میں بھرپور کردار ادا کیا۔

ان مضامین کی اشاعت کے زمانے میں بہت سے لوگوں نے (جن میں مرد بھی شامل تھے اور عورتیں بھی) خطوط کے ذریعے یا زبانی اس قسم کے تاثرات کا اظہار کیا تھا' جس سے مجھے پتا چلتا تھا کہ یہ مضامین دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ پھر متعدد ناشران

کتب نے کئی دفعہ مجھ سے ان مضامین کو کتابی شکل میں شائع کرنے کی خواہش ظاہر کی' لیکن ان کی یہ خواہش عمل شکل نہ اختیار کر سکی- اس کی وجہ یہ تھی کہ میں انھیں کتابی شکل میں لانے کے لیے ان پر نظر ثانی کرنا چاہتا تھا' لیکن اس کے لیے وقت نہیں مل رہا تھا- اب کافی جک واضافے اور ترمیمات و تبدیلی کے ساتھ انھیں ۳۸ برس کے بعد کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے- ممکن ہے کسی صاحب کے لیے یہ کتاب فائدہ مند ثابت ہو سکے-

علیہ توکلت و الیہ انیب-

محمد اسحاق بھٹی

اسلامیہ کالونی' ساندہ- لاہور

۲۵- جنوری ۲۰۰۰ء

۱۷- شوال ۱۴۲۰ھ

ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا عرب کے معزز ترین قبیلے قریش سے تعلق رکھتی تھیں۔ان کے پردادا کا نام قصی تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی جداعلی تھے۔اس لحاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہ ہم جد تھے۔حضرت خدیجہ کی والدہ کا نام فاطمہ بنت زائدہ تھا۔ان کے والد محترم کا اسم گرامی خویلد تھا جو اپنے قبیلے اور خاندان میں انتہائی عزت واحترام کے مالک تھے اور مکہ میں آکر مقیم ہو گئے تھے۔مکہ ہی میں شادی کی۔

حضرت خدیجہ عام الفیل سے پندرہ سال قبل پیدا ہوئیں۔ابتدا ہی سے بلند کردار اور حسن اخلاق کی حامل تھیں۔چونکہ بہترین اوصاف سے بہرہ مند تھیں' اس لیے طاہرہ کے لقب سے مشہور ہوئیں۔ان کی کنیت ام ہند تھی۔

باپ نے اپنی اس بیٹی کی شادی کے لیے ورقہ بن نوفل کا انتخاب کیا جو ایک باکمال شخص تھے اور تورات وانجیل کے بہت بڑے عالم تھے' لیکن کسی وجہ سے ان سے شادی نہ ہو سکی تو ابو ہالہ بن بناش تمیمی سے نکاح کر دیا گیا۔ابو ہالہ کے بعد عتیق بن عابد مخزومی کے عقد میں آئیں۔بعد ازاں عتیق بھی وفات پا گیا تو صیفی بن امیہ سے نکاح ہوا۔صیفی حضرت خدیجہ کے چچا کے بیٹے تھے۔نکاح سے تھوڑا عرصہ بعد صیفی بھی انتقال کر گئے تو حضرت خدیجہ بیوہ تھیں---باپ بھی فوت ہو چکے تھے۔

حضرت خدیجہ کا ذریعہ آمدنی تجارت تھا' لیکن باپ اور شوہر کی وفات کے بعد ان کا کوئی محافظ اور نگران نہ تھا' اس لیے سخت پریشانی میں مبتلا تھیں۔تاہم سلسلہ تجارت باقاعدہ جاری تھا اور اپنے عزیزوں کو معقول معاوضہ دے کر ان کے ہاتھ مال تجارت بھیجتی تھیں۔ان دنوں قریش کے تجارتی تعلقات زیادہ تر شام سے تھے اور حضرت خدیجہ

کا مال تجارت بھی شام ہی میں جاتا تھا۔

مکہ معظمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس زمانے میں "امین" کے لقب سے مشہور تھے اور آپؐ کے اخلاق حسنہ' صدق وعدالت' راست بازی و معاملہ فہمی' دیانت و امانت اور نجابت و شرافت کا بہت چرچا تھا اور تمام لوگ آپ کے مداح و ثناخواں تھے۔ آپؐ کے حسن معاملت کی شہرت سے متاثر ہو کر حضرت خدیجہ نے آپ کو پیغام بھیجا کہ آپؐ میرا مال تجارت لے کر شام چلے جائیں' جو معاوضہ دوسروں کو دیتی ہوں اس سے آپ کو دوگنا دوں گی۔ آنحضرت نے خدیجہ کی یہ پیش کش قبول فرمائی اور حضرت خدیجہ کے غلام میسرہ کو ساتھ لے کر بصریٰ تشریف لے گئے۔ واپس آکر حساب کیا تو پہلے کی نسبت دوگنا منافع ہوا۔

حضرت خدیجہ کے مال و دولت اور علو اخلاق کی بنا پر بہت سے لوگ ان سے نکاح کے متمنی تھے' مگر وہ کسی پر رضامند نہ تھیں۔ جب انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قریب سے دیکھا تو آپ کے اخلاق عالی اور اعمال حسنہ سے نہایت متاثر ہوئیں اور اپنی خادمہ نفیسہ بنت منیہ کی معرفت پیغام نکاح بھیجا جو آپ نے منظور فرما لیا۔ حضرت خدیجہ کے والد خویلد بن اسد حرب الفجار میں وفات پا چکے تھے' اس لیے آپ کے چچا عمرو بن اسد جو آپ کے سرپرست بھی تھے' ولی مقرر ہوئے۔ شادی کی تاریخ مقرر ہوئی۔ تاریخ معین پر حضرت خدیجہ نے اپنے اعزہ کو بلا لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے قریبی رشتہ داروں کو لے کر خدیجہ کے گھر پہنچ گئے۔ آنحضرت کے اقربا میں ابو طالب اور حضرت حمزہ آپ کے ہمراہ تھے۔ حضرت ابو طالب نے خطبہ نکاح پڑھا اور عمرو بن اسد کے مشورے سے پانچ سو طلائی مہر مقرر ہوا۔ یہ آنحضرت کی بعثت سے پندرہ سال قبل کا واقعہ ہے۔ اس وقت حضرت خدیجہ کی عمر چالیس برس کی تھی اور آنحضرت پچیس برس کے نوجوان تھے۔

نکاح سے پندرہ برس بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چالیس برس کی عمر کو پہنچے تو اللہ کی طرف سے خلعت نبوت سے نوازے گئے۔ بیوی کی حیثیت سے قدرتی

طور پر آپؐ نے سب سے پہلے حضرت خدیجہ ہی کو دعوت اسلام دی اور انھوں نے تمام لوگوں سے پہلے قبول اسلام کا شرف حاصل کیا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرتؐ کی نبوت کی صرف تصدیق ہی نہیں کی بلکہ ابتدائے اسلام ہی سے وہ آپ کی سب سے بڑی مددگار تھیں۔ آغاز اسلام میں مخالفین اسلام جو آپؐ کو مبتلائے مصائب کرنے سے کچھ جھجک محسوس کرتے تھے' اس کی بڑی وجہ حضرت خدیجہ کا ذاتی اثر و رسوخ تھا۔ انھوں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ گھبرائیے نہیں' اللہ ضرور آپ کی مدد کرے گا۔ جب کفار و مشرکین نے آپؐ کو اذیتیں پہنچانا شروع کیں تو خدیجہ آپ کو تسلی دیتی تھیں۔

نبوت کے ساتویں سال قریش نے آنحضرت اور آپ کے خاندان کو شعب ابی طالب میں محصور کیا تو حضرت خدیجہ بھی آپ کے ساتھ تھیں۔ اشاعت اسلام کے باب میں حضرت خدیجہ آنحضرت کی مشیر تھیں۔ انھوں نے زمانہ جاہلیت میں بھی بت پرستی نہیں کی۔ وہ اپنی دولت و ثروت سے آنحضرت کی امداد کرتی تھیں۔

ان کے مقام و مرتبہ کا یہ حال ہے کہ ایک دفعہ حضرت جبریل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ خدیجہ برتن میں کوئی چیز لا رہی ہیں۔ آپؐ انھیں اللہ کا اور میرا سلام پہنچا دیں۔ حضرت خدیجہ جب تک زندہ رہیں' آنحضرت نے دوسری شادی نہیں کی۔ ان کی وفات کے بعد آنحضرت کا یہ دستور تھا کہ جب کوئی جانور ذبح کرتے تو ان کی سہیلیوں کے گھر گوشت پہنچاتے۔ آنحضرت کا ارشاد ہے کہ جب لوگوں نے میری تکذیب کی تو خدیجہ نے میری تصدیق کی۔ جب لوگ کافر تھے وہ اسلام لائیں۔ جب کوئی میرا مددگار نہ تھا' انھوں نے میری مدد کی اور میری اولاد انھی سے ہوئی۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکاح سے پچیس برس بعد تک زندہ رہیں' جن میں سے پندرہ برس قبل از نبوت کے ہیں اور دس برس بعد از نبوت کے۔ وہ ۱۱ رمضان المبارک سن ۱۰ نبوی کو ہجرت سے تین سال قبل ۶۴ سال چھ ماہ کی عمر پا کر فوت ہوئیں۔ اس وقت نماز جنازہ کا شرعی حکم نافذ نہیں ہوا

تھا' لہٰذا انھیں اسی طرح دفن کر دیا گیا۔ حضور نے خود ان کی قبر میں اتر کر اپنے اس سب سے بڑے ہم درد کو اللہ کے سپرد کیا۔ حضرت خدیجہ کی قبر حجون میں ہے اور زیارت گاہ عوام و خواص ہے۔ حضرت خدیجہ کے سال وفات کو آنحضرت عام الحزن (غم کے سال) سے تعبیر کرتے تھے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے جو اولاد ہوئی اس کی مختصر طور پر تفصیل یہ ہے۔

حضرت خدیجہ کے پہلے شوہر ابوہالہ سے ہالہ' طاہر اور ہند پیدا ہوئے۔ یہ تینوں بھائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں۔ ہالہ بنت خدیجہ کا ذکر صحیح بخاری میں بھی آیا ہے۔ طاہر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ربع یمن کا حاکم مقرر کر دیا تھا۔ آنحضرت کے وصال تک یہ بہ دستور وہاں حکمران رہے۔ ان کی حکومت میں عک اور اشعریین کے قبیلے بھی شامل تھے جنھوں نے حضور کے وصال کے بعد یمن میں سب سے پہلے ارتداد اختیار کیا۔ حضرت ابوبکر صدیق نے طاہر کو ان سے لڑائی کا حکم دیا تھا اور طاہر نے مسروق بن اجدہا کی معیت میں ان پر فوج کشی کر کے اس فتنے کو ختم کر دیا تھا اور ان پر فتح حاصل کی تھی۔ اس واقعہ سے متعلق طاہر نے ایک نظم بھی کہی تھی۔

ہند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ربیب اور پروردہ تھے۔ یہ جنگ جمل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طرف دار تھے اور اسی جنگ میں شہید ہوئے۔ ہند نہایت فصیح و بلیغ تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے "وصاف" کے طور سے مشہور تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک انتہائی فصاحت اور صحت سے بیان فرماتے تھے۔

ہند کے ایک بیٹے کا نام بھی ہند تھا' جن کا انتقال بصرہ میں ہوا۔ روایت ہے کہ ان دنوں طاعون کی بیماری زوروں پر تھی اور تمام لوگ اپنے اپنے مردوں کی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے۔ ان کا جنازہ اٹھانے والے صرف چار آدمی تھے۔ بصرہ کی ایک عورت نے یہ منظر دیکھا تو چلا کر کہا۔

واہ ہند بن ہنداہ وابن ربیب رسول اللہ

لوگ عورت کی اس دردناک آواز سے انتہائی متاثر ہوئے اور اپنے اپنے مردوں کو چھوڑ کر ہند کے جنازے میں شریک ہوگئے اور دن بھر تمام بازار بند رہے۔

حضرت خدیجہ کے دوسرے شوہر سے ایک لڑکی پیدا ہوئی' اس کا نام بھی ہند تھا۔

تیسرے شوہر صیفی سے ایک لڑکا ہوا جس کا نام محمد تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چھے بچے پیدا ہوئے۔ چار صاحب زادیاں اور دو صاحب زادے۔۔۔ایک حضرت قاسم جو آپؐ کے سب سے بڑے بیٹے تھے' انہی کے نام پر آپ نے اپنی کنیت ابوالقاسم رکھی۔ قاسم صغر سنی میں مکہ مکرمہ میں فوت ہوگئے تھے۔دوسری اولاد حضرت زینب تھیں۔۔۔ تیسرے حضرت عبداللہ تھے جو زمانہ نبوت میں پیدا ہوئے اور طیب اور طاہر کے لقب سے ملقب ہوئے۔انھوں نے بھی بہت کم عمر پائی۔۔۔ چوتھی حضرت رقیہ اور پانچویں حضرت ام کلثوم تھیں۔۔۔حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے چھوٹی صاحب زادی حضرت فاطمۃ الزہرا تھیں' جن کے فضائل و مناقب احادیث و سیر کی کتابوں میں مذکور ہیں اور جنھیں یہ شرف حاصل ہے کہ ان سے آپؐ کا سلسلہ نسل چلا اور دنیا میں پھیلا۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد کے عظیم الشان واقعات سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔

ام المومنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا

حضرت سودہ رضی اللہ عنہا قریش کے ایک قبیلے عامر بن لویؔ سے تعلق رکھتی تھیں۔ سلسلہ نسب یہ ہے: سودہ بنت زمعہ بن قیس بن عبد شمس بن عبدود بن نصر بن مالک بن عسل بن عامر بن لویؔ۔

حضرت سودہ کی والدہ کا نام شموس تھا جو مدینہ منورہ کے خاندان نجار کی خاتون تھیں۔ سودہ کا پہلا نکاح ان کے والد کے چچا کے بیٹے سکران بن عمرو سے ہوا تھا۔

حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو اسلام کی دعوت کانوں میں پڑتے ہی مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔ ان کے شوہر حضرت سکران بن عمرو نے بھی ان کے ساتھ ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ کفار کے مظالم سے تنگ آکر مسلمانوں نے حبشہ کو ہجرت کی تو حضرت سودہ اور حضرت سکران مکہ مکرمہ ہی میں رہے۔ لیکن جب کفار و مشرکین کے ظلم و ستم حد سے بڑھ گئے اور مسلمانوں کی بڑی تعداد ہجرت کے ارادے سے عازم حبش ہوئی تو حضرت سودہ اور ان کے شوہر بھی ان میں شریک ہو گئے۔ یہ دونوں میاں بیوی کئی سال حبشہ میں قیام پذیر رہے۔ پھر واپس مکہ آگئے۔ مکہ واپس آنے کے کچھ دن بعد حضرت سکران رضی اللہ عنہ فوت ہو گئے۔

ازواج مطہرات میں حضرت سودہ پہلی خاتون ہیں جو حضرت خدیجہ کے بعد حرم نبوی میں داخل ہوئیں۔ ان کے نکاح کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت خدیجہ کی وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت مغموم اور پریشان رہتے تھے۔ حضرت عثمان بن مظعون کی بیوی حضرت خولہ بنت حکیم نے آنحضرت کے چہرۂ مبارک پر آثار ملال دیکھے تو عرض کیا: یارسول اللہ آپ بہت غمگین رہتے ہیں' آپ کو ایک مونس کی ضرورت ہے۔ آپ نے فرمایا گھر کی نگرانی اور بچوں کی دیکھ بھال خدیجہ کرتی تھیں' اب

میں اس سلسلے میں پریشان ہوں- آپ کا اشارہ پا کر وہ حضرت سودہ کے والد زمعہ کے پاس گئیں جو بوڑھے ہو چکے تھے- زمانۂ جاہلیت کی رسم کے مطابق "نعم صباحا" کہہ کر سلام کیا اور آنحضرت کی طرف سے پیغام نکاح دیا- زمعہ نے جواب دیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کفو تو بہت اچھے ہیں، لیکن سودہ سے دریافت کرنا ضروری ہے- بہر حال تمام مراحل طے ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود تشریف لائے- حضرت سودہ کے والد نے ہی نکاح پڑھایا اور چار سو درہم مہر مقرر ہوا- حضرت سودہ کے بھائی عبداللہ بن زمعہ اس زمانے میں اسلام نہیں لائے تھے، انھیں معلوم ہوا تو اس نکاح پر سخت اظہار افسوس کیا- نہایت خفا ہوئے اور سر پر خاک ڈال لی- قبول اسلام کے بعد وہ اپنی اس حرکت پر ہمیشہ نادم رہے- حضرت سودہ کا نکاح نبوت کے دسویں سال ہوا--- یعنی سن ۱۰ نبوت میں---!

طبقات ابن سعد میں مرقوم ہے کہ سودہ کے شوہر حضرت سکران رضی اللہ عنہ ابھی زندہ تھے کہ حضرت سودہ نے خواب دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور اپنے پاؤں سودہ کی گردن پر رکھ دیے- سودہ نے یہ خواب اپنے شوہر سے بیان کیا، انھوں نے کہا سودہ بخدا اگر تم نے فی الواقع یہ خواب دیکھا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ میں مر جاؤں گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم سے نکاح کریں گے- کچھ دنوں بعد سودہ نے پھر خواب دیکھا کہ وہ تکیے کے سہارے لیٹی ہیں اور آسمان سے چاند پھٹ کر ان پر آ گرا ہے- یہ خواب بھی انھوں نے سکران سے بیان کیا- سکران نے اس کا جواب بھی یہی دیا کہ میں بہت جلد مر جاؤں گا اور تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں چلی جاؤ گی- چنانچہ سکران اسی دن بیمار ہوئے اور چند روز بعد وفات پا گئے- ان کے بعد سودہ کا نکاح آنحضرت سے ہوا اور یہ خواب پورا ہو گیا-

حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نہایت فیاض اور سخی تھیں- ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی خدمت میں ایک تھیلی بھیجی- تھیلی لانے والے سے پوچھا اس میں کیا ہے؟ کہا درہم ہیں- فرمایا کھجوروں کی طرح تھیلی میں درہم بھیجے جاتے ہیں- یہ کہہ

کر تھیلی کا منہ کھولا اور اسی وقت تمام درہم تقسیم کر دیے۔وہ خود کام کرتی تھیں اور جو آمدنی ہوتی مستحقین میں تقسیم کر دیتی تھیں--- مزاج میں تیزی تھی۔ بعض دفعہ جلد غصے میں آجاتیں۔

ایک مرتبہ کسی ضروری کام سے باہر جارہی تھیں کہ راستے میں حضرت عمر مل گئے۔سودہ کا قد لمبا تھا۔حضرت عمر نے پہچان لیا۔ان کو ازواج مطہرات کا باہر نکلنا سخت ناگوار گزرتا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پردے کے لیے عرض بھی کر چکے تھے۔بولے: سودہ ہم نے تم کو پہچان لیا۔سودہ کو حضرت عمر کی اس بات پر غصہ آگیا اور واپس آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عمر کی شکایت کی۔اسی واقعہ کے بعد آیت حجاب نازل ہوئی۔

تاہم طبیعت میں ظرافت بھی تھی۔کبھی کبھی اس انداز سے چلتیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں دیکھ کر بے ساختہ ہنس پڑتے۔ایک مرتبہ آنحضرت کے پیچھے نماز پڑھی تو کہا کل رات کو میں نے آپ کے ساتھ نماز پڑھی۔ آپ نے اس قدر طویل رکوع کیا کہ مجھ کو نکسیر پھوٹنے کا شبہ ہو گیا اور میں نے دیر تک اپنی ناک پکڑے رکھی۔یہ جملہ سن کر حضور بڑے محظوظ ہوئے اور دیر تک مسکراتے رہے۔

حضرت سودہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرماں برداری میں تمام ازواج مطہرات سے ممتاز تھیں۔ آپؐ نے حجتہ الوداع کے موقعے پر ازواج مطہرات کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ اس حج کے بعد گھر میں بیٹھے رہنا--- چنانچہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے آپؐ کے اس ارشاد پر سختی سے عمل کیا اور حجتہ الوداع کے بعد نہ کبھی حج کیا' نہ عمرہ---- فرماتی تھیں میں حج بھی کر چکی ہوں اور عمرہ بھی۔ اب اللہ کے رسول کے حکم کے مطابق گھر ہی میں بیٹھی رہوں گی۔

ام المومنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے صرف پانچ احادیث مروی ہیں۔ان میں سے ایک صحیح بخاری میں ہے اور چار سنن اربعہ میں۔ صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن عباس' حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت یحیٰی بن عبدالرحمٰن رضی اللہ

عنہم نے ان سے روایت بیان کی۔

اصابہ میں ہے کہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا' دجال سے بہت ڈرتی تھیں۔ایک دفعہ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ کے ہاں آرہی تھیں کہ دونوں نے ازراہ مزاح کہا

سودہ: تم نے کچھ سنا؟

کہا: نہیں۔

بولیں: دجال ظاہر ہو گیا ہے۔

حضرت سودہ نے یہ سنا تو خوف زدہ ہو کر قریب کے ایک خیمے میں جا گھسیں۔

حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ ہنستی ہوئیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور آپ کو اس مزاح کے بارے میں بتایا۔ آنحضرت تشریف لائے اور خیمے کے دروازے پر کھڑے ہو کر آواز دی۔

سودہ ابھی دجال نہیں نکلا ہے' باہر آجاؤ۔

آنحضرت کی آواز سن کر حضرت سودہ باہر آئیں۔خوف طاری تھا اور بدن پر مکڑی کا جالا لگا ہوا تھا جسے باہر آکر صاف کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت سودہ کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔البتہ پہلے شوہر حضرت سکران سے ایک لڑکا ہوا تھا' جن کا نام عبدالرحمٰن تھا اور وہ علاقہ فارس کی جنگ جلولا میں شہید ہو گئے تھے۔

حضرت سودہ کا انتقال حضرت عمر کی خلافت کے آخری زمانے میں ہوا۔حضرت عمر نے ۲۳ ہجری میں شہادت پائی۔اس لیے حضرت سودہ کا سال وفات غالباً ۲۲ ہجری ہوگا۔واقدی نے لکھا ہے کہ ۵۴ ہجری میں فوت ہوئیں' لیکن دیگر مؤرخین نے اس سے اختلاف کیا ہے اور لکھا ہے کہ انھوں نے ۲۲ ہجری میں انتقال کیا۔

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

عائشہ نام' صدیقہ اور حمیرا لقب' ام عبداللہ کنیت تھی- حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحب زادی تھیں- ماں کا نام زینب تھا اور کنیت ام رومان تھی- بیت ابو بکر کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ اسلام کے دور اول ہی میں نور اسلام سے منور ہو گیا تھا اور حضرت عائشہ ان خوش بخت خواتین میں سے ہیں جن کی تربیت خالص اسلامی ماحول میں ہوئی اور ابتدا ہی سے ان کے کان کفر و شرک کی آواز سے نا آشنا رہے- وہ خود کہتی ہیں کہ جب سے میں نے اپنے والدین کو دیکھا انھیں نعمت اسلام سے بہرہ مند پایا- ازواج مطہرات میں یہ خصوصیت بھی حضرت عائشہ صدیقہ ہی کو حاصل ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کنواری بیوی تھیں- آنحضرت سے ان کا نکاح پانچ سو درہم کے عوض ۱۰ نبوی میں ہوا- حضرت عائشہ کا نکاح اور رخصتی دونوں تقریبیں شوال کے مہینے میں ہوئیں اس سے پہلے عرب شوال کے مہینے میں نکاح اور رخصتی کو فال نیک نہ سمجھتے تھے اور اس مہینے کو منحوس قرار دیتے تھے' کیونکہ کسی زمانے میں اس مہینے میں سخت طاعون پھیلا تھا- اس نکاح نے عربوں کی اس اوہام پرستی کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا-

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے غزوۂ احد میں شرکت کی- صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ میں نے عائشہ اور ام سلیم کو دیکھا کہ مشک بھر بھر کر لاتی تھیں اور زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں-

حضرت عائشہ صدیقہ ذہانت اور حاضر جوابی میں بہت مشہور تھیں- اس سلسلے میں ان کے متعدد واقعات تاریخ و سیر کی کتابوں میں منقول ہیں' جن میں ایک واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک مرتبہ گڑیوں سے کھیل رہی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے- ان گڑیوں میں ایک گھوڑا بھی تھا جس کے دائیں بائیں دو پر تھے-

آنحضرت نے پوچھا:

عائشہ یہ کیا ہے؟

عرض کیا: گھوڑا ہے۔

آپؐ نے فرمایا: گھوڑوں کے تو پر نہیں ہوتے۔

برجستہ جواب دیا: کیوں نہیں ہوتے؟ حضرت سلیمان کے گھوڑوں کے تو پر تھے۔

آنحضرت اس فوری جواب اور بے ساختہ پن پر مسکرا دیے۔

نہایت سخی اور فیاض تھیں۔ایک دن روزے سے تھیں اور گھر میں سوائے ایک روٹی کے اور کچھ نہ تھا۔اتنے میں ایک مسکین عورت آئی اور اس نے سوال کیا۔خادمہ کو حکم دیا کہ جو روٹی گھر میں پڑی ہے' اسے کھلا دو۔اس نے عرض کیا آپ روزہ کس چیز سے افطار کریں گی؟ فرمایا اللہ مالک ہے' شام ہوئی تو کسی نے بکری کا گوشت بھجوادیا' لونڈی کو بلا کر کہنے لگیں۔لو کھاؤ' یہ تیری روٹی سے بہتر ہے۔

ایک مرتبہ ان کے بھانجے حضرت عبداللہ بن زبیر نے ایک لاکھ درہم بھیجے۔حضرت عائشہ اس دن بھی روزے سے تھیں۔تمام درہم اسی وقت راہ خدا میں تقسیم کر دیے۔شام ہوئی تو ام ذرہ نے کہا: ام المومنین! اس رقم سے روزہ افطار کرنے کے لیے کچھ گوشت ہی لے لیا ہوتا۔فرمایا تم نے بھی تو پہلے توجہ نہیں دلائی۔

ایک بار حضرت منکدر بن عبداللہ حضرت عائشہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

فرمایا: منکدر تمھارے کوئی اولاد ہے؟

کہا: نہیں۔

فرمایا: اگر میرے پاس دس ہزار درہم ہوتے تو تمھیں ضرور دے دیتی۔اتفاق سے اسی شام حضرت امیر معاویہ یا ایک روایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن زبیر نے دس ہزار درہم ان کی خدمت میں بھجوا دیئے۔فرمایا کس قدر جلد میری آزمائش ہوئی۔اسی وقت آدمی بھیج کر منکدر بن عبداللہ کو بلایا اور وہ دس ہزار درہم انھیں دے دیے۔

علمی بصیرت اور فقاہت کے اونچے درجے پر فائز تھیں۔ بڑے بڑے صحابہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر بعض نہایت مشکل اور پیچیدہ مسائل دریافت کرتے۔ حضرت ابو موسی اشعری فرماتے ہیں ہم اصحاب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کوئی ایسی مشکل بات کبھی پیش نہیں آئی' جس کا حل ہم نے عائشہ سے دریافت کیا ہو اور ہمیں اس کے بارے میں معلومات نہ حاصل ہوئی ہوں۔ ہم نے جب بھی کسی عقدہ کشائی کے لیے ان کے باب عالی پر دستک دی' ہمیں ذہنی تسکین اور قلبی تسلی حاصل ہوئی۔

عروہ بن زبیر کہتے ہیں: میں نے فقہ' طب اور شاعری میں حضرت عائشہ سے زیادہ کسی کو عالم نہیں پایا۔ یہی عروہ اپنے باپ کے حوالے سے روایت کرتے ہیں کہ بسا اوقات حضرت عائشہ ساٹھ ساٹھ اور سو سو شعر کے قصیدے زبانی سنا دیا کرتی تھیں۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے صاحب زادے ابو سلمہ جو ایک جلیل القدر تابعی تھے' کہتے ہیں:

> میں نے حضرت عائشہ سے بڑھ کر سنت نبوی کا عالم' فقاہت دین کا ماہر اور آیات قرآن مجید کی شان نزول اور فرائض کا جاننے والا اور کسی کو نہیں پایا۔

عطا بن ابوالرباح کا قول ہے: حضرت عائشہ سب سے زیادہ فقیہہ' سب سے زیادہ ماہر مسائل اور سب سے زیادہ صائب الرائے تھیں۔

مسروق جو مشہور تابعی ہیں' کہتے ہیں: بخدا میں نے بڑے بڑے صحابہ کو عائشہ سے فرائض و وراثت کے مسائل دریافت کرتے دیکھا ہے۔

امام زہری فرماتے ہیں: عائشہ تمام لوگوں سے زیادہ عالم تھیں۔ اکابر صحابہ ان سے مسائل دریافت کرتے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فصاحت و بلاغت میں بھی اونچا مقام رکھتی تھیں۔ ادب و خطابت میں بھی ان کا پایہ بلند تھا۔ کہتے ہیں اس باب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سوا وہ تمام صحابہ سے ممتاز تھیں۔ ان کی بعض تقریریں ادب اور زور کلام کے اعتبار سے شاہ کار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ نہایت شیریں

کلام اور فصیح اللسان تھیں۔

جامع ترمذی میں موسی بن طلحہ سے منقول ہے کہ میں نے عائشہ سے زیادہ کسی کو فصیح اللسان نہیں دیکھا۔ بعض احادیث میں جہاں حضرت عائشہ کے اصل الفاظ مروی ہیں، ادب و حسنِ بیان نے بات کہیں سے کہیں پہنچادی ہے۔ مثلاً آغاز وحی کے ضمن میں فرماتی ہیں۔

فمارای رویا الاجاء ت مثل فلق الصبح۔

(آنحضرت جو خواب دیکھتے، وہ سپیدہ صبح کی طرح نمودار ہو جاتا۔)

آنحضرت پر جب کیفیت وحی طاری ہوتی تو جبین مبارک پر عرق کے قطرے ظاہر ہو جاتے۔ اس کیفیت کو حضرت عائشہ ان الفاظ میں ادا کرتی ہیں۔

مثل الجمان

(یعنی پیشانی پر موتی ڈھلکتے تھے۔)

واقعہ افک میں انھیں راتوں کو نیند نہیں آتی تھی۔ اس کا اظہار اس طرح کرتی ہیں۔

ما اکتحل بنوم

(میں نے سرمہ خواب نہیں لگایا۔)

آں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہائی محبت کرتی تھیں اور ان کی بے حد مداح تھیں۔ جامع ترمذی میں ہے، راوی کہتا ہے میری موجودگی میں حضرت عائشہ سے پوچھا گیا کہ عورتوں میں سب سے زیادہ فضیلت کس کو حاصل ہے؟ اور کون خاتون آنحضرت کو زیادہ عزیز تھیں؟

فرمایا: فاطمہ!

پھر سوال ہوا: مردوں میں سے یہ اعزاز کس کو حاصل ہے؟

کہا: فاطمہ کے شوہر علی کو

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فہم مسائل میں نہایت بلند مرتبے پر فائز

تھیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ آنحضرت نے فرمایا "اہل خانہ مردے پر روتے ہیں تو اس سے مردے کو عذاب ہوتا ہے"---حضرت عائشہ نے یہ روایت سنی تو اِسے ماننے سے انکار کر دیا- فرمایا: اصل معاملہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک یہودی عورت کی میت پر اس کے اعزہ واقارب رو رہے تھے- آپؐ نے فرمایا: یہ لوگ رو رہے ہیں اور اسے عذاب ہو رہا ہے- آپؐ کا مطلب یہ تھا کہ اس کے غلط اعمال کی سزا اسے مل رہی ہے--- پھر حضرت عائشہ نے فرمایا قرآن مجید کا ارشاد ہے-

و لا تزر وازرۃ وزر اخری-

(یعنی کوئی دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھاتا-)

یہ نہیں کہ رونے کی وجہ سے اسے عذاب ہو رہا ہے' بلکہ اس میت کو اپنے ان گناہوں کا عذاب ہو رہا ہے جن کا ارتکاب دنیا میں اس سے ہوتا رہا ہے-

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی تھے- ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو انھوں نے نئے کپڑے منگوا کر پہنے اور فرمایا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ مسلمان جس لباس میں مرے گا' اسی میں اٹھایا جائے گا-

حضرت عائشہ صدیقہ نے یہ واقعہ سنا تو فرمایا: "اللہ تعالیٰ ابوسعید پر رحم فرمائے- لباس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد اعمال ہے-"

یعنی جس طرح کے اعمال کوئی شخص دنیا میں کرتا ہے' اسی طرح کے اعمال لے کر وہ قیامت کے روز قبر سے اٹھے گا- لباس سے وہ کپڑے مراد نہیں ہیں جو ہم دنیا میں پہنتے ہیں-

حضرت عائشہ صدیقہ نے سہ شنبہ کی رات ۱۷ رمضان ۵۸ ہجری کو ۶۳ سال کی عمر میں وفات پائی- نماز جنازہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہا نے پڑھائی-- وصیت کے مطابق جنت البقیع میں جہاں دیگر ازواج مطہرات مدفون ہیں' انھیں دفن کیا گیا-

ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں- ان کی والدہ کا نام زینب تھا جو حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی بہن تھیں- حضرت زینب بھی صحابیہ تھیں- ان کے بھائی اور باپ بھی صحابی تھے- حضرت حفصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پانچ سال قبل پیدا ہوئیں- یہ وہ زمانہ تھا جب قریش بیت اللہ کی تعمیر کر رہے تھے- اس حساب سے یہ عمر میں آنحضرت سے پینتیس سال چھوٹی ہیں- ان کا پہلا نکاح خاندان بنو سہم کے ایک فرد خنیس بن حذافہ سے ہوا تھا' اپنے والدین اور شوہر کے ساتھ ہی اسلام قبول کیا-

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر حضرت خنیس رضی اللہ عنہ کے ساتھ مکہ سے مدینہ کو ہجرت کی- مدینہ پہنچ کر کفار مکہ اور مسلمانوں کے درمیان پہلا معرکہ کارزار ۱۷ رمضان المبارک ۲ ہجری کو بدر کے مقام پر گرم ہوا- اس جنگ میں مسلمانوں کو کافروں کے مقابلے میں عظیم الشان فتح حاصل ہوئی اور ساتھ ہی کچھ مسلمان شہید اور کچھ زخمی ہوئے- حضرت حفصہ کے شوہر حضرت خنیس رضی اللہ عنہ بھی جنگ بدر کے زخمیوں میں شامل تھے- ان کا زخم اتنا شدید اور گہرا تھا کہ شہادت پر منتج ہوا- اس وقت حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی عمر بیس اکیس سال کی تھی-

جوان بیٹی کی بیوگی پر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو اس کے نکاح ثانی کی فکر دامن گیر ہوئی اور اس کے لیے کوشش کرنے لگے- اس وقت حضرت عثمان بن عفان کی اہلیہ محترمہ حضرت رقیہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتقال کر چکی تھیں' اس لیے وہ سب سے پہلے حضرت عثمان سے ملے اور ان سے نکاح کی گفتگو شروع کی' مگر انھوں نے انکار کر دیا اور کہا میں ابھی نکاح نہیں کرنا چاہتا- پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ

عنہ کے پاس گئے اور حفصہ کو اپنے حبالہ عقد میں لے لینے کی خواہش کا اظہار کیا' وہ بالکل خاموش رہے اور کوئی جواب نہ دیا- حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابو بکر کی اس عدم توجہی کا بہت احساس ہوا- حضرت عمر اس مسئلے کے بارے میں ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ سے نکاح کی خواہش ظاہر کی اور نکاح ہو گیا- آنحضرت سے حضرت حفصہ کا نکاح ۳ ہجری میں ہوا-

بات یہ ہے کہ حضرت عثمان اور حضرت ابو بکر کے انداز گفتگو اور بے التفاتی سے مایوس ہو کر حضرت عمر آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ بیان کیا تو آپ نے فرمایا :

کیا حفصہ کا نکاح ایسے شخص سے نہ ہو جائے جو عثمان سے بہتر ہو اور عثمان کو ایسی بیوی نہ مل جائے جو حفصہ سے بہتر ہو-

اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ تھا کہ حضرت عثمان کا نکاح خود اپنی صاحب زادی حضرت ام کلثوم سے کر دیا جائے اور حضرت حفصہ رسول اللہ کے عقد میں آجائیں' چنانچہ ایسا ہی ہوا- نکاح ہو چکا تو حضرت ابو بکر نے حضرت عمر سے کہا آپ نے مجھے حفصہ سے نکاح کے بارے میں کہا تو میں خاموش رہا تھا- اس کا آپ پر ناگوار اثر پڑا- اس خاموشی کی وجہ صرف یہ تھی کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے حفصہ کا ذکر کیا تھا اور میں آپ کا یہ راز ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا- اگر آنحضرت نے اس خیال کا اظہار نہ فرمایا ہوتا تو میں آپ کو مایوس نہ کرتا-

حضرت حفصہ کچھ تیز مزاج تھیں' جس بات کو صحیح سمجھتیں اس کے لیے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی تیزی سے گفتگو کرتی تھیں- صحیح بخاری میں حضرت علی سے روایت ہے کہ ہم لوگ زمانہ جاہلیت میں عورتوں کو کوئی حیثیت نہ دیتے تھے' اسلام نے ان کو بڑا اونچا درجہ دیا اور قرآن حکیم میں ان کے بارے میں آیات نازل ہوئیں تو ہمیں ان کی قدر و منزلت کا علم ہوا- حضرت عمر سے اسی روایت میں مزید منقول ہے کہ ایک روز میری بیوی نے کسی معاملے میں کوئی مشورہ دیا' میں نے

اسے سخت لہجے میں جواب دیا:

تم کون ہوتی ہو مجھے رائے اور مشورہ دینے والی؟

اس نے کہا: ابن خطاب تم کو میری یہ چھوٹی سی بات بھی ناگوار گزری حالانکہ خود تمھاری بیٹی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو برابر کا جواب دیتی ہے۔

حضرت عمر کہتے ہیں یہ سن کر مجھے بڑا افسوس ہوا۔ میں غصے کی حالت میں اٹھا اور حفصہ کے پاس گیا۔ میں نے جاتے ہی کہا بیٹی میں نے یہ افسوس ناک بات سنی ہے کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تیز مزاجی کا مظاہرہ کرتی اور برابر کا جواب دیتی ہو۔

بولیں جی ہاں! ہم گھریلو معاملات میں جس بات کو صحیح سمجھتے ہیں اس کے لیے پوری صفائی سے گفتگو کرتے ہیں۔

میں نے کہا: خبردار آنحضرت کے سامنے لب کشائی مت کرو، میں تمھیں عذاب الٰہی سے ڈراتا ہوں۔ تم عائشہ کی ریس نہ کرو، اس کا باپ تمھارے باپ سے بہتر ہے اور وہ تم سے بہتر ہے۔

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا پیکر زہد و تقویٰ اور اخلاق حسنہ کا بہترین نمونہ تھیں۔ قائمۃ اللیل اور صائمۃ النہار تھیں، اصابہ کی روایت کے مطابق وہ وفات کے وقت بھی روزہ سے تھیں۔ اختلاف و نزاع سے سخت نفرت کرتی تھیں۔ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ البتہ ان کے شاگردوں اور ان سے سماع حدیث کرنے والوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ ان خوش بخت حضرات میں خود ان کے بھائی اور جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن عمر، بھتیجے حمزہ بن عبداللہ، صفیہ بنت ابو عبید (جو ان کے بھائی حضرت عبداللہ بن عمر کی بیوی تھیں)، حارثہ بن وہب، مطلب بن وداعہ، ام مبشر انصاریہ اور حارث بن عبدالرحمٰن رضوان اللہ علیہم اجمعین شامل ہیں۔ حضرت حفصہ سے ساٹھ احادیث مروی ہیں، جو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے والد محترم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیں۔ ان میں سے چار مشترکہ طور پر

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں، چھے صرف صحیح مسلم میں اور باقی احادیث کی دوسری کتابوں میں مندرج ہیں۔

علم و فضل، فہم و بصیرت اور استنباط و فقاہت میں حضرت حفصہ کا مرتبہ بڑا بلند تھا۔

انھوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں شعبان ۴۵ ہجری کو مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ اس زمانے میں مدینہ منورہ کے گورنر مروان تھے، نماز جنازہ انہی نے پڑھائی۔ کچھ دور تک جنازے کو کندھا بھی دیا۔ اس کے بعد حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جنازہ قبر تک لے گئے۔

حضرت حفصہ کے بھائی حضرت عبداللہ بن عمر اور بھتیجوں عاصم، سالم، عبداللہ اور حمزہ نے میت کو قبر میں اتارا۔

حضرت حفصہ کا سال وفات وہی (۴۵ھ) ہے، جس سال کہ معاویہ بن خدیج نے افریقہ پر حملہ کر کے اسے فتح کیا تھا۔ یہ حضرت معاویہ بن ابوسفیان کا عہدِ خلافت تھا۔ اس سال دوسری مرتبہ افریقہ فتح ہوا تھا۔ پہلی مرتبہ یہ علاقہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ۲۷ ہجری کو فتح کیا گیا تھا۔

ام المومنین حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا

ان کا نام زینب اور ام المساکین لقب تھا- سلسلہ نسب یہ ہے' زینب بنت خزیمہ بن حارث بن عبداللہ بن عمرو بن عبد مناف بن ہلال بن عامر بن صعصعہ-

ازواج مطہرات میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو بعض وجوہ کی بنا پر نمایاں حیثیت حاصل ہے-وہ نہایت نرم دل' منکسر المزاج اور متواضع تھیں- مسکینوں' تنگ دستوں' غریبوں اور ناداروں کا بہت خیال رکھتی تھیں- خدا ترسی اور رحم دلی ان کے امتیازی اوصاف تھے-دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر مقدم گردانتی تھیں- کسی کی تکلیف کو دیکھ کر تڑپ اٹھتیں اور اس کی مدد کے لیے ہر ممکن ذرائع عمل میں لاتیں-ان کے نزدیک دوسرے کے مفاد کو اپنے مفاد پر ترجیح حاصل تھی-

حضرت زینب بنت خزیمہ کا پہلا نکاح کس سے ہوا؟ اس باب میں کتب سیرت میں خاصا اختلاف ہے-ایک روایت جو زیادہ قرین فہم ہے' یہ ہے کہ پہلے یہ حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے عقد میں تھیں-وہ جلیل القدر صحابی اور بہت بڑے شجاع تھے- جنگ احد میں جو ۳ ہجری میں لڑی گئی تھی' شریک تھے اور اسی جنگ میں درجہ شہادت پر فائز ہوئے-حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقہ زوجیت میں آنے کے شرف سے سرفراز ہوئیں-یہ الاستیعاب اور اسد الغابہ کی روایت ہے-

دوسری روایت طبقات ابن سعد کی ہے جس پر قریب قریب اس کا اصرار ہے' وہ روایت یہ ہے کہ حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا کا پہلا نکاح طفیل بن حارث بن عبد المطلب سے ہوا تھا-اس نے کسی وجہ سے طلاق دے دی تو حضرت عبیدہ بن

حارث رضی اللہ عنہ کے عقد میں آئیں۔ حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ ان خوش بخت لوگوں میں سے ہیں جنھیں جنگ بدر میں شریک ہونے کا اعزاز عطا ہوا۔ حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کی جماعت میں شمولیت کا شرف حاصل ہوا۔

لیکن روایات کے پورے سلسلے کو پیش نگاہ رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بہ نسبت دوسری روایت کے پہلی روایت زیادہ صحیح اور قابل اعتماد ہے یعنی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا پہلا نکاح طفیل بن حارث اور اس کے بعد دوسرا حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ سے نہیں ہوا بلکہ پہلے آپ حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے عقد میں تھیں۔ وہ ۳ ہجری میں جنگ احد میں شہید ہو گئے تو اسی سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حبالہ عقد میں آ گئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عقد کے وقت حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ جنگ احد شوال ۳ ہجری میں ہوئی تھی۔ اس نکاح کا مہر بارہ اوقیہ مقرر ہوا تھا۔

آنحضرت سے نکاح پر ابھی تین مہینے گزرے تھے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا وفات پا گئیں۔ ان کی وفات ربیع الاول کے آخری دنوں میں ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن کی گئیں۔ ام المومنین حضرت خدیجہ کے بعد حضرت زینب بنت خزیمہ پہلی زوجہ مکرمہ ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ حیات میں وفات پائی۔ ان دونوں کے علاوہ باقی تمام ازواج مطہرات کا انتقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد ہوا۔

ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا

ان کا نام ہند اور کنیت ام سلمہ تھی- قریش کے خاندان بنو مخزوم سے تعلق رکھتی تھیں-والد کا نام ابوامیہ تھا' جو مکہ کے ایک مشہور فیاض اور مخیّر بزرگ تھے-ان کی فیاضی اور سخاوت کا یہ عالم تھا کہ سفر میں جاتے تو پورے قافلے کے اخراجات خود برداشت کرتے-اسی بنا پر وہ "زادالراکب" کے لقب سے ملقب تھے-حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے چونکہ ایک فراخ دل' وسیع حوصلہ اور فیاض باپ کے زیر سایہ تربیت پائی تھی اس لیے وہ بھی انہی اوصاف سے متصف تھیں-

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا پہلا نکاح عبداللہ بن عبدالاسد سے ہوا تھا' جو زیادہ تر ابو سلمہ کے نام سے معروف تھے-حضرت ام سلمہ کے چچازاد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی تھے- ان دونوں میاں بیوی کا شمار ان خوش بخت حضرات میں ہوتا ہے جو اسلام کے دور اول ہی میں نعمت اسلام سے بہرہ مند ہو گئے تھے-ان دونوں نے مکے سے حبشہ کی ہجرت کا بھی شرف حاصل کیا تھا-حبشہ میں کچھ عرصہ قیام کے بعد یہ پھر واپس مکے آگئے اور یہاں سے مدینہ کو ہجرت کی- کہتے ہیں یہ پہلی خاتون ہیں جو مکے سے ہجرت کر کے مدینے آئیں-

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا ہجرت مدینہ کا واقعہ بڑا دردناک ہے- خود ہی بیان کرتی ہیں کہ اپنے شوہر ابو سلمہ کے ساتھ ہجرت کا ارادہ کیا-ان کا ایک کم عمر لڑکا سلمہ بھی ساتھ تھا-تینوں مکے سے عازم مدینہ ہوئے-اتنے میں حضرت ام سلمہ کے خاندان کے لوگوں کو معلوم ہو گیا' وہ بھاگتے ہوئے آئے اور حضرت ام سلمہ کو شوہر سے چھین کر اپنے ساتھ لے گئے-حضرت ابو سلمہ تنہا مدینہ کو روانہ ہو گئے- ادھر حضرت ابو سلمہ کے خاندان کو واقعہ کی اطلاع ہوئی تو وہ ان کے بیٹے (سلمہ) کو لے

گئے-ان کا کہنا یہ تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو ام سلمہ کے پاس نہیں رہنے دیں گے-اب بیوی خاوند اور بیٹا تینوں ایک دوسرے سے جدا ہو چکے تھے اور تینوں نہایت پریشان تھے-حضرت ام سلمہ سب سے زیادہ بے حال تھیں-وہ روزانہ بے قراری کے عالم میں ایک مقام ابطح میں بیٹھ کر رویا کرتیں-یہ ایک ٹیلہ تھا' جس پر یہ گریہ وزاری کرتیں-عرصے تک ان کا یہی معمول رہا' مگر کسی کو ذرا ترس نہ آیا-ایک روز ابطح سے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے خاندان کے ایک شخص کا گزر ہوا-اس نے ام سلمہ کو اس انداز سے روتے دیکھا تو انتہائی مضطرب ہوا-وہ گھر آیا اور لوگوں سے کہا اس بے بس اور ناتواں عورت پر کیوں ظلم ڈھاتے ہو-اس کا بچہ اس کے حوالے کرو اور اسے اپنے شوہر کے پاس مدینے جانے دو-

اس شخص نے یہ الفاظ اس انداز سے کہے کہ سب کو ترس آ گیا-بچہ ان کے حوالے کر دیا گیا اور مدینے جانے کی اجازت دے دی گئی-اب حضرت ام سلمہ نے بچے کو گود میں لیا' اونٹ پر سوار ہوئیں اور مدینہ کو روانہ ہو گئیں-بالکل تنہا تھیں-کوئی ساتھ نہ تھا- تنعیم کے مقام پر پہنچیں تو بیت اللہ کے کلید بردار عثمان بن طلحہ نے دیکھ لیا-وہ ایک عورت کو اس طرح تنہا اور بے سہارا جاتے دیکھ کر دوڑے ہوئے آئے اور بولے :

کون ہو اور کہاں جا رہی ہو ؟

حضرت ام سلمہ نے کہا :ابو سلمہ کی بیوی ام سلمہ ہوں اور مدینے جا رہی ہوں :

کہا کوئی ساتھ ہے ؟

بولیں خدا اور یہ بچہ-

عثمان نے کہا :تم اکیلی نہیں جا سکتی' میں تمھاری مدد کروں گا-

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا-اونٹ کی مہار پکڑی اور مدینے کو روانہ ہو گیا-حضرت ام سلمہ کی اپنی روایت ہے کہ راستے میں ہمیں کہیں ٹھہرنا ہوتا تو عثمان اونٹ کو بٹھا کر خود کسی درخت کے نیچے چلا جاتا اور میں اونٹ سے اتر پڑتی-روانگی کا وقت ہوتا تو اونٹ پر

کجاوہ رکھ کر کئی قدم پیچھے ہٹ جاتا اور میں سوار ہو جاتی۔ اسی طرح وہ مختلف منزلوں پر قیام کرتا ہوا مدینے کے قریب پہنچ گیا۔ قبا کی آبادی پر نظر پڑی تو کہا اس جگہ کا نام قبا ہے اور تمھارے شوہر یہیں مقیم ہیں۔ ان کے پاس چلی جاؤ۔

عثمان نے یہ لفظ کہے اور اسی وقت مکے کو واپس ہو گیا۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ میں نے عثمان کو بہت ہی باحیا' انتہائی تقویٰ شعار اور پیکر شرافت پایا۔ میں نے کسی شخص کو اس سے زیادہ شریف النفس نہیں دیکھا۔

قبا پہنچیں تو لوگ بہت حیران ہوئے اور نہایت تعجب سے پوچھا تم اکیلی مکہ سے مدینہ کیسے پہنچ گئیں؟ جب انھیں معلوم ہوا کہ یہ ابوامیہ کی بیٹی ہیں تو اور بھی متعجب ہوئے' کیونکہ ان کے والد کی سخاوت و فیاضی میں تمام عرب میں شہرت تھی اور مدینہ کے لوگ بھی ان کے مداح تھے۔

مدینہ پہنچ کر کچھ عرصہ میاں بیوی ایک ساتھ رہے۔ حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ بڑے بہادر اور شہ سوار تھے۔ وہ بدر اور احد کی لڑائیوں میں شریک ہوئے۔ جنگ احد میں زخمی ہو گئے تھے۔ یہ زخم اتنے شدید تھے کہ ان سے جاں بر نہ ہو سکے اور جمادی الاخریٰ ۴ ہجری میں زخموں کی شدت اور تکلیف سے وفات پا گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابوسلمہ کی وفات کی خبر پہنچی تو تعزیت کے لیے تشریف لائے۔ گھر میں کہرام بپا تھا اور حضرت ام سلمہ انتہائی بے حال تھیں۔ آنحضرت حضرت ابوسلمہ کی میت پر تشریف لائے۔ حضرت ام سلمہ کو تسلی دی اور تلقین صبر کی۔ وفات کے وقت حضرت ابوسلمہ کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔ آنحضرتؐ نے اپنے ہاتھ سے بند کیں اور نہایت اہتمام سے نماز جنازہ پڑھائی۔ عدت گزر گئی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نکاح کا پیغام دیا' لیکن حضرت ام سلمہ نے انکار کر دیا۔ کچھ دنوں کے بعد خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی معرفت پیغام نکاح بھیجا' حضرت ام سلمہ نے کہا: میری چند باتوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے

(۱) میں انتہائی غیرت مند عورت ہوں۔

(۲) عیال دار ہوں ---اور

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ میری عمر زیادہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب چیزوں کو گوارا فرمایا۔ حضرت ام سلمہ نے اپنے بیٹے سے (جن کا نام عمر تھا) کہا' اٹھو اور رسول اکرم سے میرا نکاح کرو۔ شوال ۴ ہجری کے آخری دنوں میں یہ تقریب نکاح انجام پائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہ کو دو چکیاں' ایک گھڑا اور چمڑے کا ایک تکیہ جس میں کھجور کی چھال بھری تھی' عنایت فرمایا۔ دیگر ازواج مطہرات کے پاس بھی یہی سامان تھا۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بڑی بہادر' عاقل و فہیم اور اصابت رائے کی مالک تھیں۔ اس ضمن میں مختصر الفاظ میں چند واقعات ملاحظہ ہوں۔

غزوہ خندق میں اگرچہ خود شریک نہ تھیں' لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر قریب تھیں کہ ساری گفتگو اچھی طرح سن رہی تھیں۔ فرماتی ہیں مجھے وہ وقت ٹھیک طرح سے یاد ہے' جب آنحضرت کا سینہ مبارک غبار سے اٹا ہوا تھا اور آپ لوگوں کو اینٹیں اٹھا اٹھا کر دیتے اور اشعار پڑھ رہے تھے۔

بنو قریظہ کے یہودیوں کا محاصرہ ۵ ہجری میں ہوا۔ یہودیوں سے بات چیت کے لیے آنحضرت نے حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ دوران گفتگو میں حضرت ابولبابہ نے یہودیوں کو ہاتھ کے اشارہ سے بتایا کہ تمھیں قتل کر دیا جائے گا۔ لیکن بعد میں اس اشارے کو افشائے راز سمجھ کر وہ اس درجہ نادم ہوئے کہ اپنے آپ کو مسجد کے ستون سے باندھ لیا۔ چند روز اسی کیفیت میں رہے۔ پھر توبہ قبول ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے مکان پر تشریف فرما تھے کہ صبح کو مسکراتے ہوئے اٹھے۔

حضرت ام سلمہ نے عرض کیا: اللہ آپ کو ہمیشہ خنداں و فرحاں رکھے۔ اس وقت ہنسنے کی کیا وجہ ہے؟

فرمایا: ابوالبابہ کی توبہ قبول ہوگئی؟

عرض کیا: یارسول اللہ میں انھیں یہ خوش خبری سنادوں؟

فرمایا اگر چاہو تو سنادو

حضرت ام سلمہ اپنے مکان کے دروازے پر کھڑی ہو گئیں اور اونچی آواز سے پکار کر کہا: ابولبابہ مبارک ہو تمھاری توبہ قبول ہو گئی۔ جوں ہی یہ آواز فضا میں گونجی اور لوگوں کے کانوں میں پڑی پورا مدینہ اکٹھا ہو گیا۔

صلح حدیبیہ کے موقعے پر حضرت ام سلمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھیں۔ صلح کے بعد آنحضرت نے لوگوں کو قربانیاں کرنے کا حکم دیا۔ لیکن لوگ اس قدر افسردہ اور دل شکستہ تھے کہ آنحضرت کی آواز پر ایک شخص بھی اپنی جگہ سے نہ اٹھا۔ قربانیاں کرنے کا حکم آپ نے تین مرتبہ دیا مگر لوگ بالکل خاموش رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ معاہدے کی تمام شرائط بظاہر مسلمانوں کے خلاف تھیں اور وہ اس سے مغموم و متاثر تھے۔ اتنے میں آنحضرت اٹھے اور حضرت ام سلمہ کے خیمے میں تشریف لے گئے اور ان سے لوگوں کی خاموشی کی شکایت کی۔ انھوں نے کہا آپ کسی سے کچھ نہ کہیں۔ بس صرف یہ کریں کہ باہر نکل جائیں، خود قربانی کریں اور احرام اتارنے کے لیے بال منڈوائیں۔ چنانچہ آپ نے کسی کو کچھ کہنے کی بجائے خود یہ کام شروع کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام لوگوں نے وہی کچھ کیا جو حضور نے کیا اور اس میں اس درجہ تیزی کا ثبوت دیا کہ قربانیوں اور حجامت کے لیے لوگ ایک دوسرے سے آگے بڑھ رہے تھے۔

۹ ہجری میں واقعہ ایلا پیش آیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو ڈانٹا اور حضرت ام سلمہ کے پاس بھی آئے۔ حضرت ام سلمہ ان کی قریب کی رشتہ دار تھیں۔ نہایت تیزی سے بولیں۔ تم ہر معاملے میں دخل دینے لگے ہو، حتی کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی بیویوں کے معاملات میں بھی مداخلت کرتے ہو۔ یہ جواب نہایت سخت تھا۔ حضرت عمر خاموش ہو گئے اور اٹھ کر چلے گئے۔

جنگ خیبر میں حضرت ام سلمہ' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھیں۔ اس جنگ میں انھوں نے مجاہدین کی خدمت انجام دی۔

آیت تطہیر جس میں اہل بیت رضی اللہ عنہم کی طہارت اور ان کے تقدس کا ذکر کیا گیا ہے' حضرت ام سلمہ کے مکان پر نازل ہوئی۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت سے پہلے حضرت ام سلمہ نے خواب میں دیکھا کہ آنحضرت تشریف لائے ہیں' بہت پریشان ہیں' سر اور ریش مبارک غبار آلود ہیں۔ سوال کیا یا رسول اللہ کیا بات ہے؟ فرمایا حسین کے مقتل سے واپس آرہا ہوں۔ حضرت ام سلمہ بیدار ہوئیں تو آنکھیں اشک بار تھیں اور زبان پر یہ الفاظ جاری تھے۔ اہل عراق نے حسین کو قتل کیا۔ خدا انھیں قتل کرے' انھوں نے حسین کو تکلیف پہنچائی خدا ان پر لعنت کرے۔

حضرت ام سلمہ بڑی عالمہ اور محدثہ تھیں۔ ان سے روایت کرنے والوں میں بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ اور تابعین شامل ہیں۔ بہت سی روایات ان سے مروی ہیں۔ اصابہ میں ہے کہ حضرت ام سلمہ اصابت رائے' فقہ و اجتہاد علم و تدبر میں سب پر فوقیت رکھتی تھیں۔ قرآن مجید بالکل اسی لہجے اور ترتیل سے پڑھتی تھیں جس طرح رسول اللہ ﷺ تلاوت فرماتے تھے۔ ہر مہینے تین دن سوموار' جمعرات' جمعے کو روزہ رکھتی تھیں۔ نہایت فیاض تھیں۔ سائل کو دروازے سے خالی ہاتھ نہ لوٹاتی تھیں۔ غریب کی مدد کرتی تھیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر سختی سے پابند تھیں۔ ان کے واقعات و حالات کی فہرست طویل بھی ہے اور سبق آموز بھی۔

حضرت ام سلمہ کی وفات کب ہوئی؟ اس میں اختلاف ہے۔ صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ۶۳ ہجری میں (جس سال حرہ کا واقعہ پیش آیا) ۸۴ برس کی عمر میں وفات پائی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن کی گئیں۔ اس زمانے میں ولید بن عتبہ مدینے کا گورنر تھا اور گورنر ہی نماز جنازہ پڑھاتا تھا' لیکن حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے وصیت کی تھی کہ ان کی نماز جنازہ ولید نہ

پڑھائے' اس لیے ان کی وفات کا سنتے ہی وہ جنگل کی طرف نکل گیا اور نماز جنازہ کے لیے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو بھیج دیا۔

ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا

ان کا نام زینب اور کنیت ام الحکیم ہے۔ قبیلہ قریش کے خاندان اسد بن خزیمہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ والد کا نام جحش اور والدہ کا امیمہ تھا جو عبدالمطلب کی بیٹی، حضرت عبداللہ کی حقیقی بہن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی تھیں۔ اس رشتے کی رو سے حضرت زینب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھیری بہن ہوئیں۔ حضرت زینب اسلام اور ہجرت کے اعتبار سے السابقون الاولون میں شامل ہیں۔

ایک شخص زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام بھی تھے اور آپ کے متبنیٰ بھی۔ ان میں ایک خصوصیت یہ تھی کہ کتاب و سنت کے مسائل کو خوب سمجھتے اور اسلامی احکام سے بہت آگاہ تھے۔ حضرت زینب کی تربیت آنحضرت کی نگرانی میں ہوئی تھی۔ آپ نے ان کا نکاح زید بن حارثہ سے کر دیا۔ اس نکاح سے آپؐ کے سامنے دو مقصد تھے۔

ایک یہ کہ اسلام کے نزدیک ذات برادری کا تفوق کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ زید اگرچہ آزاد کردہ غلام ہیں اور حضرت زینب قریش کے اونچے طبقے سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن اسلام نے اس امتیاز کو ختم کر دیا ہے اور ان دونوں کے درمیان اونچ نیچ کی جو دیواریں حائل تھیں، وہ قبول اسلام کے بعد مسمار ہو گئی ہیں۔

دوسرا یہ کہ آنحضرت زینب کو اسلامی احکام سے پوری طرح روشناس کرانا چاہتے تھے اور خواتین قریش میں ان کے ذریعے اسلام کی تعلیم و تبلیغ کے خواہاں تھے۔ آپؐ کا خیال یہ تھا کہ حضرت زید چونکہ مسائل شرعی سے اچھی طرح باخبر ہیں لہٰذا وہ اپنی بیوی کو بھی اس کی تعلیم دیں گے۔

نکاح ہو گیا- ایک سال تک میاں بیوی ایک ساتھ رہے' لیکن اس کے بعد اختلاف پیدا ہو گیا- آنحضرت نے بہت کوشش کی کہ طلاق تک نوبت نہ آئے مگر اختلاف کی شدت نے ایسی صورت اختیار کرلی کہ معاملہ تفریق اور طلاق تک پہنچ گیا-

جب مصالحت کی کوئی صورت باقی نہ رہی اور دونوں میں جدائی پیدا ہو گئی تو کچھ عرصے کے بعد آنحضرت نے پیغام نکاح بھیجا- حضرت زینب کچھ متامل ہوئیں' کیونکہ ان کے پہلے شوہر زید بن حارثہ آنحضرت کے متبنی تھے اور لوگ انھیں زید بن محمد کے نام سے پکارتے تھے- عرب جس شخص کو متبنی قرار دے لیتے تھے اسے حقیقی بیٹا ہی سمجھتے تھے اور اس کی بیوی سے نکاح نہیں کرتے تھے' لہٰذا زینب نے کہا اللہ کے حکم کا انتظار کرنا چاہیے- خود آنحضرت بھی ان سے نکاح کرنے میں قدرے متامل تھے- قرآن مجید کی آیت نازل ہوئی تو آپ نے نکاح کر لیا- قرآن مجید نے یہ بھی وضاحت فرمادی کہ آنحضرت تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں' یعنی آپ کی کوئی اولاد نرینہ نہیں ہے' جب اولاد نرینہ نہیں تو ظاہر ہے کہ زید بن حارثہ آپ کے بیٹے نہ ہوئے اور ان کی مطلقہ بیوی سے نکاح حرام نہ ٹھہرا- یہ واقعہ ماہ ذیقعدہ ۵ ہجری کا ہے-

نکاح کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ولیمے کا اہتمام کیا' جس میں آپ نے گوشت روٹی کا انتظام فرمایا- ولیمہ نہایت شان سے ہوا اور آدمی بھیج بھیج کر تین سو آدمیوں کو مدعو کیا- کھانا ہو چکا تو اکثر لوگ بہ دستور بیٹھے رہے اور آپس میں باتیں کرتے رہے' جس سے آنحضرت کو بڑی ذہنی کوفت ہوئی- آپ بار بار اٹھتے اور ادھر ادھر جاتے تھے' لیکن اخلاقاً انھیں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتے تھے- چھوٹا سا مکان تھا جس میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا بیٹھی تھیں- وہ بھی پریشان ہوئیں اور دیوار کی طرف منہ کر کے خاموشی سے بیٹھی رہیں- اس پر پردے کی آیت یعنی آیت حجاب نازل ہوئی' جس میں قرآن نے مندرجہ ذیل احکام دیے-

۱- پردے کا حکم دیا-

۲- بلا اجازت آنحضرت کے مکان پر آنے سے روک دیا-

۳- جب کھانا ہو چکے تو فوراواپس چلے جانے کا حکم دیا'

۴- ازواج مطہرات سے اگر کسی کو کوئی سوال کرنا ہو یا کوئی چیز مانگنا ہو تو پردے کی اوٹ میں کھڑے رہنے کی تاکید فرمائی-

۵- متبنّٰی کے لیے بیٹے کی حیثیت ختم ہوئی-

اس آیت کے نزول کے بعد آنحضرت نے دروازے پر پردہ لٹکا دیا اور لوگوں کو بلا اجازت اندر آنے کی ممانعت فرمادی کہ قرآن کی اس آیت کا تقاضا یہی ہے-

حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے اس نکاح کے بارے میں ابن اثیر نے لکھا ہے کہ وہ اپنے نکاح کی خصوصیات بیان کیا کرتی تھیں اور اس پر فخر کرتی تھیں کہ دیگر ازواج مطہرات کے نکاح آنحضرت سے ان کے والدین یا بھائیوں نے کیے مگر میرا نکاح براہ راست اللہ کے حکم سے ہوا- آنحضرت نے میرے نکاح کے ولیمے میں کثرت سے لوگوں کو دعوت دی اور گوشت روٹی کا اہتمام کیا- اس نکاح کے نتیجے میں آیت حجاب نازل ہوئی' متبنی کو عربوں میں جو بیٹے کی حیثیت دی جاتی تھی اس کا خاتمہ ہوا-

طبقات ابن سعد میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کسی زوجہ محترمہ کا ولیمہ اس شان دار طریقے سے نہیں کیا جس سے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا کیا' وہ اس باب میں تمام ازواج مطہرات سے ممتاز حیثیت رکھتی ہیں-

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ازواج رسول میں اگر کوئی میری برابری اور ہم سری کا دعوی کر سکتی ہیں تو وہ حضرت زینب ہیں- یہی وہ معزز خاتون ہیں جن کی وجہ سے بہت سی اصلاحات ہوئیں اور پرانی رسوم کی جڑیں کٹیں- غلام اور آزاد میں مساوات پیدا ہوئی اور خود خاندان بنوہاشم میں اس مساوات کی بنیاد رکھی گئی- ان کی وجہ سے حالات بالکل بدل گئے اور حضور نے اصلاح احوال کے لیے اللہ کے حکم کے مطابق کئی اہم قدم اٹھائے-

حضرت عائشہ اور حضرت زینب کے درمیان بہ تقاضائے بشریت بعض امور میں

کئی بار اختلاف پیدا ہو جاتا تھا اور معاملہ کش مکش کی حد تک پہنچ جاتا تھا- لیکن حضرت زینب کسی قسم کا غصہ اور خفگی دل میں نہ رہنے دیتیں- جب حضرت عائشہ کے بارے میں واقعہ افک پیش آیا تو ان سے پوچھا گیا کہ عائشہ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ فرمایا: میں عائشہ کے بارے میں سوائے اس کے کچھ نہیں جانتی کہ وہ بہت بلند اخلاق اور بہترین خاتون ہیں- حافظ ابن حجر نے اصابہ میں لکھا ہے کہ اس سوال کے جواب میں حضرت زینب نے حضرت عائشہ کی بہت تعریف کی-

حضرت زینب خود اپنے ہاتھ سے کام کرتی تھیں- وہ چمڑے کی دباغت کا فن جانتی تھیں اور جو کچھ اس سے آمدنی ہوتی وہ سب مسکینوں، یتیموں اور مستحق لوگوں میں تقسیم کر دیتیں-

حضرت عائشہ فرماتی ہیں فیاضی اور رحم دلی میں زینب کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا- طبقات ابن سعد میں منقول ہے کہ وہ متوکل علی اللہ، فراخ دست، قانع اور تنگ دستوں کی پشت پناہ تھیں، اور تیامی و مساکین کی بے حد مدد کرتی تھیں- ان کی فیاضی کا یہ عالم تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کو بارہ ہزار درہم سالانہ بیت المال سے دیتے تھے، اور وہ سب خرچ کر دیتی تھیں- ایک مرتبہ انھوں نے یہ رقم ان کی خدمت میں بھیجی تو فرمایا:

اے اللہ! آئندہ یہ مال مجھ تک نہ پہنچنے پائے کیونکہ یہ فتنہ ہے-

پھر یہ ساری رقم مستحقین میں تقسیم فرما دی- حضرت عمر رضی اللہ عنہا کو اس کا علم ہوا تو حاضر خدمت ہوئے- سلام کیا- دیر تک دروازے پر کھڑے رہے اور عرض کیا، آپ نے جو کچھ فرمایا ہے مجھے اس کی اطلاع ہو گئی ہے- آپ نے وہ سارا مال ضرورت مندوں کو تقسیم کر دیا ہے- آپ کے پاس تو کچھ بھی باقی نہیں رہا- واپس جا کر اخراجات کے لیے ایک ہزار درہم اور بھیجے، وہ بھی تقسیم کر دیے-

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا بڑا احترام تھا- ایک دفعہ حضور مہاجرین میں کچھ مال تقسیم فرما رہے تھے کہ حضرت زینب

نے کوئی بات کہی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے' انھوں نے کچھ کہا تو حضرت زینب نے فرمایا: آپ کو اس معاملے میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔

آنحضرت نے فرمایا: عمر انھیں کچھ نہ کہو۔ یہ عابدہ و زاہدہ اور خاشعہ و متوکلہ خاتون ہیں۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں دین کے معاملے میں' تقویٰ و طہارت میں' صداقت و معاملہ فہمی میں' صلہ رحمی میں' سخاوت اور ایثار نفس میں' زینب سے بڑھ کر کوئی عورت میں نے نہیں دیکھی۔

الاستیعاب میں علامہ ابن عبدالبر نے ان کے بارے میں حضرت عائشہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے شرعی اور دینی معاملات میں حضرت زینب سب سے بڑھی ہوئی تھیں۔ دوسری جگہ فرماتی ہیں اللہ زینب پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے' وہ بلا شبہ دنیا کی بے مثال خاتون تھیں۔ خود اللہ نے اپنے پیغمبر سے اس کا نکاح کیا اور ان کی وجہ سے قرآن کی آیات نازل ہوئیں اور بہت سے احکام بارگاہِ الٰہی سے بھیجے گئے۔

۲۰ ہجری میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے انتقال کیا۔ اسی سال مصر فتح ہوا۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۵۳ سال کی تھی۔ واقدی نے پچاس سال کی عمر لکھی ہے۔ وہ اپنی تمام آمدنی ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتی تھیں۔ ان کے پاس صرف ایک مکان تھا جس میں رہائش پذیر تھیں۔ ولید بن عبدالمالک نے پچاس ہزار درہم میں یہ مکان بھی خرید لیا تھا اور اسے مسجد نبوی میں ملا دیا تھا۔

طبقات ابن سعد میں مذکور ہے کہ وفات سے قبل حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے یہ وصیت کی تھی کہ میں نے اپنا کفن خود ہی تیار کیا ہے' ممکن ہے حضرت عمر میرے لیے کفن بھیجیں' اگر انھوں نے بھیجا تو ایک کفن صدقے میں دے دینا۔

نماز جنازہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔ انھوں نے یہ بھی وصیت کی تھی کہ مجھے اسی چارپائی پر قبر تک پہنچایا جائے جس میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچایا گیا تھا- اس سے پہلے صرف حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو یہ شرف حاصل ہوا تھا-

ان کی وفات کے دن سخت گرمی پڑ رہی تھی- جہاں قبر کھودی جا رہی تھی گرمی کی شدت کی وجہ سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے وہاں خیمہ نصب کرا دیا تھا- منقول ہے کہ یہ پہلا خیمہ تھا جو جنت البقیع میں نصب کیا گیا-

دفن سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ازواج مطہرات کو پیغام بھجوا کر دریافت کیا کہ حضرت زینب کو قبر میں کون اتارے؟ جواب آیا کہ ان کی زندگی میں جو لوگ ان کے پاس آتے تھے' وہی قبر میں اتاریں- چنانچہ ان کے بھتیجے محمد بن عبداللہ بن جحش' اسامہ بن زید' عبداللہ بن ابی احمد بن جحش اور محمد بن طلحہ نے ان کو قبر میں اتارا- یہ سب حضرات ان کے رشتے دار تھے-

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی وفات پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

آج یہ نیک بخت خاتون رخصت ہو گئیں اور یتیموں اور بیوہ عورتوں کو پریشان اور بے چین کر گئیں-

حضرت زینت بنت جحش سے گیارہ حدیثیں مروی ہیں' ان کے راویوں میں حضرت ام حبیبہ اور زینب بنت ابی سلمہ وغیرہ شامل ہیں-

ام المومنین حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا قبیلہ بنو خزاعہ کے خاندان بنو مصطلق سے تعلق رکھتی تھیں۔ان کا سلسلہ نسب یہ ہے:

جویریہ بنت حارث بن ابو ضرار بن حبیب بن عائذ بن مالک بن جذیمہ بن سعد بن عمرو بن ربیعہ بن عمرو۔

حضرت جویریہ کے والد حارث بن ابو ضرار خاندان بنو مصطلق کے سردار تھے۔

حضرت جویریہ کا پہلا نکاح ان کے اپنے ہی قبیلے کے ایک شخص مسافع بن صفوان سے ہوا تھا جو ذی شفر کے نام سے معروف تھا۔

حضرت جویریہ کا والد حارث اور شوہر مسافع چونکہ اسلام کے شدید ترین دشمن اور مسلمانوں کے سخت مخالف تھے اس لیے حارث قریش کی انگیخت پر یا از خود مدینے پر حملے کے لیے کمر بستہ ہوا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اطلاع مل گئی مگر آپؐ نے حقیقت حال معلوم کرنے کی غرض سے حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی کو بھیجا۔ انھوں نے واپس آکر بتایا کہ یہ خبر صحیح ہے اور حارث فی الواقع حملے کی تیاریاں کر رہا ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو جمع کیا اور جنگ کی تیاری کا حکم دیا۔ چنانچہ شعبان ۵ ہجری کو مسلمانوں کی فوج مدینہ سے مریسیع کی جانب روانہ ہوئی۔ مریسیع ایک مقام ہے جو مدینہ منورہ سے ۹ منزل کی مسافت پر واقع ہے۔مسلمان فوج نے اسی مقام پر قیام کیا۔حارث مسلمانوں کی جوابی نقل و حرکت سے پہلے ہی مطلع ہو چکا تھا اور اس کے ساتھی بھی پوری صورت حال سے باخبر تھے‘اس لیے حارث کی تمام فوج منتشر ہو گئی اور خود حارث بھی خوف زدہ ہو کر کسی طرف بھاگ گیا‘لیکن مریسیع کی آبادی مقابلے پر اتر آئی۔وہ لوگ گھروں سے نکل آئے اور مسلمانوں کے خلاف

صف بستہ ہو گئے- دیر تک وہ لوگ مسلمانوں پر تیر اندازی کرتے رہے- پہلے تو مسلمان کچھ خاموش سے رہے' مگر بعد میں ایک دم حملہ آور ہوئے' جس سے اہل مریسیع کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے' اس کے نتیجے میں ان کے گیارہ آدمی مارے گئے اور تقریباً چھے سو آدمی گرفتار ہوئے- مال غنیمت میں دو ہزار اونٹوں اور پانچ ہزار بکریوں پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا-

مریسیع کی لڑائی میں جو لوگ گرفتار ہوئے ان میں حضرت جویریہ بھی شامل تھیں اور یہ تمام اسیران جنگ لونڈی غلام بنا کر مسلمانوں میں تقسیم کر دیے گئے تھے- جویریہ جو خاندان مصطلق کے رئیس حارث بن ابوضرار کی بیٹی تھی' حضرت ثابت بن قیس کے حصے میں آئی- جویریہ کے لیے بحیثیت لونڈی کے زندگی بسر کرنا بڑا مشکل تھا' چنانچہ انھوں نے ثابت سے "مکاتبت" کی درخواست کی یعنی ان سے کہا کہ مجھ سے کچھ رقم لی جائے اور مجھے چھوڑ دیا جائے- حضرت ثابت نے یہ درخواست قبول کر لی اور کہا کہ اگر وہ نو اوقیہ سونا ادا کر دے تو اسے رہا کیا جا سکتا ہے-

اس سے آگے سیرت کی کتابوں میں جو روایات منقول ہیں' ان میں قدرے اختلاف ہے- ایک روایت یہ ہے کہ جویریہ کے مالک حضرت ثابت بن قیس کچھ سونا لے کر ان کی رہائی پر رضامند ہو گئے' تو اب جویریہ کو اپنی رہائی کے لیے روپے کی ضرورت پڑی- وہ خود تو تہی دست تھیں' اس لیے کچھ لوگوں سے اعانت کی طالب ہوئیں- اس سلسلے میں آنحضرت کی خدمت اقدس میں بھی حاضر ہوئیں- دوسری روایت یہ ہے کہ وہ آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر طالب امداد ہوئیں تو تمام قم خود آنحضرت ہی نے ادا کر دی اور ان سے شادی کر لی- تیسری روایت زیادہ واضح اور قرین فہم ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے باپ حارث بن ابوضرار کا شمار روسائے عرب میں ہوتا تھا- وہ اپنی بیٹی کی گرفتاری سے شدید متاثر ہوا اور آنحضرت کی خدمت میں آیا- اس نے عرض کی کہ میں عرب کا ایک سرکردہ آدمی ہوں- میرا مقام و مرتبہ اور میری بیٹی کی عزت و آبرو اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ

وہ کسی کی کنیز بن کر رہے اور اس طرح ذلت کی زندگی بسر کرے۔ میں اپنے قبیلے کا سردار اور عرب کا سربر آوردہ شخص ہوں۔ آپ میری عزت کا احساس کرتے ہوئے میری بیٹی کو آزاد کر دیں۔

حضور نے فرمایا: کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ اس معاملے کو خود جویریہ کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے؟

چنانچہ حارث جویریہ کے پاس گیا اور کہا کہ مسلمانوں کے پیغمبر نے معاملے کو خود تیری ہی مرضی پر چھوڑ دیا ہے۔ اب جو تم کہو کر لیا جائے' لیکن اتنی بات یاد رکھو کہ مجھ کو ذلیل ورسوانہ کرنا۔

جویریہ نے جواب دیا: میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہنے کو ترجیح دیتی ہوں۔

اس جواب کے بعد آنحضرت نے ان سے شادی کر لی اور حارث جو زر فدیہ لے کر بیٹی کو چھڑانے آیا تھا مسلمان ہو گیا۔ طبقات ابن سعد کی روایت میں مذکور ہے کہ حضرت جویریہ کے والد حارث نے ان کا زر فدیہ ادا کیا اور وہ آزاد ہو گئیں تو باپ کے ساتھ جانے کی بجائے آنحضرت سے نکاح کرنے کو ترجیح دی۔ ان کا مہر اسیران مریسیع کی رہائی تھا' چنانچہ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کے بعد آپؐ نے جنگ مریسیع کے تمام قیدی رہا کر دیے۔ ایک قول کے مطابق مسلمان فوجیوں نے ان کی رہائی کے لیے یہ موقف اختیار کیا کہ جس خاندان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی کر لی ہے' اس کا کوئی فرد بھی غلام کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جویریہ اپنی قوم اور قبیلے کے حق میں سب سے زیادہ باعث رحمت اور قابل مبارک باد ہیں کہ جن کی وجہ سے بنو مصطلق کے کئی خاندان آزادی و حریت کی نعمت سے بہرہ مند ہوئے۔ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کا اصل نام برہ تھا۔ ان کا نام جویریہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا تھا۔

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چند احادیث

بھی مروی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت جابر، حضرت عبداللہ بن عمر، ابوایوب مراغی، حضرت کلثوم، کریب، حضرت عبداللہ بن شداد وغیرہ حضرات نے ان سے سماعت احادیث اور روایات بیان کرنے کا شرف حاصل کیا۔

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا رئیس عرب اور سردار قبیلہ کی بیٹی ہونے کے باوجود نہایت سادہ اور زاہدانہ زندگی بسر کرتی تھیں اور بہت ہی عبادت گزار تھیں۔ ان کے شغف عبادت کا یہ حال تھا کہ ایک روز صبح کے بعد آنحضرت مسجد کے قریب سے گزرے تو انھیں مصروف دعاو عبادت پایا۔ دوپہر کے قریب واپس آئے تو بھی اسی حالت میں دیکھا۔ روزے کثرت سے رکھتی تھیں۔ قناعت پیشہ اور جفاکش تھیں۔ گفتگو میں اعتدال تھا اور زندگی کے تمام معاملات میں متوازن اور میانہ رو تھیں۔ اپنے کام خود انجام دیتی تھیں۔ تحمل اور بردباری کا پیکر تھیں۔

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آئیں تو ان کی عمر بیس برس کی تھی۔ ۶۵ سال کی عمر پاکر ۵۰ ہجری میں بعہد امیر معاویہ ماہ ربیع الاول میں فوت ہوئیں۔ مروان نے جو اس وقت عامل مدینہ تھا، نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن کی گئیں۔

ایک روایت کے مطابق ۵۶ ہجری میں وفات پائی۔

ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہ

ان کا نام رملہ اور کنیت ام حبیبہ ہے اور کنیت ہی سے مشہور ہیں- والدہ صفیہ بنت ابوالعاص تھیں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حقیقی پھوپھی تھیں- باپ ابوسفیان تھے جن کا نام صخر تھا اور زیادہ تر کنیت ہی سے مشہور و متعارف تھے- حضرت ام حبیبہ کی ولادت بعثت نبوی سے سترہ سال پہلے ہوئی تھی- حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بہن تھیں-

حضرت ام حبیبہ کا پہلا نکاح ایک شخص عبیداللہ بن جحش سے ہوا تھا جو اسد بن خزیمہ کے خاندان سے تھا اور حرب بن امیہ کا حلیف تھا- دونوں میاں بیوی ایک ساتھ مسلمان ہوئے اور ایک ساتھ ہی ہجرت حبشہ کا شرف حاصل کیا- حبشہ میں عبیداللہ سے ان کے ایک لڑکی پیدا ہوئی' جس کا نام حبیبہ رکھا اور اسی وجہ سے ان کی کنیت ام حبیبہ قرار پائی- اس لڑکی (حبیبہ) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں تربیت کی منزلیں طے کیں اور قبیلہ ثقیف کے رئیس اعظم داؤد بن عروہ بن مسعود سے ان کی شادی ہوئی-

ہجرت حبشہ سے کچھ عرصہ بعد حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر عبیداللہ کو خواب میں دیکھا کہ وہ مکروہ اور بدنما شکل میں ان کے سامنے آیا ہے- وہ اس خواب سے سخت پریشان ہوئیں اور اس شبہے میں پڑ گئیں کہ کہیں صورت حال بگڑ نہ جائے- صبح ہوئی تو عبیداللہ نے سنجیدگی سے کہا ام حبیبہ میں مذہب کے مسئلے پر کئی روز سے غور کر رہا ہوں- نصرانیت سے مجھے کوئی مذہب بہتر معلوم نہیں ہوتا- میں نے اسلام تو بلاشبہ قبول کر لیا تھا' لیکن اب میں اسے ترک کرتا ہوں اور عیسائیت قبول کرتا ہوں-

حضرت ام حبیبہ بہت گھبرائیں۔ عبیداللہ کو سخت ملامت کی اور عیسائیت کے مقابلے میں اسلام کی حقانیت واضح کی اور اپنا خواب بھی بیان کیا۔ مگر عبیداللہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے اسلام ترک کر کے عیسائیت قبول کر لی اور عیاشی کی زندگی بسر کرنے لگا۔ وہ مے نوشی کا بھی عادی ہو گیا تھا اور آخر اسی حالت میں مر گیا۔

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا اب حبشہ میں تنہا تھیں اور بیوگی کی مصیبت میں مبتلا تھیں۔ عدت پوری ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن امیہ کو شاہ حبشہ نجاشی کے پاس ام حبیبہ کے لیے پیغام نکاح دے کر بھیجا۔ پیغام ملتے ہی نجاشی نے اپنی کنیز ابرہہ کو حضرت ام حبیبہ کے پاس بھیجا اور آنحضرت کا پیغام پہنچایا' ساتھ ہی کہا کہ اگر جواب اثبات میں ہے تو اپنا کوئی وکیل نکاح بھی مقرر کر دیجیے تاکہ فوری طور پر یہ تقریب انجام پا جائے۔ حضرت ام حبیبہ نے اس پیغام کا جواب اثبات میں دیا اور نجاشی کی خادمہ ابرہہ کو چاندی کے دو کنگن' پاؤں کے دو چھلے اور ایک نقرئی انگوٹھی بطور تحفہ پیش کیں اور خالد بن سعید کو وکیل نکاح مقرر کیا۔ شام کے وقت نجاشی نے وہاں کے مسلمانوں اور حضرت جعفر بن ابو طالب رضی اللہ عنہ کو دعوت دی اور خود نکاح پڑھایا۔ مہر کے چار سو دینار مقرر کیے جو اسی وقت آنحضرت کی طرف سے خالد بن سعید کو دے دیے گئے۔ نکاح کے بعد لوگ اٹھ کر جانے لگے تو خالد بن سعید نے ان کو بٹھا لیا اور کہا انبیا کی یہ سنت ہے کہ وہ نکاح کے بعد لوگوں کو کھانا بھی کھلاتے ہیں۔ چنانچہ سب کو کھانا کھلایا گیا۔ یہ نکاح ۶ ہجری کے آخر یا ۷ ہجری کے شروع میں ہوا۔ اس وقت حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہ کی عمر ۳۶ یا ۳۷ سال کی ہو گی۔ نکاح کے بعد وہ جہاز میں بیٹھ کر مدینہ کو روانہ ہو گئیں اور مدینہ کی بندرگاہ پر جا اتریں۔ ان دنوں آنحضرت خیبر میں قیام فرما تھے۔

تاریخ و سیر کی کتابوں میں مرقوم ہے کہ حضرت ام حبیبہ کا مہر چار سو دینار مقرر کیا گیا تھا' یا تو یہ راوی کا سہو ہے' کیونکہ احمد بن حنبل اور علامہ ابن عبدالبر وغیرہ نے واضح طور سے لکھا ہے کہ آنحضرت کی صاحب زادیوں اور ازواج مطہرات کا مہر چار

چار سو درہم تھا۔ حضرت ام حبیبہ کا مہر بھی چار سو درہم ہو گا' جو راوی کی غلطی سے چار سو دینار لکھا گیا' یا ممکن ہے یہ مہر چار سو دینار ہی ہو' کیونکہ یہ مہر آنحضرت کے بجائے شاہ حبش نجاشی نے مقرر کیا تھا اور اسی نے ادا کیا تھا۔

صحاح کی بعض کتابوں میں مرقوم ہے کہ حضرت ام حبیبہ کے والد ابوسفیان چونکہ زمانہ جاہلیت میں اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شدید ترین دشمن تھے اور مسلمانوں سے سخت عداوت رکھتے تھے' اس لیے ان کے قبول اسلام کے بعد بعض مسلمان ان کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اور ان سے متعلق کئی قسم کی باتیں کرتے تھے' لہٰذا ابوسفیان نے مسلمانوں میں مقبول ہونے کے لیے آنحضرت کی خدمت میں کچھ درخواستیں پیش کیں جن میں ایک یہ تھی کہ حضور ان کی بیٹی ام حبیبہ کو اپنے حلقہ زوجیت میں داخل فرمالیں' چنانچہ آپ نے یہ درخواست قبول فرمائی' لیکن یہ بات بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ یہ راوی کا سہو ہے' کیونکہ حضرت ام حبیبہ اپنے والد ابوسفیان سے بہت پہلے اسلام قبول کر چکی تھیں اور ان کے اسلام سے قبل امہات المومنین کے زمرے میں شامل ہو چکی تھیں۔

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے احادیث بھی مروی ہیں جو صحاح کی کتابوں میں مذکور ہیں اور جن کی تعداد ۶۵ کے قریب ہے۔ ان سے روایت کرنے والوں کی تعداد بھی خاصی ہے' جن میں خود ان کی لڑکی حبیبہ' ان کے بھائی حضرت معاویہ' عتبہ بن عبداللہ بن عتبہ' عروہ بن زبیر' ابوالجراح' زینب بنت ابوسلمہ' صفیہ بنت شیبہ' شہر بن حوشب اور دیگر معزز حضرات شامل ہیں' جن میں صحابہ بھی ہیں اور تابعین بھی۔

حضرت ام حبیبہ نہایت عابدہ وزاہدہ تھیں۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ جو شخص بارہ رکعت روزانہ نفل پڑھے گا' اس کے لیے جنت میں ایک گھر تیار کیا جائے گا۔ اس فرمان رسول کا یہ اثر ہوا کہ خود فرماتی ہیں میں ہمیشہ بارہ رکعت نفل پڑھتی ہوں' پھر ان کے شاگرد اور شاگردوں کے شاگرد بھی ہمیشہ بارہ رکعت نفل پڑھتے رہے۔

ان کے والد ابو سفیان کا انتقال ہوا تو خوشبو لگائی اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کسی پر تین روز سے زیادہ افسوس نہ کیا جائے' البتہ شوہر اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس کے لیے چار مہینے دس دن سوگ منایا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے مقابلے میں کسی عزیز یا رشتے دار کو ترجیح نہ دیتیں' نہ کسی کی رعایت کرتیں' اس ضمن میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے جو بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ایک مرتبہ ان کے والد ابو سفیان حالت کفر میں مدینہ منورہ آئے۔ ان کی آمد کا مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنا اور میعاد صلح میں توسیع کے بارے میں گفتگو کرنا تھا۔ وہ مدینہ آئے تو بیٹی کے پاس بھی گئے۔ حضرت ام حبیبہ کے مکان میں داخل ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر بچھا ہوا تھا۔ اس پر بیٹھنے کے لیے آگے بڑھے۔ حضرت ام حبیبہ جلدی سے اٹھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر الٹ دیا۔ ابو سفیان کو یہ بات ناگوار گزری انھوں نے غصے کے عالم میں کہا یہ کیا حرکت ہے؟ یہ بستر تمھارے نزدیک مجھ سے زیادہ عزیز ہے؟ کہا جی ہاں! یہ دنیا کی سب سے مقدس ہستی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر ہے' اس کو صاف و مطہر رکھنا ضروری ہے۔ آپ کفر کی آلودگیوں سے ملوث اور شرک کی گمراہیوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ میرے لیے ممکن نہیں کہ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر بیٹھنے کی اجازت دوں' آپ بے شک میرے باپ ہیں' لیکن کافر اور مشرک ہونے کی وجہ سے نجس اور غیر طاہر ہیں۔ آپ کا آنحضرت کے بستر پر بیٹھنا آنحضرت کے باب میں سوئے ادب ہے' جس کا ارتکاب میری موجودگی میں ہرگز نہیں ہو سکتا۔

ابو سفیان غصے سے بھر گئے اور کہا :

لقد اصابك بعدی شر

تو میرے بعد بہت خرابیوں میں مبتلا ہو گئی ہے۔

لیکن حضرت ام حبیبہ نے باپ کے غصے کی کوئی پروا نہیں کی۔

اپنے بھائی حضرت معاویہ کے عہد خلافت میں ۴۴ھ کو ۷۳ برس کی عمر پا کر انتقال

کیا۔انتقال سے پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو بلایا اور کہا سوکنوں میں جو تلخ کلامی ہو جاتی ہے' وہ کبھی کبھی ہم میں بہ تقاضائے بشریت ہو جاتی تھی' اس لیے مجھے معاف کر دیجیے اور میرے لیے دعائے مغفرت کیجئے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا میں نے آپ کو معاف کیا۔ خدا آپ کی مغفرت کرے۔ بولیں :

سر رتني سرك الله

یعنی آپ نے مجھے خوش کیا' اللہ آپ کو خوش رکھے۔

الاستیعاب میں ان کی قبر کے بارے میں یہ عجیب واقعہ لکھا ہے کہ حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہ (یعنی حضرت زین العابدین) فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ اپنے مکان کا ایک گوشہ کھدوایا' اس سے ایک کتبہ بر آمد ہوا' جس پر مرقوم تھا۔

هذا قبر رملة بنت صخر

کہ یہ رملہ بنت صخر کی قبر ہے (یاد رہے حضرت ام حبیبہ کا نام رملہ اور ان کے والد ابو سفیان کا نام صخر تھا) حضرت زین العابدین فرماتے ہیں میں نے دیکھا تو کتبہ وہیں رکھ دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی قبر مدینہ منورہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مکان میں تھی ۔واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت صفیہ بنت حیّی رضی اللہ عنہا

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد سے تھیں- انھیں صفیہ بنت حیّی اسرائیلیہ کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں- سلسلہ نسب یہ ہے: حضرت صفیہ بنت حیّی بن اخطب بن سعید بن عامر بن عبید- والدہ کا نام برہ تھا جو یہودیوں کے مشہور خاندان بنو قریظہ سے تعلق رکھتی تھیں- حضرت صفیہ کا سلسلہ نسب ددھیال کی طرف سے بنو نضیر اور ننھیال کی طرف سے بنو قریظہ سے ملتا تھا- یہ دونوں عرب کے یہودی خاندان تھے اور بڑی شہرت واہمیت کے مالک تھے- حضرت صفیہ کے باپ اور نانا اپنی قوم کے سردار اور رئیس تھے- یہودیوں کے عرب قبائل میں ان کو نہایت احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا- حضرت صفیہ کے والد حیّی بن اخطب کے سامنے ان کی پوری قوم سرنگوں رہتی تھی اور تمام رؤسائے عرب انھیں اونچی شخصیت قرار دیتے تھے- حضرت صفیہ کی والدہ برہ سموان کی بیٹی تھیں اور سموان شجاعت وبسالت میں تمام عرب میں مشہور تھا- اس کی بہادری کی بہت سی داستانیں زبان زد عوام وخواص تھیں- بہرحال حضرت صفیہ حسب ونسب کے باب میں ننھیال اور ددھیال کی طرف سے ممتاز حیثیت رکھتی تھیں-

حضرت صفیہ کی پہلی شادی ایک مشہور یہودی شاعر اور معروف بہادر و جنگ جو سلام بن مشکم قرظی سے ہوئی تھی- اس نے کسی وجہ سے اس کو طلاق دے دی تو کنانہ بن ابوالحقیق سے نکاح کیا- یہ بھی شجاعت و بہادری میں سلام بن مشکم کی ٹکر کا تھا اور خیبر کے مشہور قلعہ القموص کا سردار تھا- اس کی رہائش بھی اسی قلعے میں تھی- جنگ خیبر میں مسلمانوں کو یہودیوں کے مقابلے میں جب تاریخی فتح حاصل ہوئی اور یہودیوں کو عبرت ناک ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا تو کنانہ بن ابوالحقیق نے اپنے قلعے کے تحفظ کے لیے زبردست مقابلہ کیا اور مقابلے میں مارا گیا اور اس کے تمام اہل و عیال

گرفتار کر لیے گئے۔

خیبر کی یہ لڑائی فیصلہ کن حیثیت رکھتی تھی۔ یہودیوں کو اس میں ایسی شکست کا سامنا کرنا پڑا کہ پھر وہ مسلمانوں سے متصادم ہونے کی جرات نہ کر سکے۔ ان کے بڑے بڑے سردار اور جنگ جو ایک ایک کر کے مارے گئے۔ مرنے والوں میں حضرت صفیہ کا باپ' بھائی اور شوہر بھی شامل تھے۔ اسی بنا پر یہودی جنگی قیدیوں میں حضرت صفیہ کی حالت دوسروں کی نسبت بڑی ہی قابل رحم تھی۔

مسلمان فوجیوں میں مال غنیمت تقسیم ہونے لگا اور جنگی قیدیوں کو تقسیم کی غرض سے جمع کیا گیا تو ایک صحابی حضرت دحیہ کلبی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک لونڈی کے لیے درخواست کی۔ آپ نے فرمایا ان قیدیوں میں سے خود ہی ایک لونڈی منتخب کر لو۔ دحیہ کلبی نے حضرت صفیہ کو پسند کیا۔ حضور نے ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی۔ اتنے میں صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) صفیہ حسب و نسب کے اعتبار سے اونچے درجے کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے ساتھ وہی برتاؤ کرنا چاہیے جس کی یہ مستحق ہیں۔ دحیہ کلبی ان کے ساتھ عام عورتوں کا سا سلوک کریں گے جو ان کی عزت و احترام کے تقاضوں کے منافی ہوگا۔ یہ بنو نضیر اور بنو قریظہ کی رئیسہ ہیں۔ ان کا باپ اور شوہر اپنی قوم کے رئیس تھے' لہٰذا انھیں دحیہ کے سپرد نہ کیا جائے بلکہ مناسب یہ ہے کہ خود حضور ہی اسے اپنی تحویل میں لے لیں۔ آنحضرت نے صحابہ کا یہ مشورہ قبول فرمایا۔ دحیہ کو ایک اور لونڈی دے دی اور آپ نے صفیہ کو آزاد کر کے ازواج مطہرات میں شامل کر لیا۔

یہ ۷ھ کا واقعہ ہے۔ آپؐ نے خیبر ہی میں ان کے ساتھ نکاح کر لیا۔ وہاں سے چل کر ایک جگہ صہبا میں رسم عروسی ادا کی گئی اور دعوت ولیمہ بھی وہیں ہوئی۔ صہبا سے کوچ کرنے لگے تو آنحضرت نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو اپنے اونٹ پر سوار کیا اور اپنی عبا مبارک سے ان پر پردہ کیا' جس سے لوگوں کو یہ معلوم کرانا مقصود تھا کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا ازواج مطہرات میں شامل ہونے کا شرف حاصل کر چکی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت صفیہ کو ساتھ لے کر مدینہ منورہ میں پہنچے تو انھیں اپنے ایک جاں نثار صحابی حضرت حارث بن نعمان رضی اللہ عنہ کے مکان پر ٹھہرایا۔ مدینہ کی مہاجر اور انصار عورتوں کو معلوم ہوا تو وہیں ان کو دیکھنے کے لیے آئیں۔ ان معزز خواتین میں حضرت حفصہ، حضرت زینب بنت جحش، حضرت برہ اور حضرت عائشہ بھی شامل تھیں رضی اللہ عنھن۔ یہ سب خواتین برقعہ اوڑھ کر حضرت صفیہ کو دیکھنے اور ملنے کے لیے آئیں۔ جب واپس ہونے لگیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا:

كيف رأيتها يا عائشه!

عائشہ تم نے انھیں کیسا پایا؟

کہا یہودیہ ہے۔

حضور نے فرمایا عائشہ ایسی بات مت کہو۔ یہ مسلمان ہو چکی ہیں اور ان کا اسلام قابل تعریف ہے۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا بڑی متحمل مزاج اور حلیم الطبع تھیں اور سخت سے سخت مصیبت کے موقعے پر بھی ضبط و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتی تھیں۔ جب مسلمانوں نے ان کا قلعہ القموص فتح کیا اور خیبر کی دیواروں پر اسلام کا پرچم لہرانے لگا تو حضرت بلال ان کو اور ان کی چچازاد بہن کو ساتھ لے کر آنحضرت کی خدمت میں لے کر چلے۔ راستے میں یہودیوں کی بے شمار لاشیں پڑی تھیں، جن کے اوپر سے یہ گزر رہی تھیں۔ حضرت صفیہ کے شوہر کی لاش بھی انہی لاشوں میں تھی۔ یہ منظر دیکھ کر ان کی بہن کا دل کانپ اٹھا اور اس نے ایک ہولناک چیخ ماری اور سر پر خاک ڈالنے لگی۔ مگر حضرت صفیہ کی جبین متانت پر ادنی سی شکن بھی نہیں ابھری اور وہ سراپا تحمل بنے نہایت خاموشی سے گزر گئیں۔

ان کی ایک لونڈی نے ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے شکایت کے انداز میں کہا کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا میں اب بھی یہودیت کا اثر موجود ہے

اور وہ یوم السبت کی عزت کرتی ہیں' نیز یہودیوں سے ان کی بول چال اور مراسم ہیں۔

حضرت عمر نے حضرت صفیہ سے دریافت کرایا تو جواب دیا یوم السبت کے بجائے مجھے یوم الجمعہ مل گیا ہے اور میں یوم الجمعہ ہی کا احترام کرتی ہوں' البتہ یہودی میرے رشتے دار اور قرابت دار ہیں' صلہ رحمی کے لیے ان سے میل جول رکھتی ہوں۔

اس کے بعد اس لونڈی کو بلایا اور فرمایا تمھیں اس شکایت پر کس نے آمادہ کیا تھا؟

کہا: شیطان نے۔

یہ سن کر حضرت صفیہ خاموش ہو گئیں اور لونڈی کو آزاد کر دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت صفیہ بدرجہ غایت محبت رکھتی تھیں۔ آنحضرت بیمار ہوئے تو ازواج مطہرات مزاج پرسی کے لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے مکان پر تشریف لائیں۔ آنحضرت کی تکلیف دیکھ کر حضرت صفیہ بہت مغموم ہوئیں اور کہا یا رسول اللہ کاش آپ کی تمام بیماریاں مجھے مل جائیں اور آپ تندرست ہو جائیں۔

یہ سن کر ازواج مطہرات ان کی طرف دیکھنے لگیں۔ حضور نے فرمایا واللہ یہ سچ کہتی ہیں' یعنی ان کی یہ بات تصنع اور بناوٹ سے خالی ہے۔

قبول اسلام کے بعد یہودیت کا طعن ان کے لیے سخت تکلیف دہ اور قلبی کوفت کا باعث تھا۔ ایک دفعہ آنحضرت تشریف لائے تو رو رہی تھیں۔ آپ نے رونے کی وجہ دریافت کی تو کہا عائشہ اور زینب کہتی ہیں ہم تمام ازواج مطہرات سے افضل ہیں کیونکہ ہمیں آنحضرت کی رشتہ دار ہونے کی سعادت بھی حاصل ہے۔

آپ نے فرمایا: تم نے کیوں نہ کہہ دیا کہ میرے باپ حضرت ہارون' چچا حضرت موسی اور شوہر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں' اس لیے تم مجھ سے کس طرح افضل و بہتر قرار پا سکتی ہو؟

نہایت فیاض اور فراخ دست تھیں۔ اپنا ایک ذاتی مکان تھا۔ وہ بھی صدقے میں دے دیا تھا۔ آنحضرت کی زوجہ محترمہ کی حیثیت سے مدینہ منورہ آئیں تو حضرت

فاطمہ رضی اللہ عنہا اور تمام ازواج مطہرات میں سونے کی بالیاں تقسیم کیں۔

مظلوم کی بے حد ہمدرد تھیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو محصور کر لینے کے بعد ان کے مکان پر سخت پہرہ بٹھا دیا گیا تھا۔ ان کی امداد کے لیے خچر پر سوار ہو کر نکلیں اور ان کے مکان کی طرف چل پڑیں۔ اشتر نخعی کو معلوم ہوا تو اس نے خچر کو روک کر مارنا شروع کر دیا۔ مصلحتاً اس کا مقابلہ نہ کیا اور واپس چلی گئیں۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان کی خدمت پر مامور کیا۔

نہایت عقل مند اور حدیث کی عالمہ تھیں۔ لوگ ان سے بہت سے مسائل دریافت کرتے تھے۔ ان کا مکان عورتوں کے ایک مدرسے بلکہ دارالعلوم کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ ایک خاتون صہیرہ بنت جعفر کا بیان ہے کہ وہ حج سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ گئیں تو حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں ان سے ملنے کے لیے حاضر ہوئیں۔ وہاں پہنچیں تو دیکھا کوفہ کی متعدد خواتین ان سے مختلف مسائل دریافت کر رہی ہیں اور وہ سب کے جواب نہایت متانت اور تحمل سے دے رہی ہیں۔

ان سے متعدد احادیث مروی ہیں۔ روایت کرنے والوں میں امام زین العابدین' کنانہ' مسلم بن صفوان' یزید بن مصعب اور اسحاق بن عبداللہ بن حارث خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

۵۰ھ میں ساٹھ سال کی عمر پا کر فوت ہوئیں اور جنت البقیع میں دفن کی گئیں۔ وفات سے قبل وصیت کی تھی کہ میری متروکہ جائداد کا تیسرا حصہ میرے بھانجے کو دیا جائے۔ ان کا ترکہ ایک لاکھ درہم پر مشتمل تھا۔ جس بھانجے کے بارے میں وصیت کی تھی وہ یہودی مذہب رکھتا تھا۔ اختلاف مذہب کی بنا پر لوگوں نے اس وصیت پر عمل کرنے سے پس و پیش کیا۔ حضرت عائشہ کو معلوم ہوا تو ان الفاظ میں پیغام بھجوایا۔

لوگو اللہ کا خوف کرو اور صفیہ کی وصیت بہ ہر صورت پوری کرو۔

جوں ہی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے یہ الفاظ لوگوں کے کانوں میں گونجے' وہ پیچھے ہٹ گئے اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی وصیت پوری کی۔

ام المومنین حضرت میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا

والدین نے ان کا نام برہ رکھا تھا- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آئیں تو آپؐ نے نام بدل دیا اور برہ کے بجائے میمونہ رکھ دیا- ان کا سلسلہ نسب یہ ہے-

میمونہ بنت حارث بن حزن بن بجیر بن ہذم بن رویبہ بن عبداللہ بن ہلال بن عامر بن صعصعہ-

والدہ کا نام ہند تھا جو عوف بن زہیر بن حارث بن حماطہ بن جرش کی بیٹی تھیں-

طبقات ابن سعد اور زرقانی کی روایت کے مطابق ان کا پہلا نکاح ایک شخص مسعود بن عمرو بن عمیر ثقفی سے ہوا تھا- نکاح کے بعد اس سے اختلاف پیدا ہو گیا اور معاملہ انقطاع و طلاق تک پہنچ گیا- اس کے بعد ایک اور شخص ابورہم بن عبدالعزی کے عقد میں آئیں- ۷ ہجری میں ابورہم وفات پا گیا تو اسی سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقہ زوجیت میں آنے کی سعادت حاصل کی- حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری بیوی تھیں- اس کے بعد آپؐ نے کسی سے نکاح نہیں کیا-

مختصر الفاظ میں اس نکاح کی تفصیل یہ ہے کہ ۷ ہجری کے ماہ ذیقعدہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمرے کی غرض سے مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کو روانہ ہوئے اثنائے سفر میں آپ نے اپنے چچازاد بھائی حضرت جعفر بن ابوطالب رضی اللہ عنہ کو نکاح کا پیغام دے کر حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا- حضرت میمونہ نے حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے بات کی اور انھیں اپنا وکیل و ولی مقرر کیا- طبقات ابن سعد کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ خود حضرت عباس بن

عبدالمطلب رضی اللہ عنہ نے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت میمونہ کے نکاح کے بارے میں گفتگو کا آغاز کیا اور انہی نے آنحضرت کو اس نکاح کے لیے تیار کیا' چنانچہ حالت احرام ہی میں جو عمرے کی غرض سے آپ نے باندھ رکھا تھا' نکاح کر لیا گیا- یہ نکاح ۷ ہجری میں ہوا اور مہر پانچ سو درہم مقرر کیا گیا- آنحضرت عمرہ سے فراغت کے بعد مدینہ منورہ کو واپس لوٹے تو ایک جگہ سرف میں قیام فرمایا- یہ جگہ مدینہ منورہ کے راستے میں مکہ سے دس میل کے فاصلے پر واقع ہے- اسی مقام پر رسم عروسی ادا کی گئی' کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کو سرف ہی میں لے آئے تھے-

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا بڑی عالمہ' عابدہ و زاہدہ اور سمجھ دار خاتون تھیں- فقہ و اجتہاد میں ان کا مقام بہت بلند تھا- ان کے بارے میں طبقات ابن سعد کی آٹھویں جلد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول درج ہے-

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا ہم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والی اور صلہ رحمی کا اہتمام رکھنے والی خاتون ہیں-

بے حد عقل مند اور صاحب بصیرت و دانش خاتون تھیں- مسائل پر گہری نظر رکھتی تھیں اور مسائل شرعیہ کے بارے میں غور و فکر کے تمام پیمانے ان کے سامنے رہتے تھے- اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجیے کہ ایک مرتبہ ایک عورت بیمار پڑ گئی' اس نے نذر مانی کہ شفایاب ہو گئی تو بیت المقدس کا سفر کروں گی اور وہاں جا کر نماز پڑھوں گی- چند دنوں کے بعد صحت یاب ہو گئی اور بیت المقدس کے سفر پر روانہ ہونے کی تیاری شروع کر دی- رخصتی سلام کے لیے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئی اور درخواست دعا کی- انھوں نے ساری بات سنی تو فرمایا:

دیکھو تمھیں معلوم ہے مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کا کتنا اجر ملتا ہے- مسجد نبوی اللہ کی ایک انتہائی مقدس جگہ ہے اور اس کے آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیر کردہ ہے- اس میں نماز پڑھی جائے تو دوسری

مسجدوں سے ہزار گنا زیادہ ثواب ملتا ہے- تم اتنا دور دراز کا سفر کرنے کی بجائے مدینہ ہی میں رہو اور مسجد نبوی میں نماز پڑھ لو- اس سے اللہ کے نزدیک زیادہ مستحق اجر و ثواب قرار پاؤ گی-

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا پیکر اخلاص اور غریبوں کی ہم درد و معاون تھیں- کبھی کبھی قرض بھی لیتی تھیں اور وہ قرض کی رقم مستحقین کو تقسیم کر دیتی تھیں- ایک مرتبہ کچھ زیادہ مستحقین آ گئے تو ان کا مطالبہ پورا کرنے کے لیے زیادہ قرض لے لیا- کسی نے پوچھا آپ جو اتنا زیادہ قرض لے رہی ہیں، اسے ادا کرنے کی کیا شکل ہو گی؟ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو شخص ادا کرنے کی نیت سے قرض لیتا ہے اللہ اس کا قرض ادا کرنے کی کوئی صورت پیدا کر دیتا ہے- میں ضروری امور کی تکمیل کے لیے قرض لے رہی ہوں اور میرا مقصد نیک ہے، نیز مجھے یہ قرض بہر حال ادا کرنا ہے- اللہ کے پیغمبر کے ارشاد کی روشنی میں مجھے یقین ہے اللہ تعالیٰ میرے قرض ادا کرنے کی ضرور کوئی بہتر اور مناسب صورت پیدا کر دے گا-

شریعت کے احکام کی تبلیغ کے لیے ہر وقت کوشاں رہتی تھیں اور اگر کوئی احکام رسول کی ذرا بھی مخالفت کرتا تو اس سے سخت برتاؤ کرتیں- ایک دفعہ ان کا ایک رشتہ دار ان کے مکان پر آیا- اس سے گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ اسلام کے احکام کی کسی نہ کسی پہلو سے مخالفت کر رہا ہے، فوراً جھڑک دیا اور سخت الفاظ میں آئندہ اپنے مکان پر آنے سے روک دیا-

انھیں غلام آزاد کرنے کا بہت شوق تھا- ایک مرتبہ ایک لونڈی کو آزاد کیا تو آنحضرت نے فرمایا: اللہ تم کو اس کا اجر دے گا-

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے احادیث بھی مروی ہیں جن کی تعداد چھیالیس ہے- بعض کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے ۷۶ روایات مروی ہیں جن میں سات صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہیں- ان روایات سے یہ حقیقت نمایاں ہو جاتی ہے کہ فقاہت اور علمی بصیرت میں ان کا پایہ بہت بلند تھا-

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے تلامذہ اور ان سے روایت کرنے والوں کی تعداد بھی خاصی ہے جن میں حضرت عبداللہ بن عباس' عبدالرحمٰن بن سائب' عبداللہ بن شداد بن ہاد' عطاء بن یسار' عبداللہ بن سائب' ان کے بھانجے یزید بن اضم عبیداللہ خولانی' سلمان بن یسار' عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ' عبیدہ بن سائق اور عالیہ بنت سبیع ایسے عظیم المرتبت حضرات شامل ہیں- پھر آگے ان کے شاگردوں در شاگردوں کا سلسلہ بڑا وسیع ہے-

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے حالات میں یہ عجیب اتفاق ہے کہ ان کی وفات بھی اسی مقام پر ہوئی جہاں ان کی رسم عروسی ادا ہوئی تھی- یعنی سرف کے مقام پر' جو کسی زمانے میں ان کی شادی کی وجہ سے مشہور تھا' ان کا مدفن بھی وہی مقام قرار پایا- انھوں نے ۵۱ ہجری میں وفات پائی- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی- جب لوگوں نے ان کی میت کو اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھائے تو حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا:

> لوگو! یہ رسول اللہ کی زوجہ محترمہ ہیں- ان کے جنازے کو زیادہ حرکت نہ دو- ان کے احترام کا تقاضا یہ ہے کہ آہستہ قدم اٹھاؤ اور ادب کے ساتھ دفن کرو-

حضرت ریحانہ بنت شمعون بن زید رضی اللہ عنہا

ریحانہ بنت شمعون بن زید --- بقول بعض ریحانہ بنت زید بن عمرو بن خنافہ بن شمعون بن زید --- یہودیوں کے مشہور قبیلہ بنی نضیر سے تعلق رکھتی تھیں-

حضرت ریحانہ کا پہلا نکاح بنو قریظہ کے ایک شخص سے ہوا' جس کا نام حکم تھا- کچھ عرصہ حکم کے نکاح میں رہیں اور باقاعدہ ان کے گھر آباد رہیں- اس کے بعد مسلمان بنو قریظہ پر غالب آئے تو ان کے اموال اور جائداد پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا- مال غنیمت کے علاوہ بنو قریظہ کے بہت سے لوگ بھی بہ حیثیت قیدی کے مسلمانوں کے قبضے میں آئے' جن میں حضرت ریحانہ بھی شامل تھیں- انھیں چند روز حضرت ام المنذر بنت قیس کے گھر ٹھہرایا گیا-

مال غنیمت کی تقسیم اور اسیران جنگ کا فیصلہ ہو جانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ریحانہ سے ملنے کے لیے حضرت ام المنذر بنت قیس کے مکان پر تشریف لائے اور ریحانہ سے فرمایا:

"ریحانہ! اگر تم اللہ اور اس کے رسول کو پسند کرو تو میں تم کو اپنے لیے مناسب سمجھتا ہوں-"

اب آگے چل کر روایات میں اختلاف ہے- ایک روایت یہ ہے کہ حضرت ریحانہ نے آنحضرت کے اس فرمان کو منظور کر لیا اور آپ نے ان کو آزاد کر کے بارہ اوقیہ ایک نش مہر دے کو ان سے نکاح کر لیا- باقی ازواج مطہرات کا مہر بھی اتنا ہی تھا-

دوسری روایت یہ ہے کہ مال غنیمت تقسیم ہوا تو ریحانہ آنحضرت کے حصے میں آئیں- آپ نے ان کو اختیار دیا کہ اگر وہ چاہیں تو اسلام قبول کر لیں اور چاہیں تو اپنے

مذہب پر قائم رہیں- لیکن ریحانہ نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا اور آنحضرت سے کہا میں اپنے ہی مذہب پر قائم رہوں گی-

آنحضرت چونکہ ریحانہ کے اسلام کے خواہاں تھے' اس لیے ان کے اس جواب سے آپ کو ذہنی کوفت ہوئی اور دوبارہ پھر فرمایا:

اگر تم اسلام قبول کر لو تو میں تمھیں اپنے پاس رکھوں گا-

مگر وہ اب بھی قبول اسلام کے لیے آمادہ نہ ہوئیں- یہ بات آنحضرت کے لیے مزید قلق کا باعث ہوئی' لیکن چونکہ اسلام آزادی رائے اور حریت فکر کا مذہب ہے اور اس کی یہی تعلیم ہے کہ کسی پر جبر نہ کیا جائے اور کسی کے ارادہ و ضمیر کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا جائے' اس لیے آنحضرت نے انھیں کچھ نہیں کہا' نہ انھیں اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا اور نہ ان کے ضمیر اور ارادے کے خلاف کوئی قدم اٹھایا' البتہ ان کے اس جواب سے آپ کو تکلیف ضرور ہوئی اور یہ ایک قدرتی بات تھی-

اس واقعہ کے چند روز بعد آنحضرت ایک مجلس میں تشریف فرما تھے کہ اچانک کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی- فرمایا یہ ثعلبہ بن شعبہ آ رہا ہے اور مجھے ریحانہ کے اسلام کی بشارت دینے آیا ہے- چنانچہ ایسا ہی ہوا- ریحانہ رضی اللہ عنہا نے اسلام قبول کر لیا تو آنحضرت نے بطور ملک یمین ان کو اپنے پاس رکھا- ان سے نکاح نہیں کیا-

دوسری روایت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ریحانہ رضی اللہ عنہا کو آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا تھا' ان پر پردہ عائد کر دیا تھا اور وہ باقاعدہ حرم نبوی میں داخل ہو گئی تھیں- ابن سعد اور حافظ ابن حجر کا رجحان یہی ہے- ان کے علاوہ دیگر مورخین اور ارباب سیر کا کہنا ہے کہ حضرت ریحانہ رضی اللہ عنہا کی حیثیت آنحضرت کی بیوی کی نہ تھی بلکہ ایک خادمہ کی تھی- یہ واقعہ ٦ ہجری کا ہے-

حضرت ریحانہ رضی اللہ عنہا کی وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حجتہ الوادع سے واپسی کے بعد ہوئی اور وہ مدینہ منورہ میں جنت البقیع میں دفن کی گئیں-

حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا

یہ اپنے زمانے کی ایک فاضلہ اور عالمہ خاتون تھیں۔ان کے والد کا نام شمعون تھا۔ان کی ماں رومیہ تھیں۔حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا نہایت حسین و جمیل اور سرخ و سفید تھیں۔یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملک یمین تھیں۔اسکندریہ کے فرماں روا مقوقس نے انھیں بطور ہدیہ ۷ ہجری میں آنحضرت کی خدمت میں بھیجا تھا۔ان کی بہن سیرین بھی ساتھ تھیں۔علاوہ ازیں ہزار مثقال سونا' کپڑوں کے بیس عمدہ جوڑے'ایک دلدل گھوڑا'بہترین نسل کا ایک خچر اور ایک وفادار خادم بھی پیش خدمت کیا تھا۔خادم کا نام مابور تھا جو ایک معمر آدمی تھا۔مقوقس نے یہ سب کچھ مشہور صحابی حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کی معیت میں بھیجا تھا۔حضرت حاطب رضی اللہ عنہ نے حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا کو اسلام کی دعوت دی اور اس پر عمل پیرا رہنے کی ترغیب دی' چنانچہ اس نے اسلام قبول کر لیا اور ان کی بہن سیرین بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئیں۔لیکن ان کا خادم بدستور اپنے مذہب پر قائم رہا۔اس نے مدینہ منورہ میں آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسلام قبول کیا۔آنحضرت نے حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا کو عالیہ یعنی ایک اونچے مقام پر ٹھہرایا جو مدینہ سے نجد کو جاتے ہوئے ایک بستی میں واقع تھا۔آنحضرت ان کے پاس مختلف اوقات میں تشریف لے جاتے تھے۔آپ نے ان پر پردہ کے احکام جاری کر دیئے تھے۔ذوالحجہ ۸ ہجری میں ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہ سے' آنحضرت کا ایک لڑکا پیدا ہوا' جس کا نام ابراہیم رکھا گیا۔حضرت ابراہیم کو دودھ پلانے کے لیے آپؐ نے حضرت ام بردہ بنت منذر بن زید رضی اللہ عنہا کی تحویل میں دے دیا تھا۔حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے ہاں ابراہیم پیدا ہوئے تو آنحضرت

نے فرمایا:

اعتقها ولدها۔

یعنی ان کے بیٹے نے انھیں آزادی بخش دی۔

حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا اگرچہ ملک یمین کے گروہ سے تعلق رکھتی تھیں، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا از حد خیال رکھتے تھے، بلکہ کہنا چاہیے کہ بہت احترام کرتے اور انھیں تمام سہولتیں بہم پہنچاتے تھے۔ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت اکثر حضرت ماریہ قبطیہ کے ہاں جاتے اور ان کی ہر قسم کی ضروریات پوری کرتے، بقول حضرت عائشہ کے ماریہ جب مدینہ منورہ آئیں تو پہلے پہل انھیں حضرت حارث بن نعمان رضی اللہ عنہ کے مکان پر ٹھہرایا گیا تھا۔ اس کے بعد انھیں عالیہ میں منتقل کیا گیا۔ ان کو اللہ نے اس درجہ اعزاز بخشا کہ ایک لڑکا بھی عطا کیا اور اس ضمن میں باقی ازواج مطہرات سے ممتاز فرمایا۔

لونڈی اور غلام کا سلسلہ اس زمانے میں ایک عالم گیر تہذیب کی حیثیت رکھتا تھا اور انھیں انتہائی ذلیل سمجھا جاتا تھا۔ اسلام دنیا کا پہلا مذہب ہے جس نے غلام کے مقام و مرتبے کو متعین کیا اور انھیں باقاعدہ انسانی حقوق دیے۔ اسلام نے غلام کو اتنا اونچا درجہ دیا کہ قریب قریب اس سلسلے کو ختم کر کے رکھ دیا، غلام کو ہر طرح کی آزادی عطا کی اور وہ تمام مراعات مہیا کیں جو ایک آزاد انسان کے شایان شان ہو سکتی ہیں۔ اسلام کی اصل خواہش تو اس سلسلے کو کلیتہً ختم کر دینا تھا، لیکن بعض مصالح کی بنا پر ایسا نہیں کیا، تاہم غلام کو سہولتیں اس قدر فراہم کر دیں کہ ایک اسلامی معاشرے میں عملی طور سے آزاد اور غلام کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہ رہا۔ غلاموں کو آزاد لوگوں کے بھائی قرار دیا۔ ان کی عزت کو لازمی ٹھہرایا، ان کی تعظیم و تکریم کا حکم دیا۔ آنحضرت نے صاف الفاظ میں فرمایا کہ تم ان کو "عبدی و امتی" (یعنی میرا غلام اور میری لونڈی نہ کہو)، نہ وہ تمھیں "ربی و ربتی" (یعنی میرا پروردگار کہیں)، بلکہ تمھیں "فتای و فتاتی" (میرا بچہ اور میری بچی کہو) اور یہ تمھارے لیے "سیدی و سیدتی" (میرا آقا) کا لفظ

استعمال کریں- اس سے زیادہ غلام کی کیا عزت ہو گی کہ اسلام نے ان کے لیے مولی کا لفظ استعمال کیا جس کے معنی سردار' قائد' رہنما' مددگار' بھائی' حلیف اور معاون کے ہیں- انھیں "فتی" کہا جس کے معنی نوجوان اور لڑکے کے ہیں-

بہر حال اسلام نے غلاموں کو تمام مراعات دیں اور ہر قسم کے انسانی حقوق سے بہرہ ور کیا- امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ' حضرت بلال حبشی کو یا مولانا (ہمارے آقا کہہ کر پکارتے اور ان کا از حد احترام کرتے تھے)-

حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا اسی گروہ سے تعلق رکھتی تھیں اور اس درجہ بلند مرتبے کی حامل تھیں کہ خواتین ان پر رشک کرتی تھیں- آنحضرت کے وصال کے بعد صحابہ عظام انھیں انتہائی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے- اپنے زمانہ خلافت میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ان کی تمام ضروریات پوری کرتے تھے- ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باقاعدہ ان کا وظیفہ مقرر کیا اور ان کے اخراجات کی ذمہ داری قبول کی-

حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کی وفات ۱۶ ہجری میں ہوئی- ان کے جنازے پر لوگوں کا اتنا ہجوم تھا کہ اسے دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ انتہائی حیران ہوئے تھے- نماز جنازہ حضرت عمر ہی نے پڑھائی اور مدینہ منورہ میں جنت البقیع میں مدفون ہوئیں-

حضرت زینب رضی اللہ عنہا

ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی چار صاحب زادیاں تھیں، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں :

۱- حضرت زینب رضی اللہ عنہا

۲- حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا

۳- حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا

۴- حضرت فاطمۃ الزاہرا رضی اللہ عنہا---

حضرت زینب آنحضرتؐ کی سب سے بڑی صاحب زادی تھیں- وہ آپؐ کی بعثت سے دس پہلے پیدا ہوئیں- ان کی پیدائش کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک تیس ۳۰ برس تھی- یعنی آپ کی شادی کے پانچ سال بعد زینب پیدا ہوئیں- ان کی شادی ان کے خالہ زاد ابوالعاص بن ربیع سے ہوئی تھی- زینب اسی وقت نعمت اسلام سے سرفراز ہو گئی تھیں جب ان کی والدہ مکرمہ حضرت خدیجہ الکبریٰ ایمان لائیں، لیکن ان کے شوہر ابوالعاص اس وقت حلقہ بگوش اسلام نہیں ہوئے تھے- جنگ بدر ۱۷ رمضان ۲ ہجری کو ہوئی- ابوالعاص اس وقت تک بھی مسلمان نہیں ہوئے تھے اور کفار قریش کی جانب سے مسلمانوں سے برسر پیکار تھے- جنگ بدر میں ان کو ایک انصاری صحابی عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے گرفتار کر لیا تھا- ان کی رہائی کا انتظام ان کی بیوی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحب زادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے کیا تھا- انھوں نے اپنا ایک ہار بدلے میں بھیجا جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے شادی کے وقت اپنی بیٹی زینب کو جہیز میں دیا تھا- اس وقت تک زینب نے مدینہ منورہ کو ہجرت نہیں کی تھی اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ مکہ معظّمہ میں مقیم

تھیں- ابو العاص کی رہائی کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے یہ وعدہ لیا تھا کہ وہ اپنی بیوی زینب کو ہجرت کی اجازت دے دے گا- چنانچہ اس نے وعدہ پورا کیا اور زینب اپنے والد ذی شان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں مدینہ منورہ پہنچ گئیں-

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زینب سے بے حد پیار کرتے تھے اور ان کی تعریف فرماتے تھے- چنانچہ زرقانی میں ایک روایت ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ زینب کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا-

میری بیٹیوں میں سب سے زیادہ افضل یہی ہے' اسے میرے لیے بہت تکلیف پہنچی ہے-

۴ ہجری کے بعد ابو العاص کی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے- یہ تجارت کی غرض سے ملک شام گئے تھے' جس قافلے میں یہ شامل تھے' مسلمانوں نے اسے گرفتار کر لیا تھا- لیکن ابو العاص ایک پہاڑ میں جا چھپے' پتا ہونے کے باوجود مسلمانوں نے ان کو گرفتار نہ کیا اور ابو العاص سیدھے مدینہ منورہ آگئے- جب مدینہ منورہ پہنچے تو نماز فجر کا وقت تھا- ان کی بیوی زینب کے کانوں میں ان کی آواز پہنچی تو کہا-

"میں ابو العاص بن ربیع کو اپنے گھر میں پناہ دیتی ہوں"

زینب نے جب یہ آواز دی- اس وقت مسلمان نماز فجر میں مشغول تھے- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز سے فارغ ہونے کے بعد فرمایا لوگو! تم نے بھی وہ بات سنی ہے؟ لوگوں نے اثبات میں جواب دیا- آپ نے فرمایا-

واللہ! مجھے اس سے پہلے کچھ معلوم نہ تھا- یہ آواز میں نے تمھارے ساتھ ہی سنی ہے- یاد رکھو پناہ دینے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے-

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیٹی زینب کے گھر گئے اور فرمایا:
بیٹی ابو العاص کو عزت و احترام سے ٹھہراؤ- خود اس سے الگ رہو تو اس کے لیے یہ مناسب نہیں-

سیدہ زینب نے کہا وہ تو قافلے کا مال واپس لینے کے لیے آیا ہے۔ یہ سن کر رسول اللہ نے لوگوں کے سامنے یہ تقریر کی۔

لوگو! ہمارے ساتھ اس شخص کا جو تعلق ہے' وہ تم خوب جانتے ہو تمھارے قبضے میں اس کا مال ہے۔ یہ اگرچہ اللہ کے دین میں داخل نہیں ہوا ہے تاہم میں چاہتا ہوں کہ تم اس پر احسان کرو اور اس کا مال اسے واپس دے دو۔ لیکن اگر نہ دو تو تم اس کے زیادہ مستحق ہو' میں جبر نہیں کرتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان سن کر لوگوں نے ابوالعاص کا تمام مال واپس لوٹا دیا۔ یہاں تک کہ اونٹ کی نکیل بھی واپس کر دی۔ ابوالعاص یہ سارا سامان لے کر مکہ پہنچا اور ہر شخص کی تمام چیزیں ادا کر دیں۔ جب مکہ کے کسی شخص کا اس کے پاس کچھ مال نہ رہا تو سب کے سامنے کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو گیا اور کہا کہ اب میں اسلام کے حلقے میں داخل ہوتا اور مدینہ کو جاتا ہوں۔ چنانچہ ابوالعاص مدینہ منورہ پہنچے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو ان کے ساتھ رخصت کر دیا۔

حضرت زینب کا انتقال ۸ ہجری کو مدینہ منورہ میں ہوا۔ چار سال کے بعد ان کے شوہر ابوالعاص بن ربیع بھی ذی الحجہ ۱۲ ہجری کو وفات پا گئے۔

حضرت زینب کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا اور ایک لڑکی امامہ پیدا ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نواسی امامہ سے بہت پیار کرتے تھے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ نے امامہ رضی اللہ عنہا کو گود میں لے کر نماز پڑھی تھی۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وصیت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے امامہ کو اپنے نکاح میں لے لیا تھا اور جب حضرت علیؓ نے انتقال فرمایا تو آپ نے امامہ کو وصیت کی کہ اگر وہ نکاح کرنا چاہے تو مغیرہ بن نوفل سے کرے۔ چنانچہ امامہ نے مغیرہ سے نکاح کر لیا۔ مغیرہ سے امامہ کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا اور پھر یہ نسل دنیا سے ختم ہو گئی۔

حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری بیٹی کا نام حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا ہے۔ ان کی پیدائش کے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۳۳ برس تھی۔ ان کی شادی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے مکہ مکرمہ میں ہوئی۔ اس وقت سارے مکے میں یہ بات مشہور تھی کہ سب سے اچھا جوڑا جو دیکھا گیا وہ رقیہ اور عثمان کا ہے۔

ایک صحابیہ نے کچھ شعر بھی ان کی شادی پر کہے تھے۔ رقیہ پہلی خاتون ہیں جنھوں نے اپنے شوہر کے ساتھ راہ خدا میں مکے سے مدینے کی طرف ہجرت کی۔ (مستدرک حاکم)

۲ ہجری میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بیٹی کو چیچک نکلی اور اسی مرض سے اسی سال ان کا انتقال ہو گیا۔ ۲ ہجری میں جنگ بدر لڑی گئی' جب مسلمان میدان بدر میں کافروں سے مقابلے کے لیے جا رہے تھے تو اس وقت حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا سخت بیمار تھیں۔ ان کی خبر گیری کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں ان کے شوہر عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو چھوڑ گئے تھے۔ جنگ بدر میں مسلمانوں کی فتح کی خوش خبری لے کر سب سے پہلے مدینہ میں زید بن حارثہ پہنچے۔ اس وقت حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا فوت ہو گئی تھیں اور انھیں دفن کیا جا رہا تھا۔ انتقال کے وقت رقیہ رضی اللہ عنہا کی عمر اکیس برس تھی۔

حضرت رقیہ کا ایک لڑکا تھا جس کا نام عبداللہ تھا۔ یہ لڑکا اپنی ماں کے دو سال بعد فوت ہو گیا تھا۔

حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تیسری بیٹی کا نام ام کلثوم رضی اللہ عنہا ہے۔ رقیہ کے انتقال کے بعد ۳ ہجری کو ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عثمان غنی سے ہوا۔ اسی بنا پر حضرت عثمان غنی کو "ذوالنورین" کہتے ہیں۔ یعنی ان کے عقد میں یکے بعد دیگرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو نور آئے۔ بالفاظ دیگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دونوں صاحب زادیاں حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا دو نور قرار پائیں۔

اور حضرت عثمان دو نور والے ٹھہرے!

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ام کلثوم کا نکاح اللہ کے حکم سے ہوا تھا۔ آپ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو بلا کر یہ فرمایا تھا کہ جبریل میرے سامنے کھڑے ہیں۔ یہ اللہ کا پیغام لے کر آئے ہیں کہ میں ام کلثوم کا نکاح تمھارے ساتھ کر دوں، جن دنوں رقیہ کا انتقال ہوا، انہی دنوں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی بیٹی حضرت حفصہ کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا۔ حضرت عمر نے حضرت عثمان کو یہ اشارہ کیا کہ وہ حفصہ کا نکاح ان کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دبے لفظوں میں انکار کر دیا، جس کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بہت رنج ہوا اور انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس کا ذکر کیا۔ جواب میں آنحضرت نے فرمایا:

عثمان کو حفصہ سے بہتر بیوی ملے گی اور حفصہ کو عثمان سے بہتر خاوند ملے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیٹی حفصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد آئیں اور حضرت عثمان کو آنحضرت کی دوسری بیٹی ام کلثوم سے شادی کرنے کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی- ان کا انتقال ۹ ہجری میں ہوا- ان کی رسم تدفین حضرت علی، فضل بن عباس اور اسامہ بن زید نے ادا کی-

حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی وفات کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت ملال ہوا تھا، چنانچہ صحیح بخاری میں ہے 'انس بن مالک کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ام کلثوم کی قبر پر تشریف فرما تھے اور آپؐ کی آنکھوں سے شدت غم سے آنسو جاری تھے-

حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحب زادیوں میں سب سے کم عمر تھیں' ان کے سال ولادت میں اختلاف ہے- ایک روایت کے مطابق حضرت فاطمۃ الزہرا اس سال پیدا ہوئیں جس سال آنحضرت کو خلعت نبوت سے سرفراز کیا گیا تھا- دوسری روایت کے مطابق آنحضرت کی بعثت سے پانچ برس قبل اس دوران پیدا ہوئیں جب کعبۃ اللہ کی تعمیر ہو رہی تھی اور اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر پینتیس برس تھی- بعض روایات میں یہ مرقوم ہے کہ نبوت سے ایک سال پہلے پیدا ہوئیں--- ان کی والدہ محترمہ ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ہیں-

حضرت فاطمہ مکارم اخلاق کا مجموعہ اور فضائل حمیدہ کا پیکر تھیں- دنیا کی نیکیاں ان کی ذات ستودہ صفات میں جمع ہو گئی تھیں- وہ خواتین عالم کی سردار اور "سیدۃ نساء اہل الجنہ" ہیں- زہرہ' بتول' زکیہ' مطہرہ' راضیہ' مرضیہ اور طاہرہ ان کے القاب ہیں- فہم و فراست اور علم و فضل میں اپنے زمانے کی تمام عورتوں سے ممتاز تھیں-

مشہور روایت کے مطابق اٹھارہ سال کی عمر میں اور اگر سال ولادت ایک نبوت مان لیا جائے تو پندرہ سال ساڑھے پانچ مہینے کی عمر میں ۲ ہجری کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کا نکاح کیا- آنحضرت کا ارشاد ہے کہ میں نے دنیا کے بہترین اور باکمال انسان سے فاطمہ کا نکاح کیا ہے-- جس طرح حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ محبوب تھیں' اسی طرح مردوں میں آپ کی نظر میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ عالی مرتبہ رکھتے تھے-

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کا قصہ کچھ طویل بھی ہے اور انتہائی سبق

آموز بھی- یہ سارا واقعہ خاندان نبوت کی سادگی کی بہت بڑی مثال ہے اور اس سے اہل بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین کے انداز حیات کے تمام پہلو کھل کر سامنے آجاتے ہیں-

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے پیاری صاحب زادی تھیں- ان کے نکاح کے وقت تقریباً پورا عرب آپؐ سے مرعوب تھا- گردوپیش کے علاقوں میں آپؐ کا اثر و رسوخ پھیل چکا تھا اور حالات انتہائی شان دار مستقبل کا پتا دے رہے تھے' لیکن دنیا کے اس سب سے بڑے انسان نے اپنی سب سے پیاری بیٹی اور سیدۂ خواتینِ عالم کو جو جہیز دیا وہ کیا تھا؟ اس کا تذکرہ سیرت و تاریخ کی بہت سی کتابوں میں کیا گیا ہے- ان سب کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بیٹی کا جہیز مندرجہ ذیل اشیا پر مشتمل تھا-

۱- مصری کپڑے کا ایک بستر جس میں اون بھری گئی تھی-
۲- ایک منقش پلنگ یا تخت-
۳- چمڑے کا ایک تکیہ' جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی-
۴- مٹی کے دو برتن یا گھڑے تاکہ ان میں پانی بھر کر رکھا جائے-
۵- ایک مشکیزہ-
۶- ایک پیالہ-
۷- ایک چکی- آٹا یا ستو وغیرہ پیسنے کے لیے
۸- ایک جائے نماز-
۹- دو چادریں-
۱۰ چاندی کے دو بازوبند-

شادی ہو چکی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ولیمہ بھی ہونا چاہیے' چنانچہ مہر ادا کرنے کے بعد جو رقم بچی' اس سے ولیمے کا انتظام کیا گیا- ولیمے میں کیا چیزیں شامل تھیں- جو کی روٹی' گوشت' کھجور اور پنیر- اس زمانے کے مطابق یہ بہت اچھا ولیمہ تھا-

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے اٹھارہ روایت کتب احادیث میں مروی ہیں جوان سے جلیل القدر صحابہ نے روایت کیں' اور وہ ہیں حضرت علی بن ابی طالب' حضرت حسن' حضرت حسین' حضرت عائشہ صدیقہ' حضرت ام کلثوم' حضرت سلمی' حضرت ام رافع اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم۔

اللہ تعالی نے حضرت فاطمہ کو جن فضائل و مناقب سے نوازا' اس کی مثال نہیں ملتی۔ صداقت و راست گوئی میں حضرت فاطمہ کا کوئی جواب نہ تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔

میں نے فاطمہ سے بڑھ کر اور کسی کو راست گو نہیں دیکھا' البتہ ان کے والد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس سے مستثنیٰ ہیں۔

آنخضرت سفر سے تشریف لاتے تو سب سے پہلے حضرت فاطمہ کے مکان پر جاتے۔ اس کے بعد اپنے گھر تشریف لے جاتے۔ ایک تابعی نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ کس کو محبوب رکھتے تھے؟

ام المومنین نے جواب دیا: عورتوں میں فاطمہ کو اور مردوں میں ان کے شوہر کو۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں:

میں نے نشست و برخاست' عادات و خصائل' طرز گفتگو اور انداز کلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ فاطمہ سے زیادہ کسی کو نہیں دیکھا۔ وہ تمام مشاغل حیات میں آنخضرت کی اتباع کرتی تھیں۔ حضرت فاطمہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتیں تو آپ کھڑے ہو جاتے۔

حضرت عائشہ ہی کا فرمان ہے کہ

میری آنکھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد فاطمہ سے بہتر کسی کو نہیں دیکھا۔۔۔ آنخضرت فرماتے ہیں فاطمہ میرے جسم کا ٹکڑا ہے' جو اس کو ناراض کرے گا وہ مجھے ناراض کرے گا۔

حضرت ام سلمہ کہتی ہیں :

رفتار و گفتار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بہترین نمونہ فاطمہ تھیں۔

حضرت فاطمہ کی شکل و صورت آنحضرت سے بہت ملتی جلتی تھی۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پانچ بچے پیدا ہوئے حسن، حسین، محسن، ام کلثوم اور زینب--- محسن کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ حضرت حسن، حضرت حسین، حضرت زینب اور حضرت ام کلثوم رضوان اللہ علیہم اپنے اہم واقعات کے لحاظ سے تاریخ کی مشہور ترین شخصیتیں ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سب حضرات انتہائی محبوب تھے۔ آنحضرت کی اولاد سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہی کو یہ شرف حاصل ہے کہ ان سے آپؐ کی نسل باقی رہی اور دنیا میں پھیلی۔

حضرت فاطمہ کی عمر انتیس سال کی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ عاطفت سر سے اٹھ گیا۔ آنحضرت کو چونکہ ان سے بہت پیار تھا، اس لیے آپ کی وفات کے بعد انتہائی مغموم رہتی تھیں اور جب تک زندہ رہیں کبھی تبسم نہ فرمایا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضرت کی وفات سے قبل میں آپ کے پاس بیٹھی تھی کہ حضرت فاطمہ آئیں۔ ان کی رفتار آنحضرت کی رفتار سے بہت ملتی جلتی تھی۔ آنحضرت نے "مرحبا یا بنتی" فرمایا اور اپنے بائیں یا دائیں جانب بٹھا لیا۔ پھر آپ نے حضرت فاطمہ کے کان میں سرگوشی کے انداز میں کچھ فرمایا، وہ رونے لگیں۔ دوبارہ کان میں پھر کچھ فرمایا تو ہنسنے لگیں۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں اس سے مجھے بڑا تعجب ہوا۔

میں نے فاطمہ سے پوچھا : کیا بات ہے؟ اس سے پہلے میں نے کبھی ایک ہی وقت میں آپ کو ہنستے اور روتے ہوئے نہیں دیکھا۔

حضرت فاطمہ نے جواب دیا : میں اپنے باپ کا راز نہیں ظاہر کروں گی۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے تو میں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا : اس روز بہ یک وقت رونے اور ہنسنے کا کیا مطلب

تھا؟

حضرت فاطمہ نے جواب دیا: چونکہ آنحضرت اس دنیا سے تشریف لے گئے ہیں' اس لیے اب میں ساری بات بتادیتی ہوں- پہلی مرتبہ آپؐ نے یہ فرمایا کہ میری موت کا وقت قریب آگیا ہے' اس پر میں رونے لگی- دوسری مرتبہ ارشاد ہوا کہ میرے اہل بیت میں سب سے پہلے تم مجھ سے ملوگی اور کیا تمھیں یہ چیز پسند نہیں کہ تم تمام دنیا کی عورتوں کی سردار ہو- یہ سن کر میں ہنسنے لگی---

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے چھے ماہ بعد ۳ رمضان ۱۱ ہجری کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہو گیا-

سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہرا کی وفات کا وقت قریب آیا تو حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے فرمایا مجھے یہ پسند نہیں کہ عورت کا جنازہ کھلا ہوا' قبرستان تک جائے' اس میں بے پردگی پائی جاتی ہے اور مرد اور عورت کے جنازے میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا- مردوں کو عورتوں کا اس طرح کھلا ہوا جنازہ نہیں لے جانا چاہیے- حضرت اسماء بنت عمیس نے کہا اے دختر رسول اللہ! میں نے حبش میں عورتوں کے جنازے کا ایک بہترین طریقہ دیکھا ہے- اگر آپ فرمائیں تو وہ طریقہ پیش کروں- یہ کہہ کر کھجور کی چند شاخیں منگوائیں اور ان پر کپڑا تانا' جس سے پردے کی صورت پیدا ہو گئی-

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو یہ طریقہ بہت پسند آیا-

چنانچہ ان کا جنازہ اسی طرح پردے میں قبر تک گیا- اسلام میں حضرت فاطمہ پہلی خاتون ہیں جن کا جنازہ اس طریقے سے اٹھایا گیا- ان کے بعد حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کا جنازہ بھی اسی طرح قبر تک لے جایا گیا-

حضرت اروىٰ بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہا

اروىٰ بنت عبدالمطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی تھیں- ایک روایت کے مطابق آپ کے پھوپھیوں میں سے صرف حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا ہی مسلمان ہوئی تھیں' اور کسی کو قبول اسلام کا شرف حاصل نہیں ہوا- لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی دو پھوپھیاں نعمت اسلام سے متمتع ہوئیں- ایک صفیہ اور دوسری اروىٰ--- حضرت اروی رضی اللہ عنہا نے مکہ سے مدینہ کی ہجرت کی سعادت بھی حاصل کی- ان کے شوہر کا نام عمیر تھا- ان کا ایک بیٹا تھا جو طلیب کے نام سے موسوم تھا-

اسلام سے قبل حضرت اروی بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت بڑی معاون تھیں' آنحضرت کی تکلیف سے انھیں سخت تکلیف ہوتی اور جو لوگ آپؐ کے درپے آزاد رہتے' ان سے پوری مزاحمت کرتیں- ان کے قبول اسلام کا واقعہ یہ ہے کہ ان کے بیٹے طلیب بن عمیر دار ارقم بن ابوارقم مخزومی میں مسلمان ہوئے اور قبول اسلام کے فوراً بعد والدہ محترمہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: امی میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اختیار کر لی ہے اور آپؐ کی صداقت کو تسلیم کر کے مسلمان ہو گیا ہوں-

حق پرست ماں نے جواب دیا:

بیٹا! تم نے عمر بھر میں جو بہتر اور حقیقت پسندانہ کام کیا ہے وہ یہ ہے کہ اپنے ماموں زاد (یعنی آنحضرت) کے معاون ہو گئے ہو اور آپؐ کے دست حق پرست پر ایمان لے آئے ہو اور اسلام کی دولت بے پایاں سے مالا مال ہو گئے ہو- اگر ہم بھی مردوں کی سی قوت و طاقت کے مالک ہوتے اور وہ اقدام کر سکتے جو مرد کر سکتے ہیں تو

ضرور محمد کی اتباع پر کمر بستہ ہو جاتے اور آپ کا پورا پورا دفاع کرتے۔(صلی اللہ علیہ وسلم)

سعادت مند بیٹے نے نہایت ادب سے عرض کیا :

امی! آپ کو قبول اسلام اور اتباع محمدؐ سے کس نے روکا ہے اور کون سا مانع پیش آگیا ہے جس کی وجہ سے آپ مسلمان ہونے سے ہچکچاہٹ محسوس کرتی ہیں' آپ کو معلوم ہے آپ کے برادر مکرم حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی مسلمان ہو گئے ہیں اور محمدؐ کی اتباع کا اقرار کر چکے ہیں۔

اروئی نے نہایت متانت سے جواب دیا :

اچھا بیٹا یوں کرو کہ اپنی دیگر خالاؤں کا پتا کرو' محمدؐ کے بارے میں جوان کا رویہ ہے' وہی میں اختیار کر لوں گی' میرا وہی نقطہ نظر ہو گا جو عبدالمطلب کی دوسری بیٹیوں کا ہو گا۔

بیٹے نے عجز و نیاز مندی کے انداز میں عرض کیا :

امی! میں آپ سے اللہ کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ آپ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لے جائیں' انھیں سلام کریں' ان کی تصدیق کریں' ان کے پیغام کو صحیح قرار دیں اور زبان سے یہ الفاظ ادا کریں۔

اشهدان لا اله الا الله و اشهدان محمدا رسول الله

مخلص و نیاز مند بیٹے کے یہ الفاظ پاک طینت ماں کے دل میں اتر گئے۔اب وہ اپنے بھتیجے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت بڑی مددگار تھیں۔ زبان سے آپ کی دعوت اور پیغام کی صحت کا اقرار کرتیں اور اپنے بیٹے طلیب کو آپ کی امداد پر آمادہ کرتیں اور آپ کے لائحہ عمل پر کامل طور سے کاربند رہنے کی تلقین فرماتیں۔

ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہیں تشریف لے جا رہے تھے کہ ابو جہل اور کفار کے ایک گروہ سے آمنا سامنا ہو گیا۔ انھوں نے آنحضرت کو دیکھا تو سخت غضب ناک ہوئے اور آپ کو اذیت پہنچائی۔ اتنے میں طلیب بن عمیر کا بھی ادھر سے

گزر ہوا۔ طلیب' ابوجہل کی اس گستاخانہ حرکت کو دیکھ کر تڑپ اٹھے اور ابوجہل کو پکڑ کر خوب زدوکوب کیا' لیکن چونکہ یہ اکیلے تھے اور مخالفین خاصی بڑی تعداد میں تھے' اس لیے وہ ان پر غالب آ گئے اور انھیں پکڑ کر رسیوں سے باندھ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہاں ابولہب آ گیا' اس نے طلیب کو نجات دلائی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حضرت اروی بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہا کے جذبات نہایت نازک تھے' وہ ہر آن آپ کی مدد میں رہتی تھیں اور کسی لمحے بھی آپ کو نہ بھولتی تھیں۔ جب ابوجہل اور اس کے ساتھیوں نے حضرت اروی رضی اللہ عنہا کے بیٹے طلیب کو پکڑ کر رسیوں سے باندھ دیا تو کچھ لوگ حضرت اروی کے پاس آئے اور کہا:

کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کا بیٹا طلیب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا پشت پناہ بنا ہوا ہے اور ان کی امداد کے لیے اس نے جان کی بازی لگا رکھی ہے؟

فرمایا: مجھے معلوم ہے' میرا بیٹا یہ خدمت سرانجام دے رہا ہے۔ میرے نزدیک طلیب کی زندگی کے بہترین دن وہی ہیں جو اس کے ماموں زاد (یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی حمایت میں گزریں گے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کی طرف سے حق وصداقت کا پیغام لے کر آئے ہیں' ان کی امداد اور ان کا دفاع ہمارا بنیادی فرض ہے۔

یہ سن کر لوگوں نے سوال کیا:

کیا آپ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اختیار کر لی ہے؟

کہا ہاں مجھے ان کے حلقہ متبعین میں شامل ہونے کی سعادت حاصل ہے۔

کسی نے یہی بات جا کر ابولہب سے کہہ دی۔ ابولہب اسی وقت حضرت اروی کے پاس آیا اور کہا بڑے تعجب کی بات ہے تم نے محمد کی اتباع اختیار کر لی ہے اور اپنے باپ عبدالمطلب کے دین کو ترک کر دیا ہے' حالانکہ میرے نزدیک تم ایک عقل مند خاتون ہو۔

حضرت اروی رضی اللہ عنہا نے نہایت جرأت سے جواب دیا:

یہ تیرے بھتیجے کے غلبے' اس کی امداد و اعانت اور مدافعت کا سوال ہے۔ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تو تمھیں اختیار ہے چاہے ان کے دین میں داخل ہو جاؤ اور چاہے اپنے مذہب پر قائم رہو' لیکن ایک بات یاد رکھو اگر انھیں کسی طرف سے تکلیف پہنچائی گئی تو تم اپنے بھتیجے کے بارے میں قابل ملامت قرار پاؤ گے۔

ابولہب نے کہا: ہمیں عرب میں فیصلہ کن اور قطعی قوت حاصل ہے' لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ یہ ایک نیا دین لے کر آئے ہیں۔ یہ کہا اور چلا گیا۔

حضرت اروی رضی اللہ عنہا اچھی شاعرہ اور مرثیہ گو بھی تھیں۔ ان کے بیٹے حضرت طلیب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو امداد کی اس کے بارے میں حضرت اروی نے کچھ شعر بھی کہے۔

ان طليبا نصر ابن خاله

واساه في دمه وماله

(یعنی طلیب نے اپنے ماموں کے بیٹے کی مدد کی اور اس کے خون اور مال کی غم خواری کی) اپنے باپ عبدالمطلب کی وفات پر بھی حضرت اروی نے ایک طویل مرثیہ کہا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال پر بھی آپ نے مرثیہ کہہ کر اپنے غم و اندوہ کا اظہار کیا۔ حضرت اروی رضی اللہ عنہا کی وفات خلافت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ میں ۱۵ ہجری میں ہوئی۔

حضرت عاتکہ بنت عبد المطلب

حضرت عاتکہ بنت عبد المطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی تھیں۔ ان کے اسلام سے متعلق اصحاب سیرت اور مورخین اسلام میں اختلاف ہے۔ علامہ ابن عبد البر الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب میں رقم طراز ہیں کہ عاتکہ کا اسلام مختلف فیہ مسئلہ ہے' لیکن اکثریت کا کہنا ہے کہ وہ مسلمان نہیں تھیں۔

ان کے اسلام کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت بڑی مداح تھیں اور اپنے اشعار میں متعدد مقامات پر انھوں نے آنحضرت کی مدح کی ہے اور آپؐ کو اللہ کی طرف سے نبوت و رسالت کا جو منصب عظیم عطا کیا گیا تھا' اس پر انتہائی مسرت کا اظہار کیا ہے اور آپؐ کو نبی برحق قرار دیا ہے۔

امام دار قطنی کتاب الاخوہ میں لکھتے ہیں کہ حضرت عاتکہ نے آنحضرت کی ذات اقدس کو بہت سے اشعار میں نبی صادق کہا ہے اور ان کے یہ اشعار ان کے اسلام کی شہادت دیتے ہیں۔

ابن مندہ نے ان کو جماعت صحابہ میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان سے حضرت ام کلثوم بنت عقبہ نے روایت حدیث کی۔

ابن سعد نے طبقات میں بتایا ہے کہ حضرت عاتکہ بنت عبد المطلب رضی اللہ عنہا مکہ مکرمہ میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئیں اور پھر ہجرت مدینہ کا شرف حاصل کیا۔

یہ ایک جلیل القدر اور عظیم المرتبت خاتون تھیں۔ سیرت و تاریخ کی کتابوں میں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً ابن سعد نے طبقات میں' ابن عبد البر نے الاستیعاب میں' حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں' ابن ہشام نے اپنی تصنیف میں اور طیفور نے بلاغات النساء میں ان کے متعلق بیان کیا ہے اور اچھے الفاظ میں ان کا تذکرہ فرمایا ہے۔

خاندان عبدالمطلب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ فصاحت وبلاغت اور ادب و شعر میں ان کا مقام بڑا بلند تھا۔ اس خاندان کا ہر فرد اس باب میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔ ان کی عورتیں بھی اس میدان میں بہت آگے تھیں اور مرد بھی۔ کسی قافلے میں ان کا اگر کوئی رکن شامل ہوتا تو زبان سے پہچان لیا جاتا کہ یہ بنو ہاشم سے تعلق رکھتا ہے۔ جہاں یہ حضرات اخلاق و کردار میں ممتاز تھے وہاں فصاحت و بلاغت میں بھی بہت سی خصوصیات کے حامل تھے۔ زبان کی باریکیوں اور فن کی نزاکتوں سے پوری طرح آگاہ تھے' حضرت عاتکہ بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہا بھی اس موضوع پر دست گاہ رکھتی تھیں اور مختلف اصناف شعر میں انھیں عبور حاصل تھا۔ ان کے قصیدے' مرثیے اور مدحیہ اشعار سیرت ورجال کی کتابوں میں مذکور ہیں اور واضح طور سے بتاتے ہیں کہ اس سلسلے میں وہ کس درجہ مہارت رکھتی تھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کرتے ہوئے کہتی ہیں۔

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جس طرح حسن و جمال میں بے مثال ہیں' اسی طرح عمل واخلاق میں بھی عدیم المنظیر ہیں۔

یہ چاند کی طرح چمکتے ہوئے چہرے والا خوب رو جوان عاقل و فہیم بھی ہے اور بہادر وشجاع بھی۔

ان کا باطن بھی اسی طرح پاک اور صاف ہے جس طرح ان کا ظاہر اجلا ہوا اور بے داغ ہے۔

سخاوت اور جود ان کی فطرت میں داخل ہے اور کم زور کی اعانت اور مسکین کی دست گیری ان کا معمول۔

اللہ نے ان کو نبوت کے لیے چن لیا ہے' اس لیے کہ یہی اس منصب بلند کے حق دار تھے۔

ان کی مجلس میں اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں اور فرشتے ان پر صلات بھیجتے ہیں۔

وہ خوش قسمت لوگ ہیں جنھوں نے ان کی رفاقت اختیار کی اور ان کی ہم نشینی کو اپنے لیے ضروری ٹھہرایا۔
تم دیکھتے نہیں کہ ان کے لیے فوز و فلاح مقدر ہو چکی ہے اور انجام کار انہی کی جیت ہو گی۔
یہ اللہ کے سچے نبی ہیں اور یہ ایک ایسا اعزاز ہے جس میں بے شمار برکتیں پنہاں ہیں۔
محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مخالف یقیناً ناکام رہیں گے' انبیا کے مخالف ہمیشہ ذلیل ہوتے ہیں۔
اگر کامیابی چاہتے ہو تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تابعداری کرو' ان کی تابعداری میں ہی کامیابی کا راز مضمر ہے۔
لوگو! خیرات و حسنات کی طرف دوڑو کہ تمھارے پیغمبر کا یہی ارشاد ہے :
تم اللہ کو سجدہ کرو' اس کے رسول اسی کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔
جس کا دل رسول اللہ کی محبت سے خالی ہے' وہ دنیا اور آخرت دونوں میں ناکام رہے گا۔

حضرت عاتکہ رضی اللہ عنہا نے اپنے لائق احترام باپ عبدالمطلب کی وفات پر ایک مرثیہ کہا تھا' جس کے چند اشعار کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

اے میری دونوں آنکھو! آنسو بہانے میں بخل سے کام نہ لو' سخاوت کا اظہار کرو' آج تمھیں یہی زیب دیتا ہے۔
اے میری دونوں آنکھو! عبرت حاصل کرو' جس شخص کو تم دیکھتی رہی ہو اب تمھیں اس کا بدل نہیں مل سکے گا۔
اے میری دونوں آنکھو حیران اور متعجب کیوں ہو' اس کی موت کے بعد تمھیں کئی ناخوش گوار مراحل سے گزرنا پڑے گا۔
تم کو ایسے کریم و جواد کو دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے جس کا بدل ممکن

نہیں ہے۔
میری آنکھیں کس درجہ بلند بخت تھیں کہ ایک سردار اور معزز باپ کی زیارت سے مشرف ہوتی تھیں' اب اس کو کبھی نہ پا سکیں گی۔
میں کتنی بدقسمت ہوں کہ آج شفیق اور مہربان باپ کی شفقتوں اور مہربانیوں سے محروم ہوگئی ہوں۔
وہ میری لغزشوں کو معاف کرنے والے تھے اور میری غلطیوں کو نظر انداز کرتے تھے۔
وہ میرا سہارا تھے' میں نے ہر موقعے پر انھیں صاحب کرم پایا
وہ خاندان کی اونچی شخصیت تھے' غربا و مساکین انھیں اپنا مرجع و ماویٰ سمجھتے تھے۔
ان کا سخاوت کا دامن سمٹ گیا ہے' لیکن ان کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔
وہ بہادروں کی بہادری پر خوش ہوتے تھے اور ان کا اعزاز و اکرام کرنے والے تھے۔
غرض حضرت عاتکہ بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہا ایک باعظمت خاتون تھیں اور فصاحت و بلاغت اور ادب و شعر میں اونچے درجے پر فائز تھیں۔

صفیہ بنت عبد المطلب

حضرت صفیہ جناب عبدالمطلب کی بیٹی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی تھیں۔ حضور کی پھوپھیوں میں یہ پہلی بلکہ ایک روایت کی رو سے واحد پھوپھی تھیں جو نعمت اسلام سے متمتع ہوئیں۔ ادب و شعر، فصاحت و بلاغت، عمل و کردار، جرات و شجاعت، حسب نسب اور مجد و شرف کے اعتبار سے یہ اہل عرب میں ایک خاص امتیاز کی حامل خاتون تھیں۔ ریگستان عرب میں جب اسلام کی شمع روشن ہوئی اور انھوں نے اس سے کسب ضو کیا، اس وقت یہ چالیس سال کی تھیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات سے صفیہ رضی اللہ عنہا کے دو رشتے تھے، ایک پھوپھی ہونے کا خونی رشتہ اور دوسرا اسلام کا لازوال رشتہ۔ اس لیے آپؐ سے ان کو انتہائی محبت تھی۔ جنگ احد میں صفیہ بھی شریک تھیں۔ جب مسلمانوں پر آثار ہزیمت ظاہر ہوئے اور وہ بھاگنے لگے تو صفیہ نیزہ پکڑ کر راستے میں کھڑی ہو گئیں۔ بھاگنے والوں اور میدان جنگ سے باہر نکلنے والوں کے سینے پر نیزے کی انی مارتی تھیں اور پکار پکار کر کہتی تھیں۔

"تم میدان جنگ سے بھاگ رہے ہو، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں موجود ہیں، تمھیں احساس ندامت نہیں ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ کو میدان میں چھوڑ کر فرار کی راہیں تلاش کر رہے ہو؟"

جنگ احد میں ان کے بھائی حضرت حمزہؓ کو شہید کر دیا گیا تھا۔ حضرت حمزہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا اور بہت بڑے معاون تھے۔ نہایت بہادر اور شجاع تھے۔ مخالفین اسلام نے حضرت حمزہ کو شہید کر کے ان کی لاش کے ٹکڑے کر دیے تھے اور ہندہ نے انتہائی غصے میں ان کا کلیجہ نکال کے چبا ڈالا تھا۔ صفیہ جب میدان احد میں زیادہ آگے بڑھ گئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بیٹے زبیر سے

کہا انھیں آگے بڑھنے سے روکو حمزہ کی لاش انتہائی دردناک حالت میں پڑی ہے- بھائی کے ٹکڑے دیکھ کر ان کی قوت صبر جواب دے جائے گی اور یہ رونا دھونا شروع کر دیں گی' چنانچہ زبیر نے ان کو روکا اور عرض کیا :

"امی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آگے نہ جائیے یہیں سے واپس چلے جائیے-"

نہایت دلیری سے بولیں :

"بیٹا تم مجھے کیا ایسی نئی بات بتانے آئے ہو جس کا مجھے علم نہیں- مجھے معلوم ہے میرے بھائی کو قتل کر دیا گیا ہے- اس کی لاش کے ٹکڑے دور دور پھینک دیئے گئے ہیں اور ہندہ نے جوش غضب میں اس کا کلیجہ نکال کر چبا ڈالا ہے' لیکن مجھے اس کا کوئی غم نہیں- اسلام اسی قسم کی قربانیوں کا طالب ہے- اس کو زندہ رکھنے اور دین کی اشاعت عام کرنے کے لیے ضروری ہے کہ موت اور زندگی کے فرق کو دل سے نکال دیا جائے- جب تک زندگی موت سے ہم آغوش نہیں ہو گی' اشاعت اسلام کی طویل اور پرخطر وادیوں کو طے نہیں کیا جا سکے گا- میرے بھائی کو اگر قتل کیا گیا ہے تو کوئی بات نہیں' یہ اشاعت اسلام کے لیے ضروری تھا- یہ راہ اسلام کی قربانی ہے' اسے دیکھ کر میں خوش ہوں گی- میرے لیے اس سے زیادہ مسرت کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ میرے بھائی کو راہ خدا میں شہید کر دیا گیا ہے- میں خوب جانتی ہوں کہ مجاہد خود ہی زندگی سے کنارہ کش ہوتا اور موت کو دعوت دیتا ہے- اس پر اظہار افسوس کرنا اس کی بہادری کی توہین اور جذبہ جہاد کی اہانت ہے-"

زبیر نے واپس جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں صفیہ کے جذبات پہنچائے تو آپ نے حمزہ کی لاش دیکھنے کی اجازت دے دی اور فرمایا اس کے راستے سے ہٹ جاؤ' چنانچہ صفیہ گئیں' بھائی کی لاش کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو دیکھا' دعائے مغفرت کی اور بغیر کچھ کہے اور زبان پر حرف شکایت لائے انا للہ وانا الیہ

راجعون پڑھ کر واپس لوٹ گئیں۔

صفیہ کی دلیری اور بے پناہ بہادری کا ایک اور واقعہ جنگ خندق سے تعلق رکھتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جنگ خندق کو روانہ ہوئے تو ازواج مطہرات اور بعض خواتین ساتھ تھیں۔ خواتین کو انصار کے ایک قلعے میں جو فارع کے نام سے موسوم تھا' ٹھہرایا اور مشہور شاعر حسان بن ثابت کو ان کا محافظ و نگران مقرر کیا۔ اس قلعے میں چونکہ ان عورتوں اور حسان کے سوا اور کوئی نہ تھا' اس لیے یہودیوں نے اس سے فائدہ اٹھانے اور قلعے پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ صفیہ نے دیکھا کہ ایک یہودی قلعے کی دیوار کے ارد گرد چکر لگا رہا ہے اور عورتوں پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ انھوں نے یہودیوں کے اس مکروہ ارادے کو بھانپ کر حسان سے کہا:

"اس یہودی کی نقل و حرکت خطرے سے خالی نہیں۔ یہ اپنے ساتھیوں کو بلا کر قلعے پر حملہ کرنے کے درپے ہے۔ تلوار لے کر اس کا سر قلم کر دو۔"

حسان جو ایک مرض کی وجہ سے دل کے عارضے میں مبتلا ہو گئے تھے اور جنگ وجہاد کے قابل نہ رہے تھے' بولے مجھ سے تو یہ کام نہیں ہو سکے گا۔

یہودی کی نقل و حرکت اور تیز ہوئی تو صفیہ اٹھیں' خیمے کی چوب نکالی اور یہودی کے سر پر دے ماری' ضرب اتنی شدید اور ناگہانی تھی کہ یہودی اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا اور وہیں ڈھیر ہو گیا۔۔۔ اب صفیہ نے کہا۔

حسان جاؤ اس کا سر کاٹ کر قلعے کے باہر یہودیوں کے ہجوم میں پھینک دو تاکہ انھیں عبرت ہو اور وہ دوبارہ حملے کا ارادہ نہ کر سکیں۔

حسان نے کہا میں تو اس قابل بھی نہیں۔

صفیہ اٹھیں اور یہودی کا سر جسم سے الگ کر کے یہودیوں کے مجمع میں پھینک دیا' سر کا گرنا تھا کہ تمام یہودی مارے خوف کے بھاگ کھڑے ہوئے۔

صفیہ میں جہاں بہادری اور دلیری کے جوہر پائے جاتے تھے وہاں وہ شعر و ادب کے میدان میں بھی ایک ممتاز حیثیت رکھتی تھیں۔ انھوں نے مرثیے بھی کہے اور عام

شعر بھی کہے اور تمام اصناف شعر میں اپنی فصاحت وبلاغت اور افکار و خیالات کی ندرت وبلندی کا لوہا منوایا۔

اپنے والد محترم عبدالمطلب کی وفات پر انھوں نے زمانہ جاہلیت کے رواج کے مطابق اپنی بہنوں اور بنو ہاشم کی عورتوں کو بلایا اور ایک مجلس ماتم منعقد کی' جس میں سب نے الگ الگ مرثیے پڑھے۔ صفیہ نے بھی ایک مرثیہ پڑھا جس نے اپنے باپ کی عظمت و شرافت' جودت و سخاوت اور بزرگی و معدلت گستری کی تعریف کی۔ یہ مرثیہ سب سے بہتر قرار پایا۔ اس کے دو ابتدائی شعر ملاحظہ ہوں۔

ارقت لصوت نائحته بليل
علي رجل بقا رعة الصديد
نافضت عندذلكم دموعي
علي خدى كمنحدر الفريد

(ایک باکمال آدمی پر رات کو ایک عورت نوحہ کر رہی تھی۔ میں اس کی آواز سن کر رو پڑی اور اس کثرت سے روئی کہ موتیوں کی لڑی کی طرح میرے آنسو میرے دونوں رخساروں پر مسلسل بہنے لگے۔)

صفیہ نے اپنے بھائی حضرت حمزہ کا مرثیہ بھی کہا تھا' جس میں ان کے تمام اوصاف و کمالات بیان کیے تھے۔ اس کا ایک شعر یہ ہے۔

ان يوما اتي عليك ليوم
كورت شمسه وكان مضيئا

(آج آپ پر وہ دن آیا ہے' جس میں سورج تاریکی میں لپٹ گیا ہے' حالانکہ اس سے قبل وہ ضو فشانی کرتا اور روشنی پھیلاتا تھا۔)

صفیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مرثیہ بھی کہا جس کے دو شعر یہ ہیں۔

الا يا رسول الله كنت رجائنا
وكنت بنا براولم تلك جافيا

وکنت رحیما ھا دیا ومعلما

لبیك علیك الیوم من کان باکیا

(یارسول اللہ آپ کی ذات گرامی ہماری امیدوں کا مرکز تھی- آپ ہم پر احسان فرماتے تھے اور ظلم و جفا سے دور رہے تھے- آپ رحیم' ہادی اور معلم تھے- آج جس قدر بھی آپ پر ہو سکتا ہے رونا چاہیے-)

صفیہ نے ۷۳ برس کی عمر پا کر بعد خلافت عمر فاروق ۲۰ ہجری میں انتقال کیا- حضرت عمر فاروق نے نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں- ایک قول یہ ہے کہ خلافت عثمان کے زمانے میں وفات پائی-

حضرت ام ایمن

آغاز اسلام کی بعض خواتین نہایت بلند درجے کی حامل تھیں۔ ان خواتین میں حضرت ام ایمن بھی شامل ہیں۔ ان کا نام برکہ اور کنیت ام ایمن ہے۔ کنیت ہی سے مشہور ہیں۔ سلسلہ نسب یہ ہے: برکہ بنت ثعلبہ بن عروہ بن حصن بن مالک بن سلمہ بن عمرو بن نعمان۔

حضرت ام ایمن حبشہ کی رہنے والی تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد محترم جناب عبداللہ کی کنیز تھیں۔ ابتدائی عمر ہی میں جناب عبداللہ کی خدمت پر مامور ہو گئی تھیں۔ ان کی وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ محترمہ حضرت آمنہ سے منسلک ہو گئیں۔ ان کا انتقال ہوا تو خود رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہنے کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئیں۔ چونکہ یہ آپ کے والد محترم اور والدہ مکرمہ کی کنیز تھیں اور آپ کی ولادت مبارکہ ان کے سامنے ہوئی تھی' اس لیے انھیں آپ کی ابتدائی تربیت و پرورش کا شرف حاصل ہے۔ حضرت ام ایمن کا پہلا نکاح عبید بن زید سے ہوا جو حارث بن خزرج کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ عبید بن زید نعمت اسلام سے بہرہ ور ہوئے اور جنگ حنین میں شہادت پائی۔ ان کی شہادت کے بعد زید بن حارثہ کے عقد میں آئیں۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام اور صحابہ کرام میں نہایت عزت و احترام کے مالک تھے۔

حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کا شمار ان نامور خواتین اسلام میں ہوتا ہے' جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اسلام کو ابتدائی دور ہی میں مان لیا تھا اور اس سلسلے میں انتہائی مشکلات اور مصائب سے دوچار ہوئی تھیں۔ حضرت ام یمن نے قبول

اسلام کے نتیجے میں جو تکلیفیں برداشت کیں ان میں ایک ہجرت حبشہ ہے۔ مکہ کے کافروں نے جب مسلمانوں کو بہت زیادہ مبتلائے مصیبت کیا تو کچھ لوگ مکے سے ہجرت کر کے ملک حبشہ میں چلے گئے تھے۔ اسلام کی یہ مخلص خاتون بھی ان حضرات میں شامل تھیں۔ راہ اسلام میں ان کی یہ پہلی ہجرت تھی۔ پھر کچھ عرصہ بعد حبشہ سے واپس مکہ آگئی تھیں۔ جب مخالفین اسلام نے زیادہ تنگ کیا تو دیگر مسلمانوں کے ساتھ حضرت ام یمن بھی مدینہ طیبہ کو ہجرت کر گئی تھیں، یعنی انھیں راہ خدا میں دو ہجرتوں کا شرف حاصل ہے۔ ایک ہجرت حبشہ کا اور دوسرے ہجرت مدینہ کا۔

اس وقت مسلمان مرد اسلام کی نشر و اشاعت کرتے تھے تو ان کی عورتیں گھروں اور محلوں میں جا کر عورتوں کو دولت اسلام سے مالا مال کرنے کی جدوجہد کرتی تھیں۔ اگر مرد خدمت اسلام کے باب میں تلوار اٹھاتے تھے تو عورتیں بھی میدان جنگ میں اتر کر تیغ و سناں ہاتھ میں لیتی اور مردوں کے شانہ بشانہ مخالفین اسلام سے برسرپیکار ہوتی تھیں۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھیے کہ اسلام میں اگر کوئی سب سے زیادہ مشکل کام ہے تو وہ جنگ و جہاد ہے۔ مسلمان عورتیں اس مشکل ترین کام میں مردوں کی شریک کار تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک اور آپ کی حیات طیبہ میں آپ کی معیت و رفاقت میں کافروں کے خلاف تلوار اٹھاتی اور باقاعدہ مصروف جنگ ہوتی تھیں۔ حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کو بھی آنحضرت کی معیت میں شریک جہاد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ انھوں نے جنگ احد میں بھی شرکت کی اور بہادری کے جوہر دکھائے۔ مسلمانوں پر جب آثار ہزیمت ظاہر ہوئے اور میدان جنگ سے ان کے پاؤں اکھڑ گئے تو یہ عالی قدر خاتون میدان کارزار میں ڈٹی رہیں۔ کندھوں پر مشکیزہ اٹھا کر زخمی مجاہدین کو پانی پلاتی اور ان کی مرہم پٹی کرتی رہیں۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تحفظ و دفاع میں بھی انھوں نے کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہیں رکھا۔

جنگ احد میں جب مسلمان کافروں کے شدید اور اچانک حملے کی تاب نہ لا کر میدان چھوڑنے لگے تو اس خاتون نے نہایت بہادرانہ کارنامے سرانجام دیے۔ اس

نے مسلمانوں کو اسلامی غیرت، قبائلی حمیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کی حفاظت کا واسطہ دیا اور کہا کہ تم موت سے بھاگ کر کدھر جارہے ہو؟ کیا موت میدان جنگ سے باہر نہیں آئے گی؟ میدان جنگ سے باہر کی موت ذلت اور بزدلی کی موت اور میدان جنگ کی موت شہادت اور عزت کی موت ہوگی۔ کیا تمھارے اندر یہ احساس کروٹ نہیں لیتا کہ رسول خدا میدان جنگ میں مخالفین کا مقابلہ کر رہے ہیں اور تم انھیں چھوڑ کر بھاگے جارہے ہو؟ اس بہادر خاتون نے جنگ خیبر میں بھی شرکت کی تھی اور مخالفین کا پورے زور اور ہمت سے مقابلہ کیا تھا۔

حضرت ام یمن رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہائی محبت تھی۔ انھوں نے آپؐ کو زمانہ بچپن میں گود میں کھلایا تھا اور آپؐ کی بچپن کی تمام باتیں ایک ایک کر کے انھیں یاد تھیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی بہت عزت کرتے اور بڑے احترام سے پیش آتے تھے۔ آپ اکثر ان کے مکان میں تشریف لے جاتے اور خاصی دیر قیام فرماتے۔ آنحضرت کو متفکر اور مغموم دیکھ کر حضرت ام ایمن کو بڑی روحانی تکلیف ہوتی اور آپ کا کوئی غم برداشت نہ کر سکتیں۔ اسی طرح حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کی تکلیف سے آنحضرت کو بڑا دکھ پہنچتا اور ان کی ہر تکلیف رفع کرنے کی کوشش فرماتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ربیع الاول ۱۱ہجری میں ہوا تو حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا پر حزن وملال کے بادل چھاگئے۔

۲۳ہجری میں خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے شہادت پائی۔ حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کو معلوم ہوا تو بہت افسوس کیا اور انتہائی افسردہ خاطر ہوئیں۔

حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کے دو بیٹے تھے۔ ایک ایمن اور دوسرے اسامہ۔ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی تھے۔ حضرت ایمن رضی اللہ عنہ ان کے پہلے شوہر حضرت عبید بن زید رضی اللہ عنہ سے تھے اور حضرت اسامہ رضی

اللہ عنہ دوسرے شوہر حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے۔

ان سے بعض حضرات نے درس حدیث بھی لیا۔ان حضرات میں انس بن مالک، ابو یزید مدنی اور حنش بن عبداللہ صفانی شامل ہیں۔

حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا نے خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں وفات پائی۔عمر اور سن وفات کا پتا نہیں چل سکا۔

فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا

فاطمہ بنت خطاب اپنے دور کی بلند حوصلہ اور عالمہ خاتون تھیں۔ بڑے مضبوط ایمان، پر جوش دل اور قوی عزم وارادے کی مالک تھیں۔ ان کا شمار ان بلند بخت لوگوں میں ہوتا ہے جو سب سے پہلے حلقہ اسلام میں داخل ہوئے۔ ان کے بھائی عمر فاروق بن خطاب نہایت زوردار شخص تھے اور اسلام کے سخت ترین مخالفوں میں سے تھے، اس لیے یہ اپنے اسلام کو بھائی سے حتی الامکان مخفی رکھتی تھیں۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی خباب بن ارت انھیں قرآن پڑھاتے تھے اور تعلیم قرآن کا یہ فریضہ وہ فاطمہ کے گھر جا کر انجام دیتے تھے۔ فاطمہ کے شوہر سعید بن زید بھی اسلام قبول کر چکے تھے۔ وہ بھی خباب بن ارت سے قرآن پڑھتے تھے۔

ایک دن عمر بن خطاب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (خاک بدہن کافر) قتل کرنے کی غرض سے تلوار لے کر گھر سے نکلے، راستے میں خاندان بنو زہرہ کا ایک شخص ملا، اس نے عمر کے خطرناک تیور کو دیکھ کر پوچھا۔

"عمر! کہاں کے ارادے ہیں؟"

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کرنے جا رہا ہوں۔" عمر نے غصے میں جواب دیا۔

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر کے خاندان بنو ہاشم اور بنو زہرہ سے کس صوت میں اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکو گے۔۔۔؟" اس شخص نے سوال کیا۔

"میں سمجھتا ہوں، تم بھی بے دین اور صابی ہو گئے ہو اور تم نے دین محمد کی پیروی اختیار کر لی ہے" ۔۔۔ عمر نے چہرے پر آثار خشونت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"کیا میں تجھے یہ تعجب انگیز بات نہ بتاؤں کہ تیرا بہنوئی سعید بن زید اور تیری بہن فاطمہ بھی اپنے آباواجداد کا مذہب ترک کر کے دین محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیرو ہو گئے ہیں'۔۔۔اس شخص نے فوراً جواب دیا۔

یہ بات سن کر عمر کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو گیا اور وہ بے تابی کی حالت میں برہنہ تلوار ہاتھ میں لیے سیدھے بہن اور بہنوئی کے مکان پر پہنچے۔اس وقت ایک صحابی خباب بن ارت انھیں قرآن پاک کی تعلیم دے رہے تھے۔جب خباب نے عمر کے پاؤں کی آہٹ سنی تو وہ خوف زدہ ہو کر اپنی جگہ سے اٹھے اور بھاگ کر مکان کے ایک کونے میں جا چھپے۔اتنے میں عمر نے مکان کا دروازہ کھولا اور دہلیز پر قدم رکھتے ہی پوچھا:

"میں یہ بھنبھناہٹ سی کیا سن رہا تھا؟"

فاطمہ نے قرآن کے اوراق کو چھپاتے ہوئے کہا: کچھ بھی نہیں۔

عمر نے پورے زور سے گرج کر کہا: بخدا مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم دین محمد کے متبع ہو گئے ہو اور ساتھ ہی جوش غضب میں اپنے بہنوئی سعید کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔فاطمہ اپنے شوہر کو عمر کی گرفت سے بچانے کے لیے آگے بڑھیں تو عمر نے دھکا دے کر انھیں پیچھے ہٹا دیا۔

فاطمہ نے عمر سے کہا: اب قوت صبر جواب دے گئی ہے۔اس سے زیادہ تمھاری یہ سختیاں اور ستم رانیاں برداشت نہیں کی جائیں گی۔تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ماضی کا دور بیت چکا ہے۔زمانۂ جاہلیت کی بساط الٹ گئی ہے اور ہم معبودان باطل کو ترک کر چکے ہیں۔آفتاب اسلام کے طلوع ہوتے ہی روشنی کی ایک عالم گیر لہر دوڑ گئی ہے' جس نے جہالت کی تاریکیوں کو ختم کر کے لوگوں کے قلب ونظر کے تمام گوشوں کو منور کر دیا ہے۔

جیسے جیسے اسلام کی پاکیزہ تعلیم پھیلتی اور اپنا دامن وسیع کرتی جائے گی' روشنی کے خطوط ابھرتے اور تیز ہوتے جائیں گے۔ہم نے اسلام کو اپنے دلوں کی تہوں میں اتار لیا

ہے اور ہمارے فکر و نظر میں اس کی تعلیمات رس بس گئی ہیں' لہٰذا اس راہ کی کوئی بھی سختی ہماری لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ ہم ہر قدم پر اسلام کا دفاع اور ہر موڑ پر اپنی حفاظت کریں گے۔ تمھاری ایذا رسانیاں ہمیں اس صراط مستقیم سے ہٹنے اور ہار ماننے پر مجبور نہیں کر سکتیں۔ ہم نرمی کا جواب نرمی سے اور سختی کا جواب سختی سے دیں گے۔ تم نے وقت کی رفتار کو نہیں پہچانا اور مسلمانوں کے حوصلوں کا امتحان نہیں لیا۔ ہم جان دے سکتے ہیں' لیکن اپنے دین کو جو ہر لحاظ سے سچا ہے' ترک نہیں کر سکتے۔ تمھاری یہ تلوار ہماری گردن کو تو جسم سے جدا کر سکتی ہے مگر ہمارے عزائم پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔

عمر! میں واضح الفاظ میں کہہ دینا چاہتی ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے سچے نبی اور پیارے رسول ہیں۔ ان پر جو کتاب نازل ہو رہی ہے' وہ بالکل صحیح اور اللہ کی طرف سے ہے' خدا کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ تمھارے یہ پتھر کے بت جھوٹے اور باطل ہیں۔ تمھاری راہ جہنم کی راہ ہے اور ہماری منزل مقصود جنت ہے۔ کامیابی آخر اسلام کے لیے مقدر ہو چکی ہے۔ تم لوگ اپنی غلط تعلیم کی وجہ سے نامراد و ناکام رہو گے' البتہ جو اسلام قبول کرے گا وہ فوز و فلاح پائے گا۔ تمھاری لوہے کی تلوار سے اسلام کی تلوار کی ضرب زیادہ شدید اور اس کا زخم زیادہ گہرا ہے۔

عمر کے بہنوئی سعید بن زید نے بھی فاطمہ کی تائید کی اور دونوں تن کر عمر کے سامنے کھڑے ہو گئے اور بہ یک زبان بول اٹھے : ہم اسلام قبول کر چکے ہیں' اب تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر گزرو۔

عمر کو یہ توقع نہ تھی کہ بہن اور بہنوئی اتنی جرات سے اس کا مقابلہ کریں گے اور اس کے سامنے سرنگوں ہونے سے انکار کر دیں گے۔ اطاعت شعار بہن نے جو رویہ اختیار کیا تھا اور عمر کو جس لہجے سے مخاطب کیا تھا' وہ عمر کے لیے انتہائی حیران کن تھا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ صاف گوئی واقعی کسی غیبی سچائی کی آئینہ دار ہے۔ عمر نے ندامت اور افسوس کے انداز میں کہا جو کلام تم ابھی پڑھ رہے تھے اور جس کے بارے میں تم کہتے ہو

کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اتارا گیا ہے' وہ مجھے دکھاؤ۔

"---ہمیں ڈر ہے کہ تم اس کلام پاک کی بے حرمتی کرو گے" --- بہن نے جواب دیا۔

عمر: "میں اپنے معبود کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس کی بے حرمتی نہیں کروں گا' تم بالکل فکر نہ کرو' میں اسے پڑھ کر ابھی واپس کر دوں گا۔"

بہن: تم شرک سے آلودگی کی وجہ سے ناپاک ہو اور اس مقدس صحیفے کو پاک وطاہر لوگوں کے سوا اور کسی کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں۔

عمر فوراً اٹھے' ہاتھ دھوئے اور غسل کیا۔ بہن نے قرآن پاک کے وہ اوراق انھیں دیے جو ان کی آمد کے وقت پڑھ رہی تھیں۔ وہ سورہ طٰہ کی آیات تھیں۔ عمر نے سورہ طٰہ کی چند آیات پڑھیں اور پکار اٹھے:

یہ کلام کس درجہ حسن وخوبی سے مزین اور عزت واکرام سے مالامال ہے۔

خباب جواب تک عمر کے ڈر سے مکان کے کونے میں چھپے بیٹھے تھے' باہر نکلے اور عمر سے مخاطب ہو کر بولے:

عمر بخدا اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا قبول کر لی ہے اور تمھیں ایک بہت بڑے داعی اسلام کے طور پر چن لیا گیا ہے۔ میں نے آج ہی حضور سرور کائنات کو دیکھا کہ آپ اللہ سے یہ دعا مانگ رہے تھے کہ اے اللہ ابو جہل یا عمر بن خطاب کے ذریعے اسلام کی مدد فرما' چنانچہ اللہ نے اپنے حبیب کی یہ دعا قبول فرمائی ہے۔

"خباب! مجھے بتاؤ (محمد فداہ ابی وامی) کہاں ہیں تاکہ میں ان کے حضور جا کر حلقہ بگوش اسلام ہو جاؤں" --- عمر نے التجا کی۔

"--- آپ صفا پہاڑی کے قریب ایک مکان میں بیٹھے ہیں۔ آپ کے ساتھ چند صحابی بھی ہیں" --- خباب نے جواب دیا۔

عمر اسی طرح برہنہ تلوار ہاتھ میں پکڑے بہن کے گھر سے نکلے اور خباب کی نشان دہی کے مطابق اس مکان کے دروازے پر جا دستک دی جس میں حضور اور آپ

کے صحابہ تشریف فرما تھے۔ایک صحابی نے آہٹ پاکر مکان کے اندر سے جھانک کر دیکھا تو گھبرائے ہوئے آنحضرت کے پاس آئے اور بتایا عمر ہاتھ میں تلوار پکڑے دروازے پر کھڑے ہیں۔

آنحضرت نے فرمایا: عمر کا راستہ نہ روکو' اسے اندر آنے دو۔

عمر کے دروازے میں قدم رکھتے ہی حضور نے ان کے شانوں پر ہاتھ رکھا اور زور سے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا:

"کہو عمر کیسے آنا ہوا؟"

"اے اللہ کے سچے نبی! اسلام قبول کرنے اور آپ کی رسالت اور اللہ کی وحدانیت کا اقرار کرنے حاضر ہوا ہوں۔" عمر نے سر جھکا کر کانپتے ہونٹوں اور لرزتی زبان سے جواب دیا اور ساتھ ہی بلند آواز سے کلمہ شہادت اشهدان لا اله الا الله و اشهدان محمد ارسول الله پڑھا۔عمر کا کلمہ شہادت پڑھ کر داخل اسلام ہونے کا اعلان کرنا تھا کہ فضا پرزور نعرہ ہائے تکبیر سے گونج اٹھی۔

عرب کا یہ شہ زور اور نامی گرامی بہادر ایک عورت کی جرات ایمانی سے متاثر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہوا۔

فاطمہ بنت خطاب کی وفات اپنے اسی بھائی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں ہوئی۔

حضرت ام سلیم بنت ملحان

عرب عورتیں ان تمام اوصاف پسندیدہ کی حامل تھیں جو ان کے مردوں میں پائے جاتے تھے۔ حرب و قتال' دلیری و بہادری' صبر و شکیب اور جفاکشی و قوت برداشت ان کی وہ خصوصیات تھیں جو ان کی طبیعت کا لازمی حصہ تھیں اور زندگی کے معمولات میں داخل تھیں۔ مشکلات کا مقابلہ اور مصائب سے پنجہ آزمائی کرنے سے یوں سمجھیے کہ عرب خواتین کو راحت محسوس ہوتی تھی۔ اس ضمن میں ہر عورت ایک دوسری سے آگے بڑھنے کے لیے کوشاں رہتی۔ اس زمرے میں حضرت ام سلیم بنت ملحان کا اسم گرامی بھی شامل ہے اور مؤرخین اسلام نے ان کا ذکر بڑی اہمیت کے ساتھ کیا ہے۔

اس قابل احترام خاتون کا نام رمیلہ اور ایک روایت کے مطابق سہلہ تھا۔ عربوں کے رواج کے مطابق ان کی کنیت ام سلیم تھی۔ ان کے والد مکرم کا نام ملحان بن خالد بن زید بن حرام بن جندب تھا۔ وہ مدینہ کے باشندے اور انصار کے قبیلہ بنو نجار سے تعلق رکھتے تھے۔ والدہ محترمہ کا نام ملیکہ تھا۔ آبائی سلسلہ نسب کی رو سے ام سلیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد جناب عبدالمطلب کی والدہ محترمہ سلمی بنت زید کی پوتی تھیں۔ اسی وجہ سے لوگ انھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خالہ کہتے تھے۔

حضرت ام سلیم کا پہلا نکاح انہی کے قبیلے کے ایک شخص مالک بن نضر سے ہوا تھا۔ آنحضرت کے مشہور صحابی حضرت انس رضی اللہ عنہ انہی کی اولاد تھے۔

حضرت ام سلیم کا شمار انصار کے ان خوش بخت افراد میں ہوتا ہے جو سب سے پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ان کے اسلام لانے کے وقت ان کے بیٹے حضرت انس بالکل بچے تھے۔ یہ انھیں کلمہ پڑھاتی تھیں تو ان کے شوہر مالک بن نضر جو حلقہ اسلام

سے باہر اور دائرہ شرک میں داخل تھے' سخت خفگی کا اظہار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ تم میرے بچے کو بے دین کر کے رہو گی- مالک بن نضر کسی حال میں بھی اسلام قبول کرنا نہیں چاہتے تھے- وہ اسی حالت میں بیوی سے ناراض ہو کر شام چلے گئے تھے' وہاں ان کا کوئی دشمن پہلے سے انتظار میں بیٹھا اور موقع کی تاک میں تھا- اس نے مالک کو قتل کر ڈالا- اب ام سلیم بیوہ تھیں اور انس کے بچپن کی وجہ سے انتہائی پریشان- پھر جوان بھی تھیں' اگر دوسرا نکاح کر لیتیں تو یہ اقدام لائق اعتراض نہ تھا' مگر انھوں نے بڑے صبر اور استقلال سے کام لیا- کئی لوگوں نے نکاح کے لیے پیغام بھیجے' مگر تمام پیغام یہ کہہ کر رد کر دیے گئے کہ جب تک میرا بیٹا انس عقل مند لوگوں کی مجلسوں میں شریک ہونے اور بات چیت کرنے کے قابل نہ ہو جائے گا' نکاح نہیں کروں گی- پھر جب انس ہی میرے نکاح پر رضامند ہوں گے تو نکاح کروں گی- اس سے ان کا یہ مطلب تھا کہ سوتیلے باپ سے اسے کسی قسم کی تکلیف کا احساس اور خطرہ نہ ہو-

چنانچہ جب حضرت انس عالم طفولیت کی حدوں سے نکل کر فہم و شعور کی منزل میں داخل ہوئے تو انہی کے قبیلے کے ایک شخص ابو طلحہ نے نکاح کی خواہش ظاہر کی- لیکن ابو طلحہ نے بھی اسلام قبول نہیں کیا تھا-

ام سلیم نے ان سے کہا: ابو طلحہ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لے آئی ہوں اور یہ گواہی دیتی ہوں کہ وہ اللہ کے رسول اور اس کے برگزیدہ بندے ہیں- مگر تمھارے اس رویے پر افسوس ہے کہ تم پتھر کے مجسموں اور لکڑی کی مورتیوں کو پوجتے ہو' جنھیں ایک بڑھئی تراش کر بت کی شکل میں بدلتا ہے- تم ہی بتاؤ یہ پتھر اور لکڑی کے بت تمھیں کچھ نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟ یاد رکھو میرا اور تمھارا سب کا معبود صرف اللہ ہے' جو ساری دنیا کا خالق اور سب کا رزاق ہے اور نفع و ضرر کے تمام اختیارات اسی کے ہاتھ میں ہیں- کتنے حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ تم معبود حقیقی کو چھوڑ کر حاجت روائی اور عبادت کے لیے پتھر کی ساکت و

صامت مورتیوں کے سامنے جبین نیاز جھکاتے ہو اور بے اختیار و ناتواں بتوں کو خدا سمجھے ہوئے ہو۔

حضرت ام سلیم نے ابوطلحہ سے یہ بات کچھ ایسے حکیمانہ اور مخلصانہ انداز میں کہی کہ اسلام کی صداقت اور بسرور کائنات کی حقانیت ان کے دل پر مرتسم ہو گئی اور وہ تھوڑے سے غور و فکر کے بعد مسلمان ہو گئے۔

حضرت ابوطلحہ (رضی اللہ عنہ) مالی اعتبار سے معمولی حیثیت کے مالک تھے' لیکن چونکہ حضرت ام سلیم کی تلقین تبلیغ سے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے' اس لیے ام سلیم کے دل میں ان کی وقعت بڑھ گئی اور ان کے قبول اسلام کے فوراً ہی بعد ان سے کہہ دیا کہ میں تم سے نکاح کرتی ہوں اور تمھارے قبول اسلام ہی کو اپنا مہر مقرر کرتی ہوں۔ یہ نکاح حضرت ام سلیم کے بیٹے حضرت انس (رضی اللہ عنہ) کے زیر اہتمام ہوا تھا۔

حضرت ام سلیم مضبوط عزم و ارادے کی عورت تھیں۔ انھوں نے بہت سی صحابیات کی طرح متعدد لڑائیوں میں داو شجاعت دی اور مردوں کے دوش بدوش شریک جہاد رہیں۔ حدیث کی مشہور کتاب صحیح مسلم کی دوسری جلد میں ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم جنگوں میں حضرت ام سلیم اور انصار کی چند عورتوں کو ساتھ رکھتے تھے۔ جب مسلمان مصروف جہاد ہوتے تو یہ عورتیں (مجاہدین کو) پانی پلاتیں اور زخمیوں کو مرہم پٹی کرتی تھیں۔

جنگ احد میں حضرت ام سلیم اور ان کے شوہر حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ دونوں شریک تھے۔ ابوطلحہ آنحضرت کے تحفظ و دفاع میں دشمنوں کے تیر اور نیزے اپنے جسم پر روکتے تھے اور ام سلیم مجاہدین کی خدمت میں مصروف تھیں۔ ان کے بیٹے حضرت انس کا کہنا ہے کہ میں نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو دیکھا کہ وہ میدان جنگ میں پائنچے چڑھائے ہوئے تھیں اور نہایت تیزی کے ساتھ پانی کی مشکیں بھر بھر کر لاتیں اور زخمیوں کو پلاتی تھیں۔

جنگ خیبر بڑے معرکے کی جنگ تھی جو ۷ ہجری میں لڑی گئی۔ اس میں حضرت ام سلیم بھی آنحضرت کے ساتھ شریک جہاد تھیں۔ فتح خیبر کے بعد جب حضرت صفیہ (رضی اللہ عنہا) ازواج مطہرات میں شامل ہونے لگیں تو ان کو دلہن بنانے کے فرائض ام سلیم ہی نے انجام دیے تھے۔

جنگ حنین میں بھی حضرت ام سلیم شریک تھیں۔ ایام جنگ میں یہ حمل سے تھیں اور عبداللہ بن ابوطلحہ پیٹ میں تھے۔ مگر اس کے باوجود ہاتھ میں خنجر اٹھا رکھا تھا۔ ان کے شوہر حضرت ابوطلحہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ام سلیم خنجر اٹھائے ہوئے ہے' تو آپ نے پوچھا اس خنجر کا کیا کرو گی؟ کہا کوئی مشرک اور مخالف اسلام قریب آیا تو اس کا پیٹ چاک کر دوں گی۔ اس جواب میں آپ ہنس پڑے اور ام سلیم کی بہادری سے خوش ہوئے۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے انھیں بدرجہ غایت الفت تھی اور اسی بنا پر اپنے بیٹے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو آپ کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ایک روز حضور ان کے مکان پر تشریف لائے تو عرض کیا یارسول اللہ اپنے خادم خاص انس کے لیے خصوصیت سے دعا فرمائیے۔ آپ نے ان الفاظ سے دعا کی:

اللھم ارزقه مالا وولدا وبارك له۔

یعنی اے اللہ اس کو مال و اولاد عطا کر اور اس کی عمر میں برکت دے۔

آنحضرت کی دعا ہی کا اثر تھا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ تمام انصار سے بڑھ کر مال دار تھے اور سو سال سے زیادہ عمر پائی۔ اولاد بھی بہت تھی' خود حضرت انس کا قول ہے کہ میں انصار کی اکثر آبادی سے زیادہ صاحب مال و دولت ہوں اور حجاج بن یوسف کے بصرہ آنے تک میری صلب سے ایک سو انتیس بیٹے مدفون ہوئے۔

صبر و شکیب اور مصائب و آلام کو برداشت کرنا حضرت ام سلیم کا امتیازی وصف تھا۔ اس ضمن میں ان کے کئی واقعات مشہور ہیں' جن میں ایک یہ ہے کہ ایک مرتبہ ان کے شوہر حضرت ابوطلحہ کہیں گئے ہوئے تھے کہ ان کا بیٹا ابو عمیر کم سنی میں وفات پا

گیا- شوہر کی غیر حاضری میں نہایت صبر و ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے ماں نے بچے کو غسل دیا- شوہر واپس آئے تو انھیں بتایا اور کہا کہ اگر کوئی کسی کو کوئی چیز دے' پھر واپس لے لے تو اس پر غصہ یا افسوس کرنا چاہیے یا نہیں؟ انھوں نے جواب دیا یہ تو کوئی ناگواری اور غم و افسوس کی بات نہیں ہے- کسی چیز کے مالک نے اپنی چیز واپس لوٹا لی' اس میں افسوس کی کون سی بات ہوئی؟

بولیں :اچھا تو آپ کا بیٹا فوت ہو گیا ہے اور اللہ نے جو امانت ہمارے سپرد کی تھی' واپس لے لی ہے-

ابو طلحہ نے اناللہ وانا الیہ راجعون پڑھا- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی- جنازہ پڑھا اور لڑکے کو دفن کر آئے- اس کی وفات کے بعد حضور سرور کائنات کی دعا سے ان کے ہاں ایک لڑکا عبداللہ پیدا ہوا' جس میں اللہ نے بڑی برکت عطا کی اور اس کی اولاد میں دس ماہر فن قاری پیدا ہوئے-

حضرت ام سلیم عاقل و باکمال' حاضر دماغ و نکتہ شناس اور عالم حدیث و ذی فراست خاتون تھیں- مسائل کا صاف ستھرا ذوق رکھتی تھیں-لوگ مسائل دریافت کرنے کے لیے ان کی طرف رجوع کرتے اور مشکل امور میں ان سے مشورے لیتے تھے-ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت زید بن ثابت کے درمیان ایک مسئلے میں اختلاف ہوا تو انھوں نے انھی کو حکم بنایا تھا- مشاہیر صحابہ میں سے حضرت انس' حضرت عبداللہ بن عباس' حضرت زید بن ثابت' حضرت ابو سلمہ اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم نے ان سے احادیث روایت کی ہیں-

حضرت ام سلیم کا سن وفات معلوم نہیں ہو سکا- مشہور یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے ابتدائی دور میں فوت ہوئیں-

حضرت ام عمارہ

ان کا نام نسیبہ تھا- مگر عرب کے عام رواج کے مطابق نام کی بہ نسبت کنیت سے زیادہ مشہور ہیں- ہجرت نبوی سے تقریبا چالیس سال قبل مدینہ منورہ میں پیدا ہوئیں-حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا دو خصوصیات کی حامل تھیں-ایک تو انصاریہ تھیں-دوسرے قبول اسلام کے اعتبار سے اولیں مسلمانوں میں شامل تھیں-حضرت ام عمارہ تنہا مسلمان نہیں ہوئی تھیں' بلکہ اسلام کی آواز کانوں میں پڑتے ہی ان کا سارا خاندان دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا تھا اور پھر ان سب نے مدینہ سے آ کر عقبہ کی گھاٹی پر آنحضرت فداہ ابی وامی کی بیعت کی تھی-

۳ ہجری میں جنگ احد کا معرکہ کارزار گرم ہوا تو اس میں حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا شریک تھیں-اس جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور بہت سے صحابہ کرام جام شہادت نوش کر گئے تھے- مسلمان شکستہ دل ہو گئے تھے اور میدان جنگ میں ثابت قدم نہیں رہ سکے تھے-جو مسلمان میدان جنگ میں رہ گئے تھے' ان کی تعداد بہت کم تھی-ان میں حضرت ام عمارہ' ان کے دو بیٹے حضرت عبداللہ اور خبیب رضی اللہ عنہم شامل تھے جو میدان محاربہ میں ڈٹے اور مخالفین اسلام کا مقابلہ کرتے رہے تھے-

حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا شروع سے آخر تک میدان جنگ میں رہیں- آغاز میں پانی کی مشکیں بھر بھر کر لاتی اور مجاہدین کو پلاتی تھیں- آخر میں سرور کائنات کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہو گئی تھیں- جب مخالفین میں سے کوئی شخص آگے بڑھ کر آنحضرت پر حملہ آور ہوتا تو یہ نہایت دلیری سے حملوں کو روکتی تھیں-جب حملہ آور پیچھے کو ہٹتا تو اس کے گھوڑے کے پاؤں پر اس زور سے تلوار کا وار کرتیں کہ گھوڑے کے

پاؤں کٹ جاتے اور گھوڑا اور سوار دونوں زمین پر گر پڑتے۔ حضرت ام عمارہ خود فرماتی ہیں کہ جب آنحضرت پر حملہ کرنے والا سوار زمین پر گر جاتا تو حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم میرے بیٹے عبداللہ کو آواز دیتے اور میری امداد کے لیے بھیجتے۔ ہم دونوں ماں بیٹا اسی وقت اس گھوڑے اور سوار کا خاتمہ کر دیتے۔

جنگ احد میں حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا نے جو جرات مندانہ کارنامے انجام دیے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان کا ذکر فرمایا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"جنگ میں ام عمارہ کو میں برابر اپنے دائیں بائیں مصروف جنگ دیکھتا تھا۔"

لڑائی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی اور مخالفین اسلام زبردست یلغار کرتے ہوئے برابر آگے بڑھتے آ رہے تھے کہ ایک کافر نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پتھر پھینکا، جس سے آپ کے داندان مبارک شہید ہو گئے۔ ساتھ ہی ابن قمیہ نے آپ پر تلوار کا وار کیا، جس سے خود کے دو حلقے آنحضرت کے رخسار مبارک میں دھنس گئے اور خون بہنے لگا۔ حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا نے یہ منظر دیکھا تو برداشت نہ کر سکیں اور نہایت بے تابی کے عالم میں پیچ و تاب کھاتی ہوئی آگے بڑھیں اور پورے زور سے ابن قمیہ پر تلوار کا وار کیا، مگر وہ چونکہ لوہے کی دوہری زرہ میں غرق تھا، اس لیے اس پر تلوار کا کوئی اثر نہ ہوا۔ جواب میں ابن قمیہ نے تلوار چلائی جو حضرت ام عمارہ کے کندھے پر لگی اور خاصا گہرا زخم کر گئی۔ ابن قمیہ تو بھاگ گیا مگر حضرت ام عمارہ کا زخم اتنا گہرا تھا کہ خون کے فوارے ابل پڑے۔ سرور کائنات نے اپنی نگرانی میں پٹی بندھوائی اور چند بہادر و جری صحابہ کا نام لے کر فرمایا:

"بخدا آج ام عمارہ نے جو شجاعانہ کارنامہ سر انجام دیا ہے اور جس ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا ہے وہ ان بہادر لوگوں سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔"

ام عمارہ نے عرض کیا یا رسول اللہ دعا فرمائیے کہ مجھے جنت میں آپ کی معیت کا شرف حاصل ہو۔

آپ نے دعا فرمائی تو بولیں: اب مجھے دنیا کی کسی مصیبت کی پروا نہیں۔

جنگ احد میں حضرت ام عمارہ نے جس بہادری اور بے جگری سے حصہ لیا خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعریف فرمائی ہے- ایک مرتبہ جب معرکہ کارزار میں ان کا بیٹا عبداللہ زخمی ہو گیا تو لخت جگر کے زخم پر پٹی باندھی اور کہا-

بیٹا اب تمھارے زخم پر پٹی باندھ دی گئی ہے- یہ موقع بیٹھ کر زخم دیکھنے اور اپنے اندر احساس کمزوری پیدا کرنے کا نہیں- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود میدان جنگ میں موجود ہیں- تمھیں زخموں کو دیکھ کر اپنے اوپر آثار ضعف پیدا کرنا زیب نہیں دیتا- جاؤ پوری طاقت سے دشمن پر ٹوٹ پڑو یا اپنے آپ کو ختم کر لو یا دشمنان اسلام کو نیست و نابود کر دو-

سرور کائنات نے یہ بات سنی تو فرمایا ام عمارہ جس طاقت و قوت کی تم حامل ہو دوسرا کون ہو گا- جنگ ختم ہونے کے بعد سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک گھر تشریف نہیں لے گئے' جب تک کہ عبداللہ بن کعب مازنی کو بھیج کر حضرت ام عمارہ کی خیریت دریافت نہیں فرمالی-

طبقات ابن سعد کی آٹھویں جلد میں مذکور ہے کہ حضرت ام عمارہ جنگ اُحد کے علاوہ صلح حدیبیہ' جنگ خیبر' فتح مکہ اور جنگ حنین میں بھی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھیں-

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں اہل یمامہ کا سردار مسیلمہ مرتد ہو گیا تھا- یہ شخص مسیلمہ کذاب کے نام سے مشہور ہے- بڑا ظالم و سفاک اور ستم ران تھا- اس کے قبیلے کے کم و بیش چالیس ہزار آدمی جو بڑے جنگجو تھے' اس کے معاون و مددگار تھے- مسیلمہ نے اپنی قوت و طاقت کے گھمنڈ میں آکر نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا- جو شخص اس کی نبوت سے انکار کرتا اسے سخت اذیت پہنچاتا- ایک مرتبہ حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا کے بیٹے خبیب بن زید عمان سے مدینہ منورہ جا رہے تھے کہ راستے میں مسیلمہ کے ہاتھ لگ گئے- مسیلمہ نے حضرت خبیب کو پکڑ کر پوچھا-

"تم یہ گواہی دیتے ہو کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔"

خبیب نے کہا: ہاں میں آنحضرت کو اللہ کا رسول مانتا ہوں۔

مسیلمہ نے کہا: "تم کہو مسیلمہ اللہ کا رسول ہے۔"

جواب دیا: نہیں محمد اللہ کے رسول ہیں۔ یہ الفاظ سنتے ہی مسیلمہ نے ان کا ایک ہاتھ تلوار سے کاٹ دیا اور کہا: "کہو مسیلمہ اللہ کا رسول ہے۔"

انھوں نے پھر کہا: محمد اللہ کے رسول ہیں۔ اب اس نے دوسرا ہاتھ بھی کاٹ دیا۔

پھر کہا: میری بات مانو گے اور میری نبوت کا اقرار کرو گے؟

جواب دیا: ہرگز نہیں۔

اب مسیلمہ نے انھیں قتل کر دیا۔ واقعہ کی اطلاع حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا کو پہنچی تو خبیب سے دوہرا رشتہ جاگ اٹھا۔ ایک طرف سینے میں ممتا نے جوش مارا اور دوسری جانب دل میں جذبہ اسلام کی بے پناہیوں نے کروٹ لی اور یہ تہیہ کر لیا کہ اگر اس کے خلاف لشکر اسلام حرکت میں آیا تو ظالم و کذاب مسیلمہ کو خود اپنی تلوار سے موت کا لقمہ بناؤں گی۔

مسیلمہ کی فساد انگیزیوں اور ستم رانیوں کی اطلاع خلیفہ اول حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ہوئی تو انھوں نے اس فتنہ ارتداد کی بیخ کنی کے لیے عساکر اسلام کے سپہ سالار حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو چار ہزار فوج دے کر روانہ کیا (حضرت) عمارہ رضی اللہ عنہا حضرت ابو بکر سے اجازت لے کر فوج کے ساتھ روانہ ہو گئیں۔ سخت مقابلہ ہوا جس میں بارہ سو مسلمان شہید ہوئے اور نو ہزار کافر مارے گئے۔ فتح مسلمانوں کو حاصل ہوئی۔ (حضرت) عمارہ رضی اللہ عنہا بھی ہاتھ میں تلوار لیے کافروں سے مقابلہ کر رہی تھیں۔ انھوں نے دور سے مسیلمہ کو دیکھا تو برچھی اور تلوار سے مسلح صفوں کو چیرتی اور زخم پر زخم کھاتی ہوئی مسیلمہ کے قریب پہنچ گئیں' یہاں تک پہنچنے کے نتیجے میں ان کو نیزے اور تلوار کے گیارہ زخم آئے۔ ایک ہاتھ بھی کلائی سے الگ ہو کر کہیں گر پڑا' مگر اس شیر دل خاتون کے صبر و تحمل میں ذرا کمی واقع نہ ہوئی۔ مسیلمہ پر وار

کرنے کے لیے اور آگے بڑھی تھیں کہ اتنے میں بہ یک وقت دو تلواریں فضا میں لہرائیں اور اس زور سے مسلیمہ پر پڑیں کہ وہ کٹ کر گھوڑے سے گرا اور زمین پر آرہا۔ حضرت ام عمارہ نے گرد و غبار کی تاریکی میں غور سے دیکھا تو اس کا بیٹا عبداللہ ہاتھ میں تلوار لیے میسلمہ کی لاش پر کھڑا تھا۔ ماں نے مسرت و حیرت کے ملے جلے جذبات سے پوچھا۔

عبداللہ اسے تو نے قتل کیا ہے؟

بہادر بیٹے نے جواب دیا: امی اس پر ایک ساتھ دو تلواریں پڑی ہیں۔ ایک میری، ایک کسی اور کی۔ اب کچھ نہیں کہا جا سکتا کس کی تلوار اس کی موت کا باعث بنی ہے۔

ام عمارہ انتہائی خوش ہوئیں اور سجدہ شکر ادا کیا۔

اس جنگ میں حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا کو کافی زخم آئے تھے۔ ہاتھ بھی کٹ چکا تھا۔ اس لیے بہت کم زور ہو گئی تھیں۔ امیر لشکر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ انھوں نے نہایت توجہ سے ان کا علاج کرایا اور تیمار داری کے لیے آتے رہے۔

حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا کا احترام تمام لوگوں کے دلوں میں جاگزین تھا۔ خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عزت فرماتے تھے۔ آپؐ کے بعد خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ان کے مکان پر جاتے اور ان کی مزاج پرسی کرتے۔ خلیفہ ثانی امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ان کے مکان پر جاتے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ان کی انتہائی تکریم کرتے تھے اور ان کی قربانیوں کو بے حد قدر کی نظر سے دیکھتے تھے۔

ایک مرتبہ عہد فاروقی میں کچھ بیش قیمت ملبوسات مال غنیمت میں آئے، جن میں ایک زر کار دوپٹا بھی تھا۔ بعض لوگوں نے حضرت عمر فاروق کو یہ رائے دی کہ یہ دوپٹا آپ کے بیٹے عبداللہ کی بیوی کو دیا جائے۔ بعض نے کہا یہ آپ خود اپنی بیوی کو دے دیں۔۔۔حضرت عمر نے فرمایا:

میں اس کی سب سے زیادہ حق دار ام عمارہ کو سمجھتا ہوں - یہ دوپٹا ام عمارہ کو دیا جائے گا - میں نے جنگ احد کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ام عمارہ کی تعریف اوران کی بہادری کا تذکرہ کرتے ہوئے سنا تھا کہ میں جدھر نظر اٹھا کر دیکھتا تھا' میدان جنگ میں ام عمارہ ہی نظر آتی تھیں' چنانچہ یہ دوپٹا حضرت ام عمارہ کو دے دیا گیا-

حضرت ام عمارہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے چند احادیث بھی روایت کی ہیں جو ام سعد' حارث بن عبداللہ' عباد بن تمیم بن زید' عکرمہ اور ابی لیلیٰ سے مروی ہیں-

حضرت اسما بنت یزید

حضرت اسما بنت یزید رضی اللہ عنہا کا شمار مشہور صحابیات میں ہوتا ہے۔ سلسلہ نسب یہ ہے: اسماء بنت یزید بن اسکن بن رافع بن امراء القیس بن زید بن عبدالاشہل بن حشم بن حارث بن خزرج بن عمرو بن مالک بن اوس --- یہ قرن اول کی نہایت بہادر اور نامور خاتون تھیں۔ ان کا دل خوف و خطر سے خالی' ذہن جرات و شجاعت کی دولت بے پایاں سے بھرپور اور فکر اسلام کی نعمت بے بہا سے مالا مال تھا۔ نام اسما تھا اور اہل عرب کی عام روایات کے مطابق کنیت ام سلمہ تھی۔ ہجرت کے بعد قبول اسلام کا شرف حاصل کیا۔ جہاں جرات و بہادری کے جوہر سے آراستہ تھیں' وہاں زہد و تقویٰ' ورع و عبادت' ادب و شعر' زور بیان اور طاقت لسانی کے اوصاف سے بھی متصف تھیں۔ بیان و کلام میں سلجھاؤ' اور اظہار مدعا منفرد حیثیت کی حامل تھیں۔ جچی تلی اور مربوط گفتگو کرتی تھیں اور اپنے مقصد اور نقطہ نظر کی وضاحت پر قدرت رکھتی تھیں۔

اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے مجمع میں رونق افروز تھے۔ اسماء خواتین کی نمائندہ کی حیثیت سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور دعا و سلام کے بعد عرض کیا:

اے اللہ کے سچے اور پیارے رسول! میرے ماں باپ آپ کی ذات اقدس پر قربان ہوں' میں مسلمان عورتوں کی طرف سے ایک پیغام لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔ اللہ نے آپ کو مرد و زن سب کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ ہم آپ کے ادنی فرماں بردار ہیں اور دل کی گہرائیوں سے آپ پر ایمان لائے ہیں۔

اے اللہ کے برگزیدہ رسول! ہم عورتوں میں اور مردوں میں بہت فرق ہے۔ عورتیں اپنے گھروں کی چار دیواری میں محصور رہتی اور مردوں کی اولاد کی نگہداشت کرتی ہیں۔ مرد جمعہ میں شرکت کرتے' نماز باجماعت ادا کرتے' جنازوں میں شریک ہوتے' حج پر جانے کی سعادت حاصل کرتے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جہاد میں شریک ہو کر اللہ کی راہ میں لڑنے اور درجہ شہادت پر فائز ہونے کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ لیکن عورتیں ان بنیادی فرائض کی ادائیگی سے محروم رہتی ہیں۔ وہ مردوں کی غیر حاضری میں ان کی اولاد کو پالتی' ان کے مال و دولت کی حفاظت کرتی' امور خانہ داری سرانجام دیتی' اور گھر بار کی نگہبانی کرتی ہیں۔ کیا عورتیں ان اہم کاموں کے ثواب میں جنھیں مرد سرانجام دیتے ہیں' شریک ہونے کا استحقاق نہیں رکھتیں؟

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسما رضی اللہ عنہا کی یہ باتیں خاموشی اور غور کے ساتھ سنتے رہے' جب وہ بات ختم کر چکیں تو آنحضرت نے صحابہ کی طرف عنان توجہ مبذول فرمائی اور فرمایا کیا دین کے متعلق تم نے کسی عورت کو ایسی گفتگو کرتے سنا ہے؟

صحابہ نے عرض کیا: ہمارے ذہن میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ کوئی عورت اس طرح کی صاف اور سلجھی ہوئی گفتگو کر سکتی ہے اور مردوں اور عورتوں کے نیکی سے متعلق حدود کار کو اس طرح تقسیم کیا جا سکتا ہے' ہمارے لیے یہ زاویہ نگاہ انوکھا اور نیا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسما سے مخاطب ہو کر فرمایا:

اگر عورت اپنے شوہر کی رضاجوئی کا خیال کرتی اور اس کی موافقت واطاعت کی حدود کو سمجھتی اور ان کا احترام کرتی ہے تو وہ بھی مرد کے برابر اجر و ثواب کی مستحق ہے۔

عورتوں کے اس وفد میں جس کی قیادت حضرت اسما کر رہی تھیں' ان کی خالہ بھی شریک تھیں جو سونے کے کنگن اور انگوٹھیاں پہنے ہوئے تھیں۔ آنحضرت نے

ان سے سوال کیا : اس زیور کی زکاۃ ادا کرتی ہو ؟

بولیں : نہیں۔

فرمایا : کیا یہ پسند کرتی ہو کہ خدا تمھیں آگ کے کنگن اور انگوٹھیاں پہنائے ؟

حضرت اسما رضی اللہ عنہا نے اپنی خالہ سے کہا خالہ یہ اتار دو' چنانچہ انھوں نے سارا زیور اتار ڈالا۔ اس کے بعد حضرت اسما نے عرض کیا یارسول اللہ ہم زیور نہ پہنیں گی تو شوہر کی نظر میں ہماری کوئی وقعت نہ رہے گی۔

فرمایا : چاندی کا زیور پہنو اور اس پر زعفران مل لو تاکہ اس میں سونے کی چمک اور جھلک پیدا ہو جائے۔

اس کے بعد بیعت کا وقت آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اطاعت دین کے بارے میں چند اقرار کرائے۔

حضرت اسما نے کہا یارسول اللہ ہم ان باتوں پر آپ کی بیعت کرتے ہیں : آپ اپنا ہاتھ بڑھائیے۔ ارشاد ہوا بس اقرار ہو گیا۔ میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا۔

یہاں کسی کے دل میں یہ شبہ نہیں ابھرنا چاہیے کہ عورتوں کے لیے سونے کے زیورات پہننا خلاف شریعت ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ سونے کے وہ زیورات پہننا حرام ہیں جن سے زکاۃ نہ ادا کی جاتی ہو' اگر زکوٰۃ ادا کی جاتی ہے تو پہننے میں کوئی حرج نہیں۔

حضرت اسما کی بہادری کے واقعات سیرت و تاریخ کی کتابوں میں مرقوم ہیں جن میں ایک واقعہ جنگ یرموک سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ ۱۵ ہجری میں حضرت عمر فاروق کے زمانے میں جنگ یرموک ہوئی۔ اس میں جو خواتین شامل تھیں ان میں حضرت اسما بنت یزید بھی تھیں۔ جنگ میں ایک موقعے پر عیسائی فوجی پیش قدمی کرتے ہوئے عورتوں کے خیمے تک پہنچ گئے۔ اس وقت حضرت اسما اور ان کی ساتھی خواتین نے خیموں کی چوبیں اکھاڑ کر دشمن فوجیوں پر حملہ کر دیا اور وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے۔ اکیلی حضرت اسما نے اس وقت روم کے نو عیسائی فوجیوں کو قتل کیا۔۔۔

یہاں یہ یاد رہے کہ جہاد بلا امتیاز مرد وزن ہر مسلمان پر فرض ہے۔ نقارہ جنگ پر چوٹ پڑ چکی ہو اور مسلمانوں کے لیے نفیر عام کا حکم ہو گیا ہو تو جو شخص پیچھے رہے گا اور میدان محاربہ میں اتر کر مخالفین اسلام سے نبرد آزما ہونے سے پہلو بچائے گا' اسے مجرم گردانا جائے گا۔ اسلام صرف مردوں کا مذہب نہیں' اس میں عورتیں بھی برابر کی حصے دار ہیں۔ جس طرح اسلام کی تابعداری مردوں اور عورتوں سب پر فرض ہے' اسی طرح اس کے تحفظ ودفاع کی ذمہ داریاں بھی مساوی طور سے سب پر عائد ہوتی ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ عورتیں پردہ نشین ہیں' لیکن اس کے باوجود اپنے اندر ایک پرجوش دل' اسلام کی سچی محبت کا مخلصانہ جذبہ اور شہادت کا پورا پورا شوق بھی رکھتی ہیں۔ کیا انھیں صرف اس بنا پر جہاد سے محروم رکھا جائے گا کہ وہ عورتیں ہیں۔

حضرت اسما کی اولاد اور سن وفات کا علم نہیں ہو سکا۔ کہتے ہیں جنگ یرموک کے کئی سال بعد تک زندہ رہیں۔

حضرت ام حکیم بنت حارث

عہد اسلام کی بہادر اور نامور خواتین میں ام حکیم بنت حارث کا نام بھی شامل ہے۔اس الولوالعزم خاتون نے قبول اسلام کے بعد جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ تاریخ کے سینے میں ہمیشہ محفوظ رہیں گے اور اہل اسلام انھیں اپنے لیے مشعل راہ قرار دیں گے۔

یہ خاتون عرب کے تین مشہور خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ ددھیال کی طرف سے خاندان قریش کی معروف شاخ بنو مخزوم سے وابستہ تھیں۔ان کے باپ کا نام حارث بن ہشام بن مغیرہ تھا۔ ننھیال کی طرف سے حضرت خالد بن ولید کے خاندان سے منسلک تھیں۔ماں کا نام فاطمہ بنت ولید تھا' یعنی یہ عرب کے بہادر اور جنگ جو خالد بن ولید کی بھانجی تھیں۔ باعتبار سسرال ابو جہل کے کنبے سے وابستہ تھیں۔ابو جہل ان کا چچا تھا اور یہ اس کے بیٹے کے رشتہ زوجیت سے منسلک تھیں۔اس طرح ننھیال ددھیال اور سسرال کی جانب سے ان کا تعلق عرب کے ان خاندانوں سے تھا جو عرب عوام میں عزت و توقیر کے مالک اور جرات و شمشیر زنی میں خاص شہرت کے حامل تھے۔

ام حکیم میں بھی وہ تمام خصوصیات جمع ہو گئی تھیں جو ان خاندانوں میں پائی جاتی تھیں۔ یہ اچھی تیر انداز' بہترین تیغ زن' مشہور جنگ جو اور اس دور کی حربی صلاحیتوں سے آگاہ تھیں۔ غزوہ احد ۳ ہجری میں ہوا تھا۔ یہ اس وقت تک شرف اسلام سے مشرف نہیں ہوئی تھیں۔ان کے ماموں خالد بن ولید اور شوہر عکرمہ بن ابو جہل بھی اس زمانے میں دولت اسلام سے محروم تھے۔ یہ لوگ اپنے دوسرے ساتھیوں سمیت مسلمانوں کے خلاف صف آرا تھے۔ام حکیم ان کے ساتھ احد کے میدان جنگ میں

موجود اور مسلمانوں کے خلاف شریک قتال تھیں- اس جنگ میں اہل اسلام کے خلاف خوب جم کر لڑی تھیں اور ان لوگوں کے متواتر و مسلسل اور زوردار حملوں سے مسلمانوں کے پاؤں میدان سے اکھڑ گئے تھے اور نتیجتاً مسلمانوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا- مخالفین اسلام میں اس فتح و کامرانی کی بہت خوشی منائی گئی تھی اور مسلمانوں کی ہزیمت کو عجیب و غریب رنگ میں پیش کیا گیا تھا- مسرت و شادمانی کے اس اظہار میں جو تاریخ میں مسلمانوں کے مقابلے پر پہلی مرتبہ کافروں کو حاصل ہوئی تھی' ام حکیم پیش پیش تھیں- لیکن یہ خوشی اور مسرت کا دور عارضی ثابت ہوا اور آگے چل کر مسلمانوں نے ان کو ہر میدان میں عبرت ناک شکستیں دیں اور تمام مشاہیر عرب اور مخالفین اسلام کے بازوئے شمشیر زن یا تو مارے گئے یا پھر اسلام کی پناہ میں چلے گئے- اس گروہ میں ام حکیم بنت ثابت بھی شامل ہیں' بلکہ قبول اسلام کے باب میں اپنے خاندان کے متعدد افراد سے انھیں اولیت حاصل ہے-

ام حکیم وہ خاتون ہیں' جس کی کفر و شرک کے سائے میں پرورش و پرداخت ہوئی تھی اور جس نے عمر کی تمام منزلیں مخالف اسلام عناصر کی رہنمائی میں طے کی تھیں اور جس کی تربیت ہی اس ماحول میں ہوئی تھی کہ اسلام اور مسلمانوں کو کسی حالت اور کسی اسلوب میں بھی برداشت نہیں کیا جائے گا-

اس کے بعد ایسے حالات ظہور میں آئے کہ کفر کا زور بالکل ٹوٹ گیا اور اسلام تقدم و ترقی کی نئی شاہراہوں پر گام زن ہو گیا- پھر مکہ فتح ہوا اور اسلام کی تاریخ ایک نیا موڑ کاٹ گئی- فتح مکہ کے سال ام حکیم کی فطری صلاحیتیں بیدار ہوئیں اور تمام عمر سایہ کفر میں رہنے کے بعد وہ اسلام کے ظل عاطفت میں آ گئیں' لیکن ان کا شوہر عکرمہ جس کی رگوں میں ابوجہل کا خون دوڑ رہا تھا' ابھی تک مسلمان نہیں ہوا تھا- وہ نہ صرف یہ کہ اسلام کی دولت بے پایاں سے بہرہ ور نہیں ہوا تھا بلکہ اس کا شدید مخالف تھا- مگر چونکہ حالات یکسر بدل چکے تھے اور مخالفوں میں مسلمانوں سے تاب مقابلہ باقی نہ رہی تھی' اس لیے عکرمہ جان بچا کر مکہ سے بھاگ گیا اور یمن چلا گیا- یہ چیز حضرت ام حکیم رضی

اللہ عنہا کے لیے نہایت وجہ کوفت اور قلبی رنج والم کا باعث تھی۔ اس لیے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں اور اپنے شوہر عکرمہ کے لیے عفوودرگزر کی درخواست کی اور عرض کیا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنے شوہر کو یمن سے مکہ مکرمہ لے آؤں' شوہر کے بغیر میں سخت پریشان ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن عفو نہایت وسیع تھا۔ آپ نے فوراً اجازت مرحمت فرمادی۔ چنانچہ حضرت ام حکیم رضی اللہ عنہا مکہ سے یمن کو روانہ ہوئیں اور عکرمہ کو اپنے ساتھ لے آئیں۔ مکہ آکر عکرمہ نے بھی اسلام قبول کر لیا اور وہ آئندہ اسلام کے بہت بڑے بہادر سپاہی ثابت ہوئے۔ جس شجاعت سے انھوں نے حالت کفر میں مسلمانوں کا مقابلہ کیا تھا' اس سے کہیں بڑھ کر حالت اسلام میں کافروں سے نبرد آزما ہوئے اور ہر معرکے میں پہلے سے زیادہ داد شجاعت دی۔

خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت اگرچہ مختصر ہے مگر اس میں جو جنگیں لڑی گئیں وہ نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ عہد صدیقی کی جنگ یرموک کا واقعہ تاریخ کا ایک عظیم واقعہ ہے۔ یہ جنگ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے آخری دور حیات یعنی جمادی الثانی ۱۳ ہجری میں لڑی گئی۔ اس میں حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ اپنی بیوی حضرت ام حکیم کے ساتھ شریک جنگ ہوئے۔ یہ جگہ ملک شام میں واقع ہے۔ اس میں حضرت عکرمہ رومیوں کے مقابلے میں انتہائی شجاعت سے لڑے اور آخر درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔

حضرت ام حکیم نے عدت پوری کی تو حضرت خالد بن سعید بن عاص رضی اللہ عنہ نے پیغام نکاح بھیجا۔ حضرت ام حکیم رضی اللہ عنہا نے توقف کیا تو انھوں نے کچھ لوگوں کی معرفت نکاح کے لیے مزید اصرار واشتیاق کا اظہار کیا۔ چنانچہ دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئے۔ یہ نکاح میدان جنگ میں دمشق کے قریب ایک مقام مدج الصفر میں ہوا تھا اور وہاں رومیوں کے حملے کا ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا۔ نکاح کا مہر چار سو دینار مقرر ہوا تھا۔

اس نکاح کے بارے میں تاریخ کی کتابوں میں یہ عجیب واقعہ مرقوم ہے کہ حضرت ام حکیم رضی اللہ عنہا نے بعد از نکاح رخصتی میں جب ذرا تاخیر کا مطالبہ کیا تو حضرت خالد بن سعید بن عاص نے کہا مجھے یقین ہے کہ میں اس جنگ میں شہید ہو جاؤں گا' اس لیے چاہتا ہوں رخصتی میں تاخیر نہ ہو- چنانچہ ایک پل کے قریب جو بعد میں قنطرہ ام حکیم کے نام سے موسوم ہوا اور اب تک اسی نام سے پکارا جاتا ہے' رخصتی اور رسم عروسی ادا ہوئی- صبح کو دعوت ولیمہ تھی- لوگ ولیمہ کھانے میں مصروف تھے کہ اچانک رومی لشکر آ پہنچا اور مسلمانوں پر بے خبری میں دھاوا بول دیا- مسلمانوں کی فوج نے جلد جلد مقابلے کی تیاری کی اور مدافعانہ جنگ کے لیے سینے تان کر کھڑے ہو گئے- حضرت ام حکیم رضی اللہ عنہا کے نئے شوہر حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ بھی تیزی سے اٹھے اور انتہائی بہادری سے رومیوں کا مقابلہ کیا اور لڑتے لڑتے رومیوں کی اگلی صفوں میں جا گھسے- رومیوں کی صفیں الٹ گئیں اور وہ ان کی مستعدی اور تیزی سے نہایت مرعوب اور خوف زدہ ہوئے- آخر خالد بن سعید رضی اللہ عنہ جام شہادت نوش کر گئے-

اب حضرت ام حکیم رضی اللہ عنہا کا کردار ملاحظہ ہو- اس جنگ کی تفصیلات لکھتے اور ام حکیم کی بہادری کا تذکرہ کرتے ہوئے الاستیعاب کے عالی منزلت مصنف نے لکھا ہے کہ حضرت ام حکیم اگرچہ حجلہ عروسی میں تھیں' تاہم وہ پردے سے اٹھ کر میدان میں نکل آئیں' کپڑے درست کر کے ایک خیمے کی بڑی سی چوب اکھاڑ لائیں اور انتہائی دلیری سے رومیوں پر ٹوٹ پڑیں- انھوں نے رومی سپاہ سے مخاطب ہو کر کہا:

> تم کمینے اور ناکارہ لوگ ہو- تمھاری بزدلی کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہو گا کہ تم چھپ کر اور بغیر اطلاع دیئے مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے ہو- کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اپنی اس چال میں کامیاب ہو جاؤ گے اور مسلمانوں کو زیر کر لو گے؟ ہرگز نہیں- جب تک مسلمانوں کی جان میں جان ہے' وہ اپنے اللہ اور رسول کے احکام کے پابند ہیں- تمھاری کامیابی کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے-

پابندیٔ اسلام مسلمانوں کی سب سے بڑی ڈھال ہے اور اسی میں ان کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔ یہ اپنی جانیں قربان کر دیں گے اور ایک ایک کر کے شہید ہو جائیں گے، لیکن تمھیں تمھارے مذموم عزائم میں کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ اپنی زندگی کی پروانہ مسلمان مردوں کو ہے نہ عورتوں کو --- یاد رکھو کامیابی انھی لوگوں کے لیے ہے جو موت کو زندگی پر ترجیح دیتے ہیں۔

مؤرخین اسلام نے لکھا ہے کہ حضرت ام حکیم رضی اللہ عنہا نے اس چوب سے سات رومیوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ ان کی تاریخ وفات اور بہن بھائیوں اور اولاد کے بارے میں معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔

خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا

خولہ بنت ثعلبہ بن اصرام بن فہر بن ثعلبہ بن غنم بن عوف---قبیلہ نبی عوف بن خزرج سے تعلق رکھتی تھیں- ان کا نکاح مشہور صحابی حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے بھائی حضرت اوس بن صامت سے ہوا تھا-

حضرت خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا باقاعدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت تھیں- نہایت پارسا اور متحمل مزاج خاتون تھیں- مسئلہ ظہار کے فیصلے کا تعلق انہی سے ہے- اسلام میں یہ پہلی خاتون ہیں جن کی وجہ سے ظہار کے مسئلے میں اللہ کی طرف سے بنیادی فیصلہ صادر فرمایا گیا-

بات یہ ہے کہ دور جاہلیت میں یہ رسم چلی آرہی تھی کہ جو شخص بیوی سے خفا ہو کر یا کسی اور وجہ سے ایک مرتبہ بیوی سے ظہار کر لیتا یعنی اسے اپنے لیے ماں کی طرح حرام قرار دے لیتا' وہ ہمیشہ کے لیے اس پر حرام ہو جاتی تھی اور ازدواجی تعلقات منقطع ہو جاتے تھے- اب نہ وہ اس کی بیوی رہتی تھی اور نہ وہ اس کا شوہر-

حضرت خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا کے شوہر حضرت اوس بن صامت رضی اللہ عنہ بوڑھے آدمی تھے- بڑھاپے کی وجہ سے مزاج میں تیزی آگئی تھی اور طبیعت پر خشونت کا غلبہ ہو گیا تھا- معمولی بات پر مشتعل ہو جاتے تھے اور قدم قدم پر تشدد پر اتر آتے تھے- یعنی چڑچڑا پن جو بڑھاپے کا خاصہ ہے' ان پر حاوی ہو گیا تھا- ایک دفعہ کسی بات پر بیوی سے ناراض ہوئے اور غصے سے مغلوب ہو کر زبان سے یہ لفظ نکال دیا کہ

انت علی کظھر امی

(یعنی تم مجھ پر میری ماں کی طرح حرام ہو)

بڑھاپے اور کمزوری کا غصہ بھی بوڑھا اور کمزور ہوتا ہے- ذرا سی دیر میں اتر گیا-

طبیعت میں سکون ہوا' اور خفگی کے آثار دور ہوئے تو بے حد نادم اور انتہائی پریشان ہوئے- بیوی سے ہم کلام ہونا چاہا تو جواب ملا اگرچہ آپ نے مجھے طلاق نہیں دی ہے تاہم جب تک اللہ اور اس کا رسول کوئی حکم نہیں صادر فرمائیں گے' میرے آپ کے باہمی علائق حرام ہی ٹھہریں گے اور میں آپ سے کوئی راہ ورسم نہیں رکھوں گی- اب معاملے کو سلجھانے کی صرف یہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں اور جو الفاظ زبان سے نکال چکے ہیں ان کے بارے میں آنحضرت سے فیصلے کی استدعا کریں-

انھوں نے بیوی سے کہا: مجھے اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاتے اور آپ کی خدمت میں کچھ عرض کرتے شرم آتی ہے- میں حضور کے سامنے کس منہ سے جاؤں اور کیا کہوں- تم ہی جاؤ' ممکن ہے' اللہ ہم پر نظر کرم فرمائے اور اپنے رسول پاک کی وساطت سے دوبارہ بحالیٔ تعلقات کی کوئی صورت پیدا ہو جائے-

چنانچہ خولہ رضی اللہ عنہا تیار ہوئیں اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے مکان پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں- آپ نے آنے کی وجہ دریافت کی تو بولیں:

اے اللہ کے رسول! آپ کو معلوم ہے اوس جو میرے شوہر ہیں' میرے چچازاد بھی ہیں اور مجھے بہت ہی محبوب ہیں- ان کی تیزی طبع' تند مزاجی اور ضعف و پیری سے بھی آپ اچھی طرح واقف ہیں- انھوں نے غصے کی حالت میں مجھے ایسی بات کہہ دی ہے جو میں حلفیہ کہتی ہوں کہ طلاق نہیں ہے- انھوں نے مجھے انت علی کظھر امی (یعنی' تم مجھ پر میری ماں کی طرح حرام ہو)--- کہا ہے-

آنحضرتؐ نے فرمایا:

"اب تو تم اس پر حرام ہو گئی ہو-"

آنحضرت کی زبان مبارک سے یہ لفظ سن کر حضرت خولہ رضی اللہ عنہا کو سخت صدمہ ہوا اور بڑی لجاجت اور منت سماجت کے انداز میں رسول اکرم سے جھگڑتی رہیں اور اس بات پر اصرار کرتی رہیں کہ ان الفاظ کو طلاق نہیں کہا جا سکتا- جب دیکھا کہ رسول

اکرم ان کے ہم نوا اور موید نہیں ہیں تو نہایت مایوس ہوئیں اور وہیں بیٹھے بیٹھے ہاتھ اٹھا کر اللہ سے ان الفاظ میں دعا مانگی۔

اے اللہ میں تیری بارگاہ میں حاضر ہو کر تجھ سے اپنی سب سے بڑی تکلیف اور اپنے شوہر اوس کی جدائی کے رنج و احساس کی شکایت کرتی ہوں۔ اے اللہ جو چیز ہمارے لیے تیری رحمت کا باعث ہو اسے اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان مبارک سے ظاہر فرما دے۔ میں ایک بے بس اور ناتواں عورت ہوں اور تیرے ہی فضل و کرم کی طلب گار۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا کہنا ہے کہ خولہ کی آنحضرت کے ساتھ گفتگو اور اللہ سے دعا و الحاح کا یہ منظر اس قدر دردناک تھا کہ میری اور میرے گھر کے تمام افراد کی ہمدردیاں خولہ کی طرف منتقل ہو گئیں اور اس کی تکلیف سے متاثر ہو کر بے اختیار ہماری آنکھوں میں آنسو جاری ہو گئے۔

اس کیفیت پر ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وہی کیفیت طاری ہو گئی جو نزول وحی کے وقت ہوا کرتی تھی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مسرت کے لہجے میں حضرت خولہ سے کہا:

خولہ اللہ کی طرف سے ابھی تمھارے متعلق فیصلہ ہو جائے گا۔

حضرت خولہ رضی اللہ عنہا کے لیے یہ وقت پہلے سے بھی زیادہ نازک تھا۔ وہ یاس و امید کی کش مکش میں مبتلا تھیں۔ خطرہ تھا کہ اوس کے یہ الفاظ طلاق کے حکم میں آ جائیں اور تفریق و جدائی کا حکم صادر ہو جائے۔ خولہ رضی اللہ عنہا سخت بے تابی کے عالم میں بیٹھی تھیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نگاہ اٹھائی۔ آپؐ کے لبوں پر تبسم کھیل رہا تھا' جسے دیکھ کر حضرت خولہ کی امید بندھی اور جذبات مسرت سے کھڑی ہو گئیں۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: خولہ اللہ نے تمھارا فیصلہ کر دیا ہے۔ پھر آپ نے آخر تک یہ آیت پڑھی جو ابھی ابھی بذریعہ وحی آپؐ پر اللہ کی طرف سے نازل ہوئی تھی۔

قد سمع الله قول التی تجادلك فی زوجها--- الی آخر الایته (سورہ مجادلہ)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اس عورت کی بات سن لی ہے جو آپ کے ساتھ اپنے شوہر کے بارے میں جھگڑ رہی تھی۔

چونکہ حضرت خولہ رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر اوس (رضی اللہ عنہ) کے مسئلے پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جھگڑا کیا تھا اور شوہر کے الفاظ کو طلاق سے تعبیر کرنے سے متعلق آنحضرت سے اظہار اختلاف کیا تھا' اس لیے اس سورہ کا نام ہی "مجادلہ" پڑ گیا اور اس کا آغاز انہی الفاظ سے ہوا۔

اس سورہ مبارکہ کی رو سے حضرت خولہ (رضی اللہ عنہا) کا یہ خطرہ دور ہو گیا کہ ان کے شوہر کے الفاظ طلاق کے مفہوم میں آتے ہیں۔ اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا مجاولہ اور جھگڑا سن کر جو حکم نازل فرمایا اس میں ان الفاظ کو حکم طلاق میں نہیں مانا گیا تھا اور چونکہ الفاظ اس لب ولہجہ سے ہٹے ہوئے تھے جس سے ایک شوہر بالعموم بیوی کو خطاب کرتا ہے' اس لیے شوہر پر کچھ کفارہ و جرمانہ عائد کیا گیا چنانچہ رسول اکرم نے حضرت خولہ سے کہا:

خولہ جاؤ اپنے شوہر سے کہو کہ ایک لونڈی یا غلام آزاد کریں

خولہ نے عرض کیا: اے اللہ کے پیارے نبی کسے آزاد کریں' بخدا ان کے پاس نہ کوئی غلام ہے' نہ لونڈی اور نہ میرے سوا کوئی خادم۔

رسول اکرم نے فرمایا: اچھا تو مسلسل ساٹھ روزے رکھیں۔

خولہ نے جواب دیا: واللہ وہ اس کی بھی طاقت نہیں رکھتے۔ وہ بہت ہی کم زور آدمی ہیں۔ دن میں تھوڑی تھوڑی مقدار میں کئی کئی بار کھاتے ہیں۔ نہ بھوک برداشت کر سکتے ہیں' نہ پیاس۔ ضعف جسم کے ساتھ ان کی بینائی بھی جواب دے رہی ہے۔

رسول خدا نے فرمایا: تو پھر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائیں۔

خولہ نے کہا: حضور وہ غریب و نادار آدمی ہیں' ان سے تو یہ بھی ممکن نہیں۔
رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: اچھا ان سے کہو کہ ام المنذر بن قیس کو بلا لائیں اور ان سے بار شتر کھجوریں لے کر ساٹھ مسکینوں پر صدقہ کر دیں۔
خولہ حضور کو سلام کر کے رخصت ہوئیں' گھر پہنچیں تو دروازے پر شوہر کو منتظر پایا۔ بے تابی سے پوچھا: کہو خولہ کیا ہوا؟
جواب دیا: آپ خوش نصیب ہیں' رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ام المنذر بن قیس کو ساتھ لیتے آؤ اور ان سے بار شتر کھجوریں لے کر ساٹھ مسکینوں پر صدقہ کرو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور حضرت اوس رضی اللہ عنہ نے اپنی اس قسم یا ظہار کا کفارہ ادا کر دیا۔

یہ سارا واقعہ تفاسیر اور احادیث و سیر کی تمام کتابوں میں مذکور ہے۔
اس واقعہ اور نزول سورہ کے بعد تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے دلوں میں حضرت خولہ رضی اللہ عنہا کی عزت و توقیر اور احترام و اکرام میں بہت ہی اضافہ ہو گیا تھا' بالخصوص خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ان کی انتہائی تکریم کرتے تھے چنانچہ اسد الغابہ میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت سے لوگوں کے ساتھ کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں حضرت خولہ رضی اللہ عنہا سے ملاقات ہو گئی۔ آپ وہیں رک گئے اور دیر تک ان سے محو گفتگو رہے۔ آپ کے ساتھیوں میں سے ایک شخص نے اکتا کر کہا۔

یا امیر المومنین اس بڑھیا نے آپ کو روک لیا اور ہم سب لوگ اس کی طویل گفتگو سے تنگ آ گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خشم گین نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور کہا تمھیں معلوم ہے یہ بڑھیا کون ہے؟ یہی وہ بلند بخت عورت ہے جسے یہ فخر حاصل ہے کہ اس کی صدائے درد اللہ نے عرش معلی پر سنی۔ یہ خوش نصیب اور معزز و محترم خاتون خولہ بنت ثعلبہ ہے جس کے بارے میں یہ آیۂ مبارکہ **قد سمع الله قول التي** نازل ہوئی۔ اگر یہ شب بھر مجھے روکے رکھتی تو میں اس کی خدمت میں کھڑا

رہتا- اس اثنا میں سوائے نماز کے کوئی کام نہ کرتا' صرف اسی سے مصروف گفتگو رہتا-
افسوس ہے اس بلند مرتبت خاتون سے متعلق اس سے زیادہ حالات معلوم نہیں ہو سکے-

حضرت سمیہ بنت خباط

جب مکہ کی خشک پہاڑیوں اور بے آب و گیاہ وادیوں میں اسلام کی صدائے حق بلند ہوئی تو اس کی اثر انگیزیوں کی وسعت نے پورے جزیرہ نمائے عرب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بچے' بوڑھے' جوان' غلام' آزاد مرد و زن' سب اس کے جھنڈے تلے جمع ہونے اور اس طرح دوڑ کر اس کی آغوش میں پناہ لینے لگے کہ گویا بڑی بے تابی اور اضطراب سے اس کی آمد کے منتظر تھے۔ قبول اسلام کے وقت ان پر جو کیفیات طاری ہوتی تھیں' ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ لوگ معصیت کی کثرت سے اکتا چکے ہیں' ارتکاب گناہ کی بے پناہیوں نے ان کو نڈھال کر ڈالا ہے اور ایک عرصہ دراز تک کفر و شرک کی تاریکیوں میں غرق رہنے کے بعد وہ نور و ضیا کی تلاش میں ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کے نظر و بصر اور قلب و ضمیر کی ظلمت دور ہو اور اس کی جگہ ان کے اندر روشنی کے چشمہ ہائے صافی ابلنے لگیں۔

یہ جذبہ بلا استثنا مردوں اور عورتوں سب میں پایا جاتا تھا۔ جو لوگ اس جذبہ صادقہ اور عاطفہ صحیحہ سے محروم تھے اور جن کے دلوں پر ظلمت و تاریکی کی مہریں ثبت تھیں' ان کی تعداد روز بروز کم ہو رہی تھی۔ ان کے ناروا اور غیر پسندیدہ گفتار و کردار کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ لوگ کے دلوں میں ان کا وقار ختم ہو چکا تھا۔ ان کی عام حیثیت اور لوگوں میں شہرت و تعارف کی جو نوعیت تھی' وہ ظالم و ستم رانوں سے زیادہ نہ تھی۔ عوام ان کی ایذا رسانیوں سے گلو خلاصی کے لیے بے تاب تھے۔ ان کی گرفت ظلم اگرچہ مضبوط تھی' لوگوں کی گردنوں پر انھوں نے اپنی الم ناکیوں کے پنجے گاڑ دیے تھے اور اسلام کی تبلیغ و ترویج اور نشر و اشاعت کے راستے میں یہ لوگ بہت بڑی رکاوٹ تھے' مگر لوگ اسلام کی طرف برابر دوڑے چلے آ رہے تھے اور خاندانوں کے خاندان اس کے

حلقے میں داخل ہو رہے تھے-ان خاندانوں میں سمیہ بنت خباط کا خاندان خاص اہمیت کا حامل ہے-اس خاندان کے افراد عرب کے نحیف وکمزور لوگ تھے اور غلامانہ زندگی بسر کرتے تھے- لیکن انھوں نے اپنے آقاؤں کی بے پناہ سختیوں کے باوصف اسلام قبول کیا اور پھر اس کی تعلیمات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جس نسبت سے ان پر تشدد کیا جاتا تھا' اسی نسبت سے یہ اسلام میں پختہ اور مضبوط ہوتے جاتے تھے اور اس کی جڑیں ان کے دلوں میں گہری ہوتی جاتی تھیں-اس خاندان کے تفصیلی حالات معلوم نہیں ہو سکے-جو کچھ معلوم ہو سکا ہے' وہ اگرچہ بہت مختصر ہے تاہم اس کو تاریخ اسلام کے دور آغاز کے ایک اہم باب کی حیثیت حاصل ہے-

حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا خباط کی بیٹی حضرت عمار بن یاسر کی والدہ اور ابو حذیفہ بن مغیرہ مخزومی کی کنیز تھیں- ظہور اسلام کے وقت یہ بوڑھی ہو چکی تھیں-جوں ہی صدائے اسلام سے ان کے کان آشنا ہوئے فوراً مسلمان ہو گئیں-ان کے ساتھ ان کا بیٹا عمار اور شوہر یاسر بھی حلقہ بگوش اسلام ہو گئے' رضی اللہ عنہم-

یہ لوگ اگرچہ بہت سے لوگوں کی بہ نسبت پسماندہ اور معاشرتی اعتبار سے کم زور تھے' تاہم انھوں نے اپنے اسلام کو مخفی نہیں رکھا اور جس صدائے حق سے متاثر ہوئے تھے' اس کا برملا اعلان اور عوام میں اس کی حقانیت کا اظہار کیا-ان کی یہ تبلیغ اسلام اور اس کا اظہار و اعلان تمام مخالفین اسلام بالخصوص خاندان مغیرہ کے لیے بہت بڑا چیلنج تھا-وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کی کنیز اور اس کا بیٹا اور شوہر اس جرات کا مظاہرہ کریں اور علی الاعلان ان کی کافرانہ غیرت وحمیت کو للکاریں-

اب قبول اسلام کے بعد حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا اور ان کا مختصر کنبہ قریش کے دردناک مظالم کا شکار تھا- کفار نے ان کو دوبارہ کفر و شرک کی آلودگیوں میں مبتلا کرنے کی کوشش کی' مگر انھوں نے صاف انکار کر دیا- سختیاں بھی کی گئیں' اس کا بھی ان پر کوئی اثر نہ ہوا---سمیہ جیسے جیسے اظہار اسلام میں بے باک ہوتی جاتی تھیں کافروں کے ظلم وستم کی حدود بڑھتی اور پھیلتی جاتی تھیں-ان پر اس درجہ شدید ظلم ڈھائے گئے

کہ انھیں دوپہر کے وقت مکے کی آگ کی مانند جلتی اور تپتی ہوئی ریت پر لوہے کی بوجھل زرہ پہنا کر دھوپ میں کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ لیکن ان کے عزم واستقلال کے سامنے یہ آتش کدہ اور آہن و آگ کا یہ جہنم بالکل ٹھنڈا پڑ جاتا اور اپنا اثر حدت کھو بیٹھتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادھر سے گزرتے اور حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا اور ان کے بیٹے عمار اور ان کے شوہر یاسر کو مظالم کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے دیکھتے تو آہ بھر کر فرماتے :

"آل یاسر! صبر کرو' ان مصائب کے عوض تمھارے لیے جنت مقدر ہو چکی ہے۔"

حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا دن بھر مظالم و مصائب کے ان شکنجوں میں جکڑی رہتیں' شام کو جب ریت ٹھنڈی ہو جاتی تو وہ گھر لوٹتیں' رات قدرے آرام سے گزرتی تو صبح کو پھر وہی سلسلہ عقوبت شروع ہو جاتا۔

ایک شام دن بھر مبتلائے عذاب رہنے کے بعد حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا اپنے گھر واپس آرہی تھیں کہ راستے میں ابوجہل مل گیا' اس نے حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو دیکھا تو آپے سے باہر ہو گیا۔ جوش غضب میں اس پاک باز خاتون کو گالیاں بکنے لگا' لیکن وہ پیکر صبر و رضا بالکل خاموش رہیں اور بہ دستور گھر کی طرف قدم بڑھاتی رہیں' ان کی اس بے نیازی اور خاموشی سے ابوجہل اور برافروختہ ہو گیا اور اس زور سے ان کی طرف برچھی چلائی کہ برچھی کھاتے ہی حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

ان کے بیٹے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو اپنی والدہ کی اس مظلومانہ موت کا علم ہوا تو نہایت غم گین ہوئے اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ اب تو مسلمانوں پر کافروں کے مظالم انتہا کو پہنچ گئے ہیں۔

آپؐ نے ان کو صبر کی تلقین کی اور اللہ سے آل یاسر کے لیے ان الفاظ میں دعا فرمائی :

اللھم لاتعذب احد امن آل یاسر بالنار۔

(اے اللہ خاندان یاسر کے کسی فرد کو عذاب دوزخ میں مبتلا نہ کرنا۔)

حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کی شہادت کے بعد جنگ بدر کا معرکہ گرم ہوا، جس میں کافروں کو ذلت آمیز شکست ہوئی اور ابو جہل مارا گیا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمار رضی اللہ عنہ سے کہا

قتل اللہ قاتل امك۔

(اللہ تعالی نے تمھاری ماں کے قاتل کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے)

اسلام قبول کرنے والوں میں حضرت سمیہ کا ساتواں نمبر ہے اور مسلمان مردوں اور عورتوں میں یہ پہلی ذی عزم اور خوش بخت خاتون ہیں جو درجہ شہادت پر فائز ہوئیں۔

حضرت خنساء رضی اللہ عنہا

"جب تم دیکھو کہ لڑائی پورے زور سے شروع ہو گئی ہے' آتش جنگ کے شعلے چاروں طرف بھڑکنے لگے ہیں اور اس کے خوف ناک شرارے پوری طاقت سے میدان محاربہ میں پھیل گئے ہیں تو لڑائی میں کود پڑو' بے جگری سے لڑو' شمشیر خاراشگاف کو ہاتھ میں تھام کر دشمنان اسلام کی بیخ کنی کرتے ہوئے مسلسل آگے بڑھتے جاؤ اور فتح و کامرانی کے لیے آخری سہارا اللہ کی ذات اقدس کو سمجھو' ان شاء اللہ ضرور کامیابی سے ہم کنار ہو گے۔ دشمن کے مقابلے میں میدان جنگ میں جیت جانا بھی کامیابی ہے اور درجہ شہادت پر فائز ہو جانے کو بھی فتح و نصرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جاؤ ان دو نعمتوں میں سے جو بھی حاصل کر سکتے ہو کر لو' میں تمھاری وجہ سے اسلام کی سربلندی کی خواہاں ہوں۔"

یہ وہ الفاظ ہیں جو عرب کی مشہور شاعرہ خنساء نے اپنے چاروں بیٹوں کو قادسیہ کے محاذ جنگ پر روانہ کرتے ہوئے کہے۔

خنساء کا اصلی نام تماضر تھا چونکہ بڑی چست' بڑی مستعد' تیز طرار اور ذہین و خوب رو خاتون تھیں' اس لیے خنساء کے لقب سے معروف ہوئیں جس کے معنی ہرنی کے ہیں۔ نجد کی رہنے والی تھیں۔ سلسلہ نسب یہ ہے: خنساء بنت عمرو بن الشرید بن رباح بن یقظہ بن عصیتہ بن خفاف بن امراء القیس۔ قبیلہ قیس کے خاندان بنو سلیم سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس خاتون کے دو نکاح ہوئے۔ پہلا بنو سلیم کے ایک شخص رواحہ بن عبدالعزیز سے ہوا۔ اس کے انتقال کے بعد دوسری مرتبہ مرداں بن ابو عامر کے عقد میں آئیں۔ پہلے شوہر سے ایک لڑکا عبداللہ پیدا ہوا۔ دوسرے شوہر سے دو

لڑکے یزید اور معاویہ اور ایک لڑکی عمرہ پیدا ہوئی۔

عرب کی اس نامور اور مشہور شاعرہ کا سلسلہ نسب ساتویں پشت سے عرب کے شہرہ آفاق شاعر امراء القیس سے جاملتا ہے۔خنساء کی شاعری کی بڑی دلچسپ داستانیں تاریخ وسیرت کی مستند کتابوں میں مرقوم ہیں اور بڑے بڑے جلیل القدر شاعروں نے اس کی عظمت شعری کا لوہا مانا اور فصاحت وبلاغت کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔جریر عہد بنوامیہ کا مشہور شاعر تھا جو ۱۱۰ ہجری میں فوت ہوا۔اس سے جب پوچھا گیا کہ عرب کا سب سے بڑا شاعر کون ہے؟ تو اس نے جواب دیا اگر خنساء کے اشعار میری نظر سے نہ گزرتے تو میں عرب کا بہت بڑا شاعر ہونے کا دعویٰ کرتا۔

اسد الغابہ میں لکھا ہے کہ ناقدان سخن کا یہ فیصلہ ہے کہ خنساء کے مرتبے کی نہ کوئی عورت شاعرہ پیدا ہوئی ہے' نہ ہوگی۔

بشار عرب کا ایک عظیم شاعر گزرا ہے' اس کا کہنا ہے کہ میں عورتوں کے اشعار غور سے پڑھتا ہوں تو ان میں کوئی نہ کوئی کمزوری ضرور پاتا ہوں۔لوگوں نے پوچھا کیا خنساء کے اشعار میں بھی کمزوری پائی جاتی ہے؟ کہا نہیں۔وہ تو مردوں سے بھی بلند درجے کے شعر کہتی ہے۔

لیلیاء اخیلیہ کو شعرائے عرب نے متفقہ طور پر فن شعر گوئی میں تمام عورتوں پر ترجیح دی تھی' لیکن جب خنساء کے اشعار سامنے آئے تو یہ درجہ فضیلت خنساء کو حاصل ہوگیا۔

دور جاہلیت میں اہل عرب میں یہ دستور چلا آرہا تھا کہ مختلف مقامات پر شعرو شاعری کی مجلسیں آراستہ کرتے تھے۔ان مجلسوں میں مرد اور عورتیں برابر کی سطح پر حصہ لیتے تھے۔ربیع الاول کے مہینے میں جب کہ موسم بہار کا آغاز ہوتا تھا' یہ مجلسیں جمنا شروع ہو جاتی تھیں' اس ضمن کی پہلی مجلس دولتہ الجندل میں ہوتی۔اس کے بعد سوق ہجر میں' پھر عمان میں' پھر حضرت موت میں' پھر صنعا میں اور پھر جب ذیقعدہ کا مہینہ شروع ہو جاتا اور لوگ حج کے لیے مکہ مکرمہ کی طرف آنا شروع ہو جاتے تو مکے سے چند

میل کے فاصلے پر سوق عکاظ میں آخری مجلس آراستہ ہوتی۔ اس میں تمام عرب قبائل کے سردار اور سر کردہ لوگ حاضر ہوتے اور اگر کسی وجہ سے کوئی سردار حاضری دینے سے معذور ہوتا تو اپنا نمائندہ بھیج دیتا۔ اس میں اہل عرب کے بڑے بڑے فیصلوں کو آخری شکل دی جاتی تھی اور تمام شعرائے عرب اپنا کلام سناتے تھے' جس میں اپنی شجاعت وبسالت' فیاضی وسخاوت اور اپنے آباواجداد کے کارنامے بیان کیے جاتے تھے۔ یہاں شعرا کو ان کی قابلیت کے مطابق انعامات دیے جاتے اور ان کے درجات ومراتب مقرر کیے جاتے تھے۔

خنساء بھی ہر سال باقاعدہ ان مجالس میں شریک ہوتی تھی اور اس کے مرثیے بے نظیر سمجھے جاتے تھے۔ جب وہ اپنے اونٹ پر سوار ہو کر آتی تو تمام شعرا اس کے گرد حلقہ باندھ لیتے اور اس کے اشعار سننے کے لیے بے قرار ہو جاتے۔ وہ اپنے شعر سناتی اور مرثیے پڑھتی تو لوگ جھوم جھوم جاتے اور خوب داد دیتے۔ خنساء کو اس مجلس شعرا میں یہ امتیاز اور فخر حاصل تھا کہ اس کے خیمے کے دروازے پر ایک علم نصب کیا جاتا' جس پر ارثی العرب لکھا ہوتا تھا' یعنی یہ عرب کی سب سے بڑی مرثیہ گو شاعرہ ہے۔

عرب کا ایک بہت مشہور شاعر زیاد بن معاویہ گزرا ہے' جس کی کنیت ابوامامہ تھی اور وہ نابغہ ذبیانی کے نام سے مشہور تھا۔ کثرت شعر گوئی اور نکتہ رسی کی وجہ سے اسے نابغہ کہا جاتا تھا۔ وہ خنساء کے اشعار بہت پسند کرتا اور اسے کھل کر داد دیتا۔ اس نے خنسا سے کہا تم اس وقت جنوں اور انسانوں کی مخلوق میں بہت بڑی شاعرہ ہو۔ تمھارے جیسی سخن ور آج تک پیدا نہیں ہوئی۔

خنساء کے دو بھائی تھے جو اس سے عمر میں بڑے تھے۔ ایک کا نام معاویہ تھا' ایک کا صخر ان کے والد کا نام عمرو تھا جو قبیلہ بنو سلیم کا رئیس تھا اور اپنے قبیلے میں بڑی وجاہت و عزت کا مالک تھا۔ وہ خنساء کے عالم جوانی کو پہنچنے سے پہلے ہی فوت ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے بھائیوں نے اپنی اس چھوٹی بہن کی اس طرح تربیت کی کہ باپ کی وفات کا صدمہ اس کے دل سے نکل گیا۔

والد کی وفات کے بعد اس کی شادی اس کے قبیلے کے ایک شخص عبدالعزیٰ (ایک روایت کے مطابق رواحہ بن عبدالعزیٰ) سے ہوئی۔اس سے خنسا کا ایک بیٹا پیدا ہوا' جس کا نام ابو شجرہ 'عبداللہ رکھا گیا تھا۔ عبدالعزیٰ شادی سے تھوڑا عرصہ بعد فوت ہو گیا تھا۔ پھر وہ اسی قبیلے کے ایک شخص مرداس بن بن ابو عامر کے عقد میں چلی گئی۔ اس سے تین بیٹے پیدا ہوئے' ان کے نام علی الرتیب یہ تھے: عمرو' زید اور معاویہ۔ ایک لڑکی پیدا ہوئی' اس کا نام عمرہ تھا۔ اس کے بعد خنساء نے شادی نہیں کی' شعر و شاعری ہی کو اس نے اپنا مشغلہ قرار دے لیا۔

پھر حالات نے ایسی کروٹ لی کہ وہ عرب کی بہت بڑی مرثیہ گو ہو گئی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ عکاظ کے میلے میں اس کے بھائی معاویہ کا قبیلہ بنو مرہ کے ایک شخص ہاشم بن حرملہ سے جھگڑا ہو گیا۔ اس نے ہاشم سے انتقام لینے کے لیے اپنے چند ہم نواؤں کے ساتھ بنو مرہ کے قبیلے پر حملہ کر دیا۔ فریقین میں لڑائی ہوئی تو ہاشم کے بھائی درید نے معاویہ کو قتل کر دیا۔ پھر معاویہ کے بھائی صخر نے اس کا بدلہ لینے کا عزم کیا اور نتیجتاً درید کو قتل کر دیا۔ اس سے کچھ عرصہ بعد اس نے درید کے بھائی ہاشم کو بھی موت کا لقمہ بنا دیا۔ ان کے قتل کے بعد صخر کا غصہ ختم نہیں ہوا' وہ برابر قبیلہ بنو مرہ کے لوگوں پر حملے کرتا رہا۔ بنو مرہ کا حلیف قبیلہ بنو اسد تھا۔ موقع پا کر بنو اسد کے ایک شخص فقعس نے صخر پر حملہ کر کے اسے شدید زخمی کر دیا۔ خنساء نے بھائی کا بہت علاج کرایا۔ مگر کوئی علاج کارگر نہ ہو سکا اور وہ مر گیا۔ خنساء کو بھائی کی موت کا شدید صدمہ پہنچا اور اس صدمے نے مرثیہ گوئی کی شکل اختیار کر لی۔ پھر اس کی مرثیہ گوئی نے بے حد شہرت پائی۔ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ اس دور کے تمام عرب شعرا نے اس کی فصاحت و بلاغت کا لوہا مانا اور اس کی قادر الکلامی کے آگے سر عجز جھکا دیا۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ بھائی کی موت پر خنساء کے جذبات کا بند ٹوٹ گیا اور شدتِ غم نے ایسے مرثیے کی شکل اختیار کر لی کہ اسے سن کر تمام عرب میں اس پر اظہار افسوس کیا گیا۔ جب خنساء کی دردناک آواز فضا میں گونجی تو سننے والوں پر سکتے

کا عالم طاری ہو جاتا-وہ صخر کی قبر پر کھڑے ہو کر ایسے دل سوز اور جاں گداز لہجے میں مرثیہ پڑھتی کہ معلوم ہوتا دنیا کی ہر شے غم واندوہ میں ڈوبی ہوئی ہے-مرثیے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں-

اعيني جودا و لا تجمدا　　الا تبكيان الصخر الغدى
الا تبكيان الجرى الجميل　　الا تبكيان الفتى السيدى
طويل النجاد عظيم الرماد　　وساد عشرته امردا
اذا القوم مدوا بايديهم　　الى المجد مداليه يدا
فنال الذى فوق ايديهم　　الى المجد ثم مضى سعدا

اب ان اشعار کا ترجمہ سنیے!

اے میری دونوں آنکھو! خوب سخاوت کرو' بخیل نہ بن جاؤ' کیا تم صخر پر نہیں روؤ گی جو بہت بڑا سخی تھا-

کیا تم ایک دلیر اور خوب صورت شخص پر ماتم نہیں کرو گی-

کیا تم اس سردار پر آنسو نہیں بہاؤ گی جو بلند و بالا تھا اور اونچے مرتبے کا مالک تھا-

وہ چھوٹی عمر ہی میں اپنے قبیلے کا رہنما اور قائد مقرر ہو گیا تھا-

جب اس کے قبیلے نے ہاتھ دراز کیے تو اس نے بھی کر دیے-

پھر اس نے وہ عزت حاصل کر لی جو ان لوگوں کے ہاتھوں سے بلند تر تھی-

اور وہ اسی سعادت و عزت کی حالت میں دنیا سے رخصت ہو گیا-

ایک طویل مرثیے کا ایک شعر ملاحظہ ہو

الا يا صخر ان ابكيت عينى　　فقد اضحكتنى زمنا طويلا

اے صخر! اگر تو نے میری آنکھوں کو رلایا ہے تو کیا ہوا' ایک عرصہ دراز تک تو نے ان کو ہنسایا بھی تو ہے-

یہاں ایک دلچسپ واقعہ سنتے جایئے-زمانۂ جاہلیت کے عربوں کے عکاظ کے میلے میں اس دور کا بہت بڑا شاعر نابغہ ذبیانی بڑی شان سے آیا کرتا تھا' وہ عرب کے تمام

شاعروں میں انفرادیت میں مشہور تھا۔اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ سرخ رنگ کا شان دار خیمہ اس کے لیے نصب کیا جاتا تھا۔ بڑے بڑے شعرا اس کے سامنے سر جھکا کر بیٹھتے اور اپنا کلام سنانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔خنساء پہلی دفعہ اس میلے میں آئیں اور اسے اپنا کلام سنایا تو نہایت متعجب ہوا' اور کہا بلا شبہ تو عورتوں میں بہت بڑی شاعرہ ہے۔اگر میں نے اس سے پہلے ابو بصیر (یعنی اعشٰی) کے اشعار نہ سنے ہوتے تو تمھیں اس عہد کے تمام شعرا سے بہتر قرار دیتا ہے۔

منقول ہے کہ اس وقت حضرت حسان بن ثابت بھی وہاں موجود تھے' جنھیں دورِ جاہلیت میں بھی عرب شعرا نے عظیم شاعر گردانا تھا اور پھر زمانہ اسلام میں انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مداحی میں جو اشعار کہے' ان کا تو اسلامی تاریخ کی شاعری میں کوئی جواب ہی نہیں۔

انھوں نے نابغہ ذبیانی کی زبان سے خنساء کے اشعار کی تعریف سنی تو طیش میں آ گئے اور کہا: ''میں خنساء سے بہتر شعر کہتا ہوں۔''

نابغہ ذبیانی نے یہ الفاظ سن کر حسان سے تو کچھ نہیں کہا' البتہ خنساء کی طرف دیکھا۔

خنساء نے حسان سے کہا: ''آپ اپنے قصیدے کے جس شعر کو سب سے زیادہ بہتر قرار دیتے ہیں' وہ پڑھیے۔''

حسان نے فوراً شعر پڑھا جو ان کے نزدیک سب سے اچھا تھا۔

لنا الجفنات الغر یلمعن فی الضحی و اسیافنا یقطون من نجدۃ دما

یعنی ہمارے پاس بڑے بڑے صاف شفاف برتن ہیں جو چاشت کے وقت چمکتے ہیں اور ہماری تلواریں بلندی سے خون ٹپکاتی ہیں۔

شعر سن کر خنسا نے کہا: ''یہ شعر سات مقامات پر بلندی سے گر گیا ہے''۔۔۔ اب وہ ان مقامات کی نشان دہی کرتی ہیں۔

۱۔ ''جفنات'' کا لفظ دس سے کم پر بولا جاتا ہے' اس کی جگہ مناسب لفظ

"جفان" تھا۔

۲۔ "غر" کے معنے ہیں' پیشانی کی سفیدی۔اس کے بجائے "بیض" ہوتا تو زیادہ بہتر تھا۔

۳۔ "یلمعن" عارضی چمک کو کہا جاتا ہے۔ یہاں "یشرقن" ہوتا تو بہت مناسب رہتا' اس لیے کہ "لمعان" کی بہ نسبت "اشراق" زیادہ دیرپا ہے۔

۴۔ "الضحیٰ" سے "الدجی" زیادہ موزوں تھا' کیوں کہ روشنی' سیاہی میں زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔

۵۔ "اسیاف" کا اطلاق جمع قلت پر ہوتا ہے۔اس کے بجائے "سیوف" استعمال کرنا چاہیے تھا۔

۶۔ "یقطرن" میں وہ خوبی نہیں پائی جاتی جو "یسلن" میں پائی جاتی ہے' لہٰذا یقطرن کے بجائے یسلن زیادہ مناسب تھا۔

۷۔ "دم" کی جگہ "دماء" ہونا چاہیے تھا' اس لیے کہ اس میں "کثرت" کے معنے پائے جاتے ہیں۔

حضرت حسان نے خنساء کے یہ اعتراضات سنے اور خاموش رہے۔

خنساء کے ادب و شعر کے بارے میں بہت سی باتیں اسلامی تاریخ کی کتابوں میں مرقوم ہیں' جن میں بعض پہلے گزر چکی ہیں' کچھ ذیل میں بیان کی جاتی ہیں۔

۱۔ جریر جو ۱۱۰ ہجری میں فوت ہوا' دور بنو امیہ کا معروف و ممتاز شاعر تھا۔ اس سے کسی نے پوچھا:

"اس وقت عرب کا سب سے بڑا شاعر کون ہے؟"

جواب دیا: "اگر خنساء نہ ہوتی تو عرب کا سب سے بڑا شاعر میں تھا۔"

۲۔ بشار بن بردنہ ایک عظیم شاعر تھا۔اس کا کہنا ہے کہ میں عورتوں کے اشعار دیکھتا ہوں تو ان میں کوئی نہ کوئی نقص ضرور پاتا ہوں۔اس سے پوچھا گیا:

"کیا خنساء کے اشعار میں بھی کوئی نقص پایا جاتا ہے؟"

بولا: وہ تو شعر گوئی اور حسن کلام میں مردوں سے بھی بازی لے گئی ہیں۔

۳- عبد بنو امیہ کا ایک شاعر اخطل تھا جسے نابغہ ذبیانی کے مرتبے کا شاعر سمجھا جاتا تھا۔ وہ خلیفہ عبدالملک بن مروان کے دربار میں حاضر ہوا اور ان سے قصیدہ مدحیہ پیش کرنے کی اجازت طلب کی۔ عبدالملک نے کہا: تمھارا مقصد بہادری اور بے خوفی میں مجھے شیر، سانپ اور چیتے وغیرہ سے تشبیہ دینا ہے تو میں اس قسم کے شعر سننا نہیں چاہتا۔ البتہ اگر خنساء کی طرح کے اشعار سنانا چاہتے ہو تو ضرور سناؤ۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خنساء کب پیدا ہوئیں؟ کہاں پیدا ہوئیں؟ عرب کے کس قبیلے اور علاقے سے ان کا تعلق تھا اور کب مسلمان ہوئیں؟

ان سوالات کا جواب یہ ہے کہ خنساء نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے کم و بیش پچاس برس قبل پیدا ہوئیں۔ قبیلہ بنو سلیم کی رکن تھیں جو علاقہ نجد میں واقع تھا اور سخاوت وجودت اور شجاعت وبسالت میں عرب کا مشہور قبیلہ تھا اور بنو قیس بن عیلان کی شاخ تھا۔ قبیلہ بنو قیس بن عیلان کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ہر قوم کی ایک پناہ گاہ ہوتی ہے' عرب کی پناہ گاہ قیس بن عیلان ہے۔ آنحضرت کے اس ارشاد کا مطلب بالکل واضح ہے کہ عرب کے جن لوگوں کو کسی قسم کی کوئی ضرورت پیش آئے وہ مالی ضرورت ہو یا امداد و نصرت کے لیے افراد کی ضرورت ہو' وہ قبیلہ قیس بن عیلان کے پاس چلے جائیں اور ان سے اپنی ضرورت بیان کریں وہ لازماً ان کی امداد کرتے ہیں۔

اسلام کی آواز جب علاقہ نجد میں پہنچی اور خنساء کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا پتا چلا اور معلوم ہوا کہ آنحضرت اور آپؐ کے صحابہ کرام مکے سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے ہیں تو انھوں نے اپنے قبیلے کے کچھ لوگوں سے بات کی اور مدینہ منورہ پہنچ گئیں۔ آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ آپ سے گفتگو کی۔ وہ بولتی گئیں اور آنحضرت سنتے رہے۔ دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ آنحضرت ان کی ہر بات پر خوش ہوتے' انھیں داد دیتے اور ان کے

اندازِ کلام کی تحسین فرماتے۔

آنحضرت سے بات چیت کے بعد انھوں نے اسلام قبول کر لیا اور واپس اپنے قبیلے میں چلی گئیں۔ وہاں کے لوگوں کو قبول اسلام کی ترغیب دی اور وہ لوگ مسلمان ہو گئے۔ اس کے بعد بھی مدینہ منورہ میں ان کی آمد و رفت رہی اور انھوں نے آنحضرت کی خدمت اقدس میں حاضری دی۔

حضرت خنساء رضی اللہ عنہا اسلام لے آئیں اور اس کے احکام پر عمل کرنے لگیں، لیکن بھائی کی یاد ان کے دل میں بہ دستور رہی۔ زمانہ جاہلیت میں عورتیں کسی کا سوگ کرتیں تو سر پر بالوں کا گچھا باندھ لیتی تھیں۔ حضرت خنساء بھی اپنے بھائی صخر کے سوگ میں اس طرح کا گچھا باندھے رکھتیں۔ ایک مرتبہ وہ بیت اللہ کا طواف کر رہی تھیں کہ حضرت عمر کی نظر ان کے گچھے پر پڑی۔ انھوں نے ان کو بلایا اور فرمایا:

اسلام اس قسم کے سوگ اور افسوس کی اجازت نہیں دیتا۔

عرض کیا: امیر المؤمنین! جس غم اور افسوس میں میں مبتلا ہوں' اسے میں ہی جانتی ہوں' خدا کرے کوئی عورت اس قسم کے شدید غم میں مبتلا نہ ہو' حضرت عمر نے اسے تسلی دی اور فرمایا لوگوں پر بڑی بڑی مصیبتیں آئی ہیں اور انھوں نے برداشت کی ہیں۔ تم بھی برداشت کرو' لیکن افسوس کے اس طریقے سے اسلام نے منع فرمایا ہے' اسے ترک کر دو۔ اس کے بعد انھوں نے بالوں کا گچھا اتار دیا اور بھائی کے افسوس کا دوسرا طریقہ اختیار کر لیا۔ وہ بھائی کو یاد کر کے روتی بھی تھیں اور ساتھ ساتھ یہ شعر بھی پڑتی تھیں۔

کنت ابکی له من الثار و انا الیوم ابکی له من النار

یعنی میں پہلے اپنے بھائی صخر کو بدلہ لینے کے لیے رویا کرتی تھی اور اب اس لیے روتی ہوں کہ وہ قتل ہو گیا' لیکن اسلام نہ لا سکا' اب وہ جہنم کی آگ میں جلتا ہو گا۔

خنساء ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوا کرتی تھیں۔ انھوں نے بھی ان کو سر پر بالوں کا گچھا باندھنے سے منع فرمایا۔ بہرحال انھوں نے اسے

ترک کر دیا تھا اور اللہ کی رضا کو تمام معاملات میں مقدم اور اصل قرار دے لیا تھا-

خنساء صرف شاعرہ اور مرثیہ گو ہی نہ تھیں- بہت بڑی بہادر اور جرات مند بھی تھیں اور شجاعت و دلیری کی وہ تمام صفات اس میں جمع ہو گئی تھیں جو عربوں کا طرہ امتیاز ہے- چنانچہ ۱۶ ہجری میں حضرت عمر کے دور خلافت میں جب قادسیہ کا معرکہ کارزار گرم ہوا تو خنساء اپنے چاروں بیٹوں کو لے کر میدان جنگ میں پہنچیں اور انھیں محاذ پر روانہ کرتے ہوئے نہایت شجاعانہ اور پر جوش تقریر کی جس کے چند جملے یہ ہیں-

میرے پیارے بیٹو! تم اپنے دل کی گہرائیوں سے حلقہ بگوش اسلام ہوئے ہو اور اپنی رضامندی سے راہ خدا میں ہجرت کر کے آئے ہو' تم پر کسی قسم کا جبر واکراہ نہیں کیا گیا- یاد رکھو اللہ کے سوا کوئی دوسرا لائق عبادت نہیں' جس طرح تم ایک ماں کے بیٹے ہو اسی طرح ایک ہی باپ کے فرزند ہو- میں نے نہ کبھی تمھارے باپ سے خیانت کی اور نہ تمھارے ننھیال کو رسوا کیا- تمھارا نسب بے داغ اور تمھارا حسب بے عیب ہے- تم خوب جانتے ہو کہ مسلمانوں پر اللہ کی طرف سے مخالفین اسلام کے خلاف جہاد کرنا فرض ٹھہرایا گیا ہے- اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ عالم جاودانی کے مقابلے میں یہ دنیاے فانی ہیچ ہے- اللہ کا ارشاد ہے: مسلمانو اللہ کی راہ میں تمھیں جو تکلیفیں پیش آئیں انھیں برداشت کرو اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرو- آپس میں مضبوط رابطہ قائم رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم کامیابی کی دولت بے پایاں سے بہرہ ور ہو جاؤ-

میرے دل کے ٹکڑو' دشمن سے پنجہ آزمائی کرنے اور اس سے تیغ زن ہونے میں صرف ایک رات کا فاصلہ باقی ہے- جوں ہی چہرہ شب سے یہ پردہ سیاہ اترا تم دشمن کے مقابلے میں کھڑے ہو گے- سورج کی روشن اور تابناک کرنیں تمھاری شمشیر خاراشگاف کے جوہر دیکھنے کے لیے بے تاب ہیں- تمھارے اندر پاکیزہ خون گردش کناں ہے' بہادری تمھارا شیوہ اور لڑائی

تمھارا پیشہ ہے۔

جب دیکھو کہ معرکہ کارزار پورے جوبن پر آگیا ہے' لڑائی کے ہولناک شعلے چار سو بھڑک اٹھے ہیں اور میدان جنگ میں آگ برسنے لگی ہے اور خون کے فوارے چھوٹنے لگے ہیں تو پورے زور سے لڑائی میں گھس پڑو۔ انتہائی بے جگری سے لڑو اور بے دریغ تیغ زنی کرو۔ لڑائی میں کود کر فتح و شکست پر نظر مت رکھو۔ نتائج اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ اسی سے فتح کے طالب رہو۔

میرے جگر گوشو! اسلام کی حمایت تمھارا فرض اولین ہے۔ یہ زندگی عارضی ہے۔ بہادر کے لیے بستر کی موت عار ہے اور میدان جنگ کی موت اس کا زیور ہے۔

ایک بات اور یاد رکھو! جب تم میدان جنگ میں اترو تو کسی بزدل سے مقابلہ نہ کرو' اس سے لڑنا یا اسے مار دینا شجاعت نہیں' کسی بہادر اور جنگ جو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا اور اس کے سامنے اپنی تیغ آب دار کے جوہر کا مظاہرہ کرنا ہی بہادری ہے۔ اس لیے مقابلے کے لیے بہادر دشمن کا انتخاب کرو۔

جاؤ میرے دودھ کی لاج اور اپنے خاندان کے خون کی آبرو رکھنا۔ مسلمان کے لیے شہادت کی موت افضل ترین موت ہے۔

حضرت خنساء کے یہ بیٹے جنگ قادسیہ سے پہلے بھی کئی جنگوں میں حصہ لے چکے اور داد شجاعت دے چکے تھے۔ اب جنگ قادسیہ میں یہ شہید ہو گئے تھے۔ ان کی شہادت کی خبر خنساء کو پہنچی تو کہا: الحمد لله الذی شرفنی بقتلهم۔

اللہ کا شکر ہے' جس نے مجھے ان کی شہادت کے شرف سے نوازا۔

حضرت خنساء نے جنگ قادسیہ کے سات سال بعد ۲۴ ہجری کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں وفات پائی --- ایک روایت کے مطابق بہ عہد حضرت معاویہ کسی بادیہ میں سفر آخرت اختیار کیا۔

ام عبداللہ بنت ابی دومہ

حضرت ام عبداللہ رضی اللہ عنہا کے اصلی نام کا پتا نہیں لگ سکا- یہ مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئیں- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے زمانے میں ان کی عمر بیس سال کے قریب تھی- جس خاندان کی یہ رکن تھیں وہ اسلام اور آنحضرت کی دعوت و ارشاد کا سخت مخالف تھا- ان کے اسلام کا باعث حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا خاندان تھا- ان کی حضرت ابو بکر کے ہاں آمد و رفت تھی-

ایک مرتبہ حضرت ابو بکر قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے کہ ان کے کانوں میں ان کی آواز پڑی- انھوں نے غور سے سننا شروع کیا تو نہایت متاثر ہوئیں- اس وقت حضرت ابو بکر جو آیات پڑھ رہے تھے ان کا مطلب یہ ہے کہ (اے رسول اکرم) آپ (ان کی حالت پر) تعجب کا اظہار کرتے ہیں اور یہ لوگ ہیں کہ مذاق بازی پر اترے ہوئے ہیں' جب انھیں سمجھایا جاتا ہے تو سمجھتے نہیں ہیں اور جب کچھ نشانیاں دیکھتے ہیں تو بات ہنسی مذاق میں ٹال دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں کہ کھلا جادو ہے' کیا جب ہم مر گئے اور مٹی ہو گئے اور ہڈیوں کے سوا کچھ باقی نہ رہا تو کیا ہم (قبروں سے) اٹھائے جائیں گے اور کیا ہم سے پہلے جو ہمارے آباواجداد گزر چکے ہیں انھیں بھی اٹھایا جائے گا؟ (اے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کہہ دیجیے ہاں تم ذلیل ہو گے-

ادھر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ یہ آیات تلاوت کر رہے تھے اور ادھر حضرت ام عبداللہ بنت ابی دومہ زارو قطار رو رہی تھیں- انھیں یہ تو معلوم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگ جادوگر اور مجنوں کہتے ہیں' لیکن اس سلسلے میں انھیں زیادہ دلچسپی نہ تھی- اب قرآن کی چند آیات پردہ سماع سے ٹکرائیں تو اسلام اور آنحضرت

کی پاکیزہ تعلیمات کی طرف طبیعت راغب ہوئی اور اس کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر شروع کیا- وہاں سے اٹھ کر چلی گئیں' لیکن ذہن میں ان آیات کے الفاظ اور معانی گھومتے رہے- دن کو بھی یہ کیفیت ذہن پر طاری رہی اور رات بھی اسی حالت میں بسر کی- دوسرے روز پھر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مکان پر تشریف لائیں- اتفاق سے اس وقت بھی وہ تلاوت قرآن میں مصروف تھے اور سورہ بنی اسرائیل کی وہ آیات پڑھ رہے تھے جن میں فرمایا گیا ہے کہ (اے رسول اکرم) آپ کا رب یہ فیصلہ کر چکا کہ اللہ کے سوا کسی کو نہ پوجو' صرف اسی کے آگے سر جھکاؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرو' اگر تمھارے سامنے ان دونوں (ماں باپ) میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اف بھی نہ کہو اور نہ انھیں جھڑکو' ان کے ساتھ انتہائی ادب اور احترام سے بات کرو اور ان کے حضور عجز و انکسار اور نیاز مندی کے ساتھ کندھے جھکا دو اور اللہ سے یہ التجا کرو کہ اے اللہ ان پر اسی طرح رحم فرما جس طرح کہ انھوں نے مجھے بچپن میں پالا اور میری تربیت کے فرائض سر انجام دیے- تمھارا رب تمھارے دل کی باتوں سے پوری طرح باخبر ہے- اگر تم نیک ہو گے تو وہ رجوع کرنے والوں کے لیے مغفرت کے سامان فراہم کرتا ہے (دیکھو) تم قرابت داروں کو ان کا حق دو' مسکینوں' محتاجوں اور مسافروں کے حقوق بھی ادا کرو اور ان کی خبر گیری کرو- بے موقع مال خرچ نہ کرو اور اسے فضول مصرف میں نہ لاؤ.....

ان آیات نے ان کو اور متاثر کیا اور وہ چپکے سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ جو کچھ آپ پڑھ رہے ہیں' میں اسے کل سے سن رہی ہوں- یہ نہایت دلنشیں اور اثر انگیز کلام ہے' میں اس شخص سے ملنا چاہتی ہوں جو آپ کو اس کی تعلیم دیتا ہے- حضرت ابو بکر انھیں اسی وقت رسول اکرم کی خدمت میں لے گئے اور وہ کلمہ شہادت پڑھ کر حلقہ بگوش اسلام ہو گئیں-

قبول اسلام کے بعد ان کی دنیا بالکل بدل گئی' گھر آئیں تو ان میں ایک انقلاب پیدا ہو چکا تھا اور گفتگو اور سوچ بچار کا سانچا کوئی اور ہی صورت اختیار کر گیا تھا- سب

سے پہلے اپنی والدہ سے ہم کلام ہوئیں' ان کی والدہ اس وقت اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت مخالف تھیں' انھیں بیٹی کی اس کیفیت سے شدید کوفت ہوئی اور کہا تم نے اپنے خاندان کو ذلیل کر دیا ہے۔ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دین کو غلط اور خطرناک سمجھتے ہیں۔ یہ شخص اپنے آباواجداد اور خاندان کے مذہب اور رسوم و عوائد کو ترک کر چکا ہے اور ایسی راہ پر گام زن ہو گیا ہے جو کسی صورت میں بھی صحیح نہیں۔ تم اس کے دین سے باز آجاؤ اور اسی طریقے پر قائم رہو جو اب تک ہم میں رائج ہے۔ یہ شخص جسے تم اللہ کا رسول کہتی ہو' جادوگر ہے۔

بیٹی نے ماں کی ان باتوں کو ماننے سے انکار کیا اور دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا دین قرار دیا اور کہا کہ میں وہ کلام اپنے کانوں سے سن چکی ہوں' جسے تم جادوگر کا کلام کہتے ہو۔ وہ کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا اور نہ جادوگر یا کاہن اس قسم کی باتیں کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ اللہ کا کلام ہے اور برحق ہے اور آنحضرت پر نازل کیا گیا ہے۔

ماں بیٹی کے اس انداز گفتگو پر سخت برافروختہ ہوئی اور خوب سزا دی' لیکن بیٹی پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کے بعد جب ان کے باپ بھائیوں اور خاندان کے دوسرے افراد کو علم ہوا تو انھوں نے بھی خفگی کا اظہار کیا' پہلے تو سمجھانے کی کوشش کی' جب اس میں کامیاب نہ ہو سکے تو مارپیٹ تک نوبت پہنچی' لیکن وہ بدستور اپنے موقف پر قائم رہیں۔ یہ ان کے لیے سخت ابتلا کا دور تھا' جس سے نہ ان کے ذہن و فکر میں کوئی تبدیلی نمودار ہوئی اور نہ پائے ثبات و استقلال میں کوئی جنبش پیدا ہوئی۔

ان کی شادی خاندان ہی کے ایک شخص سے ہوئی تھی اور اس سے دو بچے بھی تھے۔ اس نے بھی ہر طرح سمجھانے کی کوشش کی' لیکن جب اس نے دیکھا کہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا تو بیوی کو طلاق دے کر گھر سے نکال دیا اور بچوں کو اپنے پاس رکھ لیا۔ یہ عورت کے لیے ایک نازک مرحلہ ہوتا ہے۔ مگر اس سے بھی وہ کامیابی سے گزر گئیں اور کسی قسم کا ملال نہ زبان سے ظاہر ہونے دیا اور نہ عمل و حرکت سے۔

ان کا دوسرا نکاح مشہور صحابی حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ہوا' لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ نکاح کس وقت اور کس دور میں ہوا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے بھی ان کے اولاد پیدا ہوئی' مگر اس کی تفصیلات کا علم نہیں ہو سکا۔

حضرت ام عبداللہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی الہ علیہ وسلم سے متعدد احادیث روایت کیں' نیز انھوں نے اپنے شوہر حضرت ابو موسیٰ اشعری سے بھی احادیث روایت کیں۔ پھر خود ان سے بھی بہت سے لوگوں نے احادیث بیان کیں جن میں حضرت عیاض اشعری' یزید بن اوس' عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ' عبدالاعلی نخعی اور ثابت بن قیس ایسے مشاہیر راوی شامل ہیں۔

ان کی وفات اس دور میں ہوئی جس میں خلیفہ رابع حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ برسر پیکار تھے۔ سیر و تاریخ کی بعض کتابوں میں منقول ہے کہ کوفہ میں فوت ہوئیں۔

ام مرشد اسلمی

ام مرشد ابتدا میں اسلام کی شدید ترین دشمن تھیں۔ انھوں نے ہر موقعے پر اسلام کی مخالفت کی اور ان لوگوں کا ساتھ دیا جو مسلمانوں کے درپے آزار رہتے تھے۔ حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں اور علامہ ابن عبدالبر نے الاستیعاب میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ مکہ مکرمہ کی رہنے والی خاتون تھیں اور ادب و فصاحت میں مہارت رکھتی تھیں۔ ان کی ماں کا نام خارجہ اور باپ کا نام زید بن ثابت ہے۔ عقل و دانش اور فہم و فراست میں شہرت رکھتی تھیں۔

ان کی شادی ایک شخص عمرو بن مرہ سے ہوئی۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل کی بات ہے۔ اسلام کا ظہور ہوا تو ان کے قرابت دار اور ان کا شوہر اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہوگئے، لیکن اسلام بتدریج پھیلتا اور ارتقا و تقدم کے مراحل طے کرتا رہا۔ ان لوگوں نے اس کے راستے میں مزاحم ہونے کی سعی کی اور ہر قدم پر رکاوٹیں ڈالیں، مگر بے سود۔ اسلام کا قافلہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں اور پوری تیزی سے آگے بڑھتا رہا۔ ام مرشد کے بچے بھی اس دور میں اسلام کے مخالف گروہ میں شامل تھے۔

مورخین لکھتے ہیں کہ جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا اور اس کی پاداش میں انھیں تکلیفیں پہنچائی گئیں تو انھوں نے اسلام ترک نہ کیا بلکہ احد احد کے لفظ ان کی زبان سے نکلتے رہے۔ پھر انھیں مزید سزا دینے کی غرض سے تپتی ریت پر لٹایا جاتا مگر کوئی سختی ان کے دل سے اسلام کو نکالنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو جس انداز سے سزائیں دی جاتی تھیں، اس سے سخت سے سخت لوگوں کے دل دہل جاتے تھے اور پورے مکے میں اس کی باتیں ہوتی تھیں۔ ام مرشد بھی ان

تمام چیزوں سے باخبر تھیں- کہتے ہیں وہ عورتوں سے کہا کرتی تھیں کہ بلال کے استقلال اور شدید سزاؤں کے باوجود اسلام پر ان کی ثابت قدمی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مذہب واقعی سچا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ضرور صادق ہیں- کیونکہ جھوٹ میں اس درجہ مستقل مزاجی کا پایا جانا ممکن نہیں- کسی غلط بات پر کوئی شخص اتنا اصرار نہیں کر سکتا جتنا کہ بلال کر رہے ہیں- پھر بعض مسلمان عورتوں کو بھی اسلام قبول کرنے کے نتیجے میں نشانہ ستم بنایا جاتا مگر ان کے پائے ثبات میں کسی نوع کی لغزش پیدا نہ ہوتی' حالانکہ عورتیں فطرتاً کمزور ہوتی ہیں اور معمولی سزا بھی ان کے قدموں کو ڈگمگا دیتی ہے- ان تمام باتوں کو دیکھ کر ام مرشد کے دل میں اسلام کو سمجھنے کا شوق پیدا ہوا اور اس کے خلاف ان میں نفرت و حقارت کے جو جذبات پائے جاتے تھے وہ آہستہ آہستہ کم ہونے لگے- لیکن وہ کھل کر اس کا اظہار نہ کرتی تھیں' اس لیے کہ خاندان کا کوئی فرد بھی اسلام اور آنحضرت کا حامی نہ تھا- چاروں طرف مخالفانہ آوازیں اٹھ رہی تھیں' مگر ذہن میں تبدیلی کے آثار ضرور نمایاں ہوگئے تھے- کئی سال اسی حال میں گزر گئے- آخر وہ وقت آیا کہ مسلمان مکہ چھوڑنے اور اپنے گھر سے نکلنے پر مجبور ہوگئے- کچھ لوگ حبشہ چلے گئے- پھر پورا مکہ مسلمانوں کے وجود سے خالی ہوگیا اور سب ایک ایک کر کے عازم مدینہ ہوگئے- مدینہ منورہ میں مسلمانوں کی حالت قطعی طور سے بدل گئی- مخالفین اسلام سے باقاعدہ مقابلہ کیا اور تمام معرکوں میں کامیاب ہوئے-

اب فتح مکہ کا زمانہ آیا اور تمام عرب اسلام کی تحویل میں آگیا- ام مرشد جو پہلے سے مسلمانوں کے کردار و استقلال سے متاثر تھیں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں- گناہوں کی معافی مانگی- اسلام قبول کیا اور آپ کی بیعت کے شرف سے مشرف ہوئیں- ان کی والدہ حضرت خارجہ رضی اللہ عنہا نے بھی اسی زمانے میں اسلام قبول کرنے کی سعادت حاصل کی- ان کے علاوہ ان کے خاندان کے دوسرے افراد بھی حلقہ اسلام میں داخل ہوئے- ان کے شوہر نے بھی اسلام قبول کیا' لیکن اسی اثنا میں انھیں یہ افسوس ناک حادثہ پیش آیا کہ شوہر کا انتقال ہوگیا-

شوہر کی وفات سے دس مہینے بعد انھوں نے دوسرا نکاح کیا' جس سے دو لڑکے اور تین لڑکیاں پیدا ہوئیں- ان کے دوسرے شوہر حلیم الطبع اور نرم خو تھے- ان کی پہلی اولاد سے بہت ہی محبت کے ساتھ پیش آتے اور بڑی مہربانی اور شفقت کا برتاؤ کرتے-

حضرت ام مرشد رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث بھی روایت کیں اور پھر ان سے بھی ان کے شاگردوں نے سماع حدیث کیا' ان سے احادیث روایت کرنے والوں میں خود ان کی والدہ حضرت خارجہ رضی اللہ عنہا بھی شامل ہیں-

اسلام قبول کرنے کے بعد ان کی زندگی کے لیل و نہار بالکل بدل گئے- اب پہلے والی کوئی بات باقی نہ رہی تھی- ہر وقت یاد خدا میں مصروف رہتیں- لوگوں کی خدمت کو اپنا معمول بنالیا تھا- صدقات و خیرات دل کھول کر کرتیں' کسی کی دل آزاری نہ کرتیں' کبھی اونچی آواز سے بات نہ کرتیں' کسی سے کوئی تکلیف بھی پہنچتی تو اس کا اظہار نہ فرماتیں' نرمی اور لجاجت کو اپنا شعار بنائے رکھتیں- ایسی مجلس میں نہ بیٹھتیں جس میں کسی کا گلہ شکوہ ہوتا ہو- اکثر روزے سے رہتیں اور موٹا جھوٹا پہنتیں-

ان کی اولاد بھی ماں باپ کے نقش قدم پر چلی- علم حدیث حاصل کیا اور اس کی نشر و اشاعت کو زندگی کا مقصد قرار دیا- ان کی اولاد میں سے بعض افراد شام اور بعض کوفے میں چلے گئے اور بعض نے مکہ کو اور بعض نے مدینہ کو اپنا مسکن بنایا اور وہاں خدمت علم میں مصروف ہوئے' جس طرح ماں نے اپنے آخری دور حیات میں سادگی کو اپنا لیا تھا اور ذکر الٰہی کو اپنا معمول ٹھہرالیا تھا' اسی طرح اولاد نے بھی یہی اسلوب اختیار کیا-

حضرت ام مرشد رضی اللہ عنہا کی وفات خلیفہ ثانی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ۲۱ھ کو ہوئی-

ام مبشر بنت براء

ام مبشر بنت براء بن معرور انصاریہ رضی اللہ عنہا ایک نرم مزاج اور حلیم الطبع خاتون تھیں۔ان کے حالات طبقات ابن سعد' تہذیب التہذیب' الاصابہ' اسد الغابہ اور الاستیعاب میں مذکور ہیں۔

ان کے قبول اسلام کاواقعہ بڑی عجیب نوعیت کا ہے۔یہ مدینہ منورہ کی رہنے والی تھیں' ابتدا ہی سے نرم گفتار' حسن کردار کی حامل' بہترین اخلاق کی مالک اور نہایت فیاض تھیں۔ان کے کان میں اسلام کی آواز پڑی تو اسے سمجھنے کی کوشش کی۔ پہلے ان عورتوں سے ملیں جو اسلام سے بہرہ مند ہو چکی تھیں' پھر مردوں سے اس کی تعلیمات کے متعلق دریافت کیا۔اسی اثنا میں طائف کے ایک قافلے کا ادھر سے گزر ہوا اور اس کی عورتیں مدینہ میں آئیں۔یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی مکہ معظمہ میں تھے اور ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں تشریف نہیں لائے تھے۔

حضرت ام مبشر رضی اللہ عنہا طائف کے اس قافلے کی ایک عورت کو اپنے گھر لائیں اور اس سے اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں دریافت کیا۔ ان دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ کچھ اس طرح کی تھی۔

ام مبشر : آپ خاص طائف کی رہنے والی ہیں؟

خاتون : ہاں میں اور میرے خاندان کے تمام لوگ طائف کے باشندے ہیں۔

ام مبشر : طائف مکہ سے کتنے فاصلے پر ہے؟

خاتون : زیادہ دور نہیں ہے۔

ام مبشر : کیا مکہ میں کوئی ایسا شخص ہے جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اللہ کا نبی ہے

اور اس پر خدا کی طرف سے وحی نازل ہوتی ہے؟

خاتون: ہاں وہ شخص عرب کے مشہور خاندان قریش سے تعلق رکھتا ہے- اس کے دادا کا نام عبدالمطلب ہے جو بہت ہی فیاض اور لوگوں کا ہمدرد تھا- یہ خاندان بڑے اثر ورسوخ کا مالک ہے- لوگ ان کی بہت تکریم کرتے ہیں- اس شخص کا نام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے- یہ اس بات کے مدعی ہیں کہ انھیں اللہ نے نبوت ورسالت کا منصب عظیم عطا کیا ہے- ان کا کہنا ہے کہ اللہ ایک ہے' اس کا کوئی شریک نہیں- یہ بت جو کعبۃ اللہ میں سالہا سال سے پڑے ہیں' محض بے کار ہیں' نہ یہ سنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں- نہ کسی کی حاجت روائی کرتے ہیں اور نہ کسی کو فائدہ یا نقصان پہنچا سکتے ہیں- انھیں فریاد رس سمجھنا اور ان کے سامنے گردن جھکانا اللہ کے ساتھ شرک کا ارتکاب کرنا ہے- یہ طائف بھی گئے تھے' وہاں کے لوگوں کو بھی انھوں نے سمجھانے کی کوشش کی' لیکن ان لوگوں نے ان پر پتھراؤ کر کے انھیں زخمی کر دیا-

انصاری اور مجاہد بن جبیر ایسے جلیل القدر اصحاب شامل ہیں- ان عظیم المرتبت خاتون سے مروی احادیث صحیح مسلم اور سنن نسائی میں مذکور ہیں-

ام مبشر: ان کے حامیوں کی تعداد زیادہ ہے یا مخالفوں کی؟

خاتون: سنا ہے مخالفین زیادہ تعداد میں ہیں' البتہ جو حمایت کا دم بھرتے ہیں وہ نہایت ثابت قدم ہیں- انھیں لوگ تکلیف بھی پہنچاتے ہیں اور نرم لہجے میں بھی اللہ کے دین سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہیں' مگر وہ کسی کی نہیں مانتے- وہ ان کی باتوں پر سختی سے عمل پیرا ہیں اور اللہ کی وحدانیت کی پورے زور سے تبلیغ کرتے ہیں-

اس گفتگو کے بعد وہ عورت تو رخصت ہو گئی' لیکن حضرت ام مبشر رضی اللہ عنہا کے دل میں اسلام کو مزید سمجھنے کی ایک زبردست خواہش کروٹ لینے لگی - مکہ سے جو شخص بھی مدینہ منورہ آتا اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں دریافت کرتیں - اسی اثنا میں یہ بات مشہور ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے معاونین مستقل طور سے مدینہ میں آرہے ہیں' ان کے دل میں آپؐ کو دیکھنے اور آپؐ سے باتیں کرنے اور ملنے کی تڑپ پیدا ہوئی - چند روز کے بعد حبشہ سے کچھ مسلمان مدینے آئے' یہ وہ مسلمان تھے جو کفار مکہ کے مظالم سے تنگ آکر حبشہ کو ہجرت کر گئے تھے - یہ ان سے ملیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کے متعلق معلومات حاصل کیں' جیسے جیسے دن گزر رہے تھے' ان کے جذبہ شوق میں اضافہ ہو رہا تھا - آخر وہ مبارک دن آ ہی گیا جس دن کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے - یہ اسی دن یا دوسرے دن آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو گئیں -

اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق اہل مدینہ کی حالت اہل مکہ سے بالکل مختلف تھی - یہ لوگ آپؐ کے سخت منتظر تھے - ہر وقت آپؐ کی خدمت میں لوگوں کا ہجوم رہتا اور آپؐ سے کئی قسم کے مسائل پوچھے جاتے - یہاں کے لوگ آپؐ کے اس قدر معاون اور ہمدرد تھے - کہ ان میں سے بعض نے تو اپنے آپ کو آپؐ کی اور آپؐ کے صحابہ کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا - حضرت ام مبشر رضی اللہ عنہا کا شمار بھی انہی خوش نصیب حضرات میں ہوتا ہے - یہ مہاجرین کے گھروں میں جا کر ان کی عورتوں کی خدمت کرتیں اور گھریلو معاملات میں ان کا ہاتھ بٹاتیں' ان کو بازار سے ضروریات کی چیزیں لا کر دیتیں اور اپنی گرہ سے بھی ان کی امداد کرتیں' ان کے اس حسن کردار اور بہتر سلوک سے مہاجر خواتین ان سے بے حد متاثر ہوئیں' ازواج مطہرات کی خدمت میں بھی یہ حاضر ہوتیں اور اس اجنبی شہر میں انھیں ہر قسم کی خانگی سہولتیں بہم پہنچانے کی کوشش کرتیں -

حضرت ام مبشر رضی اللہ عنہا کے خاندان کے لوگ بھی اسلام کی نعمت سے فیض یاب ہوئے اور انھوں نے اسلام کی خدمت کو اپنی زندگی کا بنیادی مقصد قرار دے لیا۔ یہ لوگ ان جنگوں میں بھی پیش پیش رہے جو اسلام اور کفر کے درمیان مختلف وقتوں میں لڑی گئیں۔ ان کے شوہر کی تو یہ حالت تھی کہ وہ آنحضرت کی خدمت میں مصروف رہتے۔ مدینہ کے نواح میں ان کا کھجوروں کا ایک باغ تھا' مہاجرین کے لیے اپنے باغ سے کھجوریں لاتے اور آنحضرت کو پیش کرتے تاکہ آپ ضرورت کے مطابق مہاجرین میں تقسیم فرمادیں۔

حضرت ام مبشر رضی اللہ عنہا سے احادیث بھی مروی ہیں۔ انھوں نے خود آنحضرت سے بھی احادیث روایت کیں' جن کی تعداد دس تک پہنچتی ہے۔ یہ احادیث ان سے ان کے شاگردوں نے روایت کیں۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بھی خاصی ہے' جن میں حضرت جابر بن عبداللہ انصاری' محمد بن عبدالرحمٰن بن خلاد انصاری اور مجاہد بن۔ جبیر ایسے جلیل القدر اصحاب شامل ہیں۔ ان عظیم المرتبت خاتون سے مروی احادیث صحیح مسلم اور سنن نسائی میں مذکور ہیں۔

صحابہ اور تابعین میں ان کو بڑی قدر و منزلت حاصل تھی اور سب لوگ ان سے توقیر کے ساتھ پیش آتے تھے' اس کی کئی وجوہ تھیں۔ ایک یہ کہ زمانہ جاہلیت میں یہ قبول اسلام کے لیے انتہائی مشتاق تھیں' دوسرے یہ کہ مسلمانوں بالخصوص مسلمان عورتوں کی یہ بہت مدد کرتی تھیں' تیسرے یہ کہ انتہائی منکسر المزاج اور متواضع طبیعت کی مالک تھیں' چوتھے یہ کہ ان کی وجہ سے ان کا پورا خاندان مسلمانوں کی اعانت کرتا تھا۔ پانچویں یہ کہ ان کے خاندان کے لوگ جنگ و جہاد میں پہلی صفوں میں رہتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خلفاے راشدین بھی انھیں بہت قابل احترام گردانتے اور ان کے خاندان کو لائق عزت قرار دیتے تھے۔

حضرت ام مبشر رضی اللہ عنہا کی وفات خلیفہ ثالث حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ہوئی اور انھیں جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔

ام مطاع اسلمیہ

حضرت ام مطاع رضی اللہ عنہا مدینہ منورہ کے نواح میں رہائش پذیر تھیں‘ شعرو ادب کا خاص ذوق رکھتی تھیں‘ فہم مسائل میں بڑا ملکہ حاصل تھا- ان کے حالات طبقات ابن سعد‘ اسد الغابہ اور الاستیعاب میں بیان کیے گئے ہیں-

عرب فصاحت وبلاغت میں ممتاز تھے اور ادب و شعر ان کا دل پسند موضوع تھا- عرب کے بدوی قبائل اور دور دراز علاقوں میں رہنے والے لوگ زبان کی نزاکتوں کا خصوصیت سے خیال رکھتے تھے اور اس سلسلے میں کسی لغزش کا شکار نہ ہوتے تھے- حضرت ام مطاع رضی اللہ عنہا بھی اس ضمن میں بڑی شہرت کی مالک تھیں اور اس موضوع سے متعلق ان کے نقطہ نظر کو صحت کی دلیل سمجھا جاتا تھا- ان کی زبان میں اثر اور کلام میں زور تھا- حشو وزوائد سے ان کی بات مبرا ہوتی-

فیاض بھی بہت تھیں‘ ضرورت مند ان کے پاس آتے اور طالب امداد ہوتے- یہ سب کی امداد کرتیں‘ کوئی ان کے دروازے سے خالی ہاتھ نہ جاتا- جس دن کوئی حاجت مند ان کے دروازے پر دستک نہ دیتا تو خود جاتیں اور تلاش کر کے ان کی ضروریات کی تکمیل کرتیں- اس اعتبار سے غربا کا سہارا اور محتاجوں اور مساکین کا مرجع تھیں‘ عورتیں بالخصوص حاجت روائی کے لیے ان سے رجوع کرتیں اور یہ ان کی امداد کے لیے کوشاں ہوتیں- بسا اوقات اپنی ضروریات روک کر ان کی ضرورتیں پوری کرتیں- غرض فیاضی وسخاوت میں مشہور تھیں-

عادات واطوار میں بھی ان کی مثال نہیں ملتی- سب سے حسن اخلاق سے پیش آتیں‘ کسی کی تکلیف برداشت نہ کرتیں- کذب بیانی کو نہایت برا سمجھتیں‘ صدق مقال ان کا شیوہ تھا- کسی معاملے میں دوسرے کو تنگ نہ کرتیں- مقروض کو پریشان نہ کرتیں‘

مفلوک الحال کے لیے آرام و سہولت کے مواقع مہیا کرتیں۔ حتی الامکان کسی کو شکایت کا موقع نہ دیتیں، کوئی خفگی کا اظہار کرتا تو محسوس نہ کرتیں، مظلوم کی امداد کو پہنچتیں اور ظالم کا ہاتھ ظلم کی طرف بڑھنے سے روکتیں، کسی کے خلاف دل میں بغض و عداوت کو جگہ نہ دیتیں اور غصے کی پرورش نہ کرتیں۔ دوسرے کی امداد کا جذبہ ان کے اندر اس قدر راسخ تھا کہ ایک مرتبہ ان کی بہن کا کسی عورت سے جھگڑا ہو گیا، جو معاملہ باعث نزاع تھا، اس میں ان کی بہن برسر حق اور دوسری عورت غلطی پر تھی، لیکن معاملہ ان کے علم میں آیا تو انھوں نے بہن کے مقابلے میں اس عورت کی حمایت کی اور بہن کو سرزنش کی، بہن نے ہر چند سمجھانے اور اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کی، مگر انھوں نے ایک نہ مانی اور بہن کو اس سے معافی مانگنے پر مجبور کیا۔

حضرت ام مطاع رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت مدینہ کے بعد اسلام قبول کیا۔ جب آنحضرت مکہ سے مدینہ منورہ تشریف لائے تو مدینہ کے قرب و نواح کے قبائل میں اسلام پھیلنے لگا اور لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ جب ام مطاع کو معلوم ہوا تو یہ بھی آنحضرتؐ کی خدمت میں آئیں، اسلام قبول کیا اور آپؐ سے بیعت ہوئیں۔

۶ھ میں خیبر کی مشہور جنگ لڑی گئی، اس جنگ کو مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان فیصلہ کن معرکے کی حیثیت حاصل تھی۔ حضرت ام مطاع رضی اللہ عنہا نے بھی اس جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شرکت کی اور اہم خدمات انجام دیں۔ اس جنگ میں انھوں نے مجاہدین کو پانی پلانے اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کے فرائض انجام دیے، مورخین لکھتے ہیں کہ اس موقعے پر انھوں نے متعدد خدمات انجام دیں اور انتہائی شجاعت کا ثبوت دیا جس کے نتیجے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال غنیمت کی تقسیم میں انھیں مجاہد مرد کے برابر حصہ دیا، لیکن علامہ ابن عبد البر نے الاستیعاب میں اس پر شبہے کا اظہار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حضرت ام مطاع رضی اللہ عنہا جنگ خیبر میں تو بے شک حاضر ہوئیں اور انھوں نے میدان جنگ

میں خدمات بھی سرانجام دیں' لیکن اس میں شبہ ہے کہ آنحضرت نے مال غنیمت کی تقسیم میں ان کو مجاہد مرد کے برابر حصہ دیا۔ بہر کیف معاملہ کچھ بھی ہو' اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت ام مطاع رضی اللہ عنہا بہت سی خصوصیات کی مالک تھیں اور عورتوں میں ان کا درجہ بڑا بلند تھا۔ بارگاہ رسالت میں بھی ان کو اہمیت حاصل تھی۔

راویہ حدیث کی حیثیت سے بھی ان کا مرتبہ بلند تھا اور اس باب میں ان کا مکان ایک مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ بعض حضرات نے ان سے احادیث رسول روایت کرنے کا شرف حاصل کیا۔ لوگ ان کی خدمت میں آتے اور احادیث روایت کرتے۔ روایت حدیث کے سلسلے میں عورتیں بہت بڑی تعداد میں ان کے پاس آتیں اور یہ ان سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتیں۔ ان کے شاگردوں اور راویان حدیث میں ان کی خادمائیں اور کنیزیں بھی شامل ہیں۔ ان کے مرد شاگردوں میں ابو مردان ایسے مشاہیر کے نام بھی آتے ہیں۔

حضرت ام مطاع رضی اللہ عنہا کی وفات حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کے آخری دور میں ہوئی۔ جنازے میں جلیل القدر صحابہ نے شرکت کی اور جنت البقیع میں مدفون ہوئیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو ان کی وفات کی خبر پہنچی تو فرمایا آج عورتوں سے علم رخصت ہو گیا۔

حضرت اسماء بنت ابوبکر صدیقؓ

"اے میرے لخت جگر! تم اپنے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتے ہو' اپنے دل سے پوچھ کر فیصلہ کرو' اگر تمھیں یہ یقین ہے کہ تم حق پر ہو اور حق و صداقت ہی کی دعوت دیتے ہو تو اسی جادۂ مستقیم پر گامزن رہو۔ تمھارے رفقا نے اسی راہ حق پر چلتے ہوئے' اپنی جانیں قربان کی ہیں۔ تم ذلیل چھوکروں کو اپنی گردن سے کھیلنے کا موقع نہ دو اور ان کے سامنے ہرگز سر نہ جھکاؤ۔

اگر تمھارا مقصد طلبِ دنیا ہے تو تم اس دنیا کے بدترین انسان ہو گے۔ یاد رکھو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تم نے اپنے آپ کو بھی برباد کیا اور اپنے مقتول رفقا کے لیے بھی سامانِ بربادی بہم پہنچایا۔

اور اگر تم یہ سمجھو کہ در حقیقت تم ہو تو حق پر ہی لیکن جب تمھارے ساتھی کمزور پڑ گئے تو تمھارا دل بھی بجھ گیا' تو یہ اور بھی غلط بات ہے۔ یاد رکھو! حریت پسندوں اور اہل دین کو یہ چیز زیب نہیں دیتی۔ یہ عذر قابل قبول نہیں ہے۔ بتاؤ تم کب تک اس دنیا میں زندہ رہو گے۔ ذلت کی زندگی سے موت بدرجہا بہتر ہے۔"

یہ الفاظ اسلام کی ایک بہادر اور غیرت مند خاتون حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے اپنے بیٹے عبداللہ بن زبیر کو دشمن کے مقابلے میں روانہ کرتے ہوئے کہے۔

یہ طویل قامت اور بھرے ہوئے جسم کی خوب رو خاتون خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحب زادی تھیں۔ ہجرت سے ستائیس سال قبل پیدا ہوئیں۔ اسلام قبول کرنے والوں میں ان کا اٹھارھواں نمبر تھا۔ بڑی فراخ دل' بلند حوصلہ' فیاض' دلیر' جفاکش اور صابر خاتون تھیں۔ انھیں یہ شرف حاصل ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کو ہجرت

کے ارادے سے روانہ ہوئے تو انھوں نے ان کے لیے زادِ راہ اور ناشتا تیار کر کے دیا تھا۔

حضرت ابو بکرؓ ہجرت کے وقت اپنے تمام درہم و دینار ساتھ لے گئے تھے۔ ان کے والد کا نام ابو قحافہ تھا اور وہ نابینا تھے۔ انھیں بیٹے کی ہجرت کا علم ہوا تو بولے۔

"ابو بکر ہمیں مالی اور جانی دونوں قسم کی تکلیف میں مبتلا کر گیا۔"

اسماء نے دادا کی زبان سے یہ الفاظ سنے تو درہم و دینار کے وزن کے برابر چھوٹے چھوٹے پتھروں کے ٹکڑوں کا ڈھیر لگایا' ان پر کپڑا ڈالا اور دادا کا ہاتھ پکڑ کر انھیں اس ڈھیر پر لا کھڑا کیا۔ بولیں:

"یہ دیکھیے تمام دولت یہیں پڑی ہے' وہ تو کچھ بھی اپنے ساتھ لے کر نہیں گئے۔"

کچھ دنوں کے بعد مسلمان خواتین نے ہجرت کی تو اسماء نے بھی ان کے ساتھ رختِ سفر باندھا اور عازمِ مدینہ ہو گئیں۔ مدینہ پہنچ کر قبا کے مقام پر قیام کیا' جہاں ان کے بیٹا کا پیدا ہوا' جس کا نام عبداللہ رکھا۔ یہ ہجرت کے بعد پہلی اولاد تھی جو ایک مہاجر خاندان کو اللہ نے عطا فرمائی۔ بچے کو لے کر آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ آپؐ نے بچے کو گود میں لیا۔ گھٹی دی اور دعا فرمائی --- یہی وہ بچہ ہے جو عبداللہ بن زبیر کے نام سے معروف ہے۔ جو تاریخِ اسلام کا ایک نامور سپاہی گزرا ہے۔ اسماء کے تذکرہ میں عبداللہ کا نام بھی بار بار آئے گا---!

یہ ایک امیر گھرانے کی بیٹی تھیں اور زندگی کی ابتدائی منزلیں دولت و ثروت کے ماحول میں طے کی تھیں' لیکن شادی زبیر بن عوام سے ہوئی جو نہایت غریب اور نادار شخص تھے اور جن کا اثاثہ صرف ایک گھوڑے اور ایک اونٹ تک محدود تھا۔ اسماء نے زبیر کے گھر آتے ہی اپنے آپ کو جفاکش اور محنت و مشقت کا عادی بنا لیا تھا۔ خود گھوڑے کو دانہ دیتی' پانی بھرتی اور کوئیں سے ڈول کے ساتھ پانی نکال کر اسے پلاتی تھیں۔ سرورِ کائنات نے زبیر کو ایک خطۂ زمین عنایت کیا تھا' اسماء وہاں جا کر کھجوروں کی گٹھلیاں چنتی اور سر پر اٹھا کر لاتی تھیں۔ ایک دن کھجوریں سر پر اٹھائے آ رہی تھیں

کہ ادھر سے آنحضرتؐ بھی تشریف لے آئے' آپؐ اونٹ پر سوار تھے- آپؐ نے اونٹ کو بٹھایا اور اسماء سے سوار ہونے کو کہا' لیکن ان کو اس بات سے شرم آئی کہ حضور تو پیدل چلیں اور یہ اونٹ پر سوار ہوں' اس لیے انکار کر دیا- گھر آ کر یہ واقعہ اپنے شوہر زبیر کو سنایا تو انھوں نے بطور مزاح کہا-

"واہ! سر پر بوجھ لادنے سے تو شرم نہ آئی لیکن سرور دو عالم کے اونٹ پر سوار ہونے سے شرما گئیں-"

کچھ عرصہ بعد کام کاج کے لیے حضرت ابو بکر نے حضرت اسماء کو ایک خادم دے دیا تھا' اس سے ان کی یہ تکلیفیں رفع ہو گئی تھیں-

دل کی فیاض تھیں مگر مالی اعتبار سے غریب تھیں- اس لیے ناپ تول کر خرچ کرتی تھیں- آنحضرت کو معلوم ہوا تو فرمایا-

"اگر تم لوگوں کو ناپ تول کر دو گی تو اللہ بھی تمھیں ناپ تول کر دے گا-"

اس کے بعد یہ عادت ترک کر دی اور پھر اللہ نے اتنا دیا کہ تمام مشکلیں ختم ہو گئیں- ان کے بیٹے عبداللہ بن زبیر کا بیان ہے کہ میں نے اپنی ماں سے بڑھ کر کسی کو فیاض نہیں پایا- ان کی چھوٹی بہن ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے وفات کے وقت ترکے میں ایک جنگل چھوڑا تھا جو حضرت اسماء کے حصے میں آیا تھا' مگر اس پیکر سخاوت خاتون نے جنگل ایک لاکھ درہم میں فروخت کر کے اس کی تمام رقم اپنے اعزہ و اقارب کو تقسیم کر دی- جس طرح حضرت اسماء خود خرچ کرتی اور غربا و مساکین کی مدد کرتی تھیں' اسی طرح اپنی اولاد کو بھی اس عمل کی تلقین کرتی تھیں- وہ اپنے اہل و عیال سے کہا کرتی تھیں-

"یہ مال و دولت تمھیں اس لیے دیا گیا ہے کہ اس کو دوسروں کے کام میں لاؤ- غریبوں اور ضرورت مندوں کی مدد کرو- نہ کہ اس لیے کہ اس کو تجوریوں میں بند کر کے رکھ چھوڑو- اور صرف اپنے ہی مصرف میں لاؤ- اگر تم اسے دوسرے کے لیے استعمال نہیں کرو گے اور اپنے کسی بھائی کی ضرورت پر اپنی ذاتی ضرورت کو ترجیح دو گے

تو بخیل اور کنجوس کہلاؤ گے۔دوسروں کی مشکل کشائی کے لیے اپنا مال خرچ کرنا بہترین ذخیرے کی حیثیت رکھتا ہے۔اس سے نہ مال کے کم ہونے کا خطرہ ہے' نہ ضائع ہونے کا۔

سخاوت کے علاوہ حضرت اسماء انکسار و تواضع کا پیکر تھیں اور باوجود اس کے کہ مال و دولت کی نعمت سے بہرہ مند تھی' مگر موٹا لباس پہنتی اور فقیرانہ زندگی بسر کرتی تھیں۔اس سلسلے میں ان کے بہت سے واقعات تاریخ کی کتاب میں مرقوم ہیں' جن میں ایک واقعہ یہ ہے کہ ان کے بیٹے منذر' فتح عراق سے واپس آئے تو مالِ غنیمت میں کچھ خوب صورت اور باریک منقش زنانہ کپڑے بھی ساتھ لائے۔یہ کپڑے فرمانبردار بیٹے نے نہایت ادب کے ساتھ اپنی ماں کی خدمت میں پیش کیے۔بوڑھی ماں کی بصارت زائل ہو چکی تھی۔کپڑوں کو ہاتھ سے ٹٹول کر بیٹے سے مخاطب ہوئیں اور کہا۔

"یہ اتنے باریک اور نرم و نازک کپڑے تم میرے لیے لائے ہو' میں اپنے جسم پر یہ لباس نہیں پہن سکتی۔یہ شرفا اور جفاکش لوگوں کا لباس نہیں ہے۔میرے لیے موٹے کپڑے لاؤ۔"

چنانچہ سعادت مند بیٹے نے وہ کپڑے واپس کیے اور ماں کے لیے موٹے کپڑے لا کر دیے۔یہ کپڑے لے کر وہ بہت خوش ہوئیں اور کہا:

"بیٹا مجھے اسی قسم کے کپڑے پہنایا کرو۔"

ایک روایت کے مطابق حضرت اسماء شاعرہ بھی تھیں اور زبان و اظہار کی خوبیوں سے انہیں بہرۂ وافر حاصل تھا۔۳۱ھ میں جب ان کی عمر ۵۸ سال کی ہو گئی تھی اور عالم شباب سے نکل کر بڑھاپے کی دنیا میں داخل ہو گئی تھیں' جنگ جمل کا واقعہ پیش آیا۔ان کے شوہر حضرت زبیر جنگ جمل سے واپس آ رہے تھے' ایک شخص عمرو بن جرموز مجاشعی نے ان کو بصرہ سے پانچ میل دور وادی سباع میں قتل کر دیا۔اس حادثے کا ان پر نہایت گہرا اثر ہوا اور رنج و الم میں ڈوب کر اپنے بہادر اور تیغ زن شوہر کا مرثیہ کیا جس کے تین شعر یہ ہیں

غدا ابن جرموز بفارس بهمة　　يوم الهياج و كان غير معرد

يا عمرو لو نبهته لو جدته　　لاطأشأعش الجنان ولاالید

ثكلتك امك ان قتلت مسلما　　حلت عليك عقوبة المتعمد

ابن جرموز نے لڑائی کے دن ایک شہ سوار اور عالی ہمت انسان کو ایسی حالت میں دھوکا دیا جب کہ وہ نہتا اور بے سرو سامان تھا۔

اے عمرو! اگر تو اس کو خبردار کر دیتا تو یقیناً اس کو ایسا شخص پاتا کہ نہ اس کے دل میں کوئی خوف ہوتا اور نہ ہاتھ میں کوئی لرزہ۔

تجھ سے خدا سمجھے' تو نے ایک ایسے مسلمان کو قتل کیا' جس کی وجہ سے تجھ پر ضرور عذاب نازل ہو گا۔

عبداللہ کے کان ماں کی گود ہی میں تلوار کی کاٹ اور تیزی سے آشنا ہو چکے تھے۔ ان کی ماں اپنے اس بچے کو ان اشعار سے لوری دیتی۔

ابيض كالسيف الحسام الا بريق　　بين الحواری و بين الصديق

نحفى به و رب ظن تحقيق　　والله اهل الفضل اهل التوفيق

یہ چمکتی ہوئی تیز تلوار کی طرح سفید رو ہے' جو حواری رسول (یعنی اپنے باپ زبیر) اور (اپنے نانا) صدیق کی اولاد ہے۔ اس کے بارے میں میرا یہ گمان ہے اور بسا اوقات گمان صحیح ہوتا ہے کہ بخدا یہ اہل فضل ہے اور توفیق و قوت کا حامل ہے۔

عبداللہ بن زبیر نے یزید کی بیعت کرنے اور خود کو اس کے دائرہ حکومت میں شامل کرنے سے انکار کر دیا تھا اور مکہ مکرمہ کو مرکز بنا کر اپنی خلافت کا اعلان کر دیا تھا اور کئی صوبوں پر قبضہ بھی کر لیا تھا۔ یزید کے بعد جب عبدالملک بن مروان تختِ حکومت پر متمکن ہوا تو اس نے عبداللہ بن زبیر کو شکست دینے کی ٹھان لی اور ان سے مقابلے کے لیے حجاج بن یوسف کو روانہ کیا۔ حجاج بن یوسف نہایت ظالم اور سفاک تھا۔ وہ بہت بڑی فوج کے ساتھ مکہ کی طرف بڑھا اور یکم ذی الحجہ ۷۲ھ کو اس مقدس شہر کا محاصرہ کر لیا۔ مکے میں آمدورفت کے تمام راستے بند کر دیئے اور باہر سے ہر قسم کے سامان کی درآمد

کے ذرائع منقطع ہو گئے۔ عبداللہ بن زبیر اور مکہ میں رہنے والے ان کے حامیوں کے لیے یہ نہایت نازک وقت تھا۔ چھ مہینے تک دونوں جانب کی فوجیں برسرپیکار رہیں۔

حجاج کا محاصرہ اتنا سخت تھا کہ مکہ مکرمہ میں کھانے پینے کی کوئی شے باہر سے نہیں آسکتی تھی۔ اس نے بیت اللہ کی حرمت کو اس طرح پامال کر دیا تھا کہ جبل ابوقبیس پر منجنیقیں نصب کر کے اس پر مسلسل پتھر برسائے گئے۔ لیکن حضرت عبداللہ بن زبیر کی جرأت اور اللہ سے لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ وہ اس حالت میں بھی بیت اللہ میں اس خشوع و خضوع سے نماز پڑھتے تھے کہ کبوتر اڑ کر آتے اور ان کے کندھوں اور سر پر بیٹھ جاتے۔ اس وقت وہ بہتر سال کی عمر کو پہنچ گئے تھے' لیکن دل جوان تھا اور ارادے مضبوط تھے۔

اس سخت محاصرے کے زمانے میں وہ ایک دن حضرت اسماء کی خدمت میں ان کی خیر و عافیت پوچھنے کے لئے آئے۔ وہ کچھ بیمار تھیں۔ ماں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا:

"امی جان! موت میں بڑا سکون ہے۔"

ماں نے جواب دیا: "شاید تم میرے مرنے کی خواہش رکھتے ہو کہ کمزور ماں کی خدمت سے نجات پا جاؤں۔ لیکن بیٹا میں چاہتی ہوں کہ تمھارا انجام دیکھ کر مروں۔ اگر تم شہادت کے مرتبے کو پہنچ جاؤ تو تمھارے کفن دفن کا انتظام اپنی نگرانی میں کروں اور اگر فتح یاب ہو جاؤ تو میرے دل کو سرور حاصل ہو۔"

اس سے دس دن بعد جب ان کے ساتھ گنتی کے چند آدمی رہ گئے تھے' وہ آخری دفعہ حضرت اسماء کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

"امی جان! اب میرے ساتھ چند افراد رہ گئے ہیں۔ اگر میں دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دوں تو ممکن ہے مجھے اور میرے ساتھیوں کو امان حاصل ہو جائے۔ بتایئے آپ کی کیا رائے ہے؟"

جواب دیا:

اے میرے بیٹے! اگر تمھاری یہ تمام تگ و دو حق کے لیے ہے تو بہادروں کی طرح لڑ کر درجہ شہادت پر فائز ہو جاؤ' دشمن کے سامنے سر جھکا کر ذلت کا مظاہرہ نہ

کرو- اگر تمھارا یہ سلسلہ دنیوی عزو جاہ کے حصول کے لیے تھا تو تم نہایت ناپسندیدہ شخص ہو- اس صورت میں تم نے اپنا انجام بھی خراب کیا اور دوسروں کو بھی ہلاکت میں ڈالا- بہادر لوگ جو حق و صداقت کو دنیا میں پھیلانے کی جدوجہد کرتے ہیں' نہ وہ موت سے ڈرتے ہیں اور نہ دشمن کی شرائط پر اس کے سامنے جھکتے ہیں' وہ عزت کی زندگی بسر کرتے ہیں اور عزت کی موت مرتے ہیں-

بیٹے نے جواب دیا: امی! میں موت سے نہیں ڈرتا' صرف یہ خیال ذہن میں آتا ہے کہ میری موت کے بعد دشمن میری لاش کو خراب کریں گے' اس کا مثلہ کریں گے یعنی میری ناک اور کان وغیرہ کاٹیں گے اور مجھے سولی پر چڑھائیں گے' جس سے آپ کو تکلیف پہنچے گی-

حضرت اسماء بولیں: جب بکری کو ذبح کر دیا جائے تو پھر اس کی کھال کھینچی جائے یا اس کے جسم کے ٹکڑے کر دیے جائیں' اسے کیا- تم اللہ پر توکل کر کے اپنا سلسلۂ جہاد جاری رکھو- اللہ کی راہ میں اگر جسم کا قیمہ کر دیا جائے تو یہ گمراہ لوگوں کی غلامی میں رہنے سے بہت بہتر ہے- موت سے ڈر کر غلامی کی زندگی کبھی اختیار نہیں کرنی چاہیے-

بیٹے نے ماں کی بہادرانہ اور حوصلہ مندانہ باتیں سن کر ان کی خدمت میں عرض کیا کہ اب میں اللہ کی راہ میں شہادت کے لیے میدانِ جنگ میں جا رہا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ آپ میری موت پر شکر و صبر سے کام لیں گی- میں نے کسی مسلمان پر کبھی ظلم نہیں کیا' کبھی بدعہدی نہیں کی' کبھی برائی کو پسند نہیں کیا' کبھی امانت میں خیانت نہیں کی' کبھی دنیا کے عارضی فوائد کو آخرت کے دوامی فوائد پر ترجیح نہیں دی-

اس قسم کی چند باتیں کرنے کے بعد وہ دشمن کے مقابلے میں جا کھڑے ہوئے اور جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گئے- حجاج بن یوسف نے ان کی شہادت پر نہایت خوشی کا اظہار کیا اور ان کی لاش کو حجون کے مقام میں سولی پر لٹکا دیا گیا-

تیسرے دن حضرت اسماء ایک خادمہ کے سہارے مقام حجون پر آئیں- حجاج اس وقت وہیں تھا- بولیں:

"کیا اس سوار کے اترنے کا ابھی وقت نہیں آیا"؟

حجاج نے جواب دیا: وہ ملحد تھا۔اس کی یہی سزا تھی۔

حضرت اسماء نے جواب دیا: وہ ملحد نہیں تھا' وہ نماز روزے کا پابند اور اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو ماننے والا تھا۔

حجاج نے کہا: تم سٹھیا گئی ہو۔

بولیں: تمھاری عقل جواب دے گئی ہے۔ میں بالکل صحیح کہہ رہی ہوں۔ بخدا! میں نے نبی ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ قبیلہ بنو ثقیف میں ایک کذاب اور ایک سفاک پیدا ہو گا۔ کذاب (یعنی مختار ثقفی) کو ہم نے دیکھ لیا۔ سفاک تم ہو۔

کئی روز بعد خلیفہ عبدالملک بن مروان کو دمشق میں اطلاع ہوئی کہ حضرت عبداللہ بن زبیر کی لاش ان کی والدہ کو نہیں دی گئی تو اس نے نہایت سخت الفاظ میں حجاج کو خط لکھا اور لاش ان کی والدہ کو دینے کا حکم دیا۔ لاش دی گئی تو انھیں غسل دیا گیا۔ لاش کے ٹکڑے ہو چکے تھے' پھر اسی حالت میں جنازہ پڑھ کر انھیں حجون کے مقام پر دفن کر دیا گیا۔

حضرت اسماء نہایت عالی ہمت' بلند حوصلہ اور جرأت مند خاتون تھیں۔ ان کی زندگی میں بدامنی کا دور آیا تو وہ اپنے ہاتھ میں ہمیشہ تیز دھار خنجر رکھتی تھیں۔ ایک دن ان سے لوگوں نے پوچھا:

"اس خنجر سے آپ کیا کام لیں گی؟"

فرمایا: "اگر فتنہ پرور میرے گھر میں گھس کر بدامنی کا مظاہرہ کریں گے تو یہ خنجر ان کے پیٹ میں اتار دوں گی اور ان کی تکا بوٹی کر دوں گی۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ وہ نہایت سخی تھیں اور مستحقین کی مالی مدد کرتی تھی۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ ان کی والدہ کا نام قتیلہ تھا جو عبدالعزی کی بیٹی تھیں۔ وہ مسلمان نہیں ہوئی تھیں۔ ان کے مسلمان نہ ہونے کی وجہ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہجرت سے قبل انھیں طلاق دے دی تھی۔

ایک دفعہ وہ مدینہ منورہ آئیں اور حضرت اسماء سے کچھ روپے مانگے - حضرت اسماء انھیں روپے دینا چاہتی تھیں - لیکن ان کے مشرکہ ہونے کی بنا پر روپے دینے میں کچھ تامل کر رہی تھیں - نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ میری ماں مشرکہ ہیں اور مجھ سے مالی امداد چاہتی ہیں - کیا میں ان کی مدد کر سکتی ہوں؟

آپؐ نے فرمایا: ہاں! کر سکتی ہو - اسلام صلہ رحمی سے کسی کو منع نہیں کرتا -

ایک دفعہ قتیلہ کچھ تحائف لے کر حضرت اسماء کے پاس آئیں - حضرت اسماء نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی معرفت نبی ﷺ سے دریافت کیا کہ وہ اپنی مشرکہ ماں کے تحائف قبول کر سکتی ہیں اور انھیں مہمان کی حیثیت سے اپنے مکان میں ٹھہرا سکتی ہیں؟

آنحضرت نے جواب دیا: ان کے تحائف قبول کرو اور انھیں اپنے مکان میں مہمان کی حیثیت سے ٹھہراؤ -

چنانچہ انھوں نے ان کے تحائف بھی قبول کیے اور اپنے مکان میں بھی ٹھہرایا -

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے پانچ بیٹے تھے اور تین بیٹیاں - بیٹوں کے نام تھے عبداللہ' عروہ' منذر' مہاجر اور عاصم --- بیٹیوں کے نام تھے خدیجۃ الکبریٰ' ام الحسن اور عائشہ -!

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا علم و فضل میں بھی اونچا مقام رکھتی تھیں - ان سے چھپن (۵٦) حدیثیں مروی ہیں - ان سے روایت کرنے والوں میں سے چند حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں: حضرت عبداللہ بن زبیر' عروہ بن زبیر - ابو بکر' عباد اور عامر عبداللہ بن عروہ' عبداللہ بن کیسان' فاطمہ بنت منذر بن زبیر' محمد بن منکدر' ابن ابی مکیلہ' وہب بن کیسان' مطلب بن حنطب' ابو نوفل بن ابو عقرب' مسلم مصری' صفیہ بنت کیسان' عبادہ بن حمزہ بن عبداللہ بن زبیر -

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے سو سال کے قریب عمر پائی ہے - ۷۲ھ میں اپنے لخت جگر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے بعد فوت ہوئیں -

ام مطاع بنت ارت

صحابیات کی جماعت میں اس نام کی دو عورتوں کا سراغ ملتا ہے۔ایک حضرت ام مطاع اسلمیہ ہیں اور دوسری حضرت ام مطاع بنت ارت بن جندلہ رضی اللہ عنہا۔ان کے واقعات تاریخ و سیر کی مختلف کتابوں میں بیان ہوئے ہیں۔طبقات ابن سعد میں بھی ان کا ذکر کیا گیا ہے۔

اسلام کی ہمہ گیر اشاعت کا اصل دور اس وقت شروع ہوا' جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے۔مدینہ منورہ میں ہی آپ کو جہاد کا حکم ہوا اور آپ نے مختلف جنگیں لڑیں' جن میں مسلمانوں کو اللہ نے کامیابی سے نوازا۔جہاد میں مسلمانوں کی طاقت کے جوہر کھلے اور دور دور کے علاقوں میں ان کو جانے کا اتفاق ہوا۔اس اثنا میں بڑے بڑے سرکشوں کی اکڑی ہوئی گردنیں ان کے حضور جھکیں اور مشہور جنگ جوؤں نے ان کی طاقت کا لوہا مانا۔آنحضرتؐ کی حیات طیبہ کے آخری تین سالوں میں آپؐ کی خدمت میں مختلف عرب قبائل کے وفود حاضر ہوئے' ان وفود کی قیادت ان علاقوں کے رؤسا کر رہے تھے۔ان وفود میں ایک وفد صدا تھا جو ۸ھ میں سرور کائنات کی خدمت میں حاضر ہوا۔صدا ایک قبیلے کا نام تھا۔پہلے اس قبیلے کے ایک شخص زیاد بن حارث صدائی نے آپ کی خدمت میں حاضری دی۔دوبارہ پھر یہی زیاد اپنے قبیلے کے پندرہ سربر آوردہ افراد کو ساتھ لے کر آپ کے پاس آیا۔آنحضرت نے مشہور صحابی حضرت سعد بن عبادہ کو ان کی خدمت و تواضع کے لیے مامور فرمایا۔یہ پندرہ افراد مسلمانوں کے اخلاق' میل جول اور مہمان نوازی سے انتہائی متاثر ہوئے اور اپنے قبیلے اور برادری میں جا کر ان کی بہت تعریف کی۔انھوں نے خود بھی اسلام قبول کیا اور باقی لوگوں میں بھی اسلام کی نشر و اشاعت کی۔

اس وفد کا قائد زیاد بن حارث صدائی بڑا متین شخص تھا اور اسلام کی دولت سے بہرہ مند ہو چکا تھا- اس نے آنحضرت کی خدمت میں عرض کیا: یارسول اللہ ہمارے قبیلے میں ایک کنواں ہے' موسم سرما میں اس کنوئیں کا پانی بھر جاتا ہے اور وہ ہمارے لیے کافی ہوتا ہے' لیکن موسم گرما میں پانی ایک دم خشک ہو جاتا ہے اور پھر قبیلے کے تمام لوگ پانی کی قلت کے باعث وہاں سے چلے جاتے اور ادھر ادھر بکھر جاتے ہیں- جب گرمیوں کا موسم گزر جاتا ہے تو واپس آ جاتے ہیں- یہ قبیلہ ابھی نیا نیا حلقہ اسلام میں داخل ہوا ہے- اس میں تعلیم کو پھیلانے اور اسلام کی اہمیت بیان کرنے کی بہت ضرورت ہے- آپ اللہ سے دعا فرمایے کہ کنوئیں کا پانی ختم نہ ہو- اس سے ہمارے قبیلے پر بہت اچھا اثر پڑے گا اور وہ اسلام پر قائم رہیں گے-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم سات کنکریاں لاؤ- زیاد سات کنکریاں لایا- آپ نے ان کو اپنے ہاتھ میں رکھا اور زیاد کو دے دیں- فرمایا جاؤ ایک ایک کنکری اس کنوئیں میں گرادو- ہر کنکری پر اللہ اللہ پڑھتے جانا اور باری باری گرادینا' چنانچہ زیاد نے اسی طرح کیا' زیاد کا بیان ہے کہ اس کے بعد اس کنوئیں میں پانی اتنا زیادہ ہو گیا کہ اس کی گہرائی کا اندازہ لگانا ہمارے لیے ممکن نہ رہا-

حضرت ام مطاع رضی اللہ عنہا اسی قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں- جب یہ وفد واپس گیا اور اس نواح میں اسلام کی اشاعت ہوئی تو حضرت ام مطاع بنت ارت بھی مسلمان ہو گئیں' کنوئیں کا یہ واقعہ پورے علاقے میں مشہور ہو گیا اور اس واقعہ سے متاثر ہو کر بے شمار لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے- کچھ روز بعد اس علاقے کے بعض اور لوگ آنحضرت کے پاس مدینہ منورہ آئے' جن میں حضرت ام مطاع بنت ارت رضی اللہ عنہا بھی شامل تھیں- یہ چند روز کے لیے مدینہ آئی تھیں' لیکن پھر واپس نہیں گئیں اور مستقل طور سے مدینہ ہی میں مقیم ہو گئیں-

بعض مورخین سیرت کا خیال ہے کہ حضرت ام مطاع نے آنحضرت کا آخری زمانہ پایا اور آپؐ کے آخری دور حیات میں اسلام قبول کیا- طبقات ابن سعد میں اس

سلسلے میں جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں' ان سے یہی مفہوم نکلتا ہے۔

ان کی مدنی زندگی کی سرگرمیاں دوسرے لوگوں سے بہت حد تک مختلف ہیں۔ یہ آنحضرت کی خدمت میں آتیں اور اسلام اور اس کی تعلیمات کو سمجھنے کی کوشش کرتیں۔ جن صحابہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریبی تعلق تھا' یہ ان کے پاس بھی جاتیں اور احادیث کا سماع کرتیں۔ ان خواتین سے بھی ملتیں جو اسلام کے عہد آغاز میں اسلام قبول کر چکی تھیں۔ جب یہ مدینہ منورہ میں آئیں اس وقت عمر کی بہت سی منزلیں طے کر چکی تھیں۔ ان کی اولاد اور شوہر قبیلہ صدا ہی میں تھے۔ کچھ عرصے بعد شوہر بھی وہیں آ گئے اور مسجد نبوی میں رہنے لگے۔

نہایت اچھی عادات و خصائل کی حامل تھیں۔ کم گو بلکہ خاموش طبع' زمانہ جاہلیت پر نادم رہتیں۔ پچھلے دور کو یاد کرتیں تو افسوس کا اظہار کرتیں۔ انھیں اس بات کا بہت قلق تھا کہ ابتدائی دور میں اسلام سے نا آشنا رہیں۔

آمدنی کے وسائل بہت کم تھے۔ محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتی تھیں۔ آمدنی سے خرچ کا خانہ ہمیشہ بڑھا ہوا رہتا' کیونکہ جو آمدنی ہوتی وہ مستحقین میں تقسیم کر دیتیں۔ بارہا ایسا ہوا کہ جو کچھ کمایا' وہ دوسروں کے حوالے کر دیا۔ یہ ان کی ایسی عادت تھی جو کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔

ان کی اولاد بھی تھی' لیکن ان میں سے زیادہ افراد اپنے قبیلے ہی میں رہتے تھے۔ ایک لڑکا ان کے پاس اقامت پذیر تھا۔ پوتے اور نواسے بھی تھے جن کی زیادہ تعداد اسلامی فوج میں تھی۔ ایک پوتا جس کا نام حارث تھا جنگ یرموک میں شریک تھا۔

حضرت ام مطاع بنت ارت کی وفات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ہوئی۔ ان کا شمار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حامیوں میں ہوتا تھا۔ اہل بیت کی بدرجہ غایت تکریم کرتی تھیں۔

ان کی وفات کہاں ہوئی؟ اس میں اختلاف ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں فوت ہوئیں۔ ایک روایت کے مطابق مکہ معظّمہ میں' اور ایک روایت کی رو

سے کوفہ میں انتقال کیا- یہ بھی منقول ہے کہ آخری عمر میں کوفے چلی گئی تھیں -وہاں سے حج کے لیے مکہ معظمہ گئی تھیں کہ عرفات کے میدان میں داعی اجل کو لبیک کہا-

معاذہ غفاریہ

حضرت معاذہ غفاریہ رضی اللہ عنہا اس قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں جس سے مشہور صحابی حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ تعلق رکھتے تھے۔اسد الغابہ میں ابن اثیر نے ان کے حالات تحریر کیے ہیں۔وہ لکھتے ہیں۔

ان کا شمار اپنے دور کی فاضل عورتوں میں ہوتا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بے حد انس اور محبت رکھتی تھیں۔آپ کے ہر قول و حکم پر عمل کو ضروری قرار دیتی تھیں۔جب کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو سب سے پہلے آنحضرت کے فرمان اور عمل کا حوالہ دیتیں۔عقل و دانش میں حصہ وافر پایا تھا۔حضور کے ساتھ جنگ میں تشریف لے جاتیں اور مجاہدین کی خدمت کرتیں، مریضوں کی نگاہ داشت اور زخمیوں کی مرہم پٹی کے فرائض انجام دیتیں۔اس میں انھیں بڑی مہارت حاصل تھی۔

کشادہ دست تھیں اور نادار لوگوں کا خیال رکھتیں۔اگر غریب اور امیر کا جھگڑا ہوتا تو امیر کو غریب اور نادار پر رحم کے برتاؤ کی تلقین کرتیں۔ایک مرتبہ کھجور کے باغ کے ایک ملازم کا مالک سے تنازعہ ہو گیا۔انھیں معلوم ہوا تو مالک کے پاس گئیں اور اسے اللہ کے غضب سے ڈرایا اور فرمایا:

جب یہ تمھارا کام کرتا ہے، تمھارے باغ کی نگرانی اور حفاظت کے فرائض انجام دیتا ہے، کھجوریں اتارتا اور بازار میں فروخت کرتا ہے اور اس میں دیانت داری سے کام لیتا ہے، تو اس سے تلخ کلامی سے پیش آنے کا کیا مطلب؟ اگر تم اس پر ترس نہیں کر سکتے اور اس سے مہربانی کا برتاؤ نہیں کر سکتے تو ڈانٹ ڈپٹ بھی نہ کرو اور اللہ کی گرفت سے ڈرو۔

صحابہ ان کی انتہائی تکریم کرتے اور عزت واکرام سے پیش آتے۔

حضرت معاذہ غفاریہ رضی اللہ عنہا عورتوں کے فرائض منصبی بیان فرماتیں اور انھیں نصیحت کرتیں کہ قول و عمل میں اللہ کی تابع فرمان رہیں وہ فطرتاً سادگی پسند تھیں اور دنیوی جاہ و جلال اور شوکت و حشمت کے اظہار اور کروفر کی زندگی سے نفرت کرتی تھیں۔ایک مرتبہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ تشریف لائے تو کسی کام سے یہ ان کے ہاں گئیں۔دروازے پر دربان نے روک لیا اور اندر جانے سے منع کیا۔ انھوں نے فرمایا معاویہ ہم ہی میں سے ایک فرد ہیں' ان کی ماں بھی عرب کی ایک عورت تھی اور باپ بھی عرب تھا اور اونٹ چراتا تھا' اگر معاویہ ایک منصب پر فائز ہو گیا ہے تو کیا ہوا' میں بہر حال اندر جاؤں گی اور معاویہ سے ملوں گی۔

دربان نے سختی سے اندر جانے سے روکا تو ان کی آواز غصے سے بلند ہو گئی۔امیر معاویہ نے سن لیا کہ دربان ایک عورت سے الجھ رہا ہے اور اسے اندر آنے سے روکتا ہے۔انھوں نے باہر نکل کر دیکھا تو حضرت معاذہ غفاریہ رضی اللہ عنہا دروازے پر کھڑی تھیں۔انھوں نے احترام سے سلام کیا' انھیں اندر لے گئے اور تشریف لانے کی وجہ پوچھیں۔کہنے لگیں۔

معاویہ! اب تم بڑے آدمی ہو گئے ہو' تم اپنا ماضی بھول گئے' تم عرب کے رہنے والے ایک عام آدمی ہو' تم اب دروازے پر دربان مقرر کرتے ہو' تم نے جس نہج کی زندگی اختیار کر رکھی ہے' نہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے مطابقت رکھتی ہے' نہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں اس نوع کے تکلفات کا سراغ ملتا ہے' نہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس کے عادی تھے' نہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس اسلوب کو اپنایا اور نہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کبھی اس قسم کی باتیں کیں۔یہ حضرات اس دنیا کے بہترین انسان تھے' ان سے مخالفین اسلام خوف زدہ رہتے تھے۔ان کے صبح و مسا یاد خدا میں گزرتے تھے اور پوری دنیا ان سے مرعوب تھی۔ان کے رعب کی وجہ ان کے دربان نہ تھے' نہ ان کا یہ پر تکلف معاشرتی انداز تھا' بلکہ ان کی

نیکی‘ نرمی اور لوگوں کی بہی خواہی کا جذبہ تھا جو اللہ کی طرف سے انھیں ودیعت ہوا تھا۔ اگر وہ ان عادات و خصائل کے حامل ہوتے جن کے تم ہو تو اسلام کی تبلیغ کی راہ میں شدید مشکلات پیش آتیں اور سخت رکاوٹیں حائل ہو جاتیں۔ تم اللہ سے ڈرو اور لوگوں کے میل جول کی راہ میں دربانوں کی ناقابل عبور دیواریں کھڑی نہ کرو۔

ان کی اس گفتگو سے حضرت معاویہ بہت نادم ہوئے اور ان سے معذرت طلب کی!

کہنے لگیں معاویہ! تم اس وقت شام میں نہیں ہو‘ مدینہ میں مقیم ہو۔ تمھیں یہاں کے لوگوں کے ذہنی اور فکری رجحان کی رعایت رکھنا چاہیے۔ اس شہر کے لوگوں نے خلفا کے دروازوں پر کبھی دربان نہیں دیکھے‘ ان کی آنکھیں حکمرانوں کے شان و شکوہ سے ناآشنا ہیں۔ یہ سادہ معاشرے اور خیر کے عادی ہیں۔ تم مدینہ کا رخ کرو تو تکلفات کی دنیا کو شام ہی میں چھوڑ آیا کرو۔ ہم انھی لوگوں کی عزت کرتے ہیں جو ہمارے جذبات کا خیال رکھتے ہوں‘ جو مساکین کو امیروں پر ترجیح دیتے ہوں اور جن کے دروازے دربانوں سے خالی ہوں۔

ان کی اس گفتگو سے متاثر ہو کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسی وقت اپنے دروازے سے دربان ہٹا دیے اور جب تک وہ مدینہ میں رہے‘ بلا روک ٹوک ہر شخص کو آنے جانے اور بات کرنے کی آزادی دیے رکھی۔

حضرت معاذہ رضی اللہ عنہا کی سادگی اور حق گوئی کی وجہ سے ان کی عزت و احترام کا دائرہ بڑا وسیع تھا۔ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئیں‘ وہ بڑی عزت سے پیش آئے۔

ان کی وفات حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں ہوئی۔ وفات سے کچھ عرصہ پیشتر کسی بیماری میں مبتلا ہوئیں۔ اس سے افاقہ ہو گیا‘ لیکن بعد ازاں بیماری پھر عود کر آئی۔ کہا کرتی تھیں گزرے ہوئے دنوں پر نظر ڈالتی ہوں تو نیکی کی مقدار بہت کم دکھائی دیتی ہے‘ میں اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہوں۔ اس کی رحمت کی فراوانیوں

سے وہی لوگ مایوس ہوتے ہیں جن کا ایمان کمزور ہو' تاہم اس کا کیا کروں کہ برائیوں کا پلڑا بھاری اور نیکیوں کا ہلکا دکھائی دیتا ہے۔ اللہ کی رحمت کے سوا میرا کوئی سہارا نہیں۔

بیٹوں اور ایک بھائی نے انھیں قبر میں اتارا اور جنت البقیع میں مدفون ہوئیں۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو کئی روز کے بعد موت کی اطلاع پہنچی تو انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا اور دعائے مغفرت کی۔ عامل مدینہ کی وساطت سے بھائی اور بیٹوں کو تعزیت کا پیغام بھیجا۔

ام معبد بنت کعب انصاریہ

حضرت ام معبد بنت کعب بن مالک انصاریہ رضی اللہ عنہا مدینہ کے قریب ایک گاؤں کے رہنے والی تھیں۔ ان کا گاؤں اس راستے پر پڑتا تھا جو مکہ سے مدینہ کو آتا تھا۔

یہ ہجرت کے زمانے میں مسلمان ہوئیں' ان کے قبول اسلام کا واقعہ یہ ہے کہ جب مسلمان مکے سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آ رہے تھے تو اس زمانے میں مسلمانوں کے ایک قافلے نے ان کے گاؤں کے قریب قیام کیا۔ وہاں پانی کی ایک گھاٹ تھی جو اس گاؤں کے قبضے میں تھی۔ مسلمانوں نے وہاں کے باشندوں سے پانی استعمال کرنے کی اجازت مانگی۔ انھوں نے پانی کی اجازت بھی دے دی اور ان کے کھانے کا انتظام بھی کیا۔ عربوں کی مہمان نوازی ساری دنیا میں مشہور ہے۔ انھوں نے اہل قافلہ سے سوال کیا کہ تمھارے ادھر آنے کی کیا وجہ ہے اور تم کیوں ترک وطن کر رہے ہو؟ انھوں نے جواب میں ہجرت کا سارا پس منظر بیان کیا اور بتایا کہ ہم نے اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے مطابق یہ قدم اٹھایا ہے۔ اس سے وہ بہت متاثر ہوئے اور مسلمانوں سے کامل ہم دردی کا برتاؤ کیا۔ اس مقام پر مسلمانوں کا یہ قافلہ چار دن مقیم رہا اور ان کی مہمان نوازی سے بہت اثر پذیر ہوا۔ اس دوران میں اس قبیلے کے کچھ لوگوں نے اسلام بھی قبول کر لیا جن میں حضرت ام معبد بنت کعب بھی شامل تھیں۔

چار دن کے قیام کے بعد یہ قافلہ تو مدینہ منورہ کو روانہ ہو گیا لیکن اپنے پیچھے گاؤں کے باشندوں میں اسلام کے بارے میں طلب و جستجو کا ایک جذبہ چھوڑ گیا۔ ابھی ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ اس گاؤں کے چند معزز افراد مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے۔ وہاں انھوں نے مدینہ کے ان لوگوں سے ملاقات کی جن کے ساتھ وہ پہلے سے راہ و رسم رکھتے تھے' لیکن اب وہ لوگ اسلام سے بہرہ ور ہو چکے تھے' ان کے ساتھ انھوں نے رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری دی- آنحضرتؐ انھیں بہت محبت کے ساتھ ملے اور اسلام سے متعلق چند بنیادی باتیں بیان فرمائیں- ان لوگوں کے ساتھ حضرت ام معبد بھی تھیں- باقی لوگ تو چار پانچ روز کے بعد واپس چلے گئے' مگر حضرت ام معبد وہیں ٹھہر گئیں-

پندرہ دن کے بعد حضرت ام معبد رضی اللہ عنہا کے شوہر حضرت مالک انصاری رضی اللہ عنہ بھی جو اسلام قبول کر چکے تھے' مدینہ منورہ آگئے- انھوں نے پہلے تو اپنے ایک قرابت دار کے مکان پر قیام کیا' پھر مسجد نبوی میں آئے- کچھ دنوں کے بعد مدینہ کے ایک سرے پر اپنا مکان تعمیر کر لیا- اب یہ میاں بیوی اس مکان میں منتقل ہو گئے اور مستقل طور سے مدینہ منورہ کو اپنا مسکن قرار دے لیا-

مدینہ میں رہنے کے لیے ظاہر ہے انھیں خاص آمدنی کی ضرورت تھی اور آمدنی کے لیے کسی قسم کا کاروبار لازمی تھا' اس کے لیے پہلے تو حضرت مالک انصاری رضی اللہ عنہا نے کھجوروں کے ایک باغ میں ملازمت اختیار کی- یہ باغ میں جاتے اور وہاں کھجوریں اتارتے' جس کا انھیں کچھ معاوضہ مل جاتا' مگر بعد میں انھوں نے باغ سے کھجوریں خرید کر شہر میں فروخت کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا- ادھر ان کی بیوی حضرت ام معبد بن کعب بھی محنت مزدوری کرنے لگیں' یعنی دونوں میاں بیوی کسی پر بوجھ نہیں بنے- نئی جگہ میں انھیں ایک خاص ذوق اور روحانی لگن کشاں کشاں لے گئی تھی' وہاں نہ تو انھوں نے کوئی اجنبیت محسوس کی' نہ کسی کے محتاج ہوئے' نہ کسی پر بوجھ بنے' نہ اپنی ضروریات کے لیے کسی کے دروازے پر دستک دی-

مدینہ منورہ میں ان کے شوہر حضرت مالک رضی اللہ عنہ ایک دن حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ملنے گئے- حضرت علی نے ان کا خیر مقدم کیا اور تشریف لانے کی وجہ پوچھی- انھوں نے عرض کیا' میں مدینہ منورہ میں اجنبی نہیں ہوں' قریب کی بستی میں رہائش رکھتا تھا' اب یہاں آگیا ہوں- میرا فرض ہے کہ میں آپ کے کام آؤں اور آپ کی خدمت کا فرض انجام دوں- حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کی گفتگو سے بہت خوش

ہوئے اور فرمایا اللہ کا شکر ہے میں اپنی جگہ مطمئن ہوں۔ اگرچہ آپ مدینہ منورہ سے قریب تر ہونے کی وجہ سے انصار کے زمرے میں شامل ہیں تاہم اسلام کی وجہ سے یہاں آئے ہیں' میرا بھی فرض ہے کہ آپ کے حالات سے واقف ہونے کی سعی کروں۔ انھوں نے جواب میں اپنے ذرائع آمدنی کی وضاحت کی۔ حضرت علی نے فرمایا آپ کی آمدنی کے وسائل محدود ہیں اور میرے خیال میں اخراجات کا خانہ آمدنی کی بہ نسبت وسیع ہوگا۔ میں کوشش کروں گا کہ کوئی اور ذریعہ آمدنی پیدا ہو جائے' چنانچہ ان کی وساطت سے انھیں کوئی اور کام مل گیا اور آہستہ آہستہ آمدنی میں اضافہ ہونے لگا۔ چند ہی روز میں خاصے صاحب ثروت ہو گئے۔ آمدنی میں اضافے کے بعد انھوں نے مہاجرین کی بہت مدد کی۔

حضرت ام معبد بنت کعب رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث بھی روایت کیں۔ علامہ ابن عبدالبر الاستیعاب میں رقم طراز ہیں کہ انھوں نے سرور کائنات سے دو حدیثیں روایت کرنے کا شرف حاصل کیا۔

حضرت ام معبد رضی اللہ عنہا کے چند شاگرد بھی تھے۔ اصحاب سیر نے ان کے سب شاگردوں کے ناموں کی نشان دہی نہیں کی' البتہ یہ لکھا ہے کہ ان کے شاگردوں میں ان کے بیٹے حضرت معبد بن مالک انصاری بھی شامل ہیں۔

حضرت ام معبد رضی اللہ عنہا نے پچاس سال سے کچھ زائد عمر پا کر امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ۲۰ھ کو وفات پائی۔ ان کے جنازے میں جن حضرات نے شرکت کی ان میں خود حضرت عمر فاروق' حضرت علی کرم اللہ وجہہ' حضرت عثمان بن عفان' حضرت ابوہریرہ' حضرت طلحہ' حضرت ابوموسی اشعری اور حضرت زبیر بن عوام رضوان اللہ علیہم اجمعین ایسے جلیل القدر اور عظیم المرتبت صحابہ شامل تھے۔ اس عالی مرتبت خاتون کو جنت البقیع کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

ام معقل اسدی

طبقات ابن سعد اور تہذیب التہذیب کی روایت کے مطابق یہ ام معقل اسدی ہیں اور الاستیعاب میں ام معقل انصاری لکھا ہے۔

قبول اسلام کے وقت ان کی عمر کم و بیش اٹھائیس سال تھی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ نہایت ادب سے چند باتیں عرض کیں اور مسلمان ہو گئیں اور آپ کی بیعت کا شرف حاصل کیا۔ اس کے بعد ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئیں اور عرض کیا:

اسلام کیا ہے؟

انھوں نے فرمایا: اللہ کو ایک ماننا' آنحضرتؐ کو اللہ کا نبی تسلیم کرنا' اس کے فرشتوں کی تصدیق کرنا اور اس کے گزشتہ تمام نبیوں کو برحق جاننا اور جو کتابیں انبیا پر نازل کی گئی ہیں انھیں منزل من اللہ قرار دینا۔

عرض کیا: آنحضرت کو مکے والوں نے کیوں ترک وطن پر مجبور کیا؟

فرمایا: اس لیے کہ آپ نے انھیں توحید کی تبلیغ کی اور پتھر کے بتوں کی پوجا کرنے سے روکا اور اللہ کا یہ حکم سنایا کہ پرستش کے لائق صرف اللہ کی ذات ہے۔ اللہ ہی روزی رساں ہے اور اسی کے ہاں انسان کی زندگی اور موت کے فیصلے ہوتے ہیں۔ لیکن مکے والوں نے ان باتوں کو ماننے سے انکار کیا۔ آپ کو جادوگر اور مجنون گردانا' آپ کو پتھر مارے۔ جن لوگوں نے آپؐ کی نبوت کی تصدیق کی' انھیں بھی سزائیں دیں اور ان سے قطع تعلق کیا۔ جب معاملہ حد سے بڑھ گیا اور ان کی سرکشی اور ظلم و عدوان کی رفتار تیز ہو گئی تو اللہ کے حکم کے مطابق آپؐ نے اور آپؐ کے ساتھیوں نے مکے کی

سکونت ترک کر کے مدینے کی راہ لی اور اس شہر کو اپنا تبلیغی مرکز اور جائے سکونت قرار دیا- یہاں کے لوگوں نے آپؐ کا خیر مقدم کیا اور اب مسلمانوں کی حالت روز بروز بہتر ہو رہی ہے-

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ چند سیدھی سادی اور صاف باتیں حضرت ام معقل کے لیے بڑی اثر انگیز ثابت ہوئیں اور وہ اسلام کی عظیم بیٹی بن گئیں-

حضرت ام معقل اسدی رضی اللہ عنہا نے مختلف جنگوں میں بھی شرکت کی- یہ جنگ احد میں بھی شریک تھیں- جب اس جنگ میں ایک ناخوش گوار واقعہ سے متاثر ہو کر مسلمانوں کے پاؤں اکھڑے اور ان کے ثبات قدم میں لرزش پیدا ہوئی تو انھوں نے نہایت استقلال کا مظاہرہ کیا اور مسلمانوں کو روکنے کی کوشش کی- انھوں نے زور زور سے کہنا شروع کیا کہ اے فرزندان اسلام تم کہاں جا رہے ہو؟ تمھارے پیغمبر جن کی اتباع کا تم دم بھرتے ہو اور جن کی اطاعت کو تم اپنی زندگی کی آخری متاع ٹھہراتے ہو' وہ میدان جنگ میں موجود ہیں- تم انھیں چھوڑ کر آخر کیوں بھاگے جا رہے ہو؟ اگر تم نے ان کی بات نہ مانی اور میدان میں جم کر کفار کا مقابلہ نہ کیا تو تباہ ہو جاؤ گے اور تمھارے اعمال غارت ہو جائیں گے- آنحضرت کی اتباع اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ جہاں وہ کھڑے ہوں تم بھی وہیں کھڑے نظر آؤ اور جہاں سے وہ روکیں اس سے رک جاؤ-

ان کی اس للکار اور مسلمانوں کے لیے دردمندانہ پکار نے بڑا کام کیا اور بہت سے بھاگتے ہوئے مسلمان واپس میدان جنگ میں آگئے-

حضرت ام معقل رضی اللہ عنہا نے اس جنگ میں بڑی خدمات انجام دیں' زخمی مجاہدین کی مرہم پٹی کی اور ان کے لیے ضروری دوائیں مہیا کیں-

اندازہ کیجیے اسلامی عہد کے ابتدائی دور کی خواتین کس قدر بہادر اور شجاع تھیں اور خدمت انسانیت کا جذبہ ان کے اندر کس درجہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا- وہ اسلام کی سچی فدائی اور مسلمانوں کی اصلی بہی خواہ تھیں- ان کی زندگی کا واحد مقصد اسلام کی

خدمت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت تھا۔ ان کے نزدیک اگر کوئی عزیز ترین شے تھی تو وہ خدا اور اس کے رسول کے احکام تھے۔ وہ اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کا جائزہ لیتی تھیں اور کسی حالت میں بھی اسلام کی مقرر کردہ حدود سے باہر قدم نہ رکھتی تھیں۔

میدان جنگ میں جب چاروں طرف قتل و خون کا بازار گرم ہو گردنیں کٹ رہی ہوں، تلوار سے تلوار ٹکرا رہی ہو، لہو کے فوارے چھوٹ رہے ہوں، دشمن تیزی سے پیش قدمی کر رہا ہو اور حالات ابتر ہوتے جا رہے ہوں، ایسی صورت میں ایک عورت کا ثابت قدم رہنا اور خون خوار دشمن کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر اس کا مقابلہ کرنا اور اپنی صف کے ان لوگوں کو جن پر شکست کے آثار ہویدا ہوں، گھیر کر دشمن کے مقابلے میں لانا کتنا تحیر زا اور جرات مندانہ اقدام ہے۔ عہد نبوی کی خواتین کا یہی وہ کارنامہ ہے جو تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ کے لیے نقش ہو گیا ہے اور جس نے اسلام کی ان بیٹیوں کو ابد الآباد تک کے لیے زندہ کر دیا ہے۔

اگر ہم اسلام کی عظمت کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں ماضی کے ان تابندہ ابواب کو سامنے رکھنا چاہیے اور دور گزشتہ کے اس رشتے کو حال سے وابستہ کرنا چاہیے کہ اس کے بغیر نہ ہم حال کے تقاضوں کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ اپنے آپ کو مستقبل کی شاہراہوں پر قدم زن ہونے کے قابل بنا سکتے ہیں۔ ہماری خواتین کو حضرت ام معقل رضی اللہ عنہا ایسی بہادر اور نامور خواتین کے تذکروں سے باخبر رہنا چاہیے اور ان کے سنہری کارناموں کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح ہمارا ماضی تابناک اور پر شوکت تھا، اسی طرح ہمارا مستقبل بھی ضوفشاں اور زریں ہو۔

حضرت ام معقل اسدی رضی اللہ عنہا متعدد اوصاف کی مالک تھیں۔ وہ ایک طرف اگر میدان جنگ میں شامل ہو کر مجاہدین کی خدمت کرتی ہوئی نظر آتی ہیں تو دوسری طرف مسند حدیث آراستہ کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث روایت کیں۔ وہ دس احادیث کی راویہ ہیں۔ ان سے

مروی یہ دس احادیث کئی مستند کتابوں میں بیان ہوئی ہیں۔

ان کے ان تلامذہ کی تعداد بھی کافی ہے جنھوں نے ان سے احادیث روایت کیں اور پھر ایک سلسلہ اسناد کے ساتھ آگے اپنے شاگردوں کو بتائیں۔ ان کے تلامذہ میں حدیث و روایت کے سلسلے کی بڑی بڑی عظیم شخصیتیں شامل ہیں' مثلاً ان میں ایک مشہور تابعی اسود بن یزید ہیں' جنھیں تہذیب التہذیب اور الاستیعاب میں اسود ابوزید کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام اور یوسف بن عبداللہ بن سلام ایسے اعاظم رجال کے نام لائق تذکرہ ہیں۔ یہ سب حضرات تابعین کی جماعت میں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

حضرت ام معقل رضی اللہ عنہا نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں بصرہ کے مقام پر وفات پائی۔

ام منذر بنت قیس

الاستیعاب ابن عبدالبر' تاریخ طبری' تذہیب ذہبی اور طبقات ابن سعد کی روایت کے مطابق یہ ام منذر بنت قیس انصاریہ ہیں- طبرانی نے ان کا نام سلمی لکھا ہے اور قبیلہ بنی نجار کی ایک رکن بتایا ہے اور کہا ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خالہ تھیں-

بعض مورخین نے انھیں مدینہ منورہ کی مشہور اور باعظمت خاتون قرار دیا ہے- وہ لکھتے ہیں کہ یہ اپنے دور کی بے مثال عورت تھیں- ایک وقت میں کئی خوبیاں ان کی ذات میں سمٹ آئی تھیں- مختلف قبائل عرب کے حالات و کوائف کا بھی یہ علم رکھتی تھیں' ادبا و شعراء سے بھی متعارف تھیں' عرب خاندانوں کی پیچ در پیچ قرابتوں اور رشتے داریوں سے بھی آگاہ تھیں' اور یہ اس دور کا ایک بہت بڑا شعبہ علم تھا- فصیح و بلیغ لوگوں سے بھی واقفیت رکھتی تھیں' مختلف اصناف شعر پر عبور رکھنے والوں کے نام بھی انھیں یاد تھے' عرب کے جنگجو اور شجاع لوگوں سے بھی باخبر تھیں اور ان کے کارناموں کا علم رکھتی تھیں- غرض یہ اس عصر کی ان تمام اقسام علم سے شناسا تھیں' جن کا عوام و خواص میں چرچا تھا- پھر ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ انتہا درجے کی مہمان نواز تھیں' جودت و سخاوت میں بھی ان کا شہرہ تھا- ان تمام اوصاف نے جمع ہو کر ان کی شخصیت کو بہت اونچا کر دیا تھا اور ان کے مرتبے کو بڑھا دیا تھا-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت سے انھیں بڑی عقیدت تھی- حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے بالخصوص محبت کرتیں اور بار بار ان کے پاس آتیں- حضرت فاطمۃ الزہرا کو اکثر گود میں بٹھا لیتیں اور ان سے حد درجہ الفت کا اظہار فرماتیں- اسی طرح حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم سے بھی بہت پیار کرتیں اور فرمایا

کرتیں کہ جب رسول اکرم ان سے پیار کرتے تھے تو میں کیوں نہ کروں' ان سے وہی شخص پیار کرے گا جو آنحضرت سے مراسم محبت رکھتا ہو۔

حضرت ام منذر بنت قیس رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت اسلام کی تھی اور ان کے عمل و فضل کی کوئی سمت بھی ایسی نہ تھی جس میں بلندی نہ پائی جاتی ہو' وہ عالی صفت اور بلند اخلاق خاتون تھیں۔ انھوں نے جب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی سعادت حاصل کی' اس وقت سے کوئی ایسا عمل نہیں کیا جو منصب نبوت کے منافی ہو اور جس میں اطاعت رسول کے تقاضوں کے مجروح ہونے کا کوئی ادنیٰ اندیشہ بھی پایا جاتا ہو۔

حضرت ام منذر بنت قیس رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں شرکت جہاد کی سعادت سے بھی بہرہ اندوز ہوئیں۔ جنگ حنین میں بھی شریک تھیں اور جنگ خندق کے موقعے پر بھی انھیں خدمت اسلام کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ جہاد میں شریک ہونے والی خواتین کا حوصلہ بڑھاتیں اور انھیں اللہ کی مدد کا یقین دلاتیں۔ ایک جنگ کے موقعے پر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو ہمیشہ فتح یاب کرے گا' کیونکہ اس کے دین کی تکمیل کا راز آنحضرت کی کامیابی میں مضمر ہے۔ اگر خدانخواستہ آنحضرت میدان جنگ میں شکست کھا گئے تو اس کا اثر محض آپ کی ذات یا چند شرکائے جنگ پر ہی نہیں پڑے گا بلکہ اس کے اثرات کا دائرہ دور تک وسیع ہو گا اور یہ شکست اسلام کی شکست پر منتج ہو گی۔ خدانخواستہ اگر مخالفین اسلام جیت گئے تو ان کی جیت کفر کی جیت سمجھی جائے گی' لہٰذا یاد رکھو کفر ہمیشہ ناکام اور اسلام ہمیشہ کامیاب ہو گا۔

حضرت ام منذر رضی اللہ عنہا جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے بدرجہ غایت اظہار محبت فرماتی تھیں وہاں آپ کے کلام اور گفتگو کو بہت اہمیت دیتی تھیں۔ وہ آنحضرت کے اقوال و ارشادات پوری توجہ اور انہماک سے سنتیں اور ان کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش فرماتیں۔ انھوں نے آنحضرت کی مجلس میں بیٹھ کر

آپ سے سماع حدیث کیا اور یہ احادیث کتب احادیث میں مذکور ہیں۔

خود انھوں نے بھی باقاعدہ مسند حدیث بچھائی اور ان سے بہت سے لوگوں نے حدیث روایت کی، جنھوں نے حضرت ام منذر رضی اللہ عنہا سے احادیث روایت کیں، وہ تابعی کہلائے۔ تابعین میں سے ان کے شاگردوں میں جو حضرات شامل ہیں ان میں ایک یعقوب بن ابی یعقوب ہیں جو احادیث رسول کے مستند اور اونچے پایہ کے راوی ہیں۔ جن لوگوں نے یعقوب ابن ابی یعقوب سے احادیث روایت کیں، وہ تبع تابعی کہلائے۔ ان کی تعداد بھی رجال وسیرت کی مختلف کتابوں میں مذکور ہے۔

حضرت ام منذر بنت قیس رضی اللہ عنہا کے سال وفات کے بارے میں صحیح طور سے معلومات فراہم نہیں ہو سکیں۔ البتہ اتنی بات بعض کتابوں میں بیان کی گئی ہے کہ آخری دور حیات میں یہ مدینہ سے چلی گئی تھیں اور اس کی ایک نواحی بستی میں مقیم ہو گئی تھیں، جہاں ان کے ایک صاحب زادے رہائش پذیر تھے۔ وہاں انھوں نے عام عورتوں اور لوگوں سے میل جول بالکل ترک کر دیا تھا اور تنہائی کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ کیوں کہ تنہائی اختیار کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ ان کا فرمان ہے کہ لوگوں کے دل خدا کے خوف سے خالی ہو رہے ہیں اور اخروی فوائد وہی شخص حاصل کر پائے گا جو اپنے آپ کو فتنہ و فساد سے بچا کر رکھے گا اور جس کے عمل کا پلڑا اقوال کے پلڑے پر بھاری ہو گا۔ لوگو اللہ کی عبادت اور اس کے رسول کی اطاعت کرو کہ فلاح و کامرانی اسی میں ہے۔ عیش و آرام کو ترک کر کے انسانوں کی بہبودی کو مرکز توجہ بنا لو۔

ام مغیث

الاستیعاب(ابن عبدالبر)میں مرقوم ہے کہ حضرت ام مغیث رضی اللہ عنہا مدینہ کی ان خواتین میں سے تھیں جو روایت حدیث کا خاص ذوق اور شوق رکھتی تھیں۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی احادیث روایت کیں اور پھر انھیں یہ سعادت بھی حاصل ہے کہ آنحضرت کے ساتھ قبلتین (یعنی بیت المقدس اور کعبۃ اللہ) کی طرف منہ کر کے نماز ادا فرمائی۔

یہ عرب کی ان عورتوں میں سے تھیں جو تقریر اور زور بیان میں شہرت رکھتی تھیں۔زمانہ جاہلیت میں یہ بڑے بڑے مجمعوں میں زوردار اور مؤثر تقریر کرتیں اور ان کی سلاست و روانی اور فصاحت و بلاغت پر لوگ حیران ہو ہو جاتے۔گفتگو میں تیز تھیں، مگر مدبرانہ انداز اختیار کرتی تھیں۔اپنی بات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے دلائل مہیا کرنا ان پر ختم تھا۔ نپے تلے جملے اور عمدہ الفاظ استعمال کرتیں اور جو بات زبان سے نکالتیں پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ نکالتیں۔اگر اپنی بات میں کوئی کم زور پہلو محسوس کرتیں تو اسے مزید دلائل سے مزین کرنے کی سعی کرتیں۔زمانہ اسلام میں ان کے انداز و خطابت نے اور بھی ترقی کی اور ان کی یہ فصاحت و بلاغت اور زور بیان اسلام کی تبلیغ میں بڑا ممد ثابت ہوا اور بڑے بڑے فصیح اللسان ان سے متاثر ہوئے۔

خطابت انسان کی بہت بڑی خوبی ہے۔اگر اس کا مصرف بہتر ہو اور خطیب خلوص وصداقت سے بہرہ ور ہو تو ذہنوں کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیتا ہے اور آن کی آن میں فکرو فہم کی کایا پلٹ دیتا ہے۔حضرت ام مغیث رضی اللہ عنہا کی اس خداداد نعمت سے بے شمار لوگ اثر پذیر ہوئے اور ان کے فکری رجحان میں تغیر کی لہریں نمودار ہوئیں۔ ایک مرتبہ انھوں نے ایک مجمع کو خطاب کرتے ہوئے کہا :

لوگو تم اپنے نفع و نقصان سے اتنے بے خبر کیوں ہو' کیا تمھیں معلوم نہیں ایک روز اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے' جہاں تمھارے اعمال کا محاسبہ کیا جائے گا اور تمھاری نیکیوں اور برائیوں کو پرکھا اور جانچا جائے گا۔ تم اس دنیا میں اتراتے پھرتے ہو' اپنے اموال و اولاد پر نازاں ہو' قوت و شوکت پر فخر کرتے ہو اور محلات و قصور میں دل لگائے بیٹھے ہو۔ یاد رکھو یہ سب چیزیں عارضی ہیں' دوام صرف اللہ کی ذات کو ہے۔ جو شخص خیرات و حسنات کے لیے کوشاں ہے' وہی فوز و فلاح کا مستحق ہے اور جو برائی کو مرکز توجہ ٹھہراتا ہے' وہ ناکام و نامراد ہے۔ آؤ نیکی کے سرچشموں کو تلاش کریں اور اللہ کے حضور گردن جھکادیں۔

سادہ اور صاف معاشرے میں اس قسم کے چند جملے نہایت مؤثر ثابت ہوتے ہیں اور لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ فی الواقع ہمیں اپنے عمل و فعل کا جائزہ لینا چاہیے اور غلط اور صحیح میں حد فاصل کا سراغ لگانا چاہیے۔

حضرت ام مغیث رضی اللہ عنہا میں ایک خوبی یہ تھی کہ غلط بات کو برداشت نہ کر سکتیں' اگرچہ اظہار حق سے کتنا ہی نقصان پہنچتا ہو اور غلط چیز کی حمایت سے بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہوں' مگر یہ ہر حال میں حق کی حمایت اور برائی کی تردید کرتیں۔

دوسری خوبی ان میں یہ تھی کہ اپنا نقصان کر کے بھی دوسرے کو نفع پہنچاتیں اور کوئی ایسا قدم نہ اٹھاتیں جس سے دوسرے کے نقصان کا ذرا بھی احتمال ہو۔

تیسری چیز جو ان میں نمایاں تھی وہ انسانی ہمدردی تھی۔ اس سلسلے میں یہ بعض اوقات مسلم اور غیر مسلم کے درمیان کوئی امتیاز روا نہ رکھتیں۔ کوئی کافر اور منکر اسلام بھی تکلیف میں مبتلا ہوتا' یا بھوک پیاس سے دوچار ہوتا' یا معاشی ابتلا کا شکار ہوتا تو اس کی امداد کرتیں' اس سے ہمدردی کا برتاؤ کرتیں اور اس کو بہتر سلوک کا مستحق گردانتیں۔

چوتھی صفت ان میں یہ تھی کہ خدمت خلق کے لیے ہر آن تیار رہتیں' عورتوں کو بازار سے سودا سلف لاکر دیتیں اور ہر کام میں ان کی مدد کرتیں۔

یہ اور اس قسم کے بہت سے اوصاف تھے جو ان کی ذات میں جمع ہو گئے تھے اور جن پر یہ عمل پیرا تھیں۔

حضرت ام مغیث رضی اللہ عنہا کا انتقال مکہ مکرمہ میں ہوا۔ عامل مکہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ جنازے میں بہت سے حضرات نے شرکت کی' جن میں صحابہ اور مشہور تابعین کی خاصی بڑی تعداد شامل تھی۔

ایک روایت کے مطابق ان کی نماز جنازہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے پڑھائی اور وہ دفن کے وقت بھی قبر پر موجود تھے۔

حضرت عزہ اشجعی

حضرت عزہ اشجعی رضی اللہ عنہا ایک بلند فکر اور باعظمت خاتون تھیں- ان کے حالات علامہ ابن عبدالبر نے الاستیعاب میں اور دیگر مورخین نے اپنی تصانیف میں بیان کیے ہیں جو نہایت سبق آموز ہیں اور جن سے عمل و کردار کی نئی راہیں متعین ہوتی ہیں- یا یوں کہیے کہ ہمارے لیے وہ نقش راہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان میں اخلاق و عمل کی ایک دنیا سمٹی ہوئی نظر آتی ہے-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے زمانے میں یہ بارہ تیرہ سال کی تھیں' لیکن زیرک اور عقل مند تھیں- اسلام کی آواز کانوں میں پڑی تو مسلمان ہو گئیں- قبول اسلام کے بعد عورتوں کے حلقے میں جاتیں اور اسلام کی تبلیغ کرتیں- زبان میں بڑا اثر تھا- معمر عورتیں بھی ان کی بات کا وزن محسوس کرتیں اور متاثر ہوتیں-

ان کی شادی خاندان ہی کے ایک شخص سے ہوئی تھی- ان کے شوہر ابتدا میں دائرہ اسلام سے باہر تھے- بعد میں اسلام قبول کر لیا اور اسلام کے مبلغین میں ان کا شمار ہونے لگا- بعض جنگوں میں بھی شرکت کی اور مسلمانوں کی طرف سے داد شجاعت دی- ان کے تین لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں- یہ بھی ماں باپ کے نقش قدم پر چلے-

حضرت عزہ اشجعی رضی اللہ عنہا کو کئی غزوات میں شرکت کا موقع ملا اور مسلمان مجاہدین کی خدمت کی- یہ معزز خاتون رحم دل' نرم طبیعت اور لوگوں پر ترس کرنے والی تھیں-

ایک مرتبہ ایک مقروض عورت ان کے پاس آئی اور کہا کہ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں' شوہر بیمار ہے' ماں باپ غریب ہیں اور آمدنی کے ذرائع محدود ہیں- یہ اس عورت کی بات سن کر بڑی متاثر ہوئیں اور ان کی اتنی مدد کی کہ اس کا قرض بھی ادا ہو گیا اور

بچوں کی بھی امداد ہو گئی۔

اسی طرح ایک معمر خاتون نے آکر کہا کہ میرے ہمسائے میرے ساتھ اچھے تعلقات نہیں رکھتے۔ میں عمر رسیدہ عورت ہوں۔ تمام دن گھر میں بیٹھی رہتی ہوں' کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچاتی۔ مگر میرے ہمسائے کچھ دوسری طبیعت کے مالک ہیں۔ وہ مجھے خواہ مخواہ پریشان کرتے ہیں۔ دیوار پر سے کوڑا کرکٹ میرے مکان کے صحن میں پھینک دیتے ہیں' میری دیواروں پر چڑھ جاتے ہیں' ان کے بچے میرے مکان کی چھت پر اچھل کود کرتے ہیں' دیوار کے اوپر سے میری طرف پانی پھینک دیتے ہیں' میں کچھ کہتی ہوں تو لڑنے کو آتے ہیں۔ آپ انھیں سمجھایئے کہ ایسی حرکتیں شرافت کے منافی اور حق ہمسائیگی کے خلاف ہیں۔ چنانچہ حضرت عزہ اشجعی رضی اللہ عنہا نے ان لوگوں کے گھر جا کر انھیں سمجھایا' ان کو ہمسائے کے حقوق سے آگاہ کیا' بوڑھوں کی خدمت کی طرف توجہ دلائی' دوسروں کے جذبات کا احترام کرنے کی تلقین کی اور اچھے اسلوب سے کہا کہ لوگوں کی خدمت بہت بڑی نیکی اور انھیں تنگ کرنا بہت بڑی برائی ہے اور نیکی سے التزام اور برائی سے اجتناب ضروری ہے۔

ایک دفعہ ایک عیسائی عورت آئی اور کہا میرا شوہر وفات پا گیا ہے' چھوٹے چھوٹے بچے ہیں' جن کا پیٹ پالنے کے لیے میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔ مہربانی فرما کر میری اعانت کیجیے۔ عیسائی عورت کی بات سنی' اسے تسلی دی' اکل و شرب کا سامان دیا اور پہننے کے لیے کپڑے مہیا کیے اور فرمایا تمھیں جب بھی کسی چیز کی ضرورت ہو یہاں آ جایا کرو۔ مظلوم اور ضرورت مند کی امداد مسلمان کا فرض ہے۔ اس ہمدردی اور اعانت کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ عیسائی عورت اپنے بچوں سمیت مسلمان ہو گئی۔

ایک دفعہ مجاہدین کے لیے چندے کا اعلان ہوا' ان کو پتا چلا تو گھر کا سامان اٹھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور مجاہدین کی خدمت کا فرض انجام دیا۔

اس جلیل القدر خاتون نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع حدیث کا

شرف بھی حاصل کیا۔ان سے مروی احادیث کتب حدیث میں مذکور ہیں۔
خود ان سے جن حضرات نے احادیث روایت کیں' ان میں حازم اشجعی شامل ہیں۔
حضرت عزہ اشجعی رضی اللہ عنہا حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے آخری عہد خلافت میں مدینہ منورہ کے نواح میں ایک بستی میں فوت ہوئیں۔

حضرت عمارہ

عمارہ کی کنیت ام عاصم تھی اور لقب صابرہ تھا- حضرت عبداللہ بن جعفر کی کنیز تھیں- عبداللہ بن جعفر ان کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں-

عمارہ جن خصوصیات کی حامل تھی وہ خصوصیات بہت کم عورتوں میں پائی جاتی ہیں- وہ بڑی بلند اخلاق' شیریں کلام' روشن دماغ' نہایت ایثار پیشہ تھیں- ان میں جرات و شجاعت بھی خوب پائی جاتی تھیں- میدان جنگ میں زخمیوں کی خدمت کرتی تھیں' بڑی بڑی مصیبتوں اور مشکلوں کے وقت بھی ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آتی تھی-

وہ ہمیشہ طلوع آفتاب سے چار گھنٹے قبل بیدار ہوتیں اور نماز تہجد ادا کرتیں- پھر ذکر اذکار میں مصروف ہو جاتیں- جب موذن کی اذان کانوں میں پڑتی تو فرماتیں

آہ! کیا ابھی سے صبح ہو گئی؟ بعض دفعہ ایسا ہوتا کہ تمام رات عبادت میں گزار دیتیں اور عشا کے وضو سے فجر کی نماز پڑھتیں' یعنی ایک لمحے کے لیے بھی نہ سوتیں- عبادت کا یہ ذوق آخر دم تک ان میں قائم رہا-

حضرت عمارہ اسلام کی دعوت و تبلیغ سے بھی انتہائی شغف اور دل چسپی رکھتی تھیں- اگرچہ حالات ناموافق تھے تاہم انھوں نے بے حد عزم و استقلال سے عراق اور شام کی عورتوں میں اسلام کی تبلیغ شروع کی' جن معروف خاندانوں کی خواتین کے ہاں آنا جانا تھا' ان سب کو اسلام کی دعوت دی اور وہ ان کی تبلیغ سے حلقہ بگوش اسلام ہوئیں- بعض اوقات حضرت عمارہ قبائل عرب کی غریب عورتوں کے پاس جاتیں' ان کو اسلام کے فضائل بتاتیں اور ان کے دکھ درد میں شریک ہوتیں- ان کی مساعی حسنہ سے دو سو عورتیں دائرہ اسلام میں داخل ہوئیں-

حضرت عمارہ کے بارے میں حضرت ام خالدہ کا بیان ہے کہ عمارہ اپنے فضائل و خصوصیات کے اعتبار سے عرب کی عورتوں میں منفرد حیثیت رکھتی تھیں۔اسی وجہ سے بہت سی یہودی اور عیسائی عورتوں نے کوشش کی کہ وہ اسلام ترک کر کے یہودی یا عیسائی مذہب اختیار کر لیں۔اس کے لیے انھیں بڑا دنیوی لالچ بھی دیا گیا' لیکن ان کے سچے عقیدے میں سرمو فرق نہ آیا۔ایک مرتبہ ایک یہودی عورت ہاجرہ بنت اسحاق جو دمشق کی سب سے زیادہ مال دار عورت تھی' عمارہ سے کہنے لگی :

عمارہ تم کس درجہ خوب صورت ہو' کتنی قابلیت کی مالک ہو' کتنی فاضل ہو' پورے عرب میں تم جیسی خوبیوں کی حامل ایک عورت بھی نہیں۔ لیکن افسوس تم عبداللہ بن جعفر کی کنیز کی حیثیت میں زندگی بسر کر رہی ہو' مسلمانوں نے تیری قدر نہیں پہچانی۔ میری تمنا ہے' میں تم کو اپنی بہن بنالوں' اپنے ساتھ رکھوں اور اپنی جائداد کا ایک حصہ تمھیں دے دوں' کیا تم یہودی مذہب اختیار کر لو گی ؟

حضرت عمارہ نے جواب دیا :

میں بے شک عبداللہ بن جعفر کی ایک معمولی کنیز ہوں' لیکن وہ مجھے حقیر نہیں سمجھتے۔اگر سمجھتے ہیں تو اسلام مجھے حقیر نہیں سمجھتا۔اسلام کے نزدیک سب سے اچھا وہ ہے جس کے عمل اچھے ہیں۔اللہ کا فرمان ہے تم میں زیادہ عزت والے وہ ہیں جو زیادہ پرہیز گار ہیں۔

اب رہا جائداد کا معاملہ تو بہن ہاجرہ! میں تمھیں یقین دلاتی ہوں کہ اگر تم عراق کی فرماں روائی بھی میرے حوالے کر دو تو میں پھر بھی اسلام ترک نہیں کروں گی' کیوں کہ اسلام ہی سچا مذہب ہے۔

عمارہ رضی اللہ عنہا کا یہ فیصلہ کن جواب سن کر ہاجرہ بنت اسحاق اس کی طرف سے بالکل ناامید ہو گئی۔

حضرت عبداللہ بن جعفر کی عادت تھی کہ وہ ہمیشہ عمارہ کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔جہاں جاتے اسے ساتھ لے جاتے۔ایک دفعہ اپنے کسی کام کے لیے حضرت امیر

معاویہ سے ملنے دمشق گئے۔اس طویل سفر میں بھی وہ عمارہ کو ساتھ لے گئے۔

حضرت ام خالدہ کا بیان ہے کہ عمارہ میں جہاں بہت سی خوبیاں پائی جاتی تھیں وہاں ایک نقص یہ تھا کہ وہ کسی قدر تیز مزاج تھیں۔اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو' ایک مرتبہ عبداللہ بن جعفر سے کسی بات پر تکرار ہوگئی اور پندرہ دن تک بات چیت کا سلسلہ بند رہا۔ عبداللہ بن جعفر ان سے بے حد مانوس تھے' اس ناخوش گواری کی وجہ سے اکثر پریشان رہتے۔اسی پریشانی کے زمانے میں انھوں نے ایک کنیز عارفہ سے کہا۔

اگر تم عمارہ سے میری صلح کرادو تو میں تمھیں ایک اشرفی انعام دوں گا۔

عارفہ نے اس بات کا ذمہ لے لیا اور عمارہ سے کہا کہ اب تم حضرت عبداللہ بن جعفر سے صلح کرلو۔یہ مشورہ سن کر عمارہ سخت ناراض ہوئیں اور کہنے لگیں۔

افسوس تم نے میرے رنج و غم کو تازہ کردیا۔اب میں تم سے بات کرنا نہیں چاہتی۔

عارفہ نے کہا اس صلح کے نتیجے میں عبداللہ بن جعفر مجھے ایک اشرفی انعام دیں گے۔میری خاطر صرف ایک دن کے لیے صلح کرلو۔دوسرے دن پھر لڑائی کرلینا۔ عمارہ رضی اللہ عنہا یہ بات سن کر بے اختیار ہنس پڑیں اور حضرت عبداللہ بن جعفر سے صلح کرلی۔

حضرت عمارہ کی طبیعت ۷ ربیع الثانی ۷۱ ہجری کو ناساز ہوئی اور نوروز کی بیماری کے بعد ۷ا ربیع الثانی ۷۱ ہجری کو ان کا انتقال ہوگیا۔

حضرت درہ بنت ابولہب

تاریخ اسلام کا یہ عجیب باب ہے کہ جن افراد اور خاندانوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام کی اپنے دور میں سب سے زیادہ مخالفت کی' انہی کی نسل سے ایسے لوگوں نے جنم لیا جو اسلام کے بہت بڑے معاون اور مخلص خادم ثابت ہوئے اور جن کے آباواجداد کی طاقت اسلام سے متعلق مخالفانہ سرگرمیوں میں صرف ہوتی رہی تھی' اب خود ان کی طاقت کے استعمال کا اصل مرکز اسلام کی حمایت قرار پایا- انھوں نے اپنا انداز حیات اور اسلوب فکر بالکل بدل لیا- وہ اور ان کے اکابر حالت کفر میں اسلام کے خلاف مختلف محاذ قائم کرنے میں اگر ہمہ وقت مصروف عمل رہتے تھے' تو اب ان کی سطح ذہن یکسر منقلب ہو گئی اور وہ اسلام کے عظیم حامی اور مددگار کی حیثیت سے کفر کے خلاف سینہ تان کر کھڑے نظر آتے ہیں-

ابوجہل اسلام' پیغمبر اسلام اور تمام مسلمانوں کا شدید ترین دشمن تھا' اسلام کے نام لیواؤں کو جو تکلیفیں اس کے ہاتھوں برداشت کرنا پڑیں ہیں' اور کسی کے ہاتھوں برداشت نہیں کرنا پڑیں- یہ شخص مسلمانوں کو جہاں دیکھتا تھا ان پر ٹوٹ پڑتا تھا- اسلام میں پہلی شہادت ایک خاتون حضرت سمیہ بنت خباط رضی اللہ عنہا کو حاصل ہوئی اور ابوجہل کے ہاتھوں ہوئی' یعنی اسلام میں کسی مسلمان کا پہلا خون ابوجہل کے ہاتھوں بہایا گیا-

ابوجہل کے بیٹے عکرمہ نے بھی اسلام کی انتہائی مخالفت کی اور فتح مکہ (۸ ہجری) تک ہر جنگ میں شمشیر بکف ہو کر مسلمانوں کے خلاف میدان میں اترتا رہا' اس کی بیوی ام حکیم کچھ عرصہ پہلے مسلمان ہو چکی تھیں' فتح مکہ کے موقع پر عکرمہ مکہ سے بھاگ کر یمن چلا گیا تھا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی جان کی امان کا عہد لے

کر حضرت ام حکیم اپنے شوہر (عکرمہ) کو واپس مکہ مکرمہ لانے کے لیے یمن پہنچیں اور کہا: عکرمہ واپس مکہ مکرمہ چلو۔

عکرمہ نے جواب دیا: میں کس طرح مکے جا سکتا ہوں۔ میں نے ہمیشہ محمدؐ اور مسلمانوں کی مخالفت کی ہے اور ان کے خلاف بے دریغ تلوار چلائی ہے۔ اب وہ مجھے کیوں کر معاف کریں گے۔ جب میں ان کے سامنے گیا' مجھے قتل کر دیں گے۔

ام حکیم بولیں: مسلمانوں کے پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) انتہائی رحم دل اور نہایت عالی اخلاق ہیں۔ وہ ایک لمحہ کے توقف کے بغیر دشمن کو معاف کر دیتے ہیں۔ میں عرصے سے انھیں جانتی ہوں اور میں نے گہری نظر سے ان کے عمل و کردار کے ہر گوشے کا جائزہ لیا ہے۔ وہ تمھیں بلا تامل معاف کر دیں گے۔

عکرمہ نے کہا: کیا تم میری جان کی دشمن ہو اور مجھے ختم کرانے کے درپے ہو؟

ام حکیم نے جواب دیا: ہرگز نہیں' میں تمھاری از حد ہمدرد ہوں اور یہی جذبہ مجھے مکہ سے یمن تک لانے کا محرک ہوا ہے۔ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تمھارے لیے جان بخشی کا عہد لے لیا ہے۔

چنانچہ ام حکیم کی اس یقین دہانی پر عکرمہ واپس مکہ گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر پہنچا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ باہر کھڑے تھے۔ عکرمہ کو دیکھ کر اندر گئے اور آنحضرت کو اس کی آمد کی اطلاع دی۔ آپ نے اندر بلا لیا۔ عکرمہ آنحضرت کو دیکھتے ہی احساس ندامت میں ڈوب گیا اور کلمہ شہادت پڑھ کر حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔ اس کے بعد ابو جہل کے یہ بیٹے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ اسلام کے بہت بڑے خادم ثابت ہوئے اور ان کے باپ ابو جہل اور خود انھوں نے اسلام کی جو مخالفت کی تھی اس سے کہیں بڑھ کر اسلام کی حمایت کی۔ اسلام کے ایک دشمن خاندان کے اس فرد نے نصرت حق میں بہ درجہ غایت جدوجہد کی اور آخر کار درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔

اسی طرح آنحضرت کا چچا ابولہب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام اور

مسلمانوں سے انتہائی بغض اور بے حد دشمنی رکھتا تھا- ابولہب اور اس کی بیوی کی اسلام دشمنی کی خود قرآن نے شہادت دی اور سورہ تبت نازل کی- دنیا میں کروڑوں مسلمان ہر روز قرآن کی تلاوت کرتے اور سورہ تبت کے ذریعے ان دونوں پر لعنت اور پھٹکار بھیجتے ہیں- لیکن ایک وقت آیا کہ اسی ابولہب اور اس کی بیوی کے گھر میں اسلام کی شمع روشن ہوئی اور ان کی بیٹی درہ قبول اسلام کی نعمت سے متمتع ہوئی-

درہ بنت ابولہب بن عبدالمطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چچیری بہن تھیں- ان کی شادی حارث بن نوفل بن حارث بن عبدالمطلب سے ہوئی تھی- یہ بڑی باغیرت اور باحمیت خاتون تھیں- مسلمان ہوئیں تو مکہ میں رہنا ناممکن ہو گیا- ابولہب کے کسی خاندان کے کسی فرد کا اسلام قبول کر لینا لوگوں کے لیے بڑا ہی تعجب خیز اور تحیر انگیز واقعہ تھا- کفار مکہ یہ توقع نہیں رکھتے تھے کہ اتنے بڑے دشمن اسلام کے گھر میں اسلام داخل ہو سکتا ہے اور پیغمبر اسلام سے اس درجہ شدید عداوت رکھنے والے کی اولاد محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت و نبوت پر ایمان لا کر کلمہ شہادت پڑھ سکتی ہے- چونکہ ان کے نزدیک یہ ایک ان ہونی اور غیر متوقع بات تھی' لہٰذا مکہ کی وادیوں میں درہ کے اسلام کو برداشت نہ کیا جا سکا اور انھیں مکہ سے نکلنے اور مدینہ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا گیا-

حضرت درہ رضی اللہ عنہا مدینہ گئیں تو رافع بن معلیٰ زرقی کے مکان پر قیام کیا' جس طرح ان کا اسلام قبول کرنا کفار کے نزدیک باعث تعجب تھا' اسی طرح مسلمانوں کے لیے بھی یہ ایک حیرت انگیز بات تھی- چنانچہ جب حضرت درہ رضی اللہ عنہا کی آمد کی اطلاع مدینہ کی گلیوں میں پھیلی تو لوگ نہایت متعجب ہوئے اور بے شمار عورتیں ان کو دیکھنے اور ان سے ملنے کے لیے آئیں- سب سے پہلے خاندان بنو زریق کی عورتیں آئیں کیونکہ وہ اسی خاندان میں آکر ٹھہری تھیں- ان عورتوں نے حضرت درہ رضی اللہ عنہا سے کہا-

درہ! تم اسی ابولہب کی بیٹی ہو جس کے بارے میں سورہ تبت یدا ابی لہب

نازل ہوئی ہے- تمھارا باپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی چچا تھا اور تمھاری ماں آپؐ کی چچی تھیں- لیکن ان دونوں نے آنحضرت کو حد سے زیادہ مبتلائے آلام کیا اور انتہائی تکلیفیں پہنچائیں- آنحضرت پر ان کے ظلم و ستم کی بے پناہیوں کا یہ عالم تھا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس کے متعلق مستقل سورہ نازل کی- اس سورہ کے ذریعے تمھارے ماں باپ پر ایک دائمی سلسلہ لعنت جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا- جب تمھارے ماں باپ اس قماش کے تھے تو تمھیں اس ہجرت کا اجر ملے گا؟

درہ رضی اللہ عنہا جو تکلیفوں اور مصیبتوں کے پہاڑ عبور کر کے مدینہ پہنچی تھیں، اس قسم کی گفتگو سننے کو تیار نہ تھیں- ان باتوں سے انھیں بڑی ذہنی کوفت ہوئی، غم ناک مگر پر اعتماد لہجے میں بولیں :

میں بلاشبہ اسی ابولہب کی بیٹی ہوں، جس کی نسبت سورہ تبت یدا ابی لہب نازل ہوئی ہے- مجھے نہایت افسوس ہے کہ میرے ماں باپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیفیں پہنچائیں، مگر کیا اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک انہی لوگوں کا اسلام قبول کیا جاتا ہے جن کے آباواجداد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی اذیت نہ پہنچائی ہو؟ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچانے والوں کی اولاد اسلام سے بہرہ ور ہو جائے تو اسے کوئی اہمیت نہ دی جائے؟ کتنے ہی ایسے مسلمان ہیں جن کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ ان کے آباواجداد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبتلائے مصائب کیا، کیا ان کا اسلام قبول نہیں کیا جائے گا، ضرور قبول کیا جائے گا-

اس کے بعد وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور جو کچھ عورتوں نے کہا تھا وہ بیان کیا-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت درہ رضی اللہ عنہا کا ان کے حسب مرتبہ استقبال کیا- تعظیم و تکریم سے بٹھایا، تسلی دی اور ان کے قبول اسلام کا خیر مقدم کیا- اتنے میں نماز ظہر کا وقت ہو گیا- صحابہ کرام کے ساتھ نماز ظہر ادا کی اور منبر پر چڑھ

گئے۔لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔

لوگو! بعض لوگ میرے خاندان کے بارے میں مجھے تکلیف پہنچاتے ہیں۔ حالانکہ بخدا میرے اقربا کو یقیناً میری شفاعت پہنچے گی' یہاں تک کہ صد' حکم اور سلب بھی میری شفاعت سے مستفید ہوں گے۔(ان تین قبائل سے آنحضرت کی دور کی رشتے داری تھی۔ تم ایسی باتیں زبان سے نہ نکالو جو میرے لیے باعث اذیت ہوں۔

حضرت درہ رضی اللہ عنہا قبول اسلام کے بعد اسلام کی بہت بڑی خادمہ ثابت ہوئیں' جس قدر یہ کفر میں متشدد تھیں' اس سے کہیں بڑھ کر اسلام میں سخت اور اس کے احکام کی فرماں بردار تھیں۔ان سے چند احادیث بھی مروی ہیں' جن حضرات نے ان سے احادیث روایت کیں' ان میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت عبداللہ بن عمیرہ رضی اللہ عنہ ایسے جلیل القدر حضرات شامل ہیں۔حضرت درہ سے جو احادیث روایت کی گئی ہیں ان میں مندرجہ ذیل دو حدیثیں بڑی مشہور ہیں۔

ایک حدیث یہ کہ ایک مرتبہ کسی صحابی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ لوگوں میں بہتر شخص کون ہے ؟ آپ نے فرمایا جس میں تقویٰ زیادہ پایا جاتا ہو' جو لوگوں کو بہتر کاموں کا حکم دیتا ہو' برے کاموں سے روکتا ہو اور صلہ رحمی کرتا ہو۔

دوسری یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کسی مردے کے اعمال کے بدلے میں کسی زندہ کو اذیت نہیں دی جاسکتی۔

حضرت درہ رضی اللہ عنہ کے تین بیٹے تھے۔ایک کا نام عتبہ' دوسرے کا ولید اور تیسرے کا ابو مسلم تھا۔

وہ نہایت فیاض خاتون تھیں۔حضرت درہ رضی اللہ عنہا کا سال وفات معلوم نہیں ہو سکا۔

ہند بنت عتبہ

ہند عرب کی ایک جرات مند اور بلند حوصلہ خاتون تھی- باپ کی طرف سے اس کا سلسلہ نسب یہ ہے : ہند بنت عتبہ بن ربیعہ بن عبد شمس بن عبد مناف اور ماں کی طرف سے یہ ہے : ہند بنت صفیہ بنت اسید بن حارثہ بن اوقص بن مرہ بن بلال-

ہند بڑی فہیم وذی شعور خاتون تھیں- اسد الغابہ میں لکھا ہے کہ

> وہ ایک خوددار' باحمیت و غیرت مند' صائب الرائے اور نہایت ذی فہم عورت تھی-

اس کا پہلا نکاح فاکہہ بن مغیرہ مخزومی سے ہوا تھا' لیکن کسی وجہ سے یہ ازدواجی تعلق قائم نہ رہ سکا تو دوسرا نکاح ابوسفیان بن حرب سے ہوا' جس سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے-

ہند کا باپ عتبہ' شوہر ابوسفیان اور خود ہند اسلام اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شدید عداوت رکھتے تھے- ابو جہل اس گروہ کا قائد تھا- اس کی قیادت میں یہ لوگ مسلمانوں کو مبتلائے مصائب کرنے میں کوئی دقیقہ سعی فروگزاشت نہ کرتے- جب ابو جہل میدان بدر میں مارا گیا تو مشرکین و کفار کا یہ گروہ ابوسفیان کی قیادت میں مسلمانوں کے خلاف سرگرم عمل ہو گیا اور بدر میں ہزیمت اٹھانے کے بعد ان کا جوش انتقام اور بھڑک اٹھا- ۳ ہجری میں جنگ احد کا واقعہ اسی جذبہ انتقام کا نتیجہ تھا- اس جنگ میں لشکر کفار کے ساتھ ہند بھی شامل تھی جو مسلمانوں کے خلاف سخت نفرت و عداوت کا جذبہ رکھتی تھی- لڑائی کے موقعے پر یہ رجزیہ اشعار پڑھتی اور مخالفین اسلام کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف حقارت و دشمنی کے جذبات پیدا کرتی رہی- جنگ احد سے ایک سال پیشتر جنگ بدر میں اس کا باپ عتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں مارا گیا تھا' اس لیے اس کا جوش انتقام انتہائی تیز تھا' بالخصوص حضرت حمزہ سے نہایت دشمنی کا اظہار کرتی تھی اور اس تاک میں تھی کہ موقع ملے تو حمزہ کا کام تمام کر دیا جائے۔

اس کام کی تکمیل کے لیے اسی کی نظر وحشی پر پڑی۔ وحشی ایک شخص جبیر بن مطعم کا غلام تھا۔ ہند نے اس سے وعدہ کیا کہ اگر وہ حمزہ کو قتل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اس کو آزاد کرا دیا جائے گا۔ وحشی فن حربہ اندازی میں بہت تیز اور پوری مہارت رکھتا تھا۔ موقع کا منتظر رہا' جوں ہی حضرت حمزہ اس کے داؤ میں آئے' اس نے حربہ پھینکا جو ان کی ناف میں پیوست ہو کر جسم کے دوسری طرف نکل گیا۔ حضرت حمزہ نے آگے بڑھ کر وحشی پر تلوار کا وار کرنا چاہا' مگر زخم اتنا کاری تھا کہ قدم لڑکھڑا گئے اور وہ چکرا کر زمین پر گر پڑے۔ گرتے ہی روح اور جسم کا رشتہ منقطع ہو گیا۔

ہند جو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے خلاف شدید منتقانہ جذبات رکھتی تھی' حمزہ کو زمین پر گرتے دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑی اور ان کی لاش پر آ بیٹھی۔ اس موقعے پر اس نے انتہائی سنگ دلی اور قساوت قلبی کا مظاہرہ کیا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش کا مثلہ کیا یعنی اس کے ناک اور کان کاٹ دیئے اور ان کا ہار بنا کر گلے میں ڈالا۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا' اس سے بھی بڑھ کر یہ کیا کہ ان کا پیٹ چیر کر کلیجہ نکالا اور جوش عصبیت اور فرط غضب سے کلیجہ چباڈالا' مگر حلق سے نیچے نہ اتر سکا تو مجبوراً اگل دیا۔

یہ المیہ انتہائی دل خراش اور بہ درجہ غایت اذیت رساں تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا کے ساتھ یہ بہیمانہ اور وحشیانہ سلوک کیا گیا' جو آپؐ کے بہت بڑے معاون اور مددگار تھے۔ نہایت جری اور شجاع تھے۔ ہر موقعے پر آپؐ کا ساتھ دیتے تھے۔ مخالفین اسلام ان سے لرزاں رہتے تھے' کیوں کہ حمایت حق کے ہر مقام پر وہ پیش پیش رہتے تھے۔ ان کی شہادت اور پھر لاش کے ساتھ اس قسم کا غیر انسانی سلوک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے انتہائی موجب اذیت تھا۔

وقت گزرتا گیا تا آنکہ شہادت حمزہ یعنی جنگ احد سے پانچ سال بعد ۸ ہجری میں

فتح مکہ کا واقعہ رونما ہوا- مسلمان فوز و فلاح اور فتح و کامرانی کے ساتھ شہر میں داخل ہوئے- یہ وقت بھی بڑا عجیب منظر پیش کر رہا تھا- کفار مکہ یا تو مکہ سے بھاگ کھڑے ہوئے یا پھر دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے- ہند کے دل میں بھی انقلاب و تغیر کی ایک پرجوش لہر اٹھی اور اس کی زندگی کو ایک نئے موڑ پر ڈال گئی' یعنی اسلام اور پیغمبر اسلام کی ایسی سخت ترین دشمن خاتون ہند کا دل نور اسلام سے جگمگا اٹھا- وہ دوسری عورتوں کے ساتھ آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئیں' مگر اس حالت میں کہ عورتوں کے جھرمٹ میں چھپی ہوئی تھیں اور چہرے پر نقاب ڈال رکھا تھا- مقصد یہ تھا کہ کوئی پہچان نہ سکے اور اپنی خلاف اسلام سرگرمیوں پر کسی کے سامنے اظہار ندامت نہ کرنا پڑے' تاہم آنحضرت نے پہچان لیا- بیعت کا وقت آیا تو رسول اکرم کے ساتھ نہایت دلیری سے ہم کلام ہوئیں--- بولیں :

یارسول اللہ! آپ ہم سے کن کن باتوں کا اقرار لیں گے ؟

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : اس بات کا کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ-

بولیں : یہ شرط آپ نے مردوں پر تو عائد نہیں کی' تاہم ہمیں منظور ہے-

رسول اکرم نے ارشاد فرمایا : یہ کہ چوری نہ کرو-

ہند بولیں : میں کبھی کبھار اپنے شوہر کے مال سے کچھ خرچ کر لیا کرتی ہوں' معلوم نہیں یہ جائز ہے یا ناجائز ؟

رسول اکرم نے فرمایا : اپنی اولاد کو قتل نہ کرو-

ہند نے جواباً کہا : ہم نے تو اپنی اولاد کو بچپن سے پالا تھا' لیکن جب بڑے ہوئے تو آپ نے انھیں بدر میں قتل کر ڈالا-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن رحمت نہایت وسیع تھا- ہند کی گزشتہ تمام حرکات اور سرگرمیاں آپ کے سامنے تھیں- مگر پیشانی پر غصے کی کوئی شکن نمودار نہیں ہوئی' جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہند سچے دل سے دائرہ اسلام میں داخل ہو گئیں اور بغیر

کسی جھجک اور خوف ملامت کے آنحضرت کی صداقت و حقانیت کا اعلان کیا- وہ اسی مجلس میں بے ساختہ پکار اٹھیں-

یارسول اللہ! آج سے پہلے کوئی شخص آپ سے زیادہ میرے نزدیک قابل نفرت اور لائق عداوت نہ تھا' مگر آج کے بعد کوئی شخص مجھے آپ سے زیادہ محبوب نہیں ہے-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کے بعد حضرت ہند رضی اللہ عنہا واپس گھر پہنچیں تو یکسر بدل چکی تھیں اور اسلام نے ان کے انداز حیات میں ایک عظیم انقلاب بپا کر دیا تھا' گھر جاتے ہی بتوں کو توڑ دیا اور کہا کہ اب تک ہم تمھاری وجہ سے گم راہی کے عمیق گڑھے میں گرے رہے ہیں-

ہند نہایت بہادر خاتون تھیں- اسلام کے خلاف باقاعدہ جنگوں میں شریک ہوتی تھیں- قبول اسلام کے بعد بھی بہادری کی اس روایت کو پورے اہتمام سے اس طرح قائم رکھا کہ اب وہ اسلام کی حمایت اور کفر کی مخالفت میں سرگرم عمل تھیں- اس کی ایک مثال یہ ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت یا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ابتدائی زمانۂ خلافت میں علاقہ شام کی مشہور لڑائی جنگ یرموک لڑی گئی تو حضرت ہند رضی اللہ عنہا اس میں شامل تھیں اور رجزیہ اشعار پڑھ کر مسلمانوں میں جذبہ و جوش پیدا کرتی تھیں- ان کے شوہر حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ بھی اس جنگ میں شریک تھے- ہند بہت بڑی شاعرہ' نہایت فیاض اور لوگوں کی مددگار تھیں-

سیرت ابن ہشام میں مذکور ہے کہ ہجرت نبوی کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحب زادی حضرت زینب نے مکے سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ کی تیاری کی تو ہند ان کے پاس آئیں اور کہا:

"اے دختر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم اپنے باپ کے پاس مدینے جا رہی ہو' اگر کچھ سامان سفر اور زادِ راہ وغیرہ کی ضرورت ہو تو بتاؤ' میں مہیا کر دوں گی-"

اس سے پتا چلا کہ حالتِ کفر میں اور اسلام سے کھلی دشمنی کے باوجود ان میں روا داری اور ہمدردی کا جذبہ موجود تھا۔

حضرت ہند رضی اللہ عنہا کا انتقال حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ہوا۔ یہ اسی دن فوت ہوئی تھیں، جس دن حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے والد محترم حضرت ابو قحافہ رضی اللہ عنہ نے وفات پائی تھی۔ بعض سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ حضرت ہند کی وفات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ہوئی تھی۔ ان کی اولاد سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔

حضرت لیلیٰ بنت ابو حثمہ

مکہ کی بے آب وگیاہ زمین سے اسلام کی صدا بلند ہوئی تو لوگوں پر اس کے دو قسم کے اثرات مرتب ہوئے۔ کچھ لوگوں نے اس آوازہ حق کو بالکل اجنبی سمجھا اور ان کے ذہن و فکر نے اس کو قبول کرنے سے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ اس کا مقابلہ کیا اور پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کو جس قدر تکلیفیں پہنچا سکتے تھے پہنچائیں۔ کچھ لوگوں نے اس آواز کو انتہائی مسرت کے ساتھ قبول کیا اور اس اضطراب و بے چینی کے ساتھ اس کی طرف دوڑے کہ گویا عرصے سے اس کے منتظر بیٹھے تھے۔ جوں ہی اس آواز سے ان کے کان آشنا ہوئے' وہ اس کے سامنے جھک گئے اور بغیر کسی خوف و خطر اور بلا کسی مصلحت و اندیشہ کے اپنے آپ کو اسلام کی تحویل میں دے دیا اور والسابقون الاولون کے مقدس ترین زمرے میں داخل ہو گئے۔ ایسا بھی ہوا کہ بعض خاندانوں کی عورتیں شرف اسلام سے مشرف ہونے میں سبقت لے گئیں اور مرد پیچھے رہ گئے' اور اس کے برعکس ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ مردوں نے تو فوراً ہی دعوت اسلام قبول کر لی مگر ان کی عورتیں تذبذب میں پڑ گئیں۔ بعض ایسے بلند بخت گھرانے بھی ہیں جو صدائے اسلام کانوں میں پڑتے ہی بلا امتیاز مرد و زن سب کے سب اسی آن حلقہ بگوش اسلام ہو گئے --- لیلیٰ بنت ابی حثمہ رضی اللہ عنہا وہ خوش نصیب خاتون ہیں جو دعوت اسلام کے ابتدائی دور ہی میں اس نعمت عظمیٰ سے بہرہ ور ہو گئی تھیں اور قدیم ترین مسلمانوں کی صف اول میں اپنا شمار کرا لیا تھا۔

حضرت لیلیٰ بنت ابو حثمہ رضی اللہ عنہا خاندان قریش کے قبیلہ عدی سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کا نام لیلیٰ اور کنیت ام عبداللہ تھی۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

لیلیٰ بنت ابو حثمہ بن حذیفہ بن غانم بن عامر بن عبداللہ بن عبید بن عویج بن

عدی بن کعب بن لوئی۔

ان کا نکاح ایک شخص عامر بن ربیعہ عنبری سے ہوا تھا۔ انھیں یہ فخر حاصل ہے کہ ان کے شوہر حضرت عامر بن ربیعہ عنبری بھی ظہور اسلام کے آغاز ہی میں مسلمان ہوگئے تھے اور دونوں میاں بیوی نے ایک ہی وقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت اسلام کا شرف حاصل کیا تھا۔

حضرت لیلیٰ بنت ابو حثمہ رضی اللہ عنہا کا شمار ان حضرات میں ہوتا ہے جو قبول اسلام کے بعد حبشے کو ہجرت کر گئے تھے اور وہاں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد واپس مکہ آگئے تھے اور پھر مکہ مکرمہ سے مدینہ کو ہجرت کر گئے تھے' یعنی حضرت لیلیٰ کو دو ہجرتوں کا شرف حاصل ہے۔ علاوہ ازیں اس معزز خاتون نے قبلتین کی طرف نماز پڑھنے کا بھی اعزاز حاصل کیا' یعنی مسلمانوں کا پہلا قبلہ بیت المقدس تھا' بعد کو ان کا قبلہ بیت اللہ قرار پایا۔ حضرت لیلیٰ بنت ابو حثمہ رضی اللہ عنہا چونکہ اولین مسلمانوں میں سے ہیں اس لیے انھیں بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کا بھی فخر حاصل ہے۔ بعد ازاں وہ بیت اللہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتی رہیں۔

اسد الغابہ تاریخ کی ایک مشہور کتاب ہے' جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' آپ کے صحابہ کرام اور صحابیات کے حالات و سوانح میں بہت بڑے ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں ان کی ہجرت حبشہ کے بارے میں خود انھی کی زبانی ایک عجیب واقعہ لکھا ہے جو یہ ہے۔ فرماتی ہیں :

> مسلمانوں کے ہجرت حبشہ کے زمانے میں حضرت عمر دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ وہ مسلمانوں پر انتہائی ظلم اور تشدد کرتے تھے۔ ان کے مظالم کی بے پناہیوں سے تنگ آکر ہم نے حبشے کے سفر کا عزم کیا۔ مہاجروں کا قافلہ مکہ سے حبشہ کو روانہ ہونے والا تھا اور میں اونٹ پر سوار ہو چکی تھی کہ ادھر سے عمر کا گزر ہوا۔ ہمیں دیکھ کر وہیں رک گئے اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔

ام عبداللہ کہاں کا ارادہ ہے ؟

میں نے جواب دیا : عمر ! قبول اسلام کی پاداش میں تم نے ہم کو بے انتہا تکلیفیں پہنچائیں اور جن مشکلات میں مبتلا کر سکتے تھے 'کیا' تمھیں ہماری حالت پر کبھی رحم نہ آیا- تم ہمیں سزائیں دیتے رہے اور ہم برداشت کرتے رہے- ہمارا محافظ صرف اللہ تعالیٰ ہے- اللہ کی زمین تنگ نہیں ہے- جہاں جگہ ملے گی چلے جائیں گے-

حضرت لیلیٰ بنت ابو حثمہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ عمر میری بات سن کر خاموش ہو گئے اور گردن نیچی کر کے آگے قدم بڑھا لیے- چلتے ہوئے صرف یہ الفاظ زبان سے نکالے :

اچھا ام عبداللہ خوش رہو-

لیلیٰ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں' میرے شوہر عامر بن ربیعہ آئے تو میں نے ان سے یہ سارا واقعہ بیان کیا اور اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر جو عجیب قسم کی کیفیت طاری ہو گئی تھی' اس کا بھی نقشہ کھینچا تو حضرت عامر رضی اللہ عنہ نے کہا :

کیا تمھاری یہ خواہش ہے کہ عمر اسلام قبول کر لیں ؟

میں نے کہا : جی ہاں میری خواہش تو یہی ہے-

آخر اللہ نے اپنے فضل خاص سے ایسا ہی کیا اور میری خواہش پوری ہو گئی-

حضرت لیلیٰ بنت ابو حثمہ رضی اللہ عنہا نہایت پرہیز گار خاتون تھیں- فرماتی ہیں' ایک مرتبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھی- ادھر سے میرا بیٹا بھی آ گیا- میں نے اپنے بیٹے سے مخاطب ہو کر کہا-

تعال اعطيك

(ادھر آؤ' میں تمھیں کچھ دوں گی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : تم اسے کیا دینا چاہتی تھیں ؟

میں نے عرض کیا : کھجور-

رسول اکرم نے فرمایا: اگر تم اسے کچھ نہ دیتیں تو میں تمھیں جھوٹی سمجھتا-

یہ واقعہ خواتین کے لیے بالخصوص لائق اعتنا ہے- انھیں اپنے بچوں سے کسی انداز سے بھی جھوٹی بات نہیں کہنی چاہیے- وہ عام طور پر بچوں سے کہتی رہتی ہیں' میں تمھیں یہ دوں گی اور وہ دوں گی- حال آنکہ لینا دینا کچھ بھی نہیں ہوتا- ان کا بچوں کو اس طرح کہنا جھوٹ میں داخل ہے اور جھوٹ بہت بڑا گناہ ہے-

حضرت لیلیٰ بنت ابوحثمہ رضی اللہ عنہا کی تاریخ وفات اور ان کی اولاد کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا-

حضرت ام کلثوم بنت عقبہ رضی اللہ عنہا

ان کا اصل نام معلوم نہیں ہو سکا-ام کلثوم ان کی کنیت تھی- سلسلہ نسب یہ ہے :
ام کلثوم بنت عقبہ بن ابو معیط بن ابو عمرو بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف-
والدہ کا نام اروی بنت کریز تھا-حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا دونوں باہم اخیافی بہن بھائی ہیں-ام کلثوم کا والد' عقبہ بن ابو معیط قبیلہ بنو امیہ کا ایک ممتاز فرد اور صاحب عزوجاہ شخص تھا-اسے اسلام اور پیروان اسلام سے شدید عداوت اور نفرت تھی-وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسلام قبول کر کے یا مسلمانوں سے کسی نوع کی رعایت کر کے اپنے خاندان اور دوسرے سر کردہ لوگوں میں اپنی عزت و عظمت کو داغ دار کرے- لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا-ادھر وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کے درپے آزار تھا اور ادھر ان کی حرکتوں پر کارکنان قضاو قدر مسکرا رہے تھے اور خود اسی نور اسلام سے محروم گھر میں ایمان کی شمع روشن ہو رہی تھی' یعنی اس کی اپنی بیٹی ام کلثوم باپ کی مرضی کے خلاف کفر کی چاروں طرف پھیلی ہوئی تاریکی سے نکل کر اسلام کی ضوبار اور دین کی نور افشاں وادیوں میں داخل ہو رہی تھی-

صلح حدیبیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکوں سے یہ عہد کیا تھا کہ قریش کا کوئی آدمی اگرچہ وہ اسلام قبول کر چکا ہو' مدینہ منورہ میں داخل ہو گا تو واپس کر دیا جائے گا'اب ام کلثوم اس معاہدے اور شرط کی رو سے بڑی متحیر تھیں'کیونکہ انھوں نے صلح حدیبیہ کے بعد مکہ سے مدینہ کو ہجرت کی تھی اور ہجرت بھی بڑے تکلیف دہ اور حیران کن انداز سے کی تھی-یہ خاندان بنو خزاعہ کے ایک شخص کے ساتھ پاپیادہ مکہ سے مدینہ روانہ ہوا تھا' چونکہ یہ کفار مکہ سے چھپ کر اور بھاگ کر نکلی تھیں'اس لیے ان کے بھائیوں ---ولید اور عمارہ---کو معلوم ہوا تو بہن کے تعاقب میں نکلے اور ام

کلثوم رضی اللہ عنہا کے مدینہ پہنچنے کے دوسرے روز یہ بھی مدینہ جا پہنچے۔ معاہدے کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ام کلثوم کو ان کے ساتھ واپس بھیج دیا جائے۔ لیکن دوسری طرف ام کلثوم نے دربار رسالت میں التجا کی کہ میں عورت ہوں' سچے دل سے اسلام قبول کر چکی ہوں۔ اب اسلام ہی میرا اوڑھنا بچھونا ہے' میں کسی حالت میں بھی نہ اسلام ترک کرنا چاہتی ہوں' نہ واپس مکہ جا کر کفار مکہ کے مظالم کا شکار ہونا چاہتی ہوں۔ میں عورت ہونے کی وجہ سے جسمانی اعتبار سے معاشرے کا ایک کمزور فرد ہوں۔ مجھے خطرہ ہے کہ یہ لوگ مجھے مختلف قسم کے مصائب میں مبتلا کر دیں گے' اس لیے میں فریاد کناں ہوں کہ میری حالت پر رحم کیا جائے' میری جان کی حفاظت کی جائے اور میرے اسلام کا تحفظ کیا جائے' اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ مجھے کفار مکہ کے سپرد نہ کیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ میں ان کے مظالم برداشت نہ کر سکوں اور اسلام چھوڑنے پر مجبور ہو جاؤں۔

معاہدے کی رو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سلسلے میں بہت پریشان ہوئے۔ مگر چونکہ شرط معاہدہ میں عورتوں کی واپسی کا ذکر نہ تھا اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سورہ ممتحنہ کی ایک آیت اتری جس نے معاملے کی پوری طرح وضاحت کر دی۔ آیت کے الفاظ یہ ہیں:

یا ایھاالذین امنوا اذا جاکم المومنات مھاجرات فامتحوھن ط اللہ اعلم بایمانھن فان علمتوھن مومنات فلاترجعوھن الی الکفار۔ (سورہ ممتحنہ: ۱۰)

(مسلمانو! جب تمھارے پاس مسلمان عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو ان کا امتحان کرو۔ اللہ ان کے ایمان کو خوب جانتا ہے۔ اگر تمھیں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ مسلمان ہیں تو ان عورتوں کو کافروں کے حوالے نہ کرو۔)

حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا اب تک غیر شادی شدہ تھیں۔ مدینہ منورہ ہجرت کر کے آئیں تو ایک بلند مرتبت صحابی حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے ان کا نکاح کر دیا گیا۔ وہ جنگ موتہ میں شہید ہو گئے تو حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے عقد

میں آئیں- لیکن حضرت زبیر چونکہ سخت طبیعت کے مالک تھے' اس لیے نباہ نہ ہو سکا- مجبوراً طلاق لے کر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے نکاح کر لیا- وہ بھی وفات پاگئے تو فاتح مصر حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے عقد کر لیا- عمرو بن عاص اس زمانے میں مصر کے گورنر تھے- اس نکاح پر ایک ہی مہینہ گزرا تھا کہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا وفات پا گئیں-

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سے ایک لڑکی زینب پیدا ہوئی اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے ابراہیم' حمید' محمد اور اسماعیل پیدا ہوئے- حضرت زید بن حارثہ اور عمرو بن عاص سے کوئی اولاد نہیں ہوئی-

حضرت ام کلثوم بڑے فضل و کمال کی حامل تھیں- ان سے متعدد حضرات نے احادیث بیان کیں' جن میں حمید بن عبدالرحمٰن' حمید بن نافع اور ابراہیم بن عبدالرحمٰن شامل ہیں- صحیح بخاری' صحیح مسلم' ابوداؤد' نسائی اور ابن ماجہ وغیرہ کتب احادیث میں ان سے روایات مروی ہیں-

حضرت شفا بنت عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

شفا قبیلہ قریش کے خاندان عدی سے تعلق رکھتی تھیں- سلسلہ نسب یہ ہے: شفا بنت عبد اللہ بن عبد شمس بن خلف بن سداد بن عبد اللہ بن قرط بن زراح بن عدی بن کعب بن لوئی ہے-- والدہ کا نام فاطمہ تھا- ان کی طرف سے سلسلہ نسب یہ ہے: شفا بنت فاطمہ بنت ابی وہب بن عمرو بن عائذ بن عمر بن مخزوم-

شفاء بنت عبد اللہ کی شادی ابو حثمہ بن حذیفہ عدوی سے ہوئی تھی اور یہ ہجرت سے قبل مسلمان ہوئی تھیں-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انھیں بدرجہ غایت الفت تھی- آنحضرت ان کے مکان پر بھی تشریف لے جاتے اور وہاں آرام فرماتے تھے- آنحضرت کے لیے انھوں نے علیحدہ ایک بچھونا اور تہبند بنا رکھا تھا تاکہ ان میں آپ کا پسینہ جذب ہوتا رہے اور ان کو وہ بطور تبرک اپنے پاس رکھیں- چنانچہ ان کی زندگی میں یہ تبرکات ان کے پاس رہے- وفات کے بعد ان کی اولاد نے ان تبرکات کو نہایت عقیدت و احتیاط سے محفوظ رکھا- مروان کا دور آیا تو اس نے یہ سب کچھ ان کی اولاد سے لے کر اپنے قبضے میں کر لیا-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت شفاء بنت عبد اللہ رضی اللہ عنہا کو سکونت کے لیے ایک مکان دیا تھا' جس میں وہ خود اور ان کا بیٹا سلیمان سکونت رکھتے تھے- اسد الغابہ میں لکھا ہے کہ حضرت شفاء بنت عبد اللہ بڑی عقل مند اور ذی فضل و باکمال خاتون تھیں-

زمانہ جاہلیت میں اس شخص کو بڑی قدر و منزلت اور عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا جو دو چیزوں سے آگاہی رکھتا ہو-

ایک دم اور جھاڑ پھونک سے
دوسرے تحریر و کتابت سے

حضرت شفاء رضی اللہ عنہا ان دونوں سے نہ صرف واقف تھیں بلکہ ان میں بدرجہ کمال ورک اور مہارت رکھتی تھیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا یارسول اللہ میں زمانہ جاہلیت میں جھاڑ پھونک کیا کرتی تھی' اگر اجازت ہو تو اس کے الفاظ عرض کروں اور اس سلسلے کو جاری رکھوں؟ آپ نے اجازت دے دی اور فرمایا یہ الفاظ حفصہ کو بھی سکھا دو' چنانچہ ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے بھی ان سے جھاڑ پھونک کے الفاظ اور طریقے سے آگاہی حاصل کی۔ دم اور جھاڑ پھونک کے علاوہ انھوں نے حضرت حفصہ کو کتابت بھی سکھائی۔

حضرت شفاء بنت عبداللہ رضی اللہ عنہا کو چیونٹی کے کاٹے کا دم بھی آتا تھا اور یہ دم انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو بھی سکھایا تھا۔

خلیفہ ثانی امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ان کا انتہائی احترام کرتے تھے۔ الاصابہ فی تمیز الصحابہ میں لکھا ہے کہ بعض معاملات میں حضرت عمر فاروق حضرت شفاء بنت عبداللہ کی رائے کو ترجیح دیتے تھے اور ان کے شرف و فضیلت کی رعایت رکھتے تھے' بازار سے ضروریات کی خرید و فروخت کے معاملات انھوں نے ان کے سپرد کر رکھے تھے۔

ایک دفعہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کو بلا کر ایک چادر عطا کی۔ اسی وقت ایک اور خاتون عاتکہ بنت اسید کو بھی انھوں نے ایک چادر عنایت کی جو ان کی چادر سے بہتر اور خوب صورت تھی۔ حضرت شفا نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا آپ نے عاتکہ کو بہتر چادر دی ہے' حالانکہ میں اس سے پہلے مسلمان ہوئی ہوں اور آپ کی چچازاد بھی ہوں' علاوہ ازیں آپ کے بلانے پر آئی ہوں اور عاتکہ خود آئی ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا میں تمھیں بہتر چادر دیتا لیکن جب عاتکہ تم سے پہلے آ گئیں تو اخلاقاً مجھے ان کی رعایت کرنا پڑی' کیونکہ یہ حسب ونسب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب تر ہیں۔

حضرت شفا بنت عبداللہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث بھی روایت کی ہیں' جن کی تعداد سیرت نگاروں کے بیان کی رو سے بارہ تک پہنچتی ہے۔ جن حضرات نے ان سے احادیث روایت کی ہیں ان میں ایک ان کے بیٹے سلیمان اور دو پوتے ابو بکر اور عثمان شامل ہیں۔ علاوہ ازیں ابواسحاق' ابو سلمہ اور ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے اسمائے گرامی بھی اس پاک باز گروہ میں شامل ہیں۔

ان کی اولاد کی صحیح تعداد معلوم نہیں ہو سکی۔ صرف ایک بیٹے سلیمان اور ایک بیٹی کا پتا چلا ہے جو حضرت شرحبیل بن حسنہ کے عقد میں تھیں۔

حضرت شفا بنت عبداللہ رضی اللہ عنہا کے سن وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

حضرت ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا

"رسول اللہ کی محبت اصل ایمان ہے۔ جو دل آپؐ کی محبت سے خالی ہے وہ ایمان کی نعمت سے محروم ہے۔ اگر ایمان کی حلاوت سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہو تو سرور کائنات کی الفت و مودت کو قلب کی گہرائیوں میں اتار لو۔ اللہ کی عبادت' آنحضرت کی اطاعت و محبت' اور آپؐ کے مخالفین سے عداوت کے بغیر فلاح و بہبود کے تمام دروازے بند ہیں۔ کامیابی سے ہم کنار ہونے کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع شرط اولین ہے۔"

یہ الفاظ حضرت ربیع بنت معوذ نے خواتین مدینہ کے ایک اجتماع میں گفتگو کرتے ہوئے کہے۔ حضرت ربیع قبیلہ بنو خزرج کے خاندان بنو نجار سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے باپ کا نام معوذ اور ماں کا نام ام یزید تھا۔ پانچویں پشت میں ان کے ننھیال و ددھیال کا سلسلہ نسب باہم ایک ہو جاتا ہے۔

یہ خاتون ہجرت کے بعد اسلام لائیں اور صلح حدیبیہ کی بیعت رضوان میں شریک ہوئیں۔

ان کی شادی ایاس بن بکیر لیثی سے ہوئی۔ شادی کے دوسرے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مکان پر تشریف لائے اور بستر پر بیٹھ گئے' خوشی کا موقع تھا۔ لڑکیاں دف بجا بجا کر شہدائے بدر کے مناقب میں اشعار پڑھ رہی تھیں۔ آنحضرت کی تشریف آوری کے بعد ایک لڑکی کے دل میں جو الفت رسول موج زن ہوئی تو جوش محبت میں بول اٹھی:

وفینا بنی یعلم مانی غد

(اور ہماری محفل میں وہ نبی تشریف فرما ہیں جو کل کی باتوں سے باخبر ہیں۔)

آنحضرت نے اس لڑکی کو فوراً ٹوکا اور فرمایا وہی اشعار پڑھو جو پہلے پڑھ رہی تھیں۔

ربیع بنت معوذ ایک شجاع اور بے خوف خاتون تھیں۔ کئی جنگوں میں شریک ہوئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت و ہم رکابی کا شرف حاصل کیا۔ جنگوں میں بڑی تیزی اور چوکسی کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ کتب تاریخ میں مذکور ہے کہ میدان جنگ میں ہر طرف نگاہ رکھتی تھیں۔ نہایت پھرتی سے ادھر ادھر گھومتی پھرتیں۔ مجاہدین کو پانی پلانا' انھیں اسلحہ اور سامان حرب اٹھا اٹھا کر دینا' مجروحین کو طبّی امداد بہم پہنچانا' شہیدوں اور زخمیوں کو مدینے لے جانا اور غازیوں اور مجاہدوں کو دشمن کی زد سے بچانا اور ان کے اچانک حملوں سے مطلع کرنا۔ حضرت ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا کا اہم فریضہ تھا اور اس قسم کے فرائض کی انجام دہی سے وہ بہت خوش رہتی تھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے انھیں بہ درجہ غایت عقیدت اور انتہائی محبت تھی۔ کوئی چیز بھی آپؐ کے خلاف برداشت نہ کرسکتی تھیں۔ آنحضرت بھی ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ یہ کھجوروں اور چھواروں کے دو طباق لے کر آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور نہایت ادب کے ساتھ آپ سے یہ تحفہ قبول کرنے کی درخواست کی۔ آپ نے تحفہ قبول کیا اور اس کے بدلے میں سونا یا اس سے بنا ہوا کوئی زیور عنایت فرمایا۔

ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر تشریف لے گئے تو وضو کے لیے پانی طلب فرمایا۔ حضرت ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا نے پانی پیش کیا اور خود کھڑے ہو کر وضو کرایا۔

حضرت ربیع کی حمیت مذہبی' غیرت دینی اور جوش ایمانی کو بطور ضرب المثل بیان کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال اس واقعہ میں ملاحظہ کیجیے۔ ایک شخص ابو ربیعہ تھے۔ ان کی بیوی کا نام اسماء بنت مخرمہ تھا جو خاندان قریش سے تعلق رکھتی تھیں اور عطر بیچا کرتی

تھیں۔ایک مرتبہ وہ عطر فروخت کرتی ہوئی چند عورتوں کے ہمراہ ربیع بنت معوذ کے گھر آئیں اور ان کا نام ونسب دریافت کیا۔حضرت ربیع رضی اللہ عنہا کے والد نے خاندان قریش کے سردار ابوجہل کو میدان بدر میں قتل کیا تھا۔ربیع کا سلسلہ نسب سن کر اسما بنت مخرمہ کی رگ قریشیت جاگ اٹھی اور فوراً بولیں:

اچھا تو تم ہمارے سردار کے قاتل کی بیٹی ہو؟

حضرت ربیع رضی اللہ عنہا کو ابوجہل کے لیے لفظ "سردار" کی نسبت بہت ناگوار گزری اور جواب دیا:

سردار کی نہیں بلکہ غلام کے قاتل کی بیٹی ہوں۔

اسماء ابوجہل کی یہ توہین برداشت نہ کر سکی اور نہایت خفگی سے بولی:

مجھے میرے لیے تمھارے ہاتھ سودا بیچنا حرام ہے۔

حضرت ربیع نے برجستہ جواب دیا:

مجھ کو تم سے کچھ خریدنا حرام ہے۔مجھے تمھارے عطر سے غلاظت کی بو آتی ہے۔میں دشمن رسول کے مداح کے ہاتھ سے کوئی چیز خریدنا پسند نہیں کرتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک تمام سیرت نگاروں نے بیان کیا ہے اور اس کے لیے نہایت عمدہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔حضرت ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا سے بھی ابوعبیدہ بن محمد بن عمار ابن یاسر نے آپؐ کے حلیہ مبارک کے متعلق سوال کیا تھا۔انھوں نے نہایت شاندار اور جچے تلے الفاظ میں جواب دیا تھا۔کہا

یابنی لو رائیته لرائیت الشمس طالعة

(بیٹا!اگر تم نے آپؐ کو دیکھا ہوتا تو سمجھتا کہ آفتاب کو طلوع ہوتے دیکھا ہے۔)

حضرت ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا میں عزت نفس اور احساس خودی کا جذبہ بہت زیادہ تھا۔اس لیے بسا اوقات قوت برداشت جواب دے جاتی تھی اور گفتگو کی نوعیت کو بڑے نازک موڑ اور آخری مرحلے پر لے آتی تھیں۔یہی جذبہ شوہر سے

اختلاف اور پھر علیحدگی کا باعث بنا- کسی بات پر شوہر سے ناراض ہوئیں تو کہا جتنی چیزیں میرے پاس موجود ہیں' سب لے لو اور مجھ سے علیحدگی اختیار کر لو- شوہر مان گیا اور انھوں نے اپنی تمام چیزیں شوہر کے حوالے کر دیں' کیونکہ علیحدگی اور تفریق کی بنیادی شرط یہی ہے- صرف ایک قمیص باقی رہ گئی تو شوہر نے اس کا بھی مطالبہ کیا اور خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی عدالت میں دعوی دائر کر دیا- چونکہ شرط یہی تھی اور دعوے میں شوہر حق بجانب تھا- لہٰذا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فیصلہ دیا کہ ربیع کو یہ شرط پوری کرنی چاہیے اور ساتھ ہی شوہر سے کہا' اگر تم چاہو تو ان کے جوڑ باندھنے کی دھجی تک لے سکتے ہو' کیونکہ شرط کی رو سے وہ بھی تمھاری ملکیت ہے-

حافظ ابن حجر نے اصابہ میں لکھا ہے کہ یہ واقعہ ۳۵ ہجری کو پیش آیا-

حضرت ربیع علمی اعتبار سے بڑے فضل و کمال کی مالک تھیں- انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اکیس احادیث روایت کیں- حضرت عبداللہ بن عباس اور امام زین العابدین ایسے بزرگ حل مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے- جن لوگوں نے ان سے احادیث روایت کیں ان میں سلیمان بن یسار' ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن' عائشہ بنت انس بن مالک' عبادہ بن ولید اور عبداللہ بن محمد بن عقیل ایسے اعاظم رجال شامل ہیں-

ان کی اولاد کے بارے میں صرف یہ معلوم ہو سکا ہے کہ ان کے ایک لڑکے کا نام محمد تھا- سیرت کی کسی کتاب سے ان کا سن وفات معلوم نہیں ہو سکا-

حضرت ام ہانی

جناب ابو طالب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشفق چچا' بہت بڑے ہم درد اور معاون تھے۔ انھوں نے ہر موقعے پر آپ کی اعانت کی اور بار بار آپ سے کہا :

بھتیجے تمھارا دین سچا ہے' تم لوگوں کو حق کی دعوت دیتے ہو' تم اس کلمہ حق پر ڈٹے رہو' میں تمھاری ہر ممکن مدد کروں گا۔ میری موجودگی میں کوئی شخص تمھیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ تم ضرور کامیاب ہو گے' تم غریبوں کے خیر خواہ' یتیموں کے والی' بیواؤں کے خادم' جھوٹ کے دشمن' حق کے حامی اور نادار کے معاون ہو۔ اگر مجھے میری قوم کی ملامت اور طعنہ زنی کا خطرہ نہ ہوتا تو میں ضرور تمھارے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اسلام کے حلقے میں داخل ہو جاتا۔

چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ جناب ابو طالب کی زندگی میں نہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلکہ کسی مسلمان کو بھی مخالفین اسلام بر ملا ابتلائے مصائب نہیں کر سکے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا تھے اور عمر بھر آپ کے لیے ڈھال بنے رہے۔

جناب ابو طالب کے سوا اس خاندان کے تقریباً تمام افراد اسلام کی دولت بے بہا سے بہرہ مند ہوئے اور اس گھرانے نے آنحضرت اور اسلام اور مسلمانوں کی جو امداد کی وہ تاریخ اسلام کا ایک زرین باب ہے۔ انھوں نے مال تو مال جانیں تک اسلام کی راہ میں نچھاور کر دیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضرت ابو طالب ہی کے اولوالعزم فرزند تھے' حضرت جعفر طیار اور عقیل بھی انھی کے بیٹے تھے۔ ان حضرات نے جس بہادری اور شجاعت کا مظاہرہ کیا اور خدمت اسلام کی راہ میں جو قربانیاں پیش کیں وہ تاریخ کی کتابوں میں بہ تفصیل مرقوم ہیں۔ اس خاندان کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کے

صرف مرد ہی تبلیغ اسلام کے فرائض انجام نہیں دیتے رہے' ان کی پاک باز اور عفت مآب خواتین بھی اس فریضے کی انجام دہی میں پیش پیش نظر آتی ہیں- خواتین کے اس مقدس گروہ میں جناب ابو طالب کی دختر نیک اختر حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کا اسم گرامی خاص طور سے لائق تذکرہ ہے- اس عالی ہمت خاتون کا نام فاختہ ہے- ام ہانی ان کی کنیت تھی- ان کی والدہ کا نام فاطمہ بنت اسد تھا- یہ حضرت عقیل' حضرت جعفر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کی حقیقی بہن تھیں اور ہبیرہ بن ابی وہب مخزومی کے عقد میں تھیں-

حضرت ام ہانی بنت ابو طالب فتح مکہ یعنی ۸ ہجری تک اپنے آباواجداد کے دین کی پابند رہیں- فتح مکہ کے موقعے پر شرف اسلام سے مشرف ہوئیں- مکہ میں داخل ہونے کے کچھ دیر بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مکان پر تشریف لائے' غسل فرمایا اور نماز چاشت پڑھی- حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا نے اپنے دو مشرک عزیزوں کو اپنے مکان میں پناہ دے رکھی تھی- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے بھی ان کو پناہ دی اور ان سے کوئی تعرض نہیں کیا-

فتح مکہ کے بعد حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کا شوہر ہبیرہ نجران کی طرف بھاگ گیا تھا اور اس نے اپنے اس فرار کے جواز میں یہ شعر کہے تھے- وہ اپنی بیوی ام ہانی کو مخاطب ہو کر کہتا ہے-

لعمرك ماولیت ظهری محمدا
واصحابه جبنا ولا خیفة القتل
ولكننی قلبت امری فلم اجد
لیشفی غناء ان ضربت ولانبلی
وقفت فلماخفت ضیقة موقفی
رجعت لعود كا لهزرالی الشبل

(اے ام ہانی) تیری قسم! میں نے کسی قسم کی بزدلی یا قتل کے خوف کی بنا پر

محمد اور اس کے ساتھیوں سے راہ فرار اختیار نہیں کی-

بات یہ ہوئی کہ جب میں نے اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالی اور اس کا جائزہ لیا تو تیر اور تلوار سے کام لینے کو کافی نہ سمجھا-

جب تک میں نے یہ سمجھا کہ میری جائے قیام تنگ نہیں ہے' ٹھہرا رہا- پھر اس طرح پلٹ آیا جس طرح کہ شیر اپنے بچوں کی طرف لوٹ آتا ہے-)

مگر یہ شعر ابو طالب کی بہادر بیٹی کو مطمئن نہ کر سکے اور وہ اپنے شوہر کے فرار کو ہمیشہ بزدلی پر محمول کرتی رہی- ام ہانی کا صاف اور واضح نقطہ نگاہ یہ تھا کہ یا تو میدان جنگ میں بہادروں کی طرح مقابلہ کیا جائے یا پھر اسلام کی حقانیت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے' درمیانی راستہ کوئی نہیں ہے-

حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چچازاد تھیں اور آپ سے بے پناہ عقیدت و محبت رکھتی تھیں- خود آپ بھی ان کا بے حد احترام کرتے تھے- اس کی بہت سی مثالوں میں سے ایک مثال ملاحظہ ہو' فتح مکہ کے کچھ دن بعد آنحضرت حضرت ام ہانی کے مکان پر تشریف لے گئے- انھوں نے شربت پیش کیا- آپؐ نے نوش فرمایا اور ان کی طرف بھی گلاس بڑھایا- انھوں نے بلا جھجک گلاس پکڑا اور پی گئیں- تھوڑی دیر بعد آنحضرت کو معلوم ہوا کہ یہ تو روزے سے تھیں- آپؐ نے شربت پینے اور روزہ توڑنے کی وجہ دریافت کی تو سراپا عقیدت واحترام ہو کر بولیں :

میں اگرچہ روزے سے تھی' مگر آپ کا جھوٹا شربت واپس نہیں کر سکتی تھی-

ایک مرتبہ حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا :

حضور میں بوڑھی ہو چکی ہوں- نقاہت نے اعضاے جسم کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے' چلنے پھرنے سے عاجز آ گئی ہوں' کوئی ایسا عمل اور وظیفہ بتا دیجیے جو بیٹھے بیٹھے پڑھ سکوں تاکہ طبیعت مطمئن اور دل پر سکون رہے-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : یہ وظیفہ پڑھا کرو-

سبحان اللہ : سو مرتبہ

الحمد للہ : سو مرتبہ

اللہ اکبر : سو مرتبہ اور

لا الہ الا اللہ : سو مرتبہ

حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا سے چھیالیس احادیث مروی ہیں جو احادیث کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ان کے راویوں میں سے حضرت عبداللہ بن عباس' ابو صالح' ابو مرہ' عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ' مجاہد' عروہ' یحییٰ' ہارون' جعدہ' عبداللہ بن حارث بن نوفل' عبداللہ بن عیاش' شعبی' محمد بن جحفہ' کریب اور عطا ایسے جلیل القدر حضرات شامل ہیں۔

ان کی اولاد میں ہانی' یوسف' جعدہ اور عمرو بہت مشہور ہیں۔

ان کی وفات کی صحیح تاریخ معلوم نہیں ہو سکی' البتہ یہ بالکل صحیح ہے کہ اپنے بھائی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بعد تک زندہ رہیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں فوت ہوئیں۔

حضرت ام ورقہ بنت عبداللہ

نہایت اونچے کردار کی حامل خاتون تھیں۔ ہجرت کے بعد مسلمان ہوئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کا شرف حاصل کیا۔ انصاریہ تھیں۔

ماہ رمضان ۲ ہجری میں بدر کا معرکہ کارزار گرم ہوا تھا۔ کفر اور اسلام کے درمیان اس جنگ کو ایک فیصلہ کن موڑ کی حیثیت حاصل تھی۔ اس میں جہاں مسلمان مردوں نے شرکت کی اور نہایت بہادری و جانبازی سے کفر کے مقابلے میں داد شجاعت دی' وہاں مسلمان عورتیں بھی خاصی تعداد میں شریک ہوئی تھیں۔ بعض مسلمان خواتین کی خدمات اس سلسلے میں تاریخ اسلام کے ایک زرین باب کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔

جنگ بدر میں عورتیں اتنی زیادہ تعداد میں شامل ہوئی تھیں کہ بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مزید شرکت سے انکار کر دیا تھا اور حکم جاری فرمادیا تھا کہ جنگ میں عورتوں کی تعداد ضرورت سے زیادہ ہو گئی ہے' اس لیے اب انھیں ساتھ لے جانے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ یہ گھر پر رہ کر ہی خدمات انجام دیں۔ جن خواتین کو جنگ بدر میں حاضری سے روک دیا گیا تھا' ان میں حضرت ام ورقہ بنت عبداللہ رضی اللہ عنہا بھی شامل تھیں۔ ان کو جنگ میں حاضری کا بے حد شوق تھا اور چاہتی تھیں کہ ہر قیمت پر انھیں شرکت جہاد کی اجازت دی جائے۔ ان کے دل میں شوق شہادت اور جذبہ خدمت مجاہدین انتہائی راسخ تھا--- چنانچہ بدر کے لیے نفیر عام کا اعلان ہوا تو حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور ملتجی ہوئیں کہ مجھے شریکِ جہاد ہونے کی اجازت دی جائے' لیکن ان کے جانے سے پیشتر ہی اتنی عورتیں تیار ہو چکی تھیں کہ اب ان کے لے جانے کی کوئی صورت باقی نہ رہی تھی' اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم گھر پر ہی رہو۔

بولیں : یارسول اللہ میں ہر حال میں شریک جہاد ہونا چاہتی ہوں- مسلمانوں اور کافروں کے درمیان یہ پہلا معرکہ ہے اور اس کی حیثیت ایک فیصلہ کن جنگ کی ہے- میں کسی صورت میں بھی اس میں شرکت سے محروم نہیں رہنا چاہتی- مگر آنحضرت نہیں مانے -اب مزید اصرار بڑھا اور شرکت جہاد کے لیے وجہ جواز پیدا کرنے کی غرض سے اپنی قابلیت بتانا شروع کی- کہا یارسول اللہ میں زخمیوں کی مرہم پٹی کروں گی' مریضوں کی خدمت اور تیمارداری کروں گی' مجاہدین کو پانی پلاؤں گی' غازیوں کو میدان جنگ میں اسلحہ اٹھا اٹھا کر دوں گی' شہدا کی تکفین و تدفین میں مدد کروں گی' جو لوگ زیادہ مجروح ہوں گے انھیں کیمپوں اور اس سے بھی بڑھ کر مدینہ منورہ میں پہنچانے کی خدمت سرانجام دوں گی- لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رضامند نہ ہوئے-اس کے بعد نہایت لجاجت سے گویا ہوئیں :

یارسول اللہ مجھے درجہ شہادت پر فائز ہونے کی انتہائی تمنا ہے' براہ کرم آپ مجھے شہادت کے لیے موقع فراہم کیجیے اور جنگ میں شرکت کی اجازت مرحمت فرمائیے-

حضور نے فرمایا : تم گھر میں رہو' خدا تمھاری یہ تمنا پوری کرے گا اور تم ضرور ہی شہادت پاؤ گی- بہرحال انھیں جنگ بدر میں جانے کی اجازت نہ ملی- مگر مرتبہ شہادت پر بہرحال فائز ہو گئیں-

حضرت ام ورقہ رضی اللہ عنہا قرآن کی تعلیم سے بہرہ مند تھیں' اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو گھر کی عورتوں کا امام بنا دیا تھا- آنحضرت کی اجازت سے عورتوں کا ایک مؤذن بھی مقرر تھا- مؤذن اذان دیتا تھا اور حضرت ام ورقہ امامت کرتی تھیں- یہ سلسلہ عرصے تک جاری رہا-

حضرت ام ورقہ نے اپنے ایک غلام اور لونڈی سے یہ وعدہ کیا تھا کہ میرے مرنے کے بعد تم آزاد ہو' مگر ان غلام اور لونڈی دونوں نے اس وعدے کو کافی نہ سمجھا اور بغاوت پر اتر آئے اور حضرت ام ورقہ کی موت سے قبل ہی آزادی حاصل کرنا چاہی- چنانچہ ان کے دل سے انسانیت رخصت ہو گئی اور بہیمیت نے بسیرا کر لیا اور ایک

رات ان کی گردن میں چادر ڈال کر اس نیک سیرت اور بلند کردار خاتون کی زندگی کا خاتمہ کر دیا اور خود بھاگ گئے- یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کا واقعہ ہے- حضرت عمر کے کانوں میں روزانہ ان کی قرات قرآن کی آواز پڑتی تھی- جس رات انھیں شہید کیا گیا' اس کی صبح کو حضرت عمر ان کے مکان کے آگے سے گزرے تو قرآن پڑھنے کی آواز سنائی نہ دی- آپ نے لوگوں سے پوچھا: آج کیا بات ہے' خالہ ام ورقہ کے قرآن پڑھنے کی آواز نہیں آئی- اس کے بعد ان کے گھر گئے تو دیکھا کہ مکان کے ایک کونے میں مردہ حالت میں چادر میں لپٹی ہوئی پڑی ہیں- افسوس کیا اور فرمایا اللہ کے رسول نے سچ فرمایا تھا کہ تم شہید ہو گی- پھر منبر پر تشریف لائے اور لوگوں کو اس حادثے کی اطلاع دی اور ساتھ ہی اس لونڈی اور غلام کی گرفتاری کا حکم جاری کیا-

ان دونوں کو گرفتار کر کے خلیفۃ المسلمین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو انھیں پھانسی پر لٹکا دیا گیا- یہ دونوں پہلے اشخاص ہیں جنھیں اسلام کے بعد مدینہ منورہ میں سولی دی گئی-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام ورقہ بنت عبداللہ کو شہیدہ کہا کرتے تھے- حضرت عمر نے بھی ان کی شہادت کے بعد فرمایا تھا کہ آنحضرت انھیں شہیدہ قرار دیتے تھے اور فرمایا کرتے تھے آؤ شہیدہ کے گھر چلیں-

حضرت فاطمہ بنت اسد

"امی! میں آپ کا مخلص ترین خادم ہوں' اسلام اور انسانیت کے نقطہ نظر سے آپ کی خدمت میرے فرائض میں داخل ہے۔ میں ہمیشہ آپ کا تابع فرمان رہوں گا اور آپ کے حکم سے سر مو انحراف نہیں کروں گا۔ ماں باپ کی خدمت اور فرماں برداری اسلام کی بنیادی تعلیمات میں داخل ہے۔ میں ابو طالب کا بیٹا اور خاندان بنو ہاشم کا فرد ہوں۔ میں اسلامی احکام کو ہر آن پیش نگاہ رکھوں گا اور ان پر تازیست عمل پیرا رہوں گا۔"

امی! آپ خوش قسمت ہیں کہ رسول اللہ کی لخت جگر فاطمہ بنت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کی بہو بن کر آپ کے گھر آرہی ہیں۔ میں پانی بھروں گا اور باہر کے کام کروں گا اور فاطمہ بنت رسول اللہ چکی پیسنے اور آٹا گوندھنے میں آپ کی مدد کریں گی۔

"امی! آپ محض گھر کی نگہبانی کریں۔ ہم دونوں میاں بیوی آپ کی خدمت کریں گے۔ ہم آپ کی دعاؤں اور شفقتوں کے متمنی ہیں۔"

یہ الفاظ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنی والدہ حضرت فاطمہ بنت اسد کو اس وقت کہے تھے' جب ان کی شادی حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا سے قرار پاچکی تھی اور وہ ان کے گھر آنے والی تھیں۔

حضرت فاطمہ بنت اسد رضی اللہ عنہا ہاشمیہ تھیں۔ ان کے والد کا نام اسد بن ہاشم بن عبد مناف تھا۔ یہ جناب ابو طالب بن عبد المطلب کی بیوی اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی والدہ تھیں۔ بڑی صالحہ' بلند کردار' اسلام کی سچی خادمہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہائی محبت اور پیار رکھنے والی خاتون تھیں۔

سرزمین عرب میں دعوت اسلام بلند ہوئی تو قبائل عرب میں بنو ہاشم قبول

اسلام میں پیش پیش تھے- ان میں بھی ابو طالب کا گھرانا سب سے آگے تھا- جوں ہی دعوت اسلام ان کے کانوں میں پڑی' یہ اسلام کی طرف دوڑ پڑے- پھر انھوں نے اسلام کے لیے جو قربانیاں دیں وہ سب سے زیادہ ہیں- ان کی تفصیلات بڑی حیران کن اور ان کے مختلف گوشوں کی وضاحت نہایت تعجب انگیز ہے- یہ حضرات شجاعت و بہادری میں بھی جواب نہ رکھتے تھے اور اخلاص و دیانت میں بھی سب سے پیش پیش تھے- پیکر شجاعت اور سراپا بسالت تھے- مسلمانوں کے لیے انتہائی نرم اور مخالفین اسلام کے لیے نہایت سخت تھے- رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بدرجہ غایت محبت رکھتے تھے اور اپنے مال و جان اور دنیا کی ہر شے کو ہر آن آپؐ پر نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتے تھے- جناب ابو طالب کی بیوی حضرت فاطمہ بنت اسد رضی اللہ عنہا نے بھی اسی پاک باز اور مقدس گروہ میں شامل تھیں- اسلام کی دعوت کانوں میں پڑتے ہی خود بھی مسلمان ہوئیں اور اپنی اولاد کو بھی اس نعمت عظمیٰ سے متمتع کیا- حضرت فاطمہ بنت اسد رضی اللہ عنہا ہجرت مدینہ کا شرف بھی حاصل کیا-

جب وہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچیں تو ان کے نامور فرزند حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ کی شادی ہوئی- اہل بیت رضوان اللہ علیہم کی زندگی نہایت سادہ تھی- تکلفات دنیوی سے بالکل پاک--- گھر کے تمام امور خود ہی انجام دیتی تھیں' کوئی ملازم یا غلام نہ تھا- اسی بنا پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی والدہ سے کہا تھا کہ اب میری شادی ہونے والی ہے اور فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی بہو کی حیثیت سے آپ کے گھر آنے والی ہیں' ہم سب لوگ مل جل کر گھر کے کام کر لیا کریں گے-

حضرت فاطمہ بنت اسد رضی اللہ عنہا انتہائی عالی طینت اور اونچے اوصاف کی حامل خاتون تھیں- اسد الغابہ میں لکھا ہے کہ ان کی وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دردناک لہجے میں فرمایا تھا:

ابو طالب کے بعد ان سے زیادہ مجھ پر کوئی مہربان نہ تھا-

اصابہ میں ہے کہ یہ نہایت عبادت گزار خاتون تھیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی زیارت کو تشریف لے جایا کرتے اور ان کے گھر آرام فرمایا کرتے تھے۔

حضرت علی جعفر طیار اور عقیل رضی اللہ عنہم ان کی اولاد ذکور اور ام ہانی بجانہ اور ربطہ اولاذ اناث ہیں۔

ہجرت کے بعد فوت ہوئیں۔رسول اللہ زلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنی قمیص کا کفن دیا اور دفن سے پہلے قبر میں لیٹ گئے۔لوگوں نے تعجب سے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا ابو طالب کے بعد جس قدر انھوں نے مجھ پر شفقت کی ہے' اور کسی نے نہیں کی۔ میں نے اپنی قمیص اس لیے انھیں پہنائی ہے کہ جنت میں ان کو اہل جنت کا لباس میسر ہو' اور قبر میں اس بنا پر لیٹا کہ انھیں شدائد قبر سے نجات حاصل ہو۔

حضرت فاطمہ بنت قیس

فاطمہ بنت قیس حسین و جمیل' عاقل و فہیم' ادیبہ و عالمہ' صائب الرائے والفکر' باکمال وباہمت اور پاکیزہ خصال خاتون تھیں- یہ وہ دور اول کی مسلمان خاتون ہیں جو مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آگئی تھیں- ان کا پہلا نکاح ابو عمرو حفص بن مغیرہ سے ہوا تھا-

۱۰ ہجری میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ مسلمانوں کا ایک لشکر لے کر یمن کے علاقے میں گئے تو فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کے شوہر ابو عمرو بھی آپ کے ہم رکاب تھے- ابو عمرو کے یمن کو روانگی سے قبل میاں بیوی میں کسی معاملے میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا' جس نے بڑھتے بڑھتے طلاق کی شکل اختیار کر لی تھی- ابو عمرو یکے بعد دیگرے دو طلاقیں دے بھی چکے تھے- اب صرف ایک طلاق باقی تھی- حضرت ابو عمرو رضی اللہ عنہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زیر کمان جہاد یمن پر جانے لگے تو اپنے وکیل نکاح عیاش بن ربیعہ کی وساطت سے تیسری اور آخری طلاق بھی دے دی اور ساتھ ہی پانچ صاع کھجور اور پانچ صاع جو بطور نفقہ کے بھیج دیے- حضرت فاطمہ بنت قیس نے حضرت عیاش سے کہا کہ میرے لیے مکان اور اخراجات کا انتظام بھی کیا جائے- حضرت عیاش نے کہا تمھارے شوہر نے صرف یہ جو اور خرمے دیے ہیں' وہ جہاد پر جا رہے ہیں' نہ تو ان کے پاس مزید دینے کو کوئی چیز ہے اور نہ احکام شریعت کی رو سے ان کے ذمے تمھیں کچھ دینا واجب ہے- یہ تو محض انسانی ہمدردی اور بطور احسان کے دیا گیا ہے-

حضرت فاطمہ بنت قیس کو یہ جواب بہت ناگوار گزرا اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور تمام واقعہ عرض کیا- اس وقت حضرت خالد بن

ولید اور بعض دیگر حضرات بھی وہاں موجود تھے- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ بنت قیس سے دریافت کیا:

ابو عمرو نے تمھیں کتنی مرتبہ طلاق دی ہے؟

کہا: تین مرتبہ

فرمایا: اب تمھارا نان و نفقہ ابو عمرو پر واجب نہیں ہے- تم عدت کا زمانہ ام شریک کے یہاں گزارو' لیکن چونکہ ام شریک کے مکان پر ان کے اعزہ و اقارب کی خاصی آمدورفت رہتی تھی' اس لیے فرمایا حضرت ام ابن مکتوم نابینا اور تمھارے چچازاد بھائی ہیں' تم ان کے ہاں چلی جاؤ' چنانچہ آنحضرت کے تعمیل ارشاد میں وہ وہاں رہنے لگیں-

زمانہ عدت پورا ہوا تو کئی طرف سے پیغامات نکاح آنے لگے جن میں حضرت معاویہ بن ابو سفیان' حضرت ابو جہم اور حضرت اسامہ بن زید کے پیغام بھی تھے- انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ کیا تو آپ نے فرمایا معاویہ فقیر اور مفلس ہے' ابو جہم جھگڑالو اور تیز مزاج ہے' اسامہ بن زید ان دونوں سے بہتر ہیں- ان سے نکاح کر لو' لیکن حضرت فاطمہ بنت قیس کو اس سے کچھ تامل ہوا- وہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے زمرے میں شامل ہونے کی خواہاں تھیں- آپؐ نے فرمایا سوچتی کیا ہو' اسامہ سے نکاح کر لو- یہ تمھارے لیے بہتر رہیں گے- چنانچہ اسامہ کے عقد میں چلی گئیں' وہ خود کہتی ہیں' یہ نکاح میرے لیے بڑا ہی بابرکت ثابت ہوا اور میں لوگوں کے لیے قابل رشک بن گئی-

وہ اتنی عاقل اور فہیم خاتون تھیں کہ ۲۳ ہجری میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی تو ان کے بعد خلافت کے لیے جو مشورے ہوئے' وہ انھی کے مکان پر ہوئے اور یہ خود ان مشوروں میں شامل تھیں اور اس سلسلے میں ان کی رائے کو اہمیت دی جاتی تھی-

۵۴ ہجری میں ان کے شوہر حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو حضرت فاطمہ کو اس حادثہ جاں گسل سے شدید صدمہ پہنچا- اسامہ کی وفات کے بعد

دوسری شادی نہیں کی اور اپنے بھائی ضحاک کے پاس رہنے لگیں۔ جب یزید نے اپنے دور حکومت میں ضحاک کو کوفے کا گورنر مقرر کیا تو یہ بھی بھائی کے پاس کوفہ میں اقامت پذیر ہو گئیں۔

حضرت فاطمہ سے چوبیس احادیث مروی ہیں' جن کے راویوں میں سعید بن میتب' سلیمان بن یسار' ابو سلمہ' شعبی' نخعی' قاسم بن محمد' عروہ بن زبیر ایسے ائمہ حدیث شامل ہیں۔ ان سے مروی احادیث مختلف کتب حدیث میں مندرج ہیں۔

نہایت مہمان نواز' نرم دل اور متواضع خاتون تھیں۔

ان کی تاریخ وفات معلوم نہیں ہو سکی' البتہ یہ صحیح ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر کی خلافت مکہ کے زمانے تک زندہ تھیں۔

حضرت ام الفضل بنت حارث

ان کا نام لبابہ کنیت ام الفضل اور لقب کبریٰ تھا۔ سلسلہ نسب یہ تھا: لبابۃ الکبریٰ بنت الحارث بن حزن بن بجیر بن الہرام بن روبیہ بن عبداللہ بن ہلال بن عامر بن صعصعہ۔۔۔والدہ کا نام ہند بنت عوف تھا اور قبیلہ کنانہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ لبابہ نے نام کی بجائے کنیت یعنی ام الفضل سے شہرت پائی۔ ان کی کئی حقیقی اور اخیافی بہنیں تھیں، جن کی خاندان بنو ہاشم اور قریش کے دیگر معزز گھرانوں میں شادیاں ہوئیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے، خود الفضل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے، حضرت سلمیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے عم محترم حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے، اور حضرت اسما رضی اللہ عنہا، حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے عقد میں تھیں۔ حضرت جعفر طیار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے۔ یہ وہی اسما ہیں جو جعفر طیار کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اور ان کی وفات کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نکاح میں آئیں۔ اسی وجہ سے ان کی والدہ محترمہ ہند بنت عوف کے بارے میں مشہور ہے کہ سمدھیانہ اعتبار سے نہایت خوش قسمت تھیں اور جن حضرات سے ان کی بیٹیوں کی شادی ہوئی، علو مرتبت میں ان کی کہیں مثال نہیں ملتی۔

حضرت ام الفضل بنت حارث رضی اللہ عنہا کو خواتین عرب اور خواتین مکہ میں یہ فضیلت اور خصوصیت حاصل ہے کہ یہ پہلی بلند بخت خاتون ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ ام المومنین حضرت خدیجہ کے بعد دائرہ اسلام میں داخل

ہوئیں- باقی تمام عورتیں ان کے بعد مشرف بہ اسلام ہوئیں- اس اعتبار سے ان کا زمانہ قبول اسلام بہت قدیم اور بالکل ابتدائی ہے- ان کے شوہر نام دار حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کے بعد انھوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کا شرف حاصل کیا-

حضرت ام الفضل رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں حج کرنے کا شرف حاصل ہے- چنانچہ مشہور واقعہ ہے کہ حجۃ الوداع کے موقعے پر عرفہ کے دن جب لوگوں کو آنحضرت کے بارے میں یہ شبہ ہوا کہ آپ روزے سے ہیں تو حضرت ام الفضل کے پاس اس شبہے کا اظہار کیا- انھوں نے آنحضرت کی خدمت میں دودھ کا ایک پیالہ پیش کیا- آپ چونکہ روزے سے نہ تھے اس لیے دودھ پی لیا اور لوگوں کا شبہ دور ہو گیا-

حضرت ام الفضل رضی اللہ عنہا بڑی عابدہ اور زاہدہ خاتون تھیں- تاریخ و سیرت کی کتابوں میں مرقوم ہے کہ سوموار اور جمعرات کو ہمیشہ روزہ رکھتی تھیں- بے حد فیاض اور سخی تھیں- اصابہ اور استیعاب میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے' ام الفضل' میمونہ' سلمی اور اسما چاروں مومنہ بہنیں تھیں-

حضرت ام الفضل رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تیس احادیث روایت کی ہیں' جن کے بعض رواۃ یہ ہیں: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ' حضرت تمام بن عباس' حضرت انس بن مالک' حضرت عبداللہ بن حارث بن نوفل اور حضرت عمیر رضی اللہ عنہم-

اولاد کے اعتبار سے بھی حضرت ام الفضل نہایت خوش قسمت ہیں- ان کے تمام بیٹے' بیٹیاں نہایت قابلیت' علم و فضل اور زہد و تقوی کے حامل تھے- مشہور شاعر عبداللہ بن یزید ہلالی نے چند اشعار میں ان کی اولاد کا ذکر کیا ہے اور انھیں قابل فخر گردانا ہے- ان کی اولاد کے نام یہ ہیں: ابوالفضل' عبداللہ' عبیداللہ' معبد' عبدالرحمن' قثم اور ام حبیبہ-

اب ایک خواب اور اس کی تعبیر سنئے!

ایک مرتبہ ام الفضل رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ آپ کے اعضائے مبارک میں سے ایک عضو میرے گھر میں ہے۔ آپ نے ان شاء اللہ خیر کہہ کر اس خواب کی تعبیریوں کی کہ میری بیٹی فاطمہ کے گھر لڑکا پیدا ہوگا اور تم اس کو اپنا دودھ پلاؤ گی۔ چنانچہ حضرت فاطمہ الزہرا کے ہاں حضرت حسین رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے تو حضرت ام الفضل نے ان کو دودھ پلایا اور ان کی کفالت کی۔

حضرت ام الفضل رضی اللہ عنہا کا انتقال خلیفہ ثالث عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں ہوا۔ ان کے انتقال کے وقت ان کے شوہر حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ زندہ تھے۔ نماز جنازہ حضرت عثمان نے پڑھائی۔

حضرت امامہ بنت ابوالعاص

"جو دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے خالی ہے' وہ ایمان سے محروم ہے۔ایمان کی دولت اسی شخص کو میسر آسکتی ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا تعلق الفت استوار کر لیا ہو اور آپ کی محبت کو قلب کی گہرائیوں میں اتار لیا ہو۔ اسلام محض زبان سے اقرار کر لینے کا نام نہیں بلکہ یہ انسان سے بہت سے معاملات کا متقاضی ہے۔اس کا اولین تقاضا عمل ہے اور اپنی روزمرہ کی زندگی کو اخلاق و کردار کے بہترین سانچوں میں ڈھالنا ہے۔اگر تم نے فی الواقع اپنے آپ کو اسلام کی تحویل میں دے دیا ہے تو اس کے بنیادی تقاضوں کو بھی پورا کرو اور اپنی حیات مستعار کے تمام گوشوں کو عمل و حرکت کی گرفت میں لے آؤ۔ تمہارا اٹھنا بیٹھنا' چلنا پھرنا' لین دین' لوگوں سے میل جول' نقل و حرکت' کھانا پینا' گفت و شنید' سب کچھ اسلام کے احکام کے مطابق ہونا چاہیے اور شب و روز کی سعی و کوشش کے ایسے پیمانے وضع کر لینے چاہئیں جو اسلام کی اساس اور اس کے اصول کے عین مطابق ہوں اور یہ سب کچھ اسی وقت ہو سکتا ہے جب قلب و ضمیر پوری طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و مودت کی گرفت میں ہوں۔"

یہ یا اس سے ملتے جلتے الفاظ حضرت امامہ بنت ابوالعاص رضی اللہ عنہا نے خواتین کے ایک اجتماع میں گفتگو کرتے ہوئے کہے۔حضرت امامہ رضی اللہ عنہا کے والد محترم کا نام ابوالعاص بن ربیع بن عبدالعزیٰ تھا اور والدہ کا حضرت زینب بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم!۔ان کی ولادت اپنے نانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ پر سعادت میں ہوئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی اس نواسی سے انتہائی پیار تھا۔ بعض اوقات

دوران نماز بھی آپ انھیں اپنے ساتھ رکھتے تھے- صحیح بخاری میں ہے کہ ایک بار آپ مسجد میں تشریف لائے تو حضرت امامہ کو کندھوں پر اٹھا رکھا تھا- اسی حالت میں نماز پڑھائی- جب رکوع میں جاتے تو اتار دیتے- جب کھڑے ہوتے تو پھر اٹھا لیتے- اسی طرح نماز پوری کی-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک مرتبہ کسی نے تحفۃً کچھ چیزیں بھیجیں جن میں ایک طلائی ہار بھی تھا- اس وقت حضرت امامہ رضی اللہ عنہا گھر کے ایک کونے میں کھیل رہی تھیں- آپ نے فرمایا: میں یہ ہار اپنے اہل کے محبوب ترین فرد کو دوں گا- ازواج مطہرات نے خیال کیا کہ یہ ہار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ملے گا- لیکن آپ نے حضرت امامہ کو بلایا اور یہ ہار اپنے ہاتھ سے ان کے گلے میں ڈال دیا- بعض روایات کی رو سے یہ ہار نہیں تھا' انگوٹھی تھی اور شاہ حبشہ نجاشی نے بہ طور ہدیہ آپ کی خدمت میں پیش کی تھی-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت حضرت امامہ سن شعور کو پہنچ چکی تھیں' اسی اثنا میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے انتقال فرمایا- حضرت فاطمہ نے وفات کے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وصیت کی تھی کہ ان کی وفات کے بعد وہ امامہ سے نکاح کر لیں- چنانچہ اس وصیت کے مطابق یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عقد میں آئیں- حضرت امامہ کے نکاح کے انتظام کی ذمہ داری ان کے والد بزرگ وار حضرت ابوالعاص رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے وقت حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے سپرد کی تھی' جو عشرہ مبشرہ میں سے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی تھے- حضرت زبیر نے حضرت ابوالعاص کی وصیت کے مطابق نکاح کے تمام انتظامات خود کیے اور خود ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ نکاح پڑھایا: یہ ۱۱ ہجری کا واقعہ ہے-

حضرت امامہ انتیس سال حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نکاح میں رہیں- ۴۰ ہجری میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے شہادت پائی تو وہ جناب عبدالمطلب کے پوتے مغیرہ

بن نوفل کو وصیت کر گئے کہ وہ حضرت امامہ کے ساتھ نکاح کر لیں- چنانچہ حضرت علی کی وصیت کے مطابق ان کا عقد ثانی مغیرہ سے کر دیا گیا- مغیرہ سے نکاح سے قبل انھیں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا پیغام نکاح پہنچا تھا اور انھوں نے مروان کو لکھا تھا کہ وہ ایک ہزار دینار یعنی پانچ ہزار روپے اس تقریب میں خرچ کریں اور ان کو میرے ساتھ نکاح کا پیغام دیں- لیکن حضرت امامہ رضی اللہ عنہا نے اس کی اطلاع حضرت مغیرہ کو دی تو انھوں نے فوراً ہی حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے رابطہ پیدا کیا اور ان کی اجازت سے امامہ کے ساتھ عقد کر لیا-

حضرت امامہ رضی اللہ عنہا نے حضرت مغیرہ کے پاس ہی وفات پائی- حضرت مغیرہ سے ان کے ایک لڑکا پیدا ہوا' جس کا نام یحییٰ رکھا- بعض روایات کے مطابق حضرت امامہ کے کوئی اولاد نہیں ہوئی-

حضرت ام عطیہ بنت حارث

ان کا نام نسیبہ تھا اور کنیت ام عطیہ - باپ کا نام حارث تھا- انصار کے ایک قبیلے ابو مالک بن نجار سے تعلق رکھتی تھیں-

ام عطیہ ہجرت سے پہلے ہی دعوت اسلام سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئی تھیں- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو انصار کی عورتوں کو بیعت اسلام کے لیے ایک مکان میں جمع کیا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اس مکان کے دروازے پر بھیجا کہ ان خواتین سے مندرجہ ذیل شرائط پر بیعت لیں اور ان سے عہد لیں کہ ان پر پابند رہیں گی-

- اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک نہ ٹھہرائیں گی-
- کسی پر بہتان نہ باندھیں گی اور ایک دوسری پر الزام تراشی نہ کریں گی-
- چوری نہ کریں گی-
- فحش و بدکاری اور ارتکاب زنا سے دامن کشاں رہیں گی-
- اولاد کو قتل نہ کریں گی---اور
- اچھی باتوں پر عمل پیرا ہونے سے انکار نہ کریں گی-

انصار کی خواتین نے ان باتوں کی حقانیت کو تسلیم اور ان شرائط پر پابند رہنے کا اقرار کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دروازے پر کھڑے کھڑے مکان کے اندر کی طرف ہاتھ بڑھایا اور عورتوں نے اپنے ہاتھ باہر نکالے- بس یہی علامت بیعت تھی- دونوں فریقوں نے باہم ہاتھ نہیں ملائے اور مصافحہ نہیں کیا- کیونکہ شریعت اسلامی میں عورتوں سے بیعت لیتے وقت مصافحہ کرنے کی اجازت نہیں ہے-

بیعت کے بعد حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عمر سے سوال کیا:

اچھی باتوں سے انکار نہ کرنے کا کیا مطلب ہے؟

حضرت عمر نے جواب دیا: نوحہ اور بین نہ کرنا۔

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سات جنگوں میں شرکت کی اور ہر جنگ میں کھانا پکانے' مجاہدین کے سامان کی حفاظت کرنے' مریضوں کی تیمارداری کرنے اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کی خدمات سرانجام دیں۔ ان امور کی انجام دہی میں یہ نہایت مستعد اور تیز تھیں۔

غسل میت میں انھیں خاص مہارت حاصل تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل میت کی انھیں اچھی طرح تعلیم دی تھی۔ بڑے بڑے صحابہ اور تابعین اس کا طریقہ سیکھنے اور اس کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے دور دراز مقامات سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ۸ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحب زادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا تو چند دیگر عورتوں کی مدد سے حضرت ام عطیہ نے انھیں غسل دیا تھا اور اسلام کے دور آغاز میں یہ مسئلہ بڑی اہمیت کا حامل تھا' جس طرح بعض ادوار میں بعض مسائل لوگوں کا مرکز توجہ ہوتے ہیں' اسی طرح اس دور میں یہ مسئلہ خاص احتیاط اور دلچسپی کا باعث تھا۔

عہد رسالت کے بعد خلافت راشدہ کے زمانے میں ان کا لڑکا جو کسی جنگ میں شریک تھا' بصرہ میں بیمار ہو کر آیا۔ حضرت ام عطیہ کو پتا چلا تو فوراً عازم بصرہ ہوئیں۔ لیکن ان کے بصرہ پہنچنے سے ایک یا دو دن پیشتر لڑکا فوت ہو چکا تھا۔ بصرہ آکر انھوں نے قصر بنو خلف میں قیام کیا اور پھر وہیں کی ہو کر رہ گئیں۔ تین دن لڑکے کا سوگ منایا۔ تیسرے دن خوشبو لگا کر گھر سے باہر نکلیں اور فرمایا شوہر کے علاوہ' اور کسی کے لیے تین دن سے زیادہ سوگ نہیں کرنا چاہیے' کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی حکم ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل بیت کے تمام افراد سے انتہائی تعلق خاطر اور قلبی محبت رکھتی تھیں۔ خود آنحضرت بھی ان سے بہت انس اور شفقت سے پیش آتے تھے اور انھیں بعض چیزیں بھی عطا فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے انھیں صدقے کی ایک بکری بھیجی- انھوں نے ذبح کی اور اس کا گوشت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو بھیجا- حضور گھر تشریف لائے تو کھانا طلب فرمایا- حضرت عائشہ نے عرض کیا کھانے کو اور تو کچھ نہیں البتہ جو بکری آپ نے ام عطیہ کو بھیجی تھی اس کا گوشت پڑا ہے- آپ نے فرمایا وہی لاؤ' وہ اپنے اصل مستحق کے پاس پہنچ گئی ہے-

اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وہ بہت تکریم کرتی تھیں اور حضرت علی بھی ان کا احترام کرتے تھے اور بعض اوقات ان کے ہاں جا کر قیلولہ فرماتے تھے- بہر حال استیعاب کی روایت کے مطابق صحابیات میں ان کا درجہ بہت بلند تھا اور ان کا شمار کبار صحابہ خواتین میں ہوتا تھا-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے انھوں نے متعدد احادیث روایت کی ہیں- حضرت انس' حفصہ ابن سیرین' اسماعیل بن عبدالرحمن اور مالک بن عمیر وغیرہ حضرات ان کے حلقہ رواۃ و تلامذہ میں شامل ہیں-

ان کی اولاد اور تاریخ وفات کے بارے میں تفصیلات معلوم نہیں ہو سکیں-

ہجیمہ بنت حیّ

حضرت ہجیمہ بنت حیّ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت ابودرداء انصاری رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ تھیں-ان کی دو بیویاں تھیں- پہلی بیوی کا نام خیرہ بنت ابو حدرد اسلمی تھا- دوسری بیوی ہجیمہ بنت حیّ وصابیہ کے نام سے موسوم تھیں- دونوں کی کنیت اتفاق سے ام درداء تھی اور عربوں کا معاملہ یہ تھا کہ وہ زیادہ تر کنیت سے معروف تھے اور کنیت سے انھیں پکارا جاتا تھا- یہاں ایک ہی گھر میں دونوں کے تعارف اور پکارنے میں بڑی الجھن پیدا ہوتی تھی- اس لیے اس کا حل یہ نکالا گیا کہ پہلی بیوی کو ام درداء کبریٰ کہا جانے لگا اور دوسری کو ام درداء صغریٰ- ام درداء کبریٰ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحابیہ ہونے کی سعادت حاصل تھی اور انھوں نے خود حضور علیہ الصلوۃ والسلام سے روایت حدیث کی تھی- انھیں ام بلال بھی کہا جاتا تھا- ام درداء صغریٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحابیہ نہیں تھیں، وہ تابعی خواتین میں شامل تھیں اور ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حلقہ درس سے تعلق رکھتی تھیں اور ان کی شاگرد تھیں- محدثہ وفقیہہ خاتون تھیں- نہایت معاملہ فہم اور بے حد زیرک و دانا- قبیلہ حمیر کی ایک شاخ "وصاب" کی طرف منسوب تھیں، اس لیے قبیلے کی رعایت سے انھیں ہجیمہ وصابیہ کہا جاتا تھا- مندرجہ ذیل سطور میں انہی ام درداء صغریٰ وصابیہ کے بارے میں چند باتیں عرض کرنا مقصود ہے، جن کا نام ہیجمہ تھا اور حیّ کی صاحب زادی تھیں-

جن حضرات سے انھوں نے روایت کی اور حدیث کی سماعت کا شرف حاصل کیا ان میں متعدد مشہور صحابہ کے اسمائے گرامی کتب سیر میں منقول ہیں مثلاً خود حضرت ابوالدرداء، سلمان فارسی، فضالہ بن عبید، حضرت ابوہریرہ، کعب بن عاصم اشعری اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم- یہ ان کے وہ اساتذہ ہیں جو خاص اہمیت و

فضیلت کے مالک ہیں۔ اپنے شوہر نام دار حضرت ابو درداء سے انھوں نے فن قرأت سیکھا تھا۔

خود حضرت ہجیمہ رحمتہ اللہ علیہا کے تلامذہ کا حلقہ بھی بہت وسیع ہے۔ کثیر تعداد میں لوگوں نے ان سے احادیث روایت کیں، ان میں چند حضرات کے نام یہ ہیں، جبیر بن نفیر، مہدی بن عبد الرحمٰن، ابو عمران انصاری، سالم بن ابی الجعد، زید بن اسلم، صفوان بن صفوان، اسماعیل بن عبداللہ بن ابی المہاجر، ابو حازم بن دینار المدینی، طلحہ بن عبید اللہ بن کریز، عبداللہ بن ابی زکریا، عثمان بن حبان دمشقی، یعلی بن سلک، یونس بن میرہ، مکحول شامی، بلال بن یسار، رجاء بن حیوۃ عون بن عبد اللہ، میمون بن مہران اور ام درداء کبریٰ رحہم اللہ تعالیٰ۔ ان کے علاوہ اور بھی بے شمار حضرات ہیں جنھوں نے اس باعظمت خاتون کے حلقہ تلمذ میں شریک ہونے اور ان سے احادیث کی سماعت کرنے کا فخر حاصل کیا۔ ان سے مروی احادیث صحیح مسلم، ابو داؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں منقول ہیں۔ ابن سمیع نے ان کا شمار اہل شام کے طبقہ ثانیہ میں کیا ہے۔ ابو احمد عسال ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ ام الدرداء صغریٰ (حضرت ہجیمہ) سے بہت سی احادیث روایت کی گئیں۔ مکحول کا قول ہے کہ ام الدرداء ممتاز فقیہہ تھیں اور نماز میں (حالت جلسہ میں) مردوں کی طرح بیٹھتی تھیں۔

ام درداء صغریٰ بچپن ہی میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی تربیت و نگرانی میں آ گئی تھیں۔ انہی کے ساتھ رہتیں اور وہ جہاں جاتے ان کے ساتھ جاتیں، مسجد میں جاتیں، مردوں کی صفوں میں نماز پڑھتیں اور قراء کے حلقے میں بیٹھتیں، لیکن یہ بچپن کے دور کی بات ہے۔ بعد میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے اس سے روک دیا تھا اور فرمایا عورتوں کے ساتھ نماز پڑھا کرو اور انہی کی صفوں میں بیٹھا کرو۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے ۳۲ ہجری میں وفات پائی۔ ان کی وفات کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے انھیں نکاح کا پیغام بھجوایا، مگر انھوں نے انکار کر دیا اور فرمایا: واللہ میں دنیا میں کسی سے نکاح نہیں کروں گی، جنت میں ان شاء اللہ ابوالدرداء ہی سے شادی کروں گی۔

خاندان بنو امیہ میں ان کی بڑی تکریم کی جاتی تھی- سال میں چھے مہینے بیت المقدس میں اور چھے مہینے دمشق میں قیام کرتیں- خلیفہ عبدالملک بن مروان خصوصیت سے ان کا احترام کرتا اور اکثر ان کی مجلس میں حاضر ہوتا- دمشق کے زمانہ قیام میں یہ مسجد کے آخری گوشے میں بیٹھتیں- عبدالملک بن مروان بھی وہیں آکر دوزانو ہو کر ان کے سامنے بیٹھتا اور نہایت نرم الفاظ میں عزت سے بات کرتا- اسماعیل بن عبداللہ کہتے ہیں- ایک مرتبہ بیت المقدس کے ایک کونے میں عبدالملک نماز کے لیے کھڑا ہوا- ام الدرداء بھی عبدالملک کے سہارے کھڑی ہوئیں-

ضعف اور پیری کی وجہ سے اس کے سہارے سے آہستہ آہستہ مسجد میں داخل ہوئیں' عبدالملک نے انھیں عورتوں کی صف میں کھڑا کیا اور خود آگے بڑھ کر مردوں کی صف میں شامل ہو گیا-

تمام وقت ذکر الٰہی میں صرف کرتیں- اس کے مقابلے میں دنیا کو ہیچ اور بے وقعت قرار دیتیں- عون بن عبداللہ کہتے ہیں ایک دفعہ ہم ام الدرداء کی مجلس میں بیٹھے ذکر الٰہی میں مصروف تھے کہ اس سلسلے نے زیادہ طول کھینچا- کچھ لوگوں نے عرض کیا آج ہم نے آپ کو بہت تنگ کیا- فرمایا کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ تم نے مجھے تنگ کیا یا تھکا دیا ہے- میرے نزدیک تمام عبادتوں سے افضل اور قلب و ضمیر کے لیے باعث تسلی' مجالس ذکر کے علاوہ اور کوئی مجلس نہیں- میرے سکون و راحت کا سامان اسی میں مضمر ہے اور میں اسے سب امور پر فوقیت دیتی ہوں- بہترین علم معرفت الٰہی ہے- فرمایا چھوٹی عمر میں حکمت سیکھو' بڑی عمر کے ہو کر اسے لوگوں میں پھیلاؤ- جو شخص جو کچھ بوئے گا وہی پائے گا' اچھا بوئے گا تو اچھا پائے گا' برا بوئے گا تو برا پائے گا-

ایک مرتبہ دعا اور توکل کا مفہوم بیان کرتے ہوئے فرمایا: وہ کیسا آدمی ہے جو زبان سے اللہ سے التجا کرتا ہے کہ اللہ مجھے رزق عطا فرما' حالانکہ وہ خوب جانتا ہے کہ اللہ آسمان سے اس پر دیناروں اور درہموں کی بارش نہیں کرے گا- رزق کا تعلق تو ہمارے آپس کے لینے دینے ہی سے ہے- کوئی چیز کسی کو دی جائے تو اسے قبول کر لینی

چاہیے۔اگر لینے والا صاحب ثروت ہے تو اپنے ضرورت مند بھائی کو دے دے اور اگر تنگ دست یا نادار ہے تو اسے اپنے مصرف میں لائے۔ جو رزق کسی ذریعے سے اللہ انسان کو عطا فرماتا ہے' اسے رد نہیں کرنا چاہیے۔

ایک دفعہ فرمایا: ذکر الٰہی بہت بڑی چیز ہے اور اللہ اکبر کہہ کر تم نماز پڑھو تو یہ ذکر الٰہی ہے اور اللہ کی ایسی تسبیح ہے جو بے حد افضلیت کی حامل ہے۔

ایک شخص نے ان سے کہا: میں اپنے دل میں بیماری محسوس کرتا ہوں' مگر اس کے لیے کوئی دوا نہیں پاتا اور دل کو شدید قساوت کا شکار پاتا اور بہت سی تمناؤں کا مرکز سمجھتا ہوں۔ آپ فرمایئے اس کا کیا علاج کروں؟ فرمایا: قبروں میں جایا کرو اور مردوں کی دنیا کا مشاہدہ کیا کرو۔

عورتیں حضرت ہجیمہ رحمتہ اللہ علیہا کی معیت میں عبادت کرتیں اور قیام فرماتیں۔ نماز میں قیام کی وجہ سے کمزوری محسوس کرتیں تو مسجد کی چھت پر سے لٹکتی رسیوں کا سہارا لے لیتیں' مگر حضرت ہجیمہ بدستور کھڑی رہتیں۔ وہ کسی شے کا سہارا نہ لیتیں۔

ایک مرتبہ عبدالملک بن مروان کے ہاں مقیم تھیں۔ عبدالملک نے ان کے ساتھ قیام وصلاۃ کی خواہش ظاہر کی۔ قیام کیا اور عبدالملک نے اپنے ایک خادم کا سہارا لیا۔ خادم تھک گیا اور اپنے مقام سے ذرا ہٹا تو عبدالملک نے اسے ڈانٹا اور اسے ملعون کہا' صبح ہوئی تو حضرت ہجیمہ نے عبدالملک کو بلایا اور کہا میں نے رات سنا کہ تم خادم کو ملعون قرار دے رہے تھے' کیا وہ مجھ سے ذرا دور ہٹ گیا تھا؟ فرمایا: میں نے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے سنا ہے وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کسی پر لعنت بھیجنے والے قیامت کے روز نہ کسی کی شفاعت کر سکیں گے اور نہ بطور شاہد کے پیش ہو سکیں گے۔

یہ حالات حافظ ابن حجر کی تہذیب التہذیب' ذہبی کے تذکرۃ الحفاظ' ابن قتیبہ کی عیون الاخبار' ابن جوزی کی صفوۃ الصفوہ' ابن عماد کی شذرات الذہب' جاحظ کی البیان والتبیین' خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد اور ذہبی کی تذہیب سے ماخوذ ہیں۔

حوا بنت یزید

حوا بنت یزید بن سنان بن کرز بن زعورا بن عبدالاشہل --- مدینہ منورہ کی رہنے والی تھیں اور بیعت اولیٰ اور بیعت ثانیہ کے درمیانی زمانے میں شرف اسلام سے مشرف ہوئی تھیں۔ جس دور میں یہ حلقہ بگوش اسلام ہوئیں وہ دور مسلمانوں کے لیے انتہائی تکلیف اور اذیت کا دور تھا۔ ان کا اسم گرامی ان حضرات کی فہرست میں آتا ہے جنھیں قبول اسلام کے سلسلے میں السابقون الاولون کی صف میں شامل ہونے کا فخر حاصل ہوا تھا۔ ان کا نکاح قیس بن حطیم سے ہوا تھا۔

حضرت حوا نے اپنے شوہر سے چھپ کر اسلام قبول کیا تھا۔ ایک مرتبہ ان کے شوہر قیس بن حطیم کسی کام سے مکہ معظمہ آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے' مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ لیکن سرور کائنات کی زیارت وملاقات کے لیے بہت بے تاب تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ تمھاری بیوی حوا بنت یزید اسلام قبول کر چکی ہے۔ اس سے حسن سلوک کرو' حتی الامکان اس کے لیے سہولتیں بہم پہنچاؤ اور اسلام کی وجہ سے اس کا احترام کرو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اسے بھی قبول اسلام کی دعوت دی۔ قیس نے عرض کیا میں اب واپس مدینہ جا رہا ہوں' آپ کی دعوت پر غور کروں گا۔ لیکن یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی بیوی حوا سے کچھ نہیں کہوں گا' نہ اسلام قبول کرنے کی وجہ سے اسے کوئی تکلیف پہنچاؤں گا اور نہ ارکان اسلام کی ادائیگی کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا کروں گا۔ بلکہ میری یہ کوشش ہو گی کہ اشاعت دین اور خدمت اسلام کے سلسلے میں اس کی مدد کروں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی اس گفتگو سے بہت خوش ہوئے اور اس کے رویے پر مسرت کا اظہار کیا۔ بعض مورخین کا کہنا ہے کہ وہ اپنے اس وعدے پر قائم رہا۔

لیکن صاحب طبقات الشعراء محمد بن سلام نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ حوا بنت یزید کے شوہر قیس بن حطیم کو اپنی بیوی کے قبول اسلام کی اطلاع ملی تو وہ بہت خفا ہوا۔ اس نے پہلے تو اسے کہا کہ وہ اسلام سے دست بردار ہو جائے' وہ نہ مانی تو مختلف سزائیں دینا شروع کر دیں' جو سنگین نوعیت کی تھیں۔ وہ سجدے میں جاتیں تو یہ انھیں دھکا دے کر گرا دیتا اور سخت زدو کوب کرتا۔ ایک روز اس نے قتل کی دھمکی بھی دی اور کہا اگر تم نے اسلام سے رجوع نہ کیا تو میں تمھاری کھال کھینچ دوں گا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :

تم میری بیوی ہو اور میں تمھارا شوہر ہوں۔ تمھارا فرض ہے کہ تم وہی کام کرو جسے میں پسند کروں۔ اگر تم میرا حکم ماننے سے انکار کرو گی اور وہ کام کرو گی جو میری رضا اور پسند کے خلاف ہے تو میں سخت سے سخت سزا دینے کا مجاز ہوں۔ میں اگر چاہوں تو اس جرم میں تمھیں قتل بھی کر سکتا ہوں۔ میں اگر چاہوں تو قتل کے بعد تمھاری کھال کھینچ سکتا ہوں' تم دوہرے جرم کی مرتکب ہو۔ ایک قبول اسلام کی اور دوسرے میری نافرمانی کی۔

تم نے اسلام قبول کر کے میری اور میرے خاندان کی عزت کو خاک میں ملا دیا ہے۔ میں کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکتا کہ تمھارا مذہب اور ہو اور میرا مذہب اور۔ اب تم یہ فیصلہ کرو کہ اسلام پر قائم رہنا چاہتی ہو یا اپنی جان کی حفاظت کی خواہاں ہو؟

لیکن حوا بنت یزید بھی بڑے دل گردے کی خاتون تھیں۔ وہ کسی صورت میں ترک اسلام پر آمادہ نہ ہوئیں اور اپنے شوہر سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صداقت و حقانیت کی قائل ہو چکی ہوں' لہٰذا اب ان کے حلقۂ اطاعت سے باہر نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انھوں نے اپنے شوہر سے مخاطب ہو کر کہا :

میں مانتی ہوں کہ بیوی کو شوہر کا تابع فرمان ہونا چاہیے اور کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہیے جس میں شوہر کی مرضی شامل نہ ہو' لیکن یاد رکھیے یہ تمام

احکام دنیا سے تعلق رکھتے ہیں' دین سے نہیں- مجھے پورا یقین ہے کہ اسلام سچا مذہب ہے- محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے سچے نبی ہیں اور اللہ کا فرمان ناقابل تنسیخ ہے- بلاشبہ تم بہت سخت گیر ہو' مگر میں اسلام کے مقابلے میں ان سختیوں کو کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں- میں ہر مصیبت کا مقابلہ کروں گی- میں سمجھتی ہوں کہ میرے قبول اسلام سے تمھاری اور تمھارے خاندان کی عزت میں کمی نہیں واقع ہوتی' بلکہ اس میں مزید اضافہ ہوتا ہے- میں اپنی جان دے سکتی ہوں' کھال کھنچوا سکتی ہوں' لیکن اسلام کو ترک نہیں کر سکتی- میرے محافظ تم نہیں ہو' اللہ میرا حافظ و ناصر ہے- اگر اسلام سچا ہے اور یقیناً سچا ہے تو میں اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گی اور دشمنان اسلام کی تدبیریں اللہ کی تدبیروں کے مقابلے میں ناکام رہیں گی- تم جو کچھ بھی کرنا چاہتے ہو کر لو' اللہ میری مدد کرے گا- میں اسی پر توکل کرتی ہوں اور وہی میرا آخری سہارا ہے-

حوا کی یہ تقریر بڑی زوردار تھی- اس سے خود قیس بھی متاثر ہوا اور اپنی بیوی کو اس نے جو ہدف ستم بنا رکھا تھا' اس سے رک گیا- یہ ہجرت سے پہلے کا واقعہ ہے- حوا کے استقلال اور اسلام پر اس کی سختی سے پابندی نے قیس کے دل میں نرمی پیدا کر دی- چنانچہ وہ کسی کام کے سلسلے میں مدینہ سے مکہ مکرمہ گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھی حاضر ہوا- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے مسلمانوں کے حالات سے پوری طرح باخبر رہتے تھے اور ان کے بارے میں وہاں سے آنے والے لوگوں سے معلومات حاصل کرتے رہتے تھے- حوا بنت یزید رضی اللہ عنہا کے حالات سے بھی آپ باخبر تھے- قیس آپ کے پاس آیا تو آپ نے فرمایا تم حوا پر ظلم نہ کرو- اسے اپنی حالت پر رہنے دو- قیس پر آپ کے اس فرمان کا بہت اثر ہوا اور وہ حوا پر جو ظلم ڈھاتا تھا اس سے باز آگیا-

حضرت ام معبد بنت خالد

''میں کس درجہ خوش نصیب ہوں کہ آج سرور کائنات اور ان کے پاک باز ساتھی میرے مکان میں تشریف فرما ہیں- یہ اتنا بڑا اعزاز ہے کہ نہ کسی کو حاصل ہوا ہے نہ ہو گا- میں ان کی خدمت میں مصروف ہوں اور ان کے ارشادات گرامی میرے پردہ سماع کو مستفید فرما رہے ہیں- کیا میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں؟ کیا میں فی الواقع عالم بے داری میں ہوں؟ کیا فی الحقیقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میرے یہاں تشریف رکھتے ہیں؟ کیا یہ سچ ہے کہ میں آپ کے ارشادات گرامی سے مستفید ہو رہی ہوں؟ اگر یہ صحیح ہے اور یہ سب کچھ عالم بے داری میں ہو رہا ہے تو میرے جیسا بلند بخت اور کوئی نہیں ہو گا- اللہ نے مجھ فقیر کو جو عزت بخشی ہے اور جن انعامات سے نوازا ہے' اس پر اس کا شکر ادا کرنے سے زبان قاصر اور اعضائے بدن عاجز ہیں-''

یہ الفاظ حضرت ام معبد بنت خالد رضی اللہ عنہا نے اس وقت کہے تھے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے کچھ صحابہ ان کے مکان پر رونق افروز تھے-

ان کا نام عاتکہ اور کنیت ام معبد ہے- خالد بن خلیف بن منقذ بن ربیعہ کی بیٹی تھیں اور قبیلہ بنو خزاعہ سے تعلق رکھتی تھیں- ان کی شادی تمیم بن عبد العزی بن منقذ سے ہوئی جو ان کے چچازاد تھے-

یہ وہی ام معبد ہیں جن کے ہاں ہجرت کے موقعے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام فرمایا تھا' جس پر انھوں نے بڑی مسرت کا اظہار کیا تھا- ان کی رہائش قدید کے مقام پر تھی- منگل یا بدھ کی آخری شب مکے سے مدینے کو ہجرت کرتے ہوئے آنحضرت غار سے نکل کر قدید کے مقام پر آئے تو مکہ کے نشیبی علاقے سے یکایک ایک آواز فضا میں گونجی اور لوگوں کے کانوں سے ٹکرائی- مرد عورتیں اور بچے اس آواز

کی تلاش میں دوڑے اور دور تک چلے گئے، مگر کوئی شخص نظر نہ آیا۔ وہ آواز کیا تھی؟ وہ یہ آواز تھی۔

جزى الله رب الناس خير جزائه
رفيقين قالا خيمتي ام معبد
هما نزلا بالبر واعتديا به
فقد فازمن امسىٰ رفيق محمد
ليلن بني كعب مقام فتاتهم
ومقعدها للمسلمين بمرصد

ترجمہ۔ اللہ ان دونوں ساتھیوں (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ) کو جزائے خیر سے نوازے جنھوں نے ام معبد کے خیموں میں قیام فرمایا۔

وہ دونوں نیکی کے عادی اور بر و صلاح کے خوگر ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جس شخص کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رفاقت میسر آ گئی، وہ فوز و فلاح سے ہم کنار ہو گیا۔

بنو کعب کو ایسی خوش نصیب لڑکیاں مبارک ہوں جن کا مکان مسلمانوں کے لیے جائے پناہ ہے۔

جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام معبد رضی اللہ عنہا کے ہاں قیام پذیر ہوئے اس وقت حضرت ابو بکر صدیق، ان کا غلام اور حضرت عبداللہ بن اریقط رضی اللہ عنہم بھی آپ کے ساتھ تھے۔ حضرت ام معبد نے ایک بکری ذبح کرنے کے لیے آنحضرت کی خدمت میں پیش کی۔ یہ بکری دودھ دیتی تھی۔ آپ نے بکری کے تھنوں کو ہاتھ لگایا اور فرمایا اسے ذبح نہ کرو۔ حضرت ام معبد رضی اللہ عنہا دوسری بکری لائیں اور اسے ذبح کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقائے عظام کو کھانا کھلایا اور کچھ کھانا ساتھ میں باندھ بھی دیا، تاکہ آگے چل کر کھا لیں۔

ام معبد کا کہنا ہے کہ جس بکری کے تھنوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک لگا کر واپس کر دیا تھا وہ بکری حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت تک ہمارے پاس رہی۔اس کے دودھ میں اتنی برکت پیدا ہو گئی تھی کہ ہم اسے صبح وشام دوہا کرتے اور اس کا دودھ پیا کرتے تھے۔

حضرت ام معبد رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوتے ہی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئی تھیں۔

ان کی وفات کے بارے میں معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔

حضرت خلیدہ بنت قیس

خلیدہ بنت قیس بن ثابت بن خالد بن اشجع--- قبیلہ دہمان سے تعلق رکھتی تھیں۔ جلیل القدر صحابیہ تھیں۔ان کا نکاح خاندان بنی سلمہ کے ایک شخص براء بن معرور انصاری سے ہوا تھا' جو قبیلہ خزرج کے خاندان بنو سلمہ کے رئیس تھے۔ یہ ان بلند منزلت خواتین میں سے ہیں جنھوں نے اپنا سب کچھ اسلام کی راہ میں قربان کر دیا تھا' حتی کہ اپنی اولاد تک اللہ اور اس کے رسول کے سپرد کر دی اور اس سلسلے میں جو تکلیفیں پہنچیں انھیں نہایت صبر اور استقلال سے برداشت کیا۔

قبول اسلام کے بعد ان کے اعزہ واقارب نے انھیں متنبہ کیا کہ اگر اسلام ترک نہ کیا اور یہ دستور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقہ اطاعت سے وابستہ رہیں تو تھیں انتہائی اذیتوں میں مبتلا کیا جائے گا' اور لوہے کی زنجیروں میں جکڑ کر دھوپ میں پھینک دیا جائے گا' اور صبح سے شام تک تپتی ریت میں لٹایا جائے گا۔ مگر اس پیکر استقلال اور سراپا عزیمت خاتون کے دل میں خوف کی قطعا کوئی جنبش پیدا نہیں ہوئی اور خطرے کی کسی لہر نے ان کے اندر کروٹ نہیں لی۔ نہایت متانت سے کچھ اس قسم کے الفاظ میں گویا ہوئیں۔

مجھے نہ دنیا کی کوئی پرواہے' نہ اس کے آرام و آسائش اور مصائب و مشکلات کی۔اگر کوئی حقیر و ناپائیدار شے ہے تو وہ دنیا اور اس میں پیدا ہونے والی چیزیں ہیں۔اب تک میری جو زندگی گزری ہے اس کی حیثیت ایک خواب سے زیادہ نہیں' جو وقت گزر جاتا ہے اس کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور محض چند موہوم یادیں ذہن میں باقی رہ جاتی ہیں۔تکلیفوں کا زمانہ بھی ماضی کی نذر ہو جاتا ہے اور سکون و آرام کے دن بھی شب و روز کی رفتار میں تحلیل ہو جاتے

ہیں' دور گزشتہ کے کسی بڑے سے بڑے واقعہ پر بھی غور کریں وہ محض ایک خواب معلوم ہوتا ہے۔ جس وقت کوئی حادثہ پیش آرہا ہو اس وقت بے شک اس کی تلخیوں کا احساس ہوتا ہے' لیکن جوں ہی وہ حادثہ حال سے نکل کر ماضی کی گرفت میں آیا' اس کی وقعت ختم ہو گئی اور اس کی تلخیاں ماضی کا ایک واقعہ بن کر رہ گئیں۔

تم مجھے قبول اسلام سے روکتے ہو اور اسلام کی وجہ سے مبتلائے مصائب کرنے کے درپے ہو۔ آخر مجھے کیا تکلیف پہنچاؤ گے' اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے نتیجے میں جو تکلیف بھی آئے گی میں اسے اپنی بلند بختی پر محمول کروں گی اور ہر اذیت خندہ پیشانی سے برداشت کروں گی۔ میں اللہ کی اطاعت اور اس کے رسول کی تابعداری کا عزم کر چکی ہوں۔ اب مجھے کوئی لالچ' کوئی حرص' کوئی طمع اور کسی قسم کا ڈر اور خوف اس سے ہٹا نہیں سکتا اور کوئی بڑی سے بڑی شے بھی میرے لیے سد راہ نہیں ہو سکتی۔ تم جتنے تیر آزمانا چاہتے ہو آزما دیکھو' سب ناکام رہیں گے اور اللہ کا جو رنگ مجھ پر چڑھ چکا ہے' یہی غالب رہے گا' اس کے مقابلے میں تمام رنگ ماند پڑ جائیں گے۔ اللہ ہی میرا حامی و ناصر ہے۔

چنانچہ یہی ہوا۔ حضرت خلیدہ بنت قیس رضی اللہ عنہا دائرۂ اسلام میں داخل ہوئیں تو انھیں انتہائی پریشان کیا گیا اور گوناگوں تکلیفیں پہنچائی گئیں' مگر اس عظیم المرتبت خاتون کی جبین استقلال پر کبھی کوئی شکن نمودار نہ ہوئی اور تادم واپسیں خدمت اسلام میں منہمک رہیں۔

حضرت خلیدہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کو ایک بہت بڑا حادثہ بیٹے کی شہادت کا پیش آیا۔ اس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ ۶ ہجری میں صلح حدیبیہ ہوئی اور اس سے تھوڑا عرصہ بعد جنگ خیبر کا واقعہ پیش آیا۔ خیبر کا علاقہ بڑا زرخیز تھا اور یہودیوں کے قبضے میں تھا۔ یہودی اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت ترین مخالف تھے اور ہر

وقت آنحضرت اور مسلمانوں کے درپے آزار رہتے تھے- خیبر یہودیوں کے آٹھ قلعوں کا مجموعہ تھا-ان قلعوں کے نام یہ تھے-

نطاۃ' شبق' ناعم' قتیبہ' وطیع' سلالم' قموص' جسے قلعہ ابی الحقیق بھی کہتے تھے اور قلعہ صعب بن معاذ بھی-اس زمانے میں یہ نہایت مضبوط قلعے تھے اور خیبر کے مختلف علاقوں میں واقع تھے- زراعت' باغات اور کاشت کے علاوہ جنگی اعتبار سے یہ قلعے نہایت اہم تھے-

خیبر کے یہ آٹھوں قلعے کس طرح فتح ہوئے اور کن کن صحابہ کرام کے ہاتھوں فتح ہوئے؟ یہ تفصیلات بڑی دلچسپ اور حیرت انگیز ہیں' مگر ہمارے موضوع سے خارج ہیں-ان قلعوں میں قلعہ قموص بہت مستحکم تھا-اس کے فتح کرنے پر بیس روز کوشش کی گئی لیکن ناکامی ہوئی' آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو علم عنایت فرمایا تو قلعہ فتح ہوا- فتح خیبر کے بعد یہ افسوس ناک حادثہ پیش آیا کہ خیبر کے ایک یہودی رہنما سلام بن مشکم کی بیوی زینب بنت حارث نے ایک بکری پکا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور ہدیہ پیش کی-اس بکری کے گوشت میں زہر ملا دیا گیا تھا-یہودی کہتے تھے 'اگر اس شخص (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے گوشت کھا لیا تو اس کا اسی وقت خاتمہ ہو جائے گا اور ہم نجات پا جائیں گے-اگر یہ فی الواقع اللہ کے رسول اور نبی برحق ہیں تو گوشت نہیں کھائیں گے اور چکھ کر چھوڑ دیں گے-

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ زہر آلود گوشت پیش کیا گیا تو خلیدہ بنت قیس کے بیٹے بشر بن براء بن معرور بھی آپ کے ساتھ تھے- آپ نے گوشت چکھا اور تھوک دیا' لیکن حضرت بشر بن براء رضی اللہ عنہ نے لقمہ اٹھا کر منہ میں ڈال لیا اور اسے حلق سے نیچے اتار گئے' پھر اسی وقت وفات پا گئے-حضرت بشر کو بھی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اس میں زہر ملا ہوا ہے' مگر حضور کے سامنے تھوکنے کو سوئے ادب سمجھا اور باوجود علم واحساس کے گوشت کھا گئے-اس واقعہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں اور اس عورت کو بلا کر پوچھا تو انھوں نے اقرار کیا اور کہا کہ ہم نے زہر اس

لیے ملا دیا تھا کہ اگر آپ سچے ہیں اور اللہ کے پیغمبر ہیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا اور اگر آپ جھوٹے ہیں تو ہم آپ سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

کہنا یہ ہے کہ حضرت خلیدہ بنت قیس رضی اللہ عنہا نے راہ اسلام میں بڑی قربانیاں دیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی اولاد کو اتنا تعلق خاطر تھا کہ ان کے بیٹے حضرت بشر بن براء رضی اللہ عنہ بالعموم آپ کے ساتھ رہتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی زندگی کا خاتمہ بھی آنحضرت کی رفاقت میں ہوا' اور پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ آپ کے سامنے تھوکنا گوارا نہ کیا اور جان دے دی۔

حضرت خلیدہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کے زمانہ ولادت اور وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

حضرت ام الخیر بنت صخر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدائے اسلام بلند کی تو جن خوش نصیب حضرات نے سب سے پہلے اس پر لبیک کہا وہ آنحضرت کی زوجہ محترمہ ام المومنین حضرت خدیجہ، حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت علی رضی اللہ عنہم تھے۔حضرت علی کرم اللہ وجہہ کم عمر تھے اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ عالم شباب کی حدوں سے گزر کر کہولت کی وادی میں داخل ہو رہے تھے۔وہ مکہ اور اس کے گردونواح میں خاص اثر ورسوخ رکھتے تھے، اس لیے تبلیغ اسلام کے سلسلے میں دوسروں کی بہ نسبت ان پر زیادہ ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں، اور واقعہ یہ ہے کہ ان ذمہ داریوں کو انھوں نے کما حقہ پورا کیا۔قبول اسلام کے فوراً بعد اپنے گھر کا رخ کیا اور اپنے والدین اور اہل وعیال کو اس کی دعوت دی۔سب سے پہلے اپنی والدہ محترمہ کو قبول اسلام کی طرف توجہ دلائی۔ان کی والدہ کا نام تو معلوم نہیں ہو سکا، البتہ ان کی کنیت ام الخیر تھی اور عرب کے رواج کے مطابق اپنی کنیت یعنی ام الخیر ہی سے معروف تھیں۔ان کا سلسلہ نسب یہ ہے۔

ام الخیر بنت صخر بن عامر بن کعب بن سعد بن تیم بن مرہ۔

ام الخیر بلند اخلاق اور متحمل مزاج خاتون تھیں۔خواتین مکہ میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔عورتیں اگر کسی مالی مشکل یا ذہنی الجھن یا خاندانی اور گھریلو مشکلات میں مبتلا ہوتیں تو ان کی طرف رجوع کرتی تھیں۔دعوت اسلام سے قبل یہ خواتین کو عام برائیوں سے روکتی اور نیکی کا راستہ دکھاتی تھیں۔غریبوں کی مدد کرتی، محتاجوں اور مسکینوں کی ضروریات پورا کرتی اور مستحقین کی اعانت کرتی تھیں، لڑائی جھگڑوں اور طعن وتشنیع سے دامن کشاں رہتی تھیں۔حضرت ابو بکر اپنی والدہ کی انتہائی تکریم کرتے تھے، وہ بھی بیٹے کی معاملہ فہمی سے متاثر تھیں اور لوگوں میں ان کی جو قدرو

منزلت تھی‘اس سے خوش تھیں- انھوں نے ماں کو اسلام کی دعوت دی اور کہا :

امی ! میں دنیا میں سب سے زیادہ آپ کا احترام کرتا ہوں اور ہر بات سے آپ کو باخبر رکھتا ہوں- آپ کی خیر خواہی میرے فرائض میں داخل ہے‘ جو اچھی بات مجھے معلوم ہو جاتی ہے میں آپ کو اس کی اطلاع دیتا ہوں- جب دنیا کے معاملات میں یہ التزام کرتا ہوں تو ضروری ہے کہ جن چیزوں کا تعلق دین اور آخرت سے ہو‘ اس سے بھی آپ کو باخبر کروں- بات یہ ہے کہ نبی آخر الزماں کا ظہور ہو گیا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی دینی و دینوی فلاح و بہبود کے لیے پیغمبر کی حیثیت سے اللہ کی طرف سے مبعوث کر دیئے گئے ہیں- ان کی دعوت بڑی سادہ ہے اور عقل و فہم کے عین مطابق ہے- وہ لوگوں کو برائی سے روکتے اور نیکی کی طرف بلاتے ہیں- ان پر اللہ کی طرف سے بندوں کے لیے احکام نازل ہوتے ہیں‘ جنھیں فرشتہ لے کر آتا ہے- میں نے ان کی دعوت قبول کر لی ہے اور مجھے ان کی تعلیمات کی سچائی پر کامل یقین ہے- میرے علاوہ ان کی بیوی خدیجہ نے اور ان کے چچا ابو طالب کے بیٹے علی نے بھی ان کی دعوت قبول کر لی ہے- میں چاہتا ہوں آپ بھی اس دعوت پر ایمان لے آئیں اور پیغمبر آخر الزماں کی باتوں کو تسلیم کر لیں-

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس قسم کی باتیں آسان اور عام فہم الفاظ میں ماں سے کہیں- ماں بیٹے کی ان حکیمانہ اور مخلصانہ باتوں سے متاثر ہوئیں اور کہا-

پیارے بیٹے ! تم مجھے سب سے زیادہ عزیز ہو‘ میں تمھاری سادگی اور نیکی سے بہت خوش ہوں- تم نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا- تمھاری باتیں بھی صحیح ہیں اور تمھاری راہ عمل بھی درست ہے- میں نے تمھاری یہ تمام باتیں توجہ سے سنی ہیں- ان پر ضرور غور کروں گی- مجھے یقین ہے اللہ تمھیں غلط راستے پر نہیں لگائے گا اور وہ تمھیں لازماً سیدھی اور ہدایت کی راہ پر گام زن رکھے گا-

اب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے دعوت اسلام کو عام کر دیا اور علی الاعلان

لوگوں کو اس کی دعوت دی' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرکین مکہ کے جذبات مشتعل ہو گئے اور انھوں نے حضرت ابو بکر صدیق کو زدو کوب کیا- لیکن عین اس موقعے پر جب کہ مشرکین انھیں گھیر کر زدو کوب کر رہے تھے' ان کے ننھیال بنی تیم کے کچھ لوگوں کا ادھر سے گزر ہوا- انھوں نے حضرت ابو بکر کو مشرکین کے نرغے سے نجات دلائی اور بے ہوشی کے عالم میں کپڑے میں لپیٹ کر ان کے گھر لے آئے- ہوش آیا تو پوچھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟ یہ سوال اگرچہ بعض لوگوں کو ناگوار گزرا لیکن حضرت ابو بکر برابر آنحضرت کے بارے میں پوچھتے رہے- اسی دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پتا چلا تو آپ وہاں تشریف لے گئے- آپ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اس حالت میں دیکھا تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور حضرت ابو بکر کی پیشانی کو بوسہ دیا- حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنی والدہ کی طرف اشارہ کر کے عرض کیا-

یارسول اللہ! یہ میری والدہ ہیں- میں ان کی انتہائی عزت کرتا ہوں- اللہ نے آپ کو اپنی خاص مہربانیوں اور برکتوں سے نوازا ہے- ان کے لیے دعا فرمایئے اور انھیں اسلام کی دعوت دیجیے- بہت ممکن ہے اللہ تعالیٰ آپ کی دعا سے انھیں عذاب دوزخ سے محفوظ رکھے اور دنیا و آخرت میں کامیابی عطا فرمائے-

آنحضرت نے دعا فرمائی اور ام الخیر کو اسلام کی دعوت دی' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اسی وقت مسلمان ہو گئیں اور کفر کی تمام آلائشوں سے ان کا دل صاف ہو گیا- اسد الغابہ کی پانچویں جلد میں لکھا ہے-

وہ اسلام کے دور اول ہی میں نعمت اسلام سے متمتع ہو گئی تھیں-

اسلام قبول کرنے کے بعد حضرت ام الخیر رضی اللہ عنہا نے خواتین مکہ کو پورے زور سے اسلام کی طرف بلایا' چونکہ یہ اسلام کا پہلا اور ابتدائی دور تھا اور مسلمانوں کو سخت مبتلائے مصیبت کیا جاتا تھا' اس لیے حضرت ام الخیر رضی اللہ عنہا کو بھی تکلیفیں پہنچائی گئیں اور قبول اسلام کے جرم میں انھیں پریشان کیا گیا' مگر یہ عالی حوصلہ خاتون

اپنے موقف پر قائم رہیں اور کسی تکلیف اور مشکل کا احساس کیے بغیر برابر تبلیغ اسلام میں مصروف رہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی تبلیغ نتیجہ خیز ثابت ہوئی اور مکے کی متعدد خواتین محض ان کی دعوت سے متاثر ہو کر اسلام کی خادم بن گئیں۔

حضرت ام الخیر رضی اللہ عنہا کی تاریخ وفات کا اگرچہ پتا نہیں چل سکا تاہم یہ واقعہ ہے کہ حضرت ابو بکر کی وفات کے وقت یہ زندہ تھیں اور ان کے شوہر حضرت ابو قحافہ بھی زندہ تھے اور دونوں کو بیٹے کی میراث کا حصہ ملا تھا--- اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے عہد فاروقی میں وفات پائی۔

حضرت ام حرام بنت ملحان

ام حرام بنت ملحان بن خالد بن زید بن حرام بن خبوب بن عامر بن عدی بن نجار۔۔۔قبیلہ بنی خزرج کے خاندان نجار سے تعلق رکھتی تھیں۔والدہ کا نام ملیکہ تھا جو مالک بن عدی بن زید بن مناۃ بن عدی بن عمرو بن مالک بن نجار کی بیٹی تھیں۔اس اعتبار سے حضرت ام حرام حضرت ام سلیم کی بہن اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی خالہ تھیں۔خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ان کا یہی رشتہ تھا۔

تہذیب التہذیب کی روایت کے مطابق ان کا نکاح حضرت عمرو بن قیس انصاری رضی اللہ عنہ سے معلوم ہوا تھا۔یہ جنگ احد میں شہید ہو گئے تو ایک اور صحابی حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے عقد میں آئیں۔طبقات ابن سعد میں مذکور ہے کہ پہلا نکاح عبادہ بن صامت سے ہوا تھا' پھر عمرو بن قیس کے حلقہ زوجیت میں آئیں' مگر بعض مستند مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ دوسرے شوہر حضرت عبادہ بن صامت تھے۔سیرت کی بعض کتابوں میں یہ بھی مرقوم ہے کہ عبادہ بن صامت ہی ان کے شوہر تھے'ان کے علاوہ کسی دوسرے کے عقد میں نہیں آئیں'لیکن یہ صحیح نہیں۔

حضرت ام حرام بنت ملحان کا مکان مدینہ طیبہ میں قبا کی جانب تھا۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قبا کی طرف تشریف لے جاتے تو ان کے مکان پر ضرور قدم رنجہ فرماتے اور کھانا بھی تناول فرماتے۔حجتہ الوداع کے بعد ایک روز آپ ان کے مکان پر آئے اور کھانا کھایا۔کھانے کے بعد آرام کی غرض سے چارپائی پر لیٹ گئے تو حضرت ام حرام نے سر کے بالوں کو کنگھی کرنا شروع کر دی اور آپ کو نیند آ گئی۔تھوڑی دیر کے بعد اٹھے تو ہونٹوں پر تبسم کھیل رہا تھا۔

حضرت ام حرام سے فرمایا میں نے ایک خواب دیکھا ہے اور وہ یہ کہ میری امت

کے کچھ لوگ جنگ کے ارادے سے سمندر میں سفر کر رہے ہیں۔ یہ خواب سن کر حضرت ام حرام نے عرض کیا یا رسول اللہ دعا فرمایئے مجھے بھی ان خوش قسمت لوگوں میں شامل ہونے کی سعادت حاصل ہو۔ آپ نے دعا کی اور پھر سو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر اسی طرح مسکراتے ہوئے اٹھے اور فرمایا میں نے پھر وہی خواب دیکھا ہے اور انہی الفاظ میں دوسری مرتبہ والا خواب بیان کیا۔ حضرت ام حرام بنت ملحان رضی اللہ عنہا نے پھر اپنی شرکت کے لیے دعا کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا تم پہلی جماعت میں شامل ہو۔

اس خواب کی تعبیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے سولہ سال بعد ۲۷ ہجری میں پوری ہوئی اور وہ اس طرح کہ حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق کے عہد خلافت میں مسلمانوں کے ہاتھوں بازنطینی حکومت کو جو شکست ہوئی تو اس کے نتیجے میں بحیرہ روم کا جنوبی حصہ کلیتہً اس کے دائرہ اقتدار سے باہر نکل گیا۔ اب بازنطینی حکومت نے بحیرہ روم کے مشرقی حصے کو مستحکم کرنے کا عزم کیا تو تمام کوششیں قسطنطنیہ کی حفاظت کے لیے وقف کر دیں۔ مسلمانوں کے اس مفتوحہ علاقے کے گورنر حضرت معاویہ تھے جو جنگی اور انتظامی معاملات میں نہایت مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے بازنطینی حکومت کے متعلق اس نقطہ نظر کی روشنی میں غور ضروری سمجھا کہ اسلامی حکومت کی سرحدوں کے تحفظ کے لیے ان حملوں کی روک تھام کی جائے جو بحیرہ روم کے مشرقی اطراف سے مسلمانوں پر کیے جا سکتے ہیں۔

اس زمانے میں قبرص کو بازنطینی حکومت کے ایک اہم مورچے اور بہت بڑی پناہ گاہ کی حیثیت حاصل تھی۔ حضرت معاویہ چاہتے تھے کہ اس پر قبضہ کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے قبرص پر حملہ کرنے کی اجازت طلب کی، لیکن حضرت عمر نے امیر معاویہ کی یہ درخواست قبول کرنے سے انکار کر دیا تاہم امیر معاویہ اپنے موقف پر مصر اور حملے کی اجازت کے لیے برابر کوشاں رہے، آخر ۲۷ ہجری میں خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں وہ

قبرص پر حملہ کرنے میں کامیاب ہو گئے اور ایک طاقت ور بحری بیڑہ لے کر ہلہ بول دیا۔ یہ مسلمانوں کا پہلا قافلہ تھا جو جنگ کے ارادے سے سمندر کی طوفانی لہروں پر سوار ہوا اور ساحل قبرص پر اترا۔

قبرص کے اس حملے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ متعدد صحابہ کرام شریک تھے جن میں حضرت ابوالدردا، عبادہ بن صامت، شداد بن اوس، مقداد بن اسود اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ صحابہ کے علاوہ اس مقدس جنگ میں کئی صحابیات بھی شریک تھیں، جن میں حضرت عبادہ بن صامت کی اہلیہ محترمہ حضرت ام حرام بنت ملحان، حضرت معاویہ کی بیوی فاختہ بنت قرظہ اور ان کی بہن کنوہ بنت قرظہ خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں۔

حضرت ام حرام اس وقت بوڑھی ہو چکی تھیں، لیکن بحری جہاد میں شمولیت اور شہادت کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیش گوئی فرمائی تھی اس کی تکمیل کا جذبہ ان پر اتنا غالب تھا کہ عمر اور صحت کی پروا کیے بغیر مجاہدین کے ساتھ جزیرہ قبرص کی طرف چل پڑیں۔ ان مجاہدین کا جہاز سمندر کے کنارے لنگر انداز ہوا تو حضرت ام حرام نہایت خوشی سے جہاز سے باہر نکلنے لگیں، سواری کے لیے انھیں خچر پیش کیا گیا۔ وہ خچر پر سوار ہوئیں تو خچر بدک گیا اور وہیں گر کر شہید ہو گئیں۔ اسی جگہ انھیں دفن کیا گیا۔ ان کی قبر ''لارناکا'' کی حسین اور خوب صورت جھیل کے کنارے اب بھی موجود ہے جو ''سلطان تکے'' سلطان کی خالہ تکیے کے نام سے مشہور ہے۔ اس مقام پر ایک خوب صورت مسجد بھی تعمیر کی گئی ہے جو سمندر میں سفر کرتے وقت دور سے دکھائی دیتی ہے۔ بحیرہ روم میں جب جہاز ساحل کے قریب پہنچتے ہیں تو مسلمان ملاح اسے دیکھتے ہی فرط عقیدت سے جھنڈے سرنگوں کر دیتے ہیں۔ حضرت کنوہ بنت قرظہ رضی اللہ عنہا نے بھی اسی حملے میں جام شہادت نوش فرمایا۔

ایک روایت یہ ہے کہ مسلمانوں کا یہ بحری بیڑہ حمص کے ساحل سے روانہ ہوا اور قبرص پہنچا۔ قبرص فتح کر کے جب واپس آنے لگے اور جہاز تک پہنچانے کے لیے

حضرت ام حرام کو خچر پر سوار کرانے لگے تو وہ گر کر وفات پا گئیں۔

حضرت ام حرام بنت ملحان کے بطن سے تین لڑکے پیدا ہوئے۔ پہلے شوہر حضرت عمرو بن قیس سے قیس اور عبداللہ۔ اور دوسرے شوہر حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے محمد ---یہ تینوں بیٹے اصحاب فضل و کمال تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ام حرام نے چند احادیث بھی روایت کیں۔ پھر جن لوگوں نے حضرت ام حرام سے روایت حدیث کی اور ان کے حلقہ تلمذ میں شامل ہونے کا شرف حاصل کیا' ان میں حضرت انس' حضرت عمرو بن اسود' ام حرام کے شوہر حضرت عبادہ بن صامت' عطا بن یسار' یعلیٰ بن شداد بن اوس کے نام تاریخ و رجال کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

حضرت زینب بنت ابو سلمہ

زینب بنت ابو سلمہ بن عبد الاسد بن ہلال بن عبد اللہ بن عمرو بن مخزوم---
قبیلہ بنو مخزوم سے تعلق رکھتی تھیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ربیبہ تھیں۔والدہ
کا نام ام سلمہ تھا اور حضرت اسما بنت ابو بکر نے ان کو دودھ پلایا تھا۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے والد ابو سلمہ اور والدہ ام سلمہ کا شمار ان ذی
عظمت حضرات میں ہوتا ہے جو اسلام کے دور اول ہی میں مسلمان ہو گئے تھے۔ان
میاں بیوی نے ہجرت حبشہ کا بھی شرف حاصل کیا اور ہجرت مدینہ کا بھی---! حبشہ
ہی میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی ولادت ہوئی۔ ۴ ہجری میں ان کے والد محترم
حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا۔اسی سال عدت گزر جانے کے بعد ان کی
والدہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں۔
اس وقت حضرت زینب دو سال سے کم عمر کی بچی تھیں اور شیر خوار تھیں۔اسی عالم میں
اپنی ماں ام سلمہ (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عقد کے بعد ام المومنین حضرت ام
سلمہ رضی اللہ عنہا بن چکی تھیں) کے ساتھ آنحضرت کے سایہ عاطفت میں آگئیں۔
ماں باپ نے ان کا نام برہ رکھا تھا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زینب رکھا اور پھر
اسی نام سے مشہور ہوئیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوں تو تمام بچوں پر شفقت فرماتے تھے مگر زینب
سے آپ خاص انس رکھتے تھے۔انھوں نے حضرت اسما بنت ابو بکر کا دودھ پیا تھا اور اپنی
والدہ ام سلمہ کا بھی۔جب حضرت ام سلمہ آنحضرت کے عقد میں آئیں تو ان کا دودھ
پیتی تھیں۔آپ ان کو آغوش مادر میں دودھ پیتے دیکھتے تو اس خیال سے واپس ہو جاتے
کہ کہیں آپ کو دیکھ کر یہ دودھ پینا چھوڑ نہ دیں اور بھوکی نہ رہ جائیں۔رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم ان سے اس لیے بھی پیار کرتے تھے کہ ان کے والدین نے دو ہجرتوں کا شرف حاصل کیا تھا اور ان کے والد کی وفات جنگ احد میں زخمی ہونے کی وجہ سے ہوئی تھی- علاوہ ازیں یہ سرور کائنات کی ربیبہ اور آپ کے زیر تربیت تھیں- ان تمام چیزوں نے آنحضرت کے دل میں ان کی محبت پوری طرح پیوست کر دی تھی-

حضرت زینب رضی اللہ عنہا بھی آنحضرت سے بہت پیار کرتی تھیں- ذرا پاؤں چلنے لگیں تو چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی آپ کے پاس آ جاتیں- بارہا ایسا ہوا کہ آپ غسل فرما رہے ہیں اور یہ آپ کے پاس آ کھڑی ہوئیں- آپ پیار سے منہ پر پانی چھڑک دیتے- سیرت کی کتابوں میں مرقوم ہے کہ آپؐ کے اسی بابرکت پانی چھڑکنے کی وجہ سے کبر سنی میں بھی ان کا چہرہ بڑھاپے کے آثار سے محفوظ تھا اور زندگی کے آخری سانس تک چہرے پر جوانی کی رونق اور رنگت نمایاں رہی-

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عبداللہ بن زمعہ بن اسود اسدی سے ہوا- طبقات ابن سعد کی روایت کے مطابق چھ لڑکے عبدالرحمٰن' یزید' ابوعبیدہ' وہب' ابوسلمہ اور کثیر پیدا ہوئے- تین لڑکیاں --- قریبہ' ام کلثوم اور ام سلمہ --- پیدا ہوئیں- حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی یہ اولاد جو چھ بیٹوں اور تین بیٹیوں پر مشتمل تھی' نہایت ہونہار اور سعادت مند تھی-

۶۳ ہجری میں یزید بن معاویہ کے زمانہ حکومت میں حرہ کی لڑائی ہوئی- یہ لڑائی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے لیے بہت بڑی مصیبت ثابت ہوئی- اس لڑائی میں ان کے دو بیٹے شہید ہوئے- جب ان کی لاشیں حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے سامنے لا کر رکھی گئیں تو ماں کی ممتا بے تاب ہو ہو گئی- اناو انا الیہ راجعون پڑھا اور کہا مجھ پر بہت بڑی مصیبت ٹوٹ پڑی ہے- ایک بیٹا تو میدان جنگ میں لڑتا ہوا شہید ہوا- مگر دوسرا خانہ نشین تھا' جو بلاوجہ گھر میں بیٹھا بے چارگی اور بے بسی کے عالم میں مارا گیا-

حضرت زینب کے لیے یہ انتہائی پریشانی اور اضطراب کا دور تھا- ایک ہی وقت میں دو جوان بیٹوں کی موت ان کے لیے بہت بڑے حزن وملال کا باعث تھی-

حضرت زینب رضی اللہ عنہا علم و فضل میں مرتبہ کمال تک پہنچی ہوئی تھیں- کہتے ہیں علم و فضل کے اعتبار سے اپنے دور میں خواتین کے زمرے میں وہ بہت آگے تھیں- اصابہ میں لکھا ہے کہ حضرت ابورافع کہتے ہیں-

جب میں نے مدینے کی کسی فقیہ خاتون کا ذکر کیا تو زینب بنت ابوسلمہ کو ضرور یاد کیا کیونکہ وہ مدینے کی بہت بڑی فقیہ تھیں-

علامہ ابن عبدالبر کا کہنا ہے

زینب بنت ابوسلمہ اپنے زمانے کی بہت بڑی فقیہ خاتون تھیں-

حضرت زینب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چند احادیث بھی روایت کی ہیں- حضرت ام سلمہ' حضرت ام حبیبہ اور حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے بھی انھوں نے احادیث کی روایت و سماعت کا شرف حاصل کیا-

جن حضرات نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے سماعت حدیث کی اور ان کے شاگردوں کے حلقے میں شامل ہونے کا فخر حاصل کیا' ان میں مندرجہ ذیل حضرات شامل ہیں-

امام زین العابدین علی بن حسین' ابوعبیدہ بن عبداللہ بن زمعہ' محمد بن عطا' عراک بن مالک' عروہ بن زبیر' ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن' حمید بن نافع' ابوقلابہ جرمی- کلیب بن وائل-

یہ حضرات اپنے زمانے کے محدث اور علماو صلحا بزرگ تھے-

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی وفات ۷۳ ہجری میں ہوئی- تہذیب التہذیب کی روایت کے مطابق اپنے بیٹوں کی شہادت کے دس برس بعد فوت ہوئیں- اس زمانے میں مدینے کا عامل طارق تھا' اسی نے نماز جنازہ پڑھائی- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بھی نماز جنازہ میں شریک ہوئے اور جنت البقیع میں مدفون ہوئیں-

حضرت خولہ بنت حکیم

خولہ بنت حکیم بن امیہ بن حارث بن اوقص بن مرہ بن' بلال بن فالج بن ذکوان بن ثعلبہ بن بہثہ بن سلیم--- قبیلہ بنو سلیم سے تعلق رکھتی تھیں- کنیت ام شریک ہے لیکن کنیت کے بجائے اصل نام خولہ سے مشہور ہوئیں- رشتے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خالہ تھیں-

خولہ بنت حکیم کا نکاح حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ سے ہوا جو مشہور صحابی تھے-

حضرت خولہ نہایت بلند حوصلہ اور بے حد فضل و کمال کی مالک خاتون تھیں- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بدرجہ کمال تعلق عقیدت تھا- حضور کی ذات اقدس کے خلاف کوئی بات بھی سننا گوارا نہ تھا- نکاح کے بعد دائرہ اسلام میں داخل ہوئیں اور مدینہ کو ہجرت کی- قبول اسلام کے بعد جو تکلیفیں پہنچائی گئیں وہ خندہ پیشانی اور فراخ حوصلگی سے برداشت کیں- خواتین میں اسلام کی بہت بڑی مبلغ تھیں- زبان میں بڑا اثر تھا- اسلام کے معاملے میں کسی قسم کی مداہنت اور رعایت کی قائل نہ تھیں- عورتوں میں دینی روح پیدا کرنے کے لیے کوشاں رہتیں- ایک مرتبہ چند خواتین سے باتیں کرتے ہوئے فرمایا-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے محبوب ترین پیغمبر ہیں اور اسلام اللہ کا سچا دین ہے- آپ کو دل و جان سے ماننا اور آپؐ کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ضروری ہے' عام طور سے عورتیں غیر اسلامی رسم ورواج کو اہمیت دینے کی عادی ہوتی ہیں- احکام اسلام کی پیروی میں اگر کوتاہی کی جائے گی تو اللہ کی طرف سے باز پرس ہو گی اور نافرمانی کی سخت سزا دی جائے

گی۔ اللہ کی پکڑ بڑی سخت اور اس کی گرفت بڑی مضبوط ہے۔ ہر وقت اللہ سے ڈرتے رہو اور اس کے احکام دل کی گہرائیوں سے مانو۔

ان کے شوہر حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ بلند پایہ صحابی تھے۔ میاں بیوی میں بڑی محبت تھی۔ اسلام کے رشتے نے دونوں کی محبت والفت کو مضبوط تر کر دیا تھا۔ بیوی اگر عورتوں میں تبلیغ اسلام کے لیے کوشاں رہتی تھیں تو شوہر مردوں میں یہ فریضہ انجام دیتے تھے اور دونوں نے اپنی زندگی کا مقصد اسلام ہی کو قرار دے رکھا تھا۔ ۲ ہجری میں جنگ بدر ہوئی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ وفات پا گئے۔ ان کی وفات سے حضرت خولہ رضی اللہ عنہا کے لیے دنیا تاریک ہو گئی اور وہ پریشان رہنے لگیں۔ مگر اس جلیل القدر شوہر کی وفات کے بعد دوسرا نکاح نہیں کیا۔ صحیح بخاری کی ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ لیکن آپ نے کسی وجہ سے منظور نہیں فرمایا۔

حضرت خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا اخلاق و کردار کے اعتبار سے انتہائی رفعت شان کی حامل تھیں۔ اس سلسلے میں اسد الغابہ میں لکھا ہے۔

كانت امراة صالحة۔ یعنی وہ ایک صالحہ خاتون تھیں۔

استیعاب میں ان کے بارے میں یہ الفاظ مرقوم ہیں۔

كانت امراة صالحة فاضلة

وہ نہایت صالحہ اور فاضلہ عورت تھیں۔

مسند امام احمد میں ہے۔

تصوم النهار وتقوم الليل

یعنی دن کو روزہ رکھتیں اور رات کو اللہ کی عبادت کرتی تھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تقریباً پندرہ احادیث روایت کیں۔ حضرت سعد بن ابی وقاص، سعید بن مسیّب، ربیع بن مالک، عروہ اور بشر بن سعید ایسے جلیل

القدر حضرات نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا اور احادیث بیان کیں۔

عورت فطری طور پر زیور سے محبت رکھتی ہے۔ حضرت خولہ رضی اللہ عنہا کو بھی زیور سے رغبت اور محبت تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:

یا رسول اللہ اگر طائف فتح ہو تو آپ مجھے بادیہ بنت غیلان یا فارعہ بنت عقیل کا زیور عنایت فرما دیجیے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا:

اگر اللہ اس کی اجازت نہ دے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟

حضرت خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا کی عمر اور تاریخ وفات کا پتا نہیں چل سکا۔

شیما بنت حارث

۸ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا۔ اس سے یہودیوں کو انتہائی کوفت ہوئی۔ ہوازن اور ثقیف یہودیوں کے دو مشہور قبیلے تھے اور ان کی حدیں مکہ سے ملتی تھیں۔ بلاذری نے فتح البلدان میں لکھا ہے کہ فتح مکہ کے بعد ہوازن اور ثقیف کے یہودیوں نے سوچا کہ اگر ہم متحد ہو کر مسلمانوں سے جنگ کریں اور انھیں شکست دے دیں تو ان کے وہ تمام باغات اور جاگیریں جو حدود طائف میں واقع ہیں' ہمارے قبضے میں آ جائیں گی اور مسلمانوں کا زور ٹوٹ جائے گا۔ اگر ہم ان سے مزاحم نہ ہوئے اور وہ اسی طرح آگے بڑھتے رہے تو ہمارے علاقے بھی ان کے تسلط میں آ جائیں گے۔ اس مقصد کے لیے ان یہودیوں نے بنی مضر اور بنی ہلال کے قبائل کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا اور چار ہزار بہادر فوج لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوئے اور وادیٔ حنین میں اترے۔ وہ اپنے سردار مالک بن عوف کے مشورے سے اپنی عورتوں اور بچوں اور مال مویشی کو بھی ساتھ لے کر آئے تھے۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ اپنے اہل و عیال اور مال و دولت کو چھوڑ کر کوئی شخص میدان سے بھاگنے کی کوشش نہیں کرے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہودیوں کے اس حملے کی اطلاع ہوئی' لیکن آپ بیت اللہ اور حرم مقدس میں جنگ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ آپ مکہ سے باہر نکلے۔ مسلمانوں کی تعداد بارہ ہزار تھی اور یہ تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس سے قبل کسی جنگ میں مسلمان اتنی بڑی تعداد میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ اس کثرت تعداد پر مسلمان مغرور ہو کر حزم و احتیاط کے دائرے سے باہر نکل گئے تھے۔ مسلمانوں کو شکست دینے اور ان پر اچانک حملہ کرنے کے لیے دشمن نے ایک تنگ اور دشوار گزار درے میں گھات لگائی اور مسلمان وہاں سے گزرے تو ان پر اچانک تیروں کی بارش کر

دی۔اس سے مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور بے خبری کے اس حملے نے ان کو سراسیمہ کر دیا۔اس سلسلے میں قرآن کہتا ہے کہ جنگ حنین کے موقعے پر مسلمانوں نے اپنی کثرت پر فخر اور غرور کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے لیے دشمن کے مقابلے میں سنبھلنا مشکل ہو گیا۔

بہر حال اس موقعے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بہت سے صحابہ ثابت قدم رہے اور آپ نے مختلف قبیلوں کے نام لے لے کر انھیں میدان جنگ میں بلایا اور ثابت قدم رہنے کی تلقین کی۔اور یہ شعر بار بار پڑھا۔

انا النبی لا کذب

انا ابن عبدالمطلب

یعنی میں بلا شبہ نبی ہوں اور میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔

اس سے مسلمانوں کی ڈھارس بندھی اور وہ میدان میں جم گئے۔نتیجتاً ان کو فتح حاصل ہوئی۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی میدان جنگ میں آکر ٹھہرے ہی تھے کہ ہوازن کے چھے سردار آئے اور انھوں نے آکر رحم کی درخواست کی۔اس جنگ کے موقعے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قلعہ طائف کے محاصرے کا حکم دیا اور ایک مقام اوطاس پر حضرت ابو عامر اشعری رضی اللہ عنہ کو مامور فرمایا۔اوطاس میں چوبیس ہزار اونٹ' چالیس ہزار بکریاں' چار ہزار اوقیہ چاندی اور چھے ہزار عورتیں اور بچے مسلمانوں کے قبضے میں آئے۔اسی موقعے پر ہوازن کے سردار حضور کی خدمت میں رحم کی درخواست لے کر آئے تھے۔ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے' جنھوں نے ایک عرصہ قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر طائف میں پتھر برسائے تھے۔

ان قیدیوں میں شیما بنت حارث رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔ان کا اصل نام حذافہ تھا۔لوگ اسے شیما یا شما کہتے تھے اور یہی عرفیت نام پر غالب آگئی تھی۔یہ حارث بن عبدالعزی کی بیٹی تھیں۔ان کی ماں حلیمہ سعدیہ تھیں۔اس اعتبار سے یہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی بہن تھیں- حلیمہ سعدیہ وہ لائق تکریم خاتون ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دودھ پلایا تھا- حضور کی خدمت میں جو لوگ رحم کی درخواست لے کر آئے تھے- انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ آپ اپنی رضاعی بہن شیما کی وجہ سے ہمیں معاف فرماویں- ہم انہی کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں-

شیما رضی اللہ عنہا جو اپنی والدہ حلیمہ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بچپن میں کھلایا کرتی تھیں اور آج ایک قیدی کی حیثیت میں آپ کے سامنے کھڑی تھیں، آنحضرت کے سن شعور کو پہنچنے سے قبل ہی اپنے قبیلے میں واپس چلی گئی تھیں- اب یہ مال غنیمت میں حضور کے سامنے لائی گئیں تو کہا :

یارسول اللہ میں آپ کی رضاعی بہن ہوں-

آپ نے فرمایا: اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم میری رضاعی بہن ہو؟

شیما نے عرض کیا: میری کمر میں آپ کے دانت کے نشان ہیں- بچپن میں آپ نے مجھے کاٹ لیا تھا-

آپ نے فرمایا تم ٹھیک کہتی ہو- واقعی تم میری رضاعی بہن ہو-

یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شیما کا انتہائی احترام کیا- اٹھ کر کھڑے ہو گئے- اپنی چادر مبارک بچھا دی اور اس پر نہایت احترام سے بٹھایا- پھر فرمایا اگر تم میرے پاس رہنا چاہو تو میں تمھیں عزت و احترام سے رکھوں گا- اگر اپنی قوم میں جانا چاہو تو تمھیں اس کا بھی اختیار ہے-

شیما نے دوسری بات کو پسند فرمایا اور آپ نے ان کو بہت سا مال و متاع دے کر رخصت فرمایا- ایک لونڈی اور غلام بھی عنایت فرمائے- شیما نے اس لونڈی اور غلام کا باہم نکاح کر دیا، جس سے آگے نسل چلی- کہتے ہیں آج تک وہ نسل باقی ہے-

تاریخ کی بعض کتابوں میں مرقوم ہے کہ شیما جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بچپن میں کھلاتی تھیں تو چند اشعار پڑھا کرتی تھیں اور وہ اشعار یہ ہیں- کتابوں میں لکھا ہے کہ یہ اشعار وہ باقاعدہ گاتی تھیں-

یاربنا ابق لنا محمدا

حتی اراہ یافعا وامردا

ثم اراہ سید اسودا

واکبت اعادبہ معادالحسدا

واعطہ عزایدوم ابدا

ترجمہ: یااللہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو زندہ رکھیو' یہاں تک کہ ہم ان کو جوان دیکھیں۔ پھر انھیں ایک معزز سردار دیکھیں اور اس طرح دیکھیں کہ ان کے حاسد دشمن ان کے سامنے سرنگوں ہوں۔اے اللہ انھیں ہمیشہ عزت واحترام کے ساتھ رکھیو۔

اس کے علاوہ ان کے مزید حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ تاریخ وفات وغیرہ کا بھی علم نہیں ہو سکا۔

حضرت زینب بنت ابو معاویہ

زینب بنت عبداللہ ابو معاویہ بن عتاب بن اسعد بن عامرہ بن حطیط بن جشم بن ثقیف---ان کا نام زینب اور لقب رائطہ تھا- خاندان ثقیف سے تھیں- نکاح جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ہوا-

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے شوہر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تنگ دست تھے' کوئی ذریعہ معاش اور وسیلہ آمدنی نہ تھا- حضرت زینب دست کار تھیں- دست کاری سے انھیں خاصی آمدنی ہو جاتی تھی' لیکن جو کچھ کماتیں شوہر اور اولاد پر خرچ ہو جاتا یعنی گھر کے تمام اخراجات کی کفالت یہی کرتی تھیں اور کچھ باقی نہ بچتا تھا- ایک مرتبہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے صدقے کی فضیلت کے بارے میں سن چکی تھیں' اس کے بعد مستحقین پر صدقہ کرنے اور ان کی مالی امداد دینے کے لیے ہر وقت تیار رہتی تھیں- ایک دن شوہر سے کہنے لگیں جو کچھ دست کاری سے کماتی ہوں' آپ پر اور آپ کی اولاد پر خرچ کر دیتی ہوں' صدقات و خیرات کا بڑا اجر ہے' لیکن میں اس سے محروم ہوں' آپ ہی بتائیے مجھے اپنی کمائی سے کیا حاصل؟

حضرت عبداللہ بن مسعود نے جواب دیا: تم اپنا فائدہ پیش نگاہ رکھو- میں تمھیں نقصان پہنچانا نہیں چاہتا-

شوہر کا یہ جواب سن کر حضرت زینب رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا:

> یا رسول اللہ میں دست کار ہوں' جو کچھ کماتی ہوں شوہر اور اولاد پر خرچ ہو جاتا ہے' شوہر کا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں- گھر کا خرچ زیادہ ہونے کی وجہ سے مستحق اور محتاج لوگوں کو صدقہ نہیں دے سکتی- ایسی صورت میں مجھے کچھ

اجر ملے گا؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: ہاں تمھیں ان کی خبر گیری کرنی چاہیے۔

اسی اثنا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو صدقہ کرنے کی تلقین کی تو حضرت زینب مزید تفصیلات معلوم کرنے کے لیے آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ وہاں پہنچیں تو دروازے پر ایک اور خاتون کو کھڑے پایا۔ ان کا نام بھی زینب تھا۔ یہ انصار سے تعلق رکھتی تھیں اور اسی کام سے آئی تھیں' جس کام سے حضرت زینب بنت ابو معاویہ آئی تھیں۔ لیکن آنحضرت کے جلال اور رعب کی وجہ سے اندر جانے کی جرات نہ تھی۔ اتنے میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ باہر آئے تو دونوں نے بیک زبان کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر کہیے باہر دو عورتیں کھڑی ہیں اور آپ سے یہ دریافت کرنا چاہتی ہیں کہ شوہر اور خاندان کے یتیموں کو صدقہ دینے سے ثواب ملتا ہے یا نہیں؟ حضرت بلال اندر گئے اور پوچھا تو حضور نے فرمایا ان سے پوچھو وہ کون ہیں؟ بلال باہر آئے تو عورتوں نے کہا ایک انصار کی خاتون ہے اور ایک زینب۔ حضور نے فرمایا: کون زینب؟ عبداللہ بن مسعود کی بیوی؟

فرمایا: ان سے کہو

لهما اجران اجر الصدقة واجر القرابة

یعنی یہ دو بڑے اجر کی حق دار ہیں۔ ایک اجر صدقے کا اور ایک اجر قرابت کا۔

حضرت زینب بنت ابو معاویہ رضی اللہ عنہا اکثر آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوتی تھیں۔ ایک روز آپؐ کے پاس آئیں تو کسی کام میں مصروف ہو گئیں۔ وہاں مہاجرین کی کچھ خواتین بیٹھی تھیں۔ ایک بات شروع ہوئی تو حضرت زینب کام چھوڑ کر گفتگو میں حصہ لینے لگیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تم آنکھوں سے تو نہیں بول رہی ہو' زبان سے بات کرو اور آنکھ سے دیکھ کر کام کرتی جاؤ۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی اولاد کی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی' البتہ مشہور محدث ابو عبیدہ بن عبداللہ بن مسعود ان کے فرزند تھے- یہ اونچے درجے کے حافظ حدیث تھے-

حضرت زینب بڑے علم و فضل کی حامل تھیں- انھیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' حضرت عبداللہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے احادیث سننے اور روایت کرنے کا شرف حاصل ہے- پھر ان سے بھی بہت سے حضرات نے احادیث روایت کیں جن میں عمر بن حارث' بسر بن سعید' عبید بن سیاق اور زینب کے بیٹے ابو عبیدہ شامل ہیں- حضرت زینب کے ایک بھائی نے بھی ان سے روایت حدیث کی-

حضرت زینب بہت بڑی محدثہ اور بہت بڑی مبلغ اسلام تھیں- گفتگو میں متین تھیں اور زبان میں اثر رکھتی تھیں- اکثر حضور کی خدمت میں آتیں اور مختلف مسائل دریافت فرماتیں-

حضرت معاذہ بنت عبداللہ

معاذہ بنت عبداللہ بن جریر الضریر بن امیہ بن حدارہ بن حارث بن خزرج۔۔۔ عبداللہ بن ابیّ کی کنیز تھیں۔ قبول اسلام کے باعث اللہ نے ان کو آزادی کی نعمت عطا کی۔ ان عظیم خواتین میں سے تھیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی سعادت حاصل کی۔

حضرت معاذہ بنت عبداللہ رضی اللہ عنہا کا پہلا نکاح سہل بن قرظہ سے ہوا۔ ان کے انتقال کر جانے یا طلاق دینے کے بعد دوسرا نکاح حمیر بن عدی القاری سے کیا۔ انھوں نے طلاق دے دی تو تیسری شادی عامر بن عدی سے کی۔ پہلے شوہر سہل بن قرظہ سے دو بچے پیدا ہوئے۔ ایک لڑکا عبداللہ بن سہل اور ایک لڑکی ام سعید بنت سہل۔ دوسرے شوہر حمیر بن عدی سے دو جڑواں لڑکے حارث اور عدی پیدا ہوئے اور ایک لڑکی ام سعد پیدا ہوئی۔۔۔ تیسرے خاوند عامر بن عدی سے صرف ایک لڑکی ام حبیب بنت عامر پیدا ہوئی۔

الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب میں بتایا گیا ہے کہ جہاں یہ بہت بڑی عاملہ و فاضلہ اور معلّمہ تھیں' وہاں سخاوت و عادات کے لحاظ سے نہایت بلند مرتبے پر فائز تھیں۔ صدقات و خیرات بڑی وسعت قلب سے کرتی تھیں۔ بلند حوصلہ اور عالی ذہن خاتون تھیں۔ متکبر اور ظالم کے سامنے کبھی سر نہ جھکاتیں' کم زور اور نادار کی مدد کرتیں۔ ضرورت مندوں کے کام آتی اور حاجت مندوں کی حاجت روائی کے لیے تیار رہتیں۔ لوگوں کا سودا سلف لا دیتیں اور بوڑھی عورتوں کی خدمت کرتیں۔ زبان میں اثر اور زور تھا۔ ایک عرصے تک مشہور منافق عبداللہ بن ابی بن سلول کی کنیز رہیں۔ لیکن ضمیر زندہ تھا' جذبات تیز تھے' ذہن آزاد تھا اور فکر میں روانی تھی۔ نہ خود کسی پر ظلم کرتیں

اور نہ کسی پر ظلم ہوتا دیکھ کر برداشت کر سکتیں- اسلام کی بہت بڑی خادمہ تھیں اور حالات کی رفتار کو خوب سمجھتی تھیں- محنت مزدوری سے جی نہ چراتیں-

اسلام کی آواز کانوں میں پہنچی تو مسلمان ہو گئیں- عبداللہ بن ابی ان کے اسلام کا شدید مخالف تھا- اس لیے انھیں سخت اذیتیں پہنچاتا- اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اس کی تکلیفوں اور اذیتوں کو برداشت نہ کر سکیں گے اور زیادہ رقم دے کر اسے چھڑا لیں گے- مگر معاذہ بنت عبداللہ رضی اللہ عنہا کے دل میں اسلام کی محبت اس درجہ راسخ ہو چکی تھی اور حب رسول ان کے اندر اس قدر گھر کر چکی تھی کہ انھیں کسی تکلیف کی کوئی پروانہ ہوتی اور وہ برابر اپنے اسلام کا اعلان کرتی اور احکام شریعت پر پابندی سے عمل پیرا رہتیں- ایک مرتبہ عبداللہ بن ابی کی طرف سے تکلیفوں میں اضافہ ہوا تو اس بلند مرتبت خاتون نے اس سے کہا-

> میں اگرچہ غلاموں اور کنیزوں کے گروہ سے تعلق رکھتی ہوں، لیکن میرا ضمیر آزاد ہے اور میرے فکر و عمل کی دنیا وسیع ہے- میں بتا دینا چاہتی ہوں کہ میں اسلام کی نعمت سے مالا مال ہو چکی ہوں- اسلام کے خلاف تمھاری کوئی بات ماننے کو تیار نہیں- بہ صدق دل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لا چکی ہوں- اب کوئی تکلیف اور کوئی حرص مجھے رسول اللہ کے دامن سے الگ نہیں کر سکتی- مجھے یقین ہے کہ دین و دنیا کی کامیابی کا ضامن صرف اسلام ہے اور رسول اللہ سے قلبی وابستگی تمام بیماریوں کا واحد علاج---

میں نے اسلام قبول کر کے اور آنحضرت کی بیعت کا شرف حاصل کر کے پوری صورت حال کا جائزہ لے لیا ہے- اسلام میں غلام اور آزاد کی کوئی تمیز نہیں- وہاں چھوٹے اور بڑے میں کوئی فرق نہیں، آقا اور مالک کو کوئی فوقیت حاصل نہیں، امیر اور غریب میں کوئی امتیاز نہیں- میں اسلام کے معاملے میں تمھیں کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں- جاؤ جو جی چاہے کر لو- میں اب کسی صورت میں اسلام ترک نہیں کر سکتی-

وہ حضرت معاذہ کو کنیز کی حیثیت سے بدکاری پر مجبور کرتا تھا- اس پر سورہ نور کی

یہ آیت نازل ہوئی۔

لاتکرھوافتیبا تکم علی البغاء اس کے بعد ان کو آزادی حاصل ہو گئی اور انھوں نے اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔

تاریخ وفات کا پتا نہیں چل سکا۔

حضرت حمنہ بنت جحش

حمنہ بنت جحش بن رباب بن یعمر بن صبرہ بن مرہ بن کثیر بن غنم بن وودان بن سعد بن خزیمہ ---ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کی حقیقی بہن تھیں- قبیلہ قریش کے خاندان اسد بن خزیمہ سے تعلق رکھتی تھیں-ان کی والدہ کا نام امیمہ تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جدامجد حضرت عبدالمطلب کی بیٹی تھیں- اس لحاظ سے یہ آنحضرت کی پھوپھی زاد بہن تھیں-

حضرت حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا کا نکاح مشہور صحابی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ سے ہوا' اور اپنے شوہر کے ساتھ ہی حلقہ بگوش اسلام ہوئیں-

حضرت حمنہ ان خواتین میں سے ہیں جنھوں نے ہجرت مدینہ کا شرف حاصل کیا اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کی خواتین سے بیعت لی تو یہ بھی ان خوش نصیب خواتین میں شامل ہوئیں-ان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے متعدد جنگوں میں سرورکائنات کے ساتھ شریک ہونے کا فخر حاصل کیا- جنگ احد میں بڑی خدمات انجام دیں- جنگوں میں یہ مجاہدین کو پانی پلاتیں' زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں لور ان کے علاج و معالجہ کے لیے کوشاں ہوتیں- زمانہ رسالت میں اکثر صحابیات یہ خدمت سرانجام دیتی تھیں اور اس خدمت کے لیے وہ باقاعدہ شریک جنگ ہوتی تھیں- بعض عورتیں مجاہدین کو پانی فراہم کرتیں' بعض مجروحین کا علاج کرتیں' بعض انھیں اسلحہ دیتیں اور بعض زخمیوں کو محفوظ مقامات پر پہنچانے پر مامور ہوتی تھیں اور بعض مسلح ہو کر دشمنان اسلام سے جنگ کرتی تھیں-

اس قسم کی خدمات سرانجام دینے والی خواتین کی فہرست بڑی طویل ہے اور تاریخ ورجال کی کتابوں میں اس نوع کی جابجا تفصیلات مذکور ہیں-اس دور کی مشہور

خواتین میں سے حضرت ام کبشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت رفیدہ رضی اللہ عنہا عہد رسالت کے غزوات میں یہی خدمات انجام دیتی تھیں- کتابوں میں مرقوم ہے کہ خود آنحضرت بعض خواتین کو اس اہم کام کی انجام دہی پر متعین فرماتے اور وہ اس پر فخر محسوس کرتیں اور سمجھتی تھیں کہ مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی میدان جنگ میں اترنا اور ان کے شانہ بشانہ لڑنا چاہیے' کیونکہ جس طرح اسلام کا تحفظ مردوں کے لیے ضروری ہے' اسی طرح عورتوں کا بھی فرض ہے کہ وہ اسلام کی حفاظت و دفاع کے لیے اپنی مساعی وقف کر دیں- حضرت حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا خواتین کی اسی جماعت میں شامل تھیں- وہ باقاعدہ مسلمانوں کی فوج میں بطور سپاہی کے شرکت کرتیں اور مخالفین اسلام کے ساتھ برسرپیکار ہوتیں-

حضرت حمنہ رضی اللہ عنہا کے شوہر نامدار حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے جنگ احد میں شہادت پائی- اس وقت خود حضرت حمنہ میدان کارزار میں موجود تھیں- ان کے سامنے ہی خاوند کی شہادت کا واقعہ پیش آیا- ان کی شہادت کے بعد حضرت حمنہ نے حضرت طلحہ سے نکاح کیا- حضرت طلحہ عشرہ مبشرہ میں سے تھے' یعنی ان کا شمار ان دس رفیع الشان صحابہ میں ہوتا ہے' جنھیں دنیا ہی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی خوش خبری دے دی تھی اور یہ بتا دیا تھا کہ ان کے اعمال حسنہ اور بلند کردار کی بنا پر اللہ نے ان کی مغفرت فرما دی ہے اور انھیں مستحق جنت قرار دے دیا ہے-

واقعہ افک میں منافقین کے ساتھ جو مسلمان شریک ہو گئے تھے' ان میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے غلام حضرت مسطح اور حضرت حسان (مشہور شاعر) بھی تھے- علاوہ ازیں حضرت حمنہ رضی اللہ عنہا بھی انہی لوگوں کی ہم نوا تھیں- اس سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو انتہائی قلبی اور ذہنی کوفت ہوئی اور یہ بات فی الواقع المناک تھی- چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ سے منقول ہے کہ ام المومنین حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی بہن حمنہ برابر میری مخالفت کرتی رہیں یہاں تک کہ

دیگر اصحاب افک کی طرح وہ بھی ناکام ہوئیں۔

اس حدیث کے تحت فتح الباری میں مذکور ہے کہ واقعہ افک میں حضرت حمنہ کے شریک ہونے کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عائشہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظروں سے گرا کر اپنی بہن حضرت زینب کو ترجیح دی جائے' لیکن اس باب میں عجیب بات یہ ہے کہ خود حضرت زینب نے اس موقعے سے قطعاً کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت حمنہ اپنی اس غلطی پر ہمیشہ نادم رہیں۔

حضرت حمنہ بنت جحش کی وفات کی صحیح تاریخ تو معلوم نہیں ہو سکی' البتہ تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ وہ حضرت زینب کی وفات تک زندہ تھیں۔ حضرت زینب کی وفات ۲۰ ہجری میں ہوئی تھی۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے حضرت حمنہ کے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ ایک محمد اور دوسرا عمران۔ محمد' سجاد کے لقب سے مشہور تھے۔ ابن سعد کی روایت کے مطابق ان کے بطن سے حضرت مصعب بن عمیر کی اولاد بھی ہوئی' مگر دیگر کتابوں میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ ان تمام کتب تاریخ و رجال میں حضرت طلحہ کی اولاد کا تذکرہ ہی ملتا ہے۔

حضرت ربیع بنت نضر

ربیع بنت نضر بن ضمضم بن زید بن حرام--- انصاریہ تھیں اور انصار کے معروف خاندان عدی بن نجار سے تعلق رکھتی تھیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ کی بہن اور آپ کے خادم خاص حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی پھوپھی تھیں۔ان کی شادی ایک شخص سراقہ سے ہوئی تھی۔نہایت بلند حوصلہ اور عزم وارادے کی خاتون تھیں۔مصائب و مشکلات سے قطعاً نہ گھبراتیں۔اللہ کی راہ میں جو تکلیفیں آتیں خندہ پیشانی سے برداشت کرتی تھیں۔

ربیع بنت نضر رضی اللہ عنہا نے اسلام قبول کرنے کے بعد اسلام کی تبلیغ و اشاعت کو اپنا مقصد زندگی ٹھہرالیا تھا۔وہ جو مسائل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنتیں ان سے خواتین مدینہ کو آگاہ کرتیں' بچوں کو اسلام تعلیمات سے آگاہ کرتیں اور قرآن مجید پڑھاتیں۔بوڑھی اور سن رسیدہ عورتوں کی خدمت کرتیں۔انھوں نے اپنی زندگی کا یہی نصب العین قرار دے لیا تھا کہ جہاں تک ہوسکے لوگوں کے کانوں میں اسلام کی آواز پہنچائی جائے۔مدینہ کے مرد اور عورتیں انھیں احترام کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان کے اخلاص وانکسار و تواضع اور خدمت خلق کے جذبہ صادقہ سے انتہائی متاثر تھے۔

حضرت ربیع بنت نضر رضی اللہ عنہا غزوات میں بھی شریک ہوتی تھیں۔غزوات میں وہ مجاہدین کو پانی پلاتیں' ان کے لیے کھانا تیار کرتیں' انھیں اسلحہ دیتیں' زخمیوں کے لیے دوائیں مہیا کرتیں وہ کوشش کرتیں کہ تمام امور اپنے ہاتھوں سے انجام دیں۔ان کی یہ تگ و تازباقی خواتین کے لیے نہایت مؤثر ثابت ہوتی اور یہ بات خود مجاہدین میں ایک جوش اور عزم پیدا کرنے کا باعث بنتی۔جب مجاہدین ایک عورت کا یہ ولولہ اور

ہمت دیکھتے تو خود ان کے عزم و استقلال کے جذبے میں مزید استحکام اور مضبوطی کے آثار ابھرتے۔

حضرت ربیع بنت نضر رضی اللہ عنہا کا ایک بیٹا تھا' جس کا نام حارثہ بن سراقہ تھا۔ ماں کی طرح بیٹا بھی بڑا بہادر اور جری تھا اور اسلام کا مخلص سپاہی اور سچا خادم۔ حضرت حارثہ بن سراقہ ان لوگوں میں سے تھے' جنھوں نے جنگ بدر میں شرکت کی سعادت حاصل کی تھی۔ جنگ بدر کو عہد رسالت کی جنگوں میں بے حد اہمیت حاصل ہے' کیونکہ یہ جنگ کفر اور اسلام کے درمیان فیصلہ کن معرکے کی حیثیت رکھتی تھی اور اس میں مخالفین اسلام کو عبرت ناک ہزیمت اور مسلمانوں کو زبردست فتح حاصل ہوئی تھی۔ حضرت حارثہ بن سراقہ رضی اللہ عنہ اس جنگ میں شہید ہو گئے تھے۔ حضرت ربیع رضی اللہ عنہا بیٹے سے بہت اداس رہتی تھیں۔ بسا اوقات ماں کی ممتا کا معصوم جذبہ اس قدر جوش میں آجاتا کہ وہ دل پر قابو نہ رکھ سکتیں اور آنکھوں سے بے ساختہ آنسو رواں ہو جاتے۔ ایک روز اتنی مغموم ہوئیں اور بیٹے کی موت کے صدمے نے اس درجہ شدت اختیار کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا یارسول اللہ آپ کو معلوم ہے میدان بدر میں میرا لخت جگر حارثہ جام شہادت نوش کر چکا ہے اور میں اس کی جدائی میں بہت مغموم ہوں۔ میں آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ میرا پیارا بیٹا کس حال میں ہے؟ اگر وہ جنت میں ہے تو صبر کروں اور اس یقین پر کہ وہ آرام سے ہے اظہار مسرت کروں۔ اور اگر خدانخواستہ صورت حال کچھ اور ہے تو مجھ پر دو صدمے ہوں گے۔ ایک بیٹے کی موت کا۔ دوسرے اس کی تکلیف کا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ربیع خوش رہو۔

انه اصاب الفردوس الاعلی

اسے جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام حاصل ہو چکا ہے۔

حضرت ربیع بنت نضر رضی اللہ عنہا ایک مرتبہ کسی عورت سے کسی معاملے میں جھگڑ پڑیں اور غصے میں آکر اس کا دانت توڑ ڈالا۔ اس کے متعلقین نے اس کا انتقام لینا

چاہا-معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا تو آپؐ نے قصاص کا حکم دیا-اس پر حضرت ربیع رضی اللہ عنہا کے بھائی حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور لجاجت کے انداز میں عرض کیا کہ ربیع کے دانت نہ توڑے جائیں- حضرت انس کے اس عاجزانہ اسلوب گفتگو سے بلا استثنا تمام حاضرین مجلس کو رحم آگیا اور حضرت ربیع بنت نضر رضی اللہ عنہا کو معاف کر دیا گیا-

حضرت ربیع رضی اللہ عنہا کی تاریخ ولادت و وفات کے بارے میں معلومات نہیں حاصل ہو سکیں-

حضرت امیمہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی تھے جو یمن کے معروف قبیلہ "دوس" سے تعلق رکھتے تھے۔ ۷ ہجری میں مدینہ منورہ آکر مسلمان ہوئے' انھیں ابو ہریرہ دوسی کہا جاتا تھا۔ حضرت ابو ہریرہ اگرچہ اسلام قبول کرنے میں سبقت نہ حاصل کر سکے' لیکن قدیم زمانے میں اسلام قبول کرنے والے تمام حضرات کی بہ نسبت ان سے زیادہ احادیث مروی ہیں۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔

ایک یہ کہ دوسرے صحابہ اپنے کام کاج اور زراعت و تجارت وغیرہ میں مصروف رہتے تھے' جب کہ ابو ہریرہ ہر وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستگی اختیار کیے رکھتے اور بعض خاص مواقع کے علاوہ کسی لمحے بھی آنحضرت سے علیحدہ نہ ہوتے تھے۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ پڑھے لکھے تھے اور علمی ذوق رکھتے تھے۔ وہ یمن کے باشندے تھے اور اس زمانے میں یمن ایک ترقی یافتہ علاقہ اور پڑھے لکھے لوگوں کا مرکز تھا۔ تاریخ کی قدیم کتابوں میں لکھا ہے کہ یمن کا تمدن شہر روما کے قیام سے بھی کئی ہزار سال پہلے انتہائی عروج کو پہنچا ہوا تھا اور خود یہودی اور عیسائی حکومتیں اس کی تہذیب و مدنیت کی مداح تھیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ چونکہ ایک تعلیم یافتہ خطہ زمین سے آئے تھے۔ اس لیے جمع حدیث اور کتابت حدیث کے سلسلے میں سب سے پیش پیش تھے۔ علاوہ ازیں ان کا حافظہ بہت تیز تھا۔ اس کی وجہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور آپ کی نظر کرم قرار دیتے ہیں۔ ان کے حافظے کے بارے میں متعدد روایات مشہور ہیں اور اس ضمن کے کئی واقعات کتابوں میں مذکور ہیں۔۔۔ بقول حافظ ابن حجر کے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کرنے والے صحابہ اور

تابعین کی تعداد آٹھ سو سے زیادہ ہے۔

ان کی وفات ۵۸ ہجری میں ہوئی۔

حضرت امیمہ رضی اللہ عنہا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں جو اپنی کنیت ام ابوہریرہ سے زیادہ مشہور تھیں۔ ام امیمہ کے والد کا نام صبیح یا صفیح تھا۔ امیمہ اپنے بیٹے ابوہریرہ کے ساتھ ہی ۷ ہجری میں یمن سے مدینہ آگئی تھیں۔ ابوہریرہ تو مسلمان ہو گئے تھے' اور وہ اسلام قبول کرنے کے لیے ہی یمن سے مدینہ آئے تھے مگر ان کی والدہ امیمہ اس نعمت سے سعادت اندوز نہیں ہوئی تھیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا شمار اصحاب صفہ اور آنحضرت کے خدام خاص سے ہوتا تھا۔ انھیں اس بات کی شدید روحانی کوفت تھی کہ ان کی والدہ مسلمان نہیں ہیں۔ وہ بارگاہ نبوت میں حاضر رہتے' احادیث کی کتابت کرتے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف مسائل پوچھتے اور سب سے زیادہ آنحضرت سے قرب رکھتے' لیکن انھیں اس بات کا سخت صدمہ تھا کہ ان کی ماں اس چشمہ فیض سے سیراب نہیں ہوئیں۔ بلکہ کتب رجال میں یہاں تک لکھا ہے کہ وہ صرف غیر مسلم ہی نہ تھیں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی سخت مخالف تھیں اور اکثر آنحضرت کے خلاف اظہار خیال کرتی رہتی تھیں۔ ظاہر ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے لیے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دل و جان سے فدا تھے اور زیادہ تر آپ کی مجلس میں رہتے تھے' یہ صورت حال حد درجہ باعث اذیت تھی۔ لیکن ماں کا احترام بھی ملحوظ خاطر تھا اور ان سے کچھ کہنا مشکل تھا۔ ماں کے حق میں بیٹے کی سعادت مندی ملاحظہ ہو کہ سب کچھ اپنے کانوں سے سنتے اور خاموش رہتے۔

ایک روز امیمہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کچھ بہت ہی گستاخانہ کلمات کہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو سخت ناگوار گزرے اور حلیم الطبع بیٹے نے ماں کو تو کچھ نہ کہا' لیکن شدت احساس سے آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سیلاب امنڈ آیا

اور سسکیاں بھرتے ہوئے آنحضرت کی خدمت میں پہنچے۔ حضور نے ابوہریرہ کو روتے دیکھا تو سراپا شفقت بن کر پوچھا:

ابوہریرہ کیا بات ہے؟ خلاف عادت اتنے مغموم کیوں ہو اور رونے کی وجہ کیا ہے؟

عرض کیا: یارسول اللہ میں آپ کا خادم خاص اور اطاعت گزار ہوں' لیکن میری ماں اسلام سے دور اور آپ کی مخالف ہیں۔ دعا فرمایئے اللہ انھیں بھی اسلام کی دولت سے مالامال کرے اور آپ کی اطاعت کا شرف بخشے۔

چنانچہ ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی اور ادھر حضرت امیمہ کے دل میں دفعتۃً انقلاب پیدا ہو گیا۔ انھوں نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو روتے ہوئے دیکھا تھا تو اس سے بھی سخت متاثر ہوئی تھیں۔ فوراً اپنی جگہ سے اٹھیں' پیغام بھیج کر ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو بلایا' ان کے سامنے غسل کیا' کپڑے بدلے اور بیٹے سے کہا ابوہریرہ میں اپنے ماضی پر نادم ہوں۔ میں نے اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہمیشہ گستاخانہ کلمات کہے اور سراسر غلط رویہ اختیار کیے رکھا۔ اب تمھیں گواہ بنا کر اپنے گناہوں سے تائب ہوتی اور اسلام قبول کرتی ہوں۔ میں اللہ کو حاضر ناظر جان کر اقرار کرتی ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول اور اس کے بندے ہیں اور اسلام سچا اور صحیح مذہب ہے۔ یہ کہا اور کلمہ شہادت پڑھ کر دائرہ اسلام میں داخل ہو گئیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے ماں کے منہ سے یہ الفاظ سنے تو انتہائی خوش ہوئے اور فرط مسرت سے آب دیدہ ہو گئے۔ اسی وقت خوشی سے بھاگے بھاگے آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ماں کے قبول اسلام کی اطلاع دی۔ آنحضرت نے یہ سنا تو اللہ کا شکر ادا کیا۔

حضرت امیمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد میں حضرت ابوہریرہ ہی کو زیادہ شہرت حاصل

ہوئی۔ باقی اولاد کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ عمر اور تاریخ وفات کا بھی پتا نہیں چل سکا۔

حضرت امتہ بنت خالد

امتہ بنت خالد بن سعید بن عاص بن امیہ بن عبد شمس--- مشہور صحابیہ تھیں اور قریش کے خاندان بنو امیہ سے تعلق رکھتی تھیں- ان کی کنیت ام خالد تھی- والدہ کا نام امینہ یا ہمینہ تھا جو خلف بن اسعد بن عامر خزاعی کی بیٹی تھیں- امتہ اصل نام کی بہ نسبت اپنی کنیت ام خالد سے زیادہ مشہور تھیں- ان کے والد خالد بن سعید اور والدہ ہمینہ بنت خلف اس عظیم القدر گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو صدائے اسلام کانوں میں پڑتے ہی مسلمان ہو گئے تھے اور جنھوں نے باعتبار قبول اسلام کے السابقون الاولون کے زمرے میں شامل ہونے کا شرف حاصل کیا-

مکی زندگی میں مسلمانوں کو مشرکین و کفار نے جو تکلیفیں پہنچائیں اور جن دردناک اذیتوں سے دوچار کیا وہ تاریخ کی کتابوں میں پوری تفصیل سے مرقوم ہیں اور ان کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں- مخالفین اسلام کی ایذا رسانیوں سے تنگ آ کر بعض مسلمانوں نے مکہ سے ہجرت کر کے عارضی طور پر حبشہ کو اپنا مسکن قرار دے لیا تھا' کیونکہ اس زمانے میں وہی ایک ایسی جگہ تھی جو مسلمانوں کے لیے امن و امان کا باعث بن سکتی تھی اور جہاں اہل اسلام سکون و عافیت سے رہ سکتے تھے- ظہور اسلام کے بعد جن لوگوں نے قبول اسلام کی سعادت حاصل کی ان میں امتہ کے والد خالد بن سعید اور والدہ ہمینہ بنت خلف بھی شامل تھے- مہاجرین کا یہ گروہ خاندانی اور مالی اعتبار سے بلند پایہ لوگوں پر مشتمل تھا- حضرت امتہ رضی اللہ عنہا حبشہ ہی میں پیدا ہوئیں اور سن شعور تک اپنے والدین کے ساتھ اقامت پذیر رہیں-

جب تمام مسلمان مکہ سے مدینہ منورہ کو ہجرت کر گئے تو جو لوگ حبشہ چلے گئے تھے' وہ بھی مدینہ منورہ آ گئے- اس وقت حضرت امتہ رضی اللہ عنہا سن و سال کی کئی

منزلیں طے کر چکی تھیں اور ہوش و شعور کی وادی میں داخل ہو گئی تھیں- یہ اور ان کے والدین حبشہ کے ساحل سے کشتیوں میں سوار ہو کر عازم مدینہ ہوئے--- مدینہ میں آمد سے چند سال بعد امتہ عالم بلوغ کو پہنچیں تو ان کی شادی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سے کر دی گئی-

اس دور میں حبشہ کا حکمران نجاشی تھا جو مسلمانوں کا بہت بڑا ہمدرد اور نیک دل انسان تھا- اس نے مسلمانوں کو اپنی مملکت میں بڑی عزت و تکریم سے رکھا اور ہر لحاظ سے ان کی پذیرائی کی- جب مسلمانوں کا قافلہ حبشہ سے مدینہ کو روانہ ہوا تو نجاشی نے ان کو پورے احترام سے رخصت کیا اور طبقات ابن سعد کے مطابق اس نے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہا:

آپ سب لوگ رسول اللہ کی خدمت میں میرا سلام پہنچا دیں-

حضرت امتہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں ہم مدینہ پہنچے تو مہاجرین و انصار نے ہمارا استقبال کیا- حالات دریافت کیے' روداد سفر پوچھی اور نجاشی اور باشندگان حبشہ کے بارے میں متعدد سوال کیے- وہاں کی آب و ہوا' مذہبی کیفیت' لوگوں کے اخلاق و کردار اور عادات و اطوار سے متعلق استفسار کیا اور ہم نے اپنی معلومات اور ذاتی تاثرات کی روشنی میں تمام سوالات کے جواب دیے- حضرت امتہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں حبشہ سے جو لوگ مدینہ پہنچے وہ سب اجتماعی شکل میں نجاشی کا سلام پہنچانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے- مجھے بھی انہی لوگوں میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہے' جنھوں نے آنحضرت کو نجاشی کا سلام پہنچایا- رسول اللہ نے سلام سن کر تبسم فرمایا اور ساتھ ہی آب دیدہ ہو گئے-

حضرت امتہ رضی اللہ عنہا ایک باکمال اور ذی فضل خاتون تھیں- رسول اللہ کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتیں اور احادیث کی سماعت کرتیں- خود انھوں نے بھی حضور کی احادیث لوگوں کو سنائیں- جو لوگ ان کے حلقہ درس میں شامل ہوئے اور ان سے سماع حدیث کا شرف حاصل کیا ان میں سے بعض لوگ فہم حدیث میں اونچے مرتبے

کے حامل ہیں-اس گروہ میں موسیٰ بن عقبہ' ابراہیم بن عقبہ اور کریب بن سلیمان کندی وہ بزرگ ہیں جو قرن اول کے اہل علم میں انتہائی رفعت شان اور علو مرتبت کے مالک ہیں-(تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو اسد الغابہ) احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ جو آج ہمارے پاس مختلف کتابوں کی شکل میں محفوظ ہے' اس میں خاصا بڑا حصہ ان جلیل القدر حضرات کی مرویات پر مبنی ہے-

حضرت زبیر بن عوام سے حضرت امتہ رضی اللہ عنہا کے دو بیٹے تھے-بڑے کا نام عمر بن زبیر اور چھوٹے کا خالد بن زبیر تھا (رضی اللہ عنہم)

حضرت امتہ کی تاریخ وفات معلوم نہیں ہو سکی-

حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا

حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ ایک اور ماریہ بھی تھیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خادمہ کی حیثیت سے مشہور تھیں۔ یہ ایک جرات مند' بلند حوصلہ اور عظیم المرتبت خاتون تھیں۔

یہ عورتوں میں جاتیں اور انھیں اسلام کے احکام سے باخبر کرتی تھیں۔ مدینہ اور اس کے گردونواح میں مقیم یہودی عورتوں کے ہاں جاتیں اور انھیں اسلام سے روشناس کراتیں۔ ان کا انداز گفتگو نہایت مؤثر تھا۔ حاضر جواب اور اچھی مقرر تھیں۔ اس زمانے کی یہودی عورتیں اسلام پر اعتراض کرتیں اور اس کی تعلیمات کو ہدف تنقید ٹھہراتیں تو حضرت ماریہ ان کی ہر طرح تسلی کرتیں اور ان کے شکوک و شبہات کا بطریق احسن ازالہ فرماتیں۔ تحمل اور اطمینان کا دامن کسی آن ہاتھ سے نہ چھوڑتیں۔

ان میں عدل وانصاف کی صلاحیتیں بھی اللہ کی طرف سے بدرجہ کمال ودیعت کی گئی تھیں۔ مدینہ منورہ کی عورتیں اگر کسی خانگی معاملے میں جھگڑ پڑتیں یا کسی سلسلے میں ان کے درمیان کوئی نزاع پیدا ہو جاتا تو حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا کی طرف ہی رجوع کرتیں' اور وہ ان کی باتیں سن کر مصالحت کرادیتیں۔

اس دور میں اس شخصیت کو خاص اہمیت دی جاتی اور قدرومنزلت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا' جس میں فصاحت وبلاغت کے جوہر پائے جاتے ہوں اور جو شعروکلام سے دلچسپی رکھتا ہو' اس زمانے کی بہت سی عورتیں اس وصف سے بہرہ مند تھیں' حضرت ماریہ کو بھی اس صلاحیت سے نوازا گیا تھا۔ وہ فصاحت وبلاغت میں مشہور تھیں اور قادرالکلام تھیں۔ شعروشاعری سے لگاؤ تھا۔ گفتگو میں اتنا زور' استدلال' ادبیت اور فصاحت وبلاغت ہوتی کہ کسی کو درمیان میں بولنے اور معترض ہونے کی جرات نہ

ہوتی-بات کو سمیٹنے اور مختصر کرنے کا بھی انھیں خوب ملکہ حاصل تھا' لمبی سے لمبی بات
چند الفاظ میں ادا کر دیتیں اور قوت بیانیہ سے ان میں جان ڈال دیتیں-

حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا نے میدان جہاد میں بھی قابل قدر کارنامے انجام
دیے-زخمیوں کی مرہم پٹی' مریضوں کی خدمت اور مجاہدین کے لیے پانی کی بہم رسانی
کے فرائض محنت و شوق سے سرانجام دیتیں-خوف اور گھبراہٹ سے ناآشنا تھیں-
آنحضرت کی پاکیزہ تعلیمات نے ان میں بڑی بسالت پیدا کر دی تھی-

ان کی تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا-

حضرت اروی بنت انیس رضی اللہ عنہا

اس نام کی متعدد صحابیات تھیں، مثلاً اروی بنت عبدالمطلب، اروی بنت حارث بن عبدالمطلب اور اروی بنت انیس رضی اللہ عنہن۔ یہ تمام خواتین اپنی اپنی جگہ نہایت اہمیت کی حامل اور بدرجہ غایت عظمت و رفعت کی مالک تھیں۔ ان کی مختلف خدمات کا دائرہ بہت وسیع تھا اور اسلام کے باب میں ان کی سرگرمیاں بڑی تیز تھیں۔

اروی بنت انیس رضی اللہ عنہا اکثر آنحضرت کی خدمت اقدس میں رہتیں۔ مدینہ منورہ کی خواتین مسائل دریافت کرنے کے لیے کثیر تعداد میں ان کے پاس آتیں اور یہ ان کی صحیح صحیح رہنمائی کرتیں۔ بسا اوقات عورتیں براہ راست آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہونے سے ہچکچاہٹ یا حجاب محسوس کرتیں تو ان کے ہاں آتیں اور انھیں آنحضرت سے کوئی مسئلہ دریافت کرنے یا آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ذریعہ بناتیں۔

حضرت اروی بنت انیس رضی اللہ عنہا کا باقاعدہ مسند درس آراستہ کرتیں اور لوگوں کو آنحضرت کے فرامین وارشادات سے باخبر کرتیں۔ ان کے حلقۂ درس میں جو عورتیں شامل ہوتیں۔ انھیں احادیث سناتیں اور ان کی قابلیت و ضرورت کے مطابق انھیں مسائل سے آگاہ کرتیں۔ ان کے حلقہ درس میں صحابہ بھی تشریف لاتے اور ان کے ارشادات عالیہ سے مستفید ہوتے۔ جن میں حضرت عروہ اور ابو اروی رضی اللہ عنہم ایسے رفیع المرتبت حضرات کے نام آتے ہیں۔

حضرت اروی بنت انیس رضی اللہ عنہا کے دل میں تبلیغ اسلام کا جذبہ بڑا راسخ تھا اس میں وہ کسی کی پروا کیے بغیر سرگرم عمل رہتیں۔ اس ضمن میں انھیں تکلیفیں

پہنچائی گئیں اور کئی قسم کی اذیتوں سے دوچار کیا گیا' مگر یہ بدستور اپنے کام میں لگی رہیں۔نہ کوئی لالچ ان کے راستے میں حائل ہو سکا' نہ مخالفین کی ایذار سانیاں ان کے قدموں کو ڈگمگا سکیں اور نہ مصائب و مشکلات کی بے پناہیاں ان کے ارادے کی پختگی میں تزلزل پیدا کر سکیں اور نہ حالات کی عدم موافقت ان کے لیے سدراہ بن سکی۔ یہ دھن کی پکی' ارادے کی مضبوط' حق کی پرستار' اسلام کی کامل وفادار اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی جان نثار خاتون تھیں۔ ان کا طریق تبلیغ اثر انگیزیوں سے بھرپور تھا اور اسلام کی آواز کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے ان کے اندر ایک جوش' جذبہ اور ولولہ پایا جاتا تھا۔ عورتیں ان کی تقریر سے متاثر ہوتیں۔ان کا حسن کلام' انداز خطاب اور اسلوب گفتگو اتنا موثر اور میٹھا تھا کہ لوگوں کے دلوں میں اترتا جاتا تھا۔

حضرت اروی رضی اللہ عنہا کم سن بچوں پر بہت شفقت فرماتیں۔ان کے مزاج اور ذہنی سطح کے مطابق انھیں اسلام کی حقانیت سے آگاہ کرتیں' ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین کی تعلیم دیتیں اور اس اسلوب سے ان سے مخاطب ہوتیں کہ ہر بات ان کے دل میں پیوست ہوتی جاتی۔

بچے باتیں سننے کے لیے ایک دن ان کی خدمت میں حاضر ہوئے' ایک بچے نے معصومانہ انداز میں کہا آپ ہمیں میدان جہاد میں لے چلیے۔ بچے کی یہ بات سن کر وہ بہت خوش ہوئیں۔اس وقت ان کی مجلس میں مدینہ منورہ کی چند خواتین بھی موجود تھیں۔ ان خواتین میں بعض ان بچوں کی مائیں بہنیں اور خالائیں بھی تھیں' جو حضرت اروی رضی اللہ عنہا سے بعض مسائل دریافت کرنے کی غرض سے حاضر ہوئی تھیں۔حضرت اروی نے بچے کی اس معصومانہ خواہش سے متاثر ہو کر کچھ اس قسم کے الفاظ ارشاد فرمائے جو عام طور پر بڑے چھوٹوں کو بتاتے ہیں۔

تم اسلام کے سچے اور مخلص ترین خادم ہو' چند روز تک جب تم بچپن کی حدود سے نکل کر عالم شباب میں داخل ہو جاؤ گے تو ہمیں اپنے درمیان نہ پاؤ گے'

ہماری عمریں سمٹ رہی ہیں' ہم جوانی کی حدوں سے نکل کر بڑھاپے کی طرف دوڑ رہے ہیں' اور تم بچپن کے حصار سے کود کر جوانی کی طرف قدم زن ہو' ہمیں بڑھاپا قبر کی طرف لے جائے گا اور تمھیں جوانی جہاد کا راستہ دکھائے گی- ہمارے جسموں کے ساتھ ساتھ ہمارا خون بھی بوڑھا ہو جائے گا اور اس کی گردش کی رفتار میں کمی آجائے گی-

قبول اسلام کے نتیجے میں ہمیں ازحد اذیتیں پہنچائی گئیں اور کئی قسم کی مشکلات سے دوچار کیا گیا' لیکن ہم نے ہمت نہ ہاری اور ہر اذیت کو راحت اور ہر زحمت کو رحمت تصور کر کے آگے قدم بڑھاتے رہے تا آنکہ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا- لیکن تم خوش قسمت ہو کہ تمھارے زمانے میں ان مصیبتوں کا دور ختم ہو گیا ہے' جن سے ہمیں دوچار کیا جاتا تھا- اب اللہ کی مدد سے اسلام عرب کے حدود سے باہر نکل گیا ہے اور ہمارے مجاہدین دور دراز کے مقامات تک پہنچ گئے ہیں اور یہ وہ مقامات ہیں جو ابتدائی دور میں ہمارے حیطہ خیال میں بھی نہیں آسکتے تھے- تم جب جوان ہو گئے تو تمھارے گھوڑے اس سے بھی آگے بڑھیں گے اور پوری دنیا تمھارے قدموں کے نیچے ہو گی- تم اسلام کے سچے خادم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخلص ترین وفاشعار ہو گے-

اسلام ذات پات اور اونچ نیچ کا داعی نہیں' اس میں آزاد کو غلام پر' کسی خاندان کو کسی خاندان پر اور گورے کو کالے پر' کوئی فوقیت حاصل نہیں- اسلام اپنے ماننے والوں میں عمل کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور گفتار پر کردار کو ترجیح دیتا ہے- تمھارا مستقبل روشن ہے اور تم تاریکی سے نکل کر نور کی طرف دوڑ رہے ہو- تم صداقت کے پیکر اور اخلاص کے مجسمے ہو- اللہ تمھارا حامی و ناصر ہو گا-

حضرت اروی بنت انیس رضی اللہ عنہا کی عمر اور تاریخ وفات کے بارے میں

معلومات حاصل نہیں ہو سکیں- صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ متعدد تابعین نے ان کے حلقہ تلمذ میں شامل ہونے کا شرف حاصل کیا-

حضرت اسماء بنت مخرمہ رضی اللہ عنہا

صحابیات رضوان اللہ علیھن میں کئی قسم کی خواتین تھیں' وہ بھی تھیں جنھوں نے تبلیغ اسلام کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا' وہ بھی تھیں جن کا زیادہ تر وقت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں گزرتا تھا' وہ بھی تھیں جو اکثر ان جنگوں میں شرکت کرتی تھیں جو مسلمانوں اور کافروں کے درمیان لڑی جاتی تھیں۔ یہ خواتین مجاہدین کی خدمت کرتیں اور ان کی مرہم پٹی کے فرائض انجام دیتی تھیں۔ صحابیات کی مقدس جماعت میں ایسی خواتین بھی تھیں جو اس زمانے کے انداز اور اپنے مالی حالات کے مطابق تجارت سے دلچسپی رکھتی تھیں۔ ان تمام خواتین کا مطمح نظر تو خدمت اسلام تھا اور یہی ان کا اوڑھنا اور بچھونا تھا مگر طریق کار اور نہج عمل مختلف تھے۔ جو خواتین تجارت کرتی تھیں ان کا بھی زیادہ وقت اسلام کی نشر واشاعت میں صرف ہوتا تھا' مگر ان کا اسلوب یہ تھا کہ تجارت کے ساتھ ساتھ اس بنیادی فرض کی انجام دہی کے لیے بھی کوشاں رہتیں۔

حضرت اسماء بنت مخرمہ بن جندل رضی اللہ عنہا کا شمار تجارت پیشہ صحابیات میں ہوتا ہے۔ یہ مدینہ منورہ سے باہر کی رہنے والی تھیں اور قبول اسلام سے قبل بھی تجارت کرتی تھیں۔ ابتدا ہی سے دیانت دار اور امین خاتون تھیں' نہ کسی کو دھوکا دیتی تھیں اور نہ کسی سے غلط بیانی کرتی تھیں۔ بلند کردار اور اونچے ذہن کی مالک تھیں۔ دیانت اور امانت کے باب میں ان کی بڑی شہرت تھی۔

تجارت کی غرض سے کہیں باہر گئی ہوئی تھیں کہ اسلام کی آواز کانوں میں پڑی۔

مدینہ منورہ کی ایک نواحی بستی کے ایک مکان میں اپنے کاروبار کی غرض سے گئی تھیں کہ چند مرد اور عورتوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق مصروف گفتگو پایا۔ ان سے قرآن مجید کی چند آیات بھی سنیں، جن سے ان کے قلب پر انتہائی گہرا اثر پڑا اور آنحضرت کے بارے میں مزید معلومات حاصل کر کے اسی وقت مدینہ کی راہ لی اور آپ کی خدمت میں جا حاضر ہوئیں۔ بڑی ذی فہم اور سمجھ دار خاتون تھیں۔ مردم شناس بھی تھیں اور دوسرے کی بات اور نقطہ نظر کو سمجھنے میں نہایت تیز بھی۔۔۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ اقدس پر نظر ڈالی اور چند باتیں کیں، فوراً کلمہ شہادت پڑھ کر دائرہ اسلام میں داخل ہو گئیں۔ آپ سے باقاعدہ بیعت اسلام کی اور مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کر لی۔

حضرت اسماء بنت مخرمہ بن جندل رضی اللہ عنہا عطر کی تجارت کرتی تھیں اور ان کا یہ کاروبار بڑا وسیع تھا۔ اس زمانے میں یمن عطر کی تجارت کا مشہور مرکز تھا اور وہاں بہت اچھے عطر تیار ہوتے تھے۔ حضرت اسماء براہ راست یمن سے عطر لاتی تھیں اور مدینہ میں آکر فروخت کرتی تھیں۔ مدینہ اور اس کے قرب وجوار میں ان کا مال بڑی وسعت سے فروخت ہوتا تھا اور لوگ اس کو بہت پسند کرتے تھے، کیونکہ یہ کاروباری اعتبار سے دیانت دار تھیں اور خالص مال فروخت کرتی تھیں۔ اگر انھیں اپنے مال میں کسی نوع کا شبہ پڑ جاتا تو اس کی فروخت روک دیتیں اور نیا مال منگوانے کا انتظام کرتیں۔ ان کی اس کاروباری دیانت نے ان کی شہرت میں بہت اضافہ کیا اور ان کا شمار اونچے طبقے کے تاجروں میں ہونے لگا۔

ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ نادار اور غریب لوگوں کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ بیوہ عورتوں اور یتامی کا بھی ان کے مال سے خاص حصہ مقرر تھا۔ خود ان کے گھروں میں جاتیں اور روپے پیسے سے ان کی مدد کرتیں۔ علاوہ ازیں مجاہدین کے لیے بھی چندہ دیتیں۔ نہایت فیاض اور سخی خاتون تھیں۔

عبادت اور ذکر الٰہی میں بھی پیش پیش رہتیں- قرآن پاک کی تلاوت کثرت سے کرتیں- تہجد اور نوافل پابندی سے پڑھتیں- ضرورت سے زائد بات کبھی نہ کرتیں- عورتوں پر ان کی عبادت اور نیکی کا بہت اثر تھا- اکثر عورتیں ان سے مسائل دریافت کرتیں اور وہ دینی معاملات میں ان کی صحیح صحیح رہنمائی کے فرائض انجام دیتیں- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بالخصوص مدینہ کی خواتین ان کی خدمت میں حاضر ہوتیں- یہ انھیں مسائل سے بھی مطلع فرماتیں' گھریلو معاملات میں بھی عورتیں ان سے رہنمائی کی طالب ہوتیں اور یہ ان کو صائب مشوروں سے نوازتیں-

ان کی دیانت وامانت کی اس درجہ شہرت تھی کہ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم عورتیں بھی اپنی امانتیں ان کے ہاں رکھ جاتی تھیں اور پھر کئی کئی مہینوں یا سال کے بعد بالکل اسی حالت میں واپس لے جاتیں-

حضرت اسماء بنت مخرمہ رضی اللہ عنہا نہ کسی کے ساتھ جھگڑتیں' نہ تلخ کلامی کرتیں اور نہ کسی دوسرے کی اس حرکت کو پسند کرتی تھیں- گلی محلے کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے باہمی جھگڑوں سے بھی گھبراتی تھیں- اگر عورتیں کسی معاملے میں جھگڑ پڑتیں تو ان کے گھر جاتیں اور ان کی مصالحت کراتیں- پھر ان کے سامنے لڑائی جھگڑے اور باہمی آویزش کی مضرتیں بیان کرتیں- ان سے نہایت لجاجت سے کہتیں کہ آپس میں محبت اور پیار سے رہا کریں- معمولی سا جھگڑا بھی بہت بڑے جھگڑے کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے- بڑی نرم طبیعت اور دھیمے مزاج کی خاتون تھیں- اپنے سے بڑی عمر کی عورتوں اور مردوں کی بہت عزت کرتیں اور چھوٹوں سے شفقت ومہربانی سے پیش آتیں-

ان کی وفات کی صحیح تاریخ کا تو علم نہیں ہو سکا البتہ طبقات ابن سعد وغیرہ سے

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت تک زندہ رہیں بلکہ ایک روایت میں تو بتایا گیا ہے کہ خلافت فاروقی کے بعد فوت ہوئیں۔

حضرت برزہ بنت مسعود ثقفی رضی اللہ عنہا

حضرت برزہ رضی اللہ عنہا نہایت عظیم المرتبت صحابیہ تھیں۔ حضرت مسعود بن عمرو ثقفی کی صاحب زادی تھیں۔ ان کے کارناموں کی فہرست بڑی طویل ہے۔ طبقات ابن سعد اور سیرت ابن ہشام میں ان کے حالات ملتے ہیں جو انتہائی سبق آموز ہیں اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاتون صبر و استقلال اور عزیمت و استقامت کی ایک عظیم الشان مثال تھیں' جو بہ یک وقت بہادر و جری بھی تھیں اور عابدہ و زاہدہ بھی' بلاغت و فصاحت میں بھی بہت آگے تھیں اور عزم و ہمت میں بھی۔ ان خوش بخت اور رفیع المنزلت افراد میں سے تھیں' جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کے حضور قبول اسلام کا شرف حاصل کیا اور آپؐ سے بیعت کی سعادت عظمیٰ سے بہرہ ور ہوئے۔ کردار کی پاکیزگی اور خدمت خلق کی بنا پر حضرت برزہ خاص شہرت کی حامل تھیں۔ حدیث رسول کی راویہ اور متعدد مشاہیر کی استاد تھیں۔ ان کے سامنے بعض حضرات نے زانوئے شاگردی تہہ کیا اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے سماع کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ ان کی زبان میں زور اور عذوبت دونوں کا حسین امتزاج پایا جاتا تھا۔ بہترین خطیب اور پرجوش مبلغ اسلام تھیں۔ تحمل اور بردباری کے جو جوہر ان میں پائے جاتے تھے وہ کم لوگوں کے حصے میں آتے ہیں۔

حضرت برزہ بنت مسعود ثقفی رضی اللہ عنہا نے سیرت ابن ہشام کی روایت کے مطابق جنگ احد میں بھی شرکت کی۔ یہ جنگ ۳ ہجری میں لڑی گئی تھی اور اس میں مسلمانوں سے ایک جنگی لغزش ہو گئی تھی جس کے نتیجے میں مسلمانوں میں گھبراہٹ کے آثار پیدا ہو گئے تھے اور یکایک جنگ کا نقشہ کچھ اس طرح بدل گیا تھا کہ مسلمانوں کا اس میں ثابت قدم رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس موقعے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

ساتھ جن حضرات نے اثبات واستقامت کا ثبوت دیا' ان میں حضرت برزہ رضی اللہ عنہا کا اسم گرامی بھی شامل ہے- یہ خاتون اس درجہ بلند ہمت اور عزم وارادے کی مالک تھیں کہ انتہائی خوف ناک اور شدید تکلیف دہ حالات میں بھی میدان جنگ میں ڈٹی رہیں- جب مسلمانوں میں ہزیمت کے آثار دکھائی دینے لگے تو یہ بہادر خاتون ایک کنارے پر کھڑی تھیں اور ایک اونچے مقام سے تمام معاملات کو بنظر غائر دیکھ رہی تھیں- انھوں نے مسلمانوں کو پکارا اور بلند آواز سے کہنا شروع کیا-

مسلمانو! کہاں جارہے ہو؟ میدان جنگ سے بھاگنے کی کوشش کرنا اسلام کے منافی اور بہادری کے تقاضوں کے خلاف ہے- یہ دیکھو تمھارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) بدستور میدان میں موجود ہیں اور ان پر تیروں کی بوچھاڑ ہورہی ہے- لیکن رسول اکرم ہر صورت میں حالات کا مقابلہ کریں گے- تم عجیب مسلمان ہو کہ اپنے پیغمبر کو چھوڑ کر بھاگنے کی کوشش کررہے ہو- ہر حال میں استقامت کا ثبوت دو' اپنی گردنیں کٹادو' جان کی بازی لگادو' کفر کی طاقت کے ساتھ پوری طاقت سے ٹکرا جاؤ' اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرو- میدان سے بھاگ جانا بہادروں کا شیوا اور سچے لوگوں کا کام نہیں- اگر تم اپنی بات میں صادق ہو' تمھارا مذہب سچائیوں کا جامع ہے' تم اللہ کے پرستار ہو اور صدق دل سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت و رسالت کا اقرار کرتے ہو تو میدان میں ڈٹے رہو اور جواں مردی سے دشمن کے تیر و تفنگ کا مقابلہ کرو' کسی نوع کی کم ہمتی اور کم زوری کا اظہار تمھاری توہین ہے' بہادر بھاگنے کے نام سے ناآشنا ہوتے ہیں- ان کے مستقبل کے فیصلے میدان جنگ ہی کرتا ہے- تمھارے آبا و اجداد کی عمریں دشمن سے تصادم اور لڑائیوں میں گزر گئیں' آج تم یہاں سے پیٹھ دکھا کر ان کے نام کو بھی بٹا لگا رہے ہو اور اپنے جذبہ اسلامیت کی بھی اہانت کے درپے ہو- ٹھہرو اپنے مستقبل کا فیصلہ یہیں کرو- تعجب ہے عورتیں تو تیروں کی چھاؤں

میں کھڑی ہیں اور مردوں پر شکست کے آثار نمایاں ہیں۔

حضرت برزہ رضی اللہ عنہا نے جنگ احد میں انتہائی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ یہ زخمیوں کی مرہم پٹی بھی کرتی تھیں، مجاہدین کو پانی بھی پلاتی تھیں اور دشمن سے مقابلے کے لیے انھیں اسلحہ بھی فراہم کرتی تھیں۔ جنگ سے واپسی کے بعد انھوں نے ایک نہایت اہم خدمت یہ انجام دی کہ شہدائے احد کے گھروں میں جا کر ان کے اہل و عیال کو تسلی دی اور شہادت کے فضائل بیان کیے اور یہ بتایا کہ مسلمان کا اصل کام جہاد ہے۔ جو شخص جہاد سے گریزاں ہے، مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں۔ اسلام کی تعلیم میں جہاد کو جو اہمیت حاصل ہے وہ اور کسی عبادت کو حاصل نہیں۔

انھوں نے کہا کہ جہاد کی متعدد نوعیتیں ہیں، جن میں بنیادی نوعیت میدان جنگ میں جانا اور شمشیر بکف ہو کر دشمن سے برسرپیکار ہونا ہے۔ اگر کوئی شخص اس اثنا میں درجہ شہادت پر فائز ہو جانے کا شرف حاصل کر لیتا ہے تو وہ انتہائی خوش نصیب ہے، ان کی اس انداز کی تسلی اور اس اسلوب گفتگو نے شہدا کے ورثا کو انتہائی متاثر کیا اور ان کے افسوس و حزن کے آثار دور ہو گئے۔

حضرت امتہ اللہ بنت ابو بکرہ ثقفی

حضرت امتہ اللہ بنت ابو بکرہ رضی اللہ عنہا ایک گوشہ نشین خاتون تھیں- عبادت و زہد کا پیکر' صالحیت کا سراپا اور حسن اخلاق و حسن طبیعت کا مجسمہ- بقول ذہبی کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت اسلام کی تھی- ان کے شاگردوں کی جماعت میں قتادہ بن ابو میمونہ ایسے عظیم الشان حضرات شامل ہیں-

ان کے قبول اسلام کا واقعہ بڑا دلچسپ اور عجیب و غریب ہے- ان کی زندگی خالص قبائلی نوعیت کی تھی اور اسی ماحول میں طفولیت کی منزلیں طے کی تھیں- ایک روز اپنے قبیلہ بنو ثقیف کی کسی خاتون سے ملنے گھر سے نکلیں' رات کا وقت تھا' فضا ساکن اور ماحول خاموش تھا- شب کی تاریکی پوری طرح پھیل چکی تھی- یہ ایک کم سن بچے کو ساتھ لیے تیز تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھ رہی تھیں کہ ایک خیمے سے جو چاروں طرف سے بند تھا کچھ پڑھنے کی آواز کانوں سے ٹکرائی- پڑھنے والے کا لہجہ اتنا دلکش تھا اور آواز میں اس درجہ لوچ اور جاذبیت تھی کہ اس نے وہیں ان کے قدم روک لیے' وہ قرآن کی ایک سورہ تھی جس کی تلاوت ہو رہی تھی' امتہ اللہ سن رہی تھیں اور بے حال ہو رہی تھیں- اس قسم کا پیارا کلام نہ کبھی سنا تھا اور نہ فکر و خیال کے کسی گوشے میں آیا تھا- انھوں نے اس دنیا کی ناپائیداری اور آخرت کی دوامی زندگی کے بارے میں سنا تو بالکل بے بس ہو گئیں اور آخر وہیں بیٹھ گئیں- خیمے کے اندر سے مسلسل تلاوت قرآن کی آواز آ رہی تھی اور یہ سن رہی تھیں- اتنے میں بچہ بھی جو حیرت و استعجاب کے عالم میں ڈوبا ہوا تھا' سو گیا- اب حضرت امتہ اللہ نے بچے پر ایک کپڑا ڈالا اور خود خیمے کے ارد گرد چکر کاٹنے لگیں- جدھر جاتی ہیں خیمے کو بند پاتی ہیں- شب کی تاریکی تیزی سے بڑھ رہی ہے تا آنکہ رات تا بہ کمر پہنچ گئی ہے' مگر قرآن کی آیات برابر پردہ سماع سے ٹکرا رہی

ہیں اور قاری بعض آیات کی بہ تکرار تلاوت کر رہا ہے۔ اتنے میں ان کے بھائی کی آنکھ بھی کھل گئی۔ اس نے اٹھ کر دیکھا تو بہن کی چارپائی خالی ہے۔ وہ گھبرا کر باہر نکلا۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی لیکن بہن کا کچھ پتا نہ چلا۔ اب بھائی کو باہر نکلے اور بہن کی تلاش کرتے ہوئے خاصی دیر ہو گئی تھی اور رات کے اندھیرے نے خود اپنے اندر ایک روشنی سی پیدا کر دی تھی۔ اس روشنی کی مدد سے بھائی نے جو لمبی نظر دوڑائی تو دور کے ایک خیمے کے ارد گرد ایک سایہ حرکت کرتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اس سائے کی طرف بڑھا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا خیمے کے قریب آ گیا اور دوسری طرف خیمے کے قریب کھجور کے درخت کے تنے کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ بچہ کپڑا اوڑھے لیٹا ہوا ہے' اندر سے کچھ پڑھنے کی آواز آ رہی ہے اور وہ سایہ جو دور سے متحرک نظر آ رہا ہے' وہ اس کی بہن امتہ اللہ ہے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر جذب و شوق کے عالم میں ڈوبی ہوئی خیمے کے ارد گرد چکر کاٹ رہی ہے۔ بھائی نے آواز دی :

امتہ اللہ۔

لیکن وہ خاموش تھیں۔

اس نے پھر آواز دی۔ اب بھی جواب نہ آیا تو وہ قریب گیا اور بہن کے دونوں شانوں کو ہلاتے ہوئے کہا :

امتہ اللہ یہاں کیوں کھڑی ہو اور کیا سن رہی ہو ؟

بہن نے بھائی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور دونوں خاموشی سے قرآن سننے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اس کلام کی عمدگی اور حسن بیان پر تعجب کا اظہار کیا۔ بھائی آہستہ سے آگے بڑھا اور خیمے پر دستک دی۔ معاً پڑھنے کی آواز رک گئی۔ بھائی نے پھر دستک دی اور قاری سے باہر آنے کی درخواست کی۔ صحرا کا بدوی قاری باہر آیا اور اس بے وقت بلانے کی وجہ پوچھی۔ دونوں نے بہ یک وقت سوال کیا :

یہ کیا پڑھ رہے تھے ؟ یہ کسی شاعر یا ادیب کا کلام تو نہیں ہو سکتا۔

بدوی نے جواب دیا:

یہ اللہ کا کلام ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے۔

پوچھا: وہ کون ہیں؟

کہا: مدینہ میں سکونت پذیر ہیں اور اللہ کے سچے پیغمبر ہیں۔

بہن اور بھائی نے اسی وقت کلمہ شہادت پڑھا اور دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔

چند روز کے بعد حضرت امتہ اللہ رضی اللہ عنہا نے مدینہ منورہ کا رخ کیا اور سرور کائنات فداہ ابی وامی کے دست حق پرست پر بیعت کی سعادت حاصل کی۔

حضرت امتہ اللہ رضی اللہ عنہا نے مدینہ منورہ کی عورتوں سے کہا۔

اے جماعت خواتین! اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمھیں بت پرستی سے نکلنے اور اسلام قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ تم اللہ کے سچے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں شامل ہو' آپؐ کے احکام کی تابع رہو' آپ کی اطاعت ہی میں دین و دنیا کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔ قرآن کی تلاوت کثرت سے کرو' جتنا زیادہ قرآن پڑھو گی اور سرور کائنات کے ارشادات پر عمل کرو گی' اسی قدر تمھارا دل روشن ہو گا اور فوز و کامرانی کی راہیں تمھارے لیے ہوں گی۔ حرص و طمع سے ہاتھ کھینچ لو' خدا کی راہ میں خرچ کرو اور مستحقین کی امداد کو اپنا شیوہ بنالو۔

ان کی تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

حضرت ام معبد خزاعیہ

حضرت ام معبد خزاعیہ رضی اللہ عنہا ایک بدوی خاتون تھیں، جنھوں نے صحرا میں خیمہ لگا رکھا تھا۔ ان کے شوہر حضرت ابو معبد رضی اللہ عنہ بھی وہیں تھے۔ چند اونٹ اور بکریاں ان کا کل سرمایہ تھا اور بکریوں کا دودھ ان کی گزربسر کا اصل ذریعہ تھا۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے موقعے پر ان کے خیمے کے آگے سے گزرے تو چند لمحے وہاں بھی قیام فرمایا۔ آپؐ کے چند ارشادات سن کر حضرت ام معبد نہایت متاثر ہوئیں۔ اس وقت ان کے شوہر خیمے میں موجود نہ تھے۔ وہ آئے تو خالی برتنوں کو دودھ سے بھرے ہوئے پایا اور ام معبد سے پوچھا: یہ دودھ کہاں سے آیا؟

انھوں نے جواب دیا: ایک شخص کی برکت و یمن کا نتیجہ ہے جو ابھی ادھر سے گزرا ہے۔

انھوں نے تعجب سے سوال کیا: وہ ایسا کون بابرکت شخص ہے، ذرا اس کے بارے میں کچھ بیان تو کرو۔

اس پر ام معبد نے زبان کو حرکت دی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں چند لمحوں میں جو کچھ معلوم ہو سکا تھا، اس طرح بیان کرنا شروع کیا کہ فصاحت وبلاغت کا دریا بہا دیا۔ انھوں نے اپنے مافی الضمیر کا پوری روانی سے اظہار کیا۔ الفاظ نہایت جچے تلے اور ادب واحترام کے سانچے میں ڈھلے ہوئے۔ ذیل میں ان کے عربی الفاظ کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

میں نے ایک معزز شخص کو دیکھا جن کی نفاست نمایاں، چہرہ روشن اور خلق و بناوٹ میں حسن، نہ موٹاپے کا عیب، نہ دبلاپے کا نقص، خوش رو، خوب صورت، آنکھیں کشادہ اور سیاہ، پلکیں لمبی، آواز میں کھنک، گردن صراحی دار،

داڑھی گھنی' بھویں کمان دار اور جٹی ہوئی' خاموشی میں وقار کے مجسمہ' گفتگو میں صفائی اور دلکشی' سراپا حسن' جمال میں یگانہ روزگار' دور سے دیکھو تو حسین ترین' قریب سے دیکھو تو شیریں ترین بھی اور جمیل ترین بھی' بات چیت میں مٹھاس' نہ زیادہ باتیں کریں اور نہ ضرورت کے وقت خاموش رہیں- گفتگو اس انداز کی جیسے پروئے ہوئے موتی' قدو قامت ایسا میانہ اور متوازن کہ جس میں نہ درازی ہے' نہ کوتاہی' اگر دو شاخوں کے درمیان ایک شاخ ہو تو وہ دیکھنے میں ان تینوں شاخوں سے زیادہ تروتازہ دکھائی دے' قدرو قیمت میں سب سے بہتر نظر آئیں' ان کے کچھ جاں نثار بھی ساتھ تھے جو انھیں گھیرے ہوئے تھے- وہ بولتے تو سب خاموش ہو جاتے' کوئی حکم دیتے تو اس کی تعمیل کے لیے ٹوٹ پڑتے- سب کے مخدوم سب کے مطاع- ترش روئی سے پاک اور قابل گرفت باتوں سے مبرا-

ابو معبد بولے : خدا کی قسم یہ شخص وہی قریشی معلوم ہوتے ہیں جن کا ذکر میں مکہ میں سن چکا ہوں' میں ارادہ بھی کر چکا ہوں کہ ان کی صحبت کا شرف حاصل کروں- اگر کوئی ذریعہ میسر آیا تو ضرور ان کی خدمت میں حاضری دوں گا-

یہ عرب کی ایک بدوی خاتون کا انداز بیان ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیہ مبارک اور سراپا کی تصویر کشی کی گئی ہے- اندازہ فرمایئے' کیا حسنِ کلام ہے' کیا فصاحت و بلاغت ہے' کیا ادبیت ہے' کیا زبان کا نکھار ہے-

حضرت بریرہ

حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خادمہ تھیں۔ فہم و فراست اور عقل و خرد میں ان کا شمار مدینہ منورہ کی ممتاز خواتین میں ہوتا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی چونکہ انتہائی زیرک اور گہرے فکر و نظر کی مالک تھیں اس لیے جو لوگ ان کے خدام اور متعلقین کے حلقے میں شامل تھے وہ بھی اسی قسم کی ذہنی رسائی کے حامل تھے اور ان کا طائر فکر نہایت بلندیوں پر محو پرواز تھا۔

حضرت بریرہ اپنے اندر بہ یک وقت کئی خصوصیات رکھتی تھیں۔ وہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی صحابیہ' ام المومنین حضرت عائشہ کی خادمہ' جلیل القدر صحابہ اور تابعین کی معلّمہ اور فرامین رسالت مآب کی راویہ۔ ان اوصاف و خصوصیات کی بنا پر انھیں بے حد عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا اور تمام لوگ ان کی قدر کرتے تھے۔

حضرت بریرہ کو حضرت عائشہ کی خادمہ کی حیثیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھریلو حالات سے پوری آگاہی حاصل تھی۔ وہ فرماتی ہیں کہ ازواج مطہرات کے ساتھ آنحضرت کے تعلقات نہایت اچھے تھے۔ اپنی صاحب زادیوں سے آپؐ انتہائی حسن سلوک روا رکھتے تھے' رشتہ داروں اور قرابت داروں سے پوری صلہ رحمی کرتے تھے' محلے اور شہر کے باشندوں سے آپ بہت اچھی طرح پیش آتے تھے اور ان کے کام کاج سرانجام دینے میں مسرت محسوس فرماتے تھے' خادموں اور خادماؤں سے گفتگو کرتے اور ہم کلام ہوتے وقت نرمی و رافت کا برتاؤ فرماتے تھے' مہمانوں اور گھر میں آنے جانے والوں کا احترام کرتے تھے۔ غرض وہ آنحضرت اور آپؐ کے گھر سے پوری طرح باخبر تھیں اور آپؐ جن جن لوگوں سے جو سلوک فرماتے اس کا علم رکھتی

تھیں۔

حضرت بریرہ راویہ حدیث بھی ہیں اور آنحضرت کی بعض احادیث ان سے مروی ہیں۔اس حیثیت سے انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ حضور اپنے صحابہ اور اصحاب صفہ کی بڑی تکریم فرماتے تھے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جن خصوصیات کی مالک تھیں اور جو اوصاف ان کی ذات گرامی میں پائے جاتے ہیں' ان کی تفصیلات ان کے سامنے بالکل واضح تھیں۔وہ فرماتی ہیں کہ دیگر ازواج مطہرات سے حضرت عائشہ کے تعلقات و مراسم بہنوں کے سے تھے اور وہ سب کے ساتھ حسن سلوک کا مظاہرہ کرتی تھیں۔

حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا متعدد غزوات میں شریک ہوئیں' جس غزوے میں حضرت عائشہ نے شرکت فرمائی' انھوں نے بھی اس میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کی۔ یہ مجاہدین کو پانی پلانے' ان کے لیے کھانا تیار کرنے' ان کو ہتھیار فراہم کرنے اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کی خدمت انجام دیتی تھیں۔

تمام لوگوں میں ان کو عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا۔ خلفائے راشدین بھی ان کی تکریم کرتے تھے۔ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان کے گھر تشریف لے جاتے اور ان کی ضروریات کے بارے میں دریافت کرتے۔حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی ان کے مکان پر جاتے' دیگر خلفا کا بھی یہی حال تھا۔حضرت عمر فاروق کی تو یہ کیفیت تھی کہ انھیں دیکھ کر راستہ چلتے ہوئے رک جاتے اور اس وقت تک قدم نہ اٹھاتے جب تک وہ خود نہ چل پڑتیں' یا جانے کی اجازت نہ دے دیتیں۔

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہیں جارہے تھے' ان کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے۔ ادھر سے حضرت بریرہ بھی آرہی تھیں۔انھوں نے ان کو دیکھا تو فرط احترام سے نظریں نیچی کرلیں اور قدم رک گئے۔سلام کیا اور کھڑے ہوگئے اور کافی دیر کھڑے رہے۔ایک شخص نے کہا امیر المومنین بہت دیر ہوگئی ہے' اب تو چلیے۔اسے ڈانٹا اور فرمایا تمھیں معلوم ہے یہ کون ہیں؟ یہ نہایت معزز خاتون ہیں۔میرے نزدیک

یہ سب سے زیادہ لائق تعظیم ہیں- جب تک یہ کھڑی رہیں گی یا مجھے اجازت نہیں دیں گی میرے قدم حرکت میں نہیں آئیں گے- میں کھڑا رہوں گا اور ان کی باتیں سنتا رہوں گا-

اصحاب سیر نے ان کے اقوال وارشادات بھی نقل کیے ہیں جو بڑی اہمیت کے حامل ہیں- مثلاً فرماتی ہیں :

نیکی کر کے اس کی تشہیر نہ کرو‘ کسی پر احسان کرو تو اس کا بدلہ نہ چاہو‘ راست بازی کو اپنا شعار بناؤ‘ اس انداز سے بات کرو کہ اس کے سمجھنے میں الجھن نہ پیدا ہو‘ کسی کو حقیر نہ سمجھو‘ ہمیشہ اپنے اعمال کا محاسبہ کرو‘ کذب بیانی سب سے بڑا فتنہ ہے‘ اپنے اندر اخلاق حسنہ کی جنت آباد کرنے کی عادت ڈالو- تلاوت قرآن کو اپنے لیے لازمی قرار دو‘ صدق مقال انسان کا عظیم سرمایہ ہے‘ کسی کو غلط فہمی میں ڈال کر اپنا کام نہ چلاؤ‘ دنیا کے مفاد عارضی ہیں‘ ان کے لیے زیادہ تگ و تاز نہ کرو‘ اکل حلال میں بے شمار برکتیں پنہاں ہیں- انسانیت کا احترام بنیادی شے ہے‘ کم زور سے انتقام نہ لینا ہی اصل بہادری ہے- اپنی شجاعت کا ثبوت دینا ہو تو ضعیف و ناتواں کو ہدف ستم نہ بناؤ- اپنا کام خود کرو‘ کسی کے دست نگر بننے سے احتراز کرو‘ قتل وخوں ریزی ناقابل عفو معصیت ہے- دوسرے کے جذبات کا احترام بلندی اخلاق کی علامت ہے- حکمرانوں کی نگاہ تیز اور وسیع ہونی چاہیے- مال دار وہ ہے جو دوسروں کی ضروریات کا خیال رکھے- ضرورت سے زیادہ بات کرنا کذب بیانی کی راہ پر لگا دیتا ہے‘ کسی سے مانگنا ذلت کا موجب ہے‘ زبان کو قابو میں رکھنا تقوے کی علامت ہے‘ نیک لوگوں کی مجلس حصول خیر کا ذریعہ ہے‘ قطع کلامی آداب مجلس کے منافی ہے- نیکی کی بات نہ بتانا امانت میں خیانت کرنا ہے‘ دل ایک شفاف آئینہ ہے جسے یاوہ گوئی غبار آلود کر دیتی ہے- بہترین انسان وہ ہے جو زندگی کے قافلے میں اچھے لوگوں کو شامل کرتا ہے-

حضرت بریرہ کے شاگردوں کا بھی ایک حلقہ تھا' جن لوگوں نے ان سے سماع حدیث اور روایت حدیث کا شرف حاصل کیا' ان میں عبدالملک بن مروان بھی شامل ہیں جو بعد میں بنوامیہ کے بہت بڑے حکمران ہوئے۔ وہ ایک زوردار حاکم تھے۔ خود کہتے ہیں کہ میں حضرت بریرہ کی مجلس میں حاضر تھا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے سماع کا شرف حاصل کر رہا تھا کہ انھوں نے میری طرف مخاطب ہو کر زوردار الفاظ اور مرعوب کن انداز میں کہا:

> عبدالملک! غور سے سنو۔ میں تم میں کچھ خصوصیات دیکھ رہی ہوں اور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت زمام اختیار تمھارے ہاتھ میں آئے گی۔ اگر تمھیں حکمران بنا دیا گیا تو خوں ریزی سے دامن کشاں رہنا اور قتل و غارت سے اپنے ہاتھ آلودہ نہ کرنا۔ میں یہ اس لیے کہہ رہی ہوں کہ میں نے اپنے ان کانوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس شخص نے دنیا میں ناحق کسی مسلمان کا خون بہایا ہوگا اور اس کے ہاتھ اس کے لہو سے رنگین ہوئے ہوں گے' اسے دھکے دے کر جنت کے دروازے سے پیچھے ہٹا دیا جائے گا۔

حضرت بریرہ جرأت مند خاتون تھیں۔ کلمہ حق کہنے میں کسی مصلحت کا لحاظ نہ کرتیں۔ وہ خلفا میں اگر کسی قسم کی غلط بات دیکھتیں تو برملا ٹوک دیتیں۔ اللہ سے ڈراتیں اور آنحضرت کی پاکیزہ تعلیمات یاد دلاتیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت سے انھیں انتہائی محبت تھی۔ وہ عادات و خصائل کے اعتبار سے ممتاز درجہ رکھتی تھیں۔ کسی کو تکلیف میں دیکھ کر افسردہ ہو جاتیں اور اس کی تکلیف دور کرنے کی کوشش فرماتیں۔

حضرت یُسَیرہ

یسیرہ بنت صفوان بن نوفل بن اسد --- یہ قریشی تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحابیہ ---! ان کے خاندان کے لوگوں نے اسلام قبول کیا تو یہ بھی مسلمان ہو گئیں۔ لیکن ایک طبقے نے ان کے اسلام کی شدید مخالفت کی اور انھیں تکلیفیں پہنچائیں۔ بقول امام شافعی کے ان کا شمار ان خوش قسمت حضرات میں ہوتا ہے جو سب سے پہلے مسلمان ہوئے اور ہجرت میں اولیت کا شرف حاصل کیا۔ نہایت صابرہ و ضابطہ خاتون تھیں۔ تمام تکلیفیں خندہ پیشانی سے برداشت کیں اور سخت سے سخت مصیبت کی بھی پروانہ کی۔ اسلام کی محبت ان کی ہڈیوں میں رچ چکی تھی اور اللہ و رسول کے احکام کی پیروی ان کا شب و روز کا معمول بن گیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ان کے نزدیک سب سے زیادہ لائق اعتنا اور شائستہ التفات تھی۔ جب آنحضرت کا اسم گرامی زبان پر آتا تو ادب و احترام کے تمام گوشے بیدار ہو جاتے اور الفاظ عزت و توقیر کے قالب میں ڈھل جاتے۔ آنحضرت کے بارے میں ان کے جذبات نہایت نازک تھے۔ آپؐ کے خلاف کوئی اونی سے ادنی بات بھی سننا گوارا نہ کرتیں۔ آپؐ کے وجود اقدس کو دنیا کی سب سے قیمتی متاع قرار دیتیں اور آپ کے سوا اس عالم آب و گل کی تمام چیزوں کو ہیچ سمجھتیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقربا و اعزا سے بدرجہ غایت الفت و مودت کا اظہار فرماتیں۔ آنحضرت کے اہل بیت، دختران رسالت مآبؐ اور ازواج مطہرات کی حد سے زیادہ توقیر کرتیں اور اس خاندان کے معزز ارکان کو تمام لوگوں پر ترجیح دیتیں۔ اس باب میں ان کے نزاکت احساس کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ کسی نے آنحضرت کے اہل بیت کے ایک رکن کے بارے میں کوئی ایسی بات کہہ دی جو ان کے نزدیک اہانت کا

پہلو لیے ہوئے تھی۔ اس پر سخت خفگی کا اظہار کیا اور سنتے ہی چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور فرمایا:

تم کیسے مسلمان اور کس قسم کے محبّ رسول ہو۔ آپؐ کے اہل بیت کے بارے میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہو۔ یہ تم نے ایک ایسا کلمہ کہا ہے جو حقیقت سے دور ہے اور اپنے اندر معصیت لیے ہوئے ہے۔

اس کے بعد آنحضرت کے اقربا و متعلقین کے فضائل و مناقب بیان کرنا شروع کیے اور اس شخص نے اللہ سے معافی مانگی۔

غرض حضرت یسیرہ رضی اللہ عنہا ایک اونچے کردار کی خاتون تھیں اور اسلام کی محبت اور آنحضرت سے تعلق خاطر ان کی زندگی کا ماحاصل تھا۔

عادات و اطوار کے بارے میں ان کی دنیا بہت سے لوگوں سے جداگانہ تھی، نہ ضرورت سے زیادہ بات کرتیں، نہ کسی سے جھگڑتیں اور نہ بے مقصد چیزوں میں وقت صرف کرتیں۔ ان کا زیادہ وقت تلاوت قرآن، درس حدیث اور عبادت میں گزر ہوتا۔ تہجد لازما پڑھتیں اور رات کا اکثر حصہ عبادت میں گزارتیں۔

خرچ اور لین دین کے سلسلے میں فراخ دست اور وسعت قلب کی مالک تھیں مستحقین کی تلاش میں رہتیں۔ جو غریب اور مستحق نظر آتا اس کی امداد کو پہنچتیں۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ دنیا کا یہ مال یہیں رہ جائے گا، جس طرح یہ دنیا فانی ہے، اسی طرح اس کا مال و دولت بھی فنا پذیر ہے، یہاں کی کسی چیز کو ثبات اور دوام حاصل نہیں، اصل شے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اور اس کے بندوں کی خدمت کے لیے آمادہ و تیار رہنا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے مدینہ اور گرد و نواح کے تمام قبائل میں کہرام بپا ہو گیا تھا اور ہر شخص حیران و پریشان تھا۔ حضرت یسیرہ کی اس وقت عجیب کیفیت تھی۔ یہ انتہائی غم و آلام میں مبتلا اور حزن و ملال کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

بلاشبہ اس دن اسلام کا نیر درخشاں غروب ہو گیا تھا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ

پوری دنیا پر تاریکیوں کے بادل چھاگئے ہیں اور دلوں کی حالت دگرگوں ہو گئی ہے' رسول اکرم کی ذات اقدس کو اللہ کی طرف سے تمام فضائل و مناقب سے نوازا گیا تھا اور آپ کی ذات میں خدائے واحد نے ہر قسم کے محاسن جمع کر دیے تھے- دنیا سے آپ کا تشریف لے جانا' صحابہ کے نزدیک بہت بڑے صدمے کا باعث تھا- وہ سمجھتے تھے کہ اب تک ہم فتح و نصرت سے ہم کنار ہوتے رہے ہیں اور اللہ ہمارا معاون و مددگار رہا ہے' آئندہ معلوم نہیں ہم پر کیا گزرنے والی ہے اور ہم کس قسم کے حالات سے دوچار ہونے والے ہیں- وہ برملا کہتے تھے کہ آنحضرت کی ذات گرامی کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کی وجہ سے' ہم بے یارو مددگار ہو گئے ہیں' اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور مستقبل کو درست رکھنے کے لیے مستعد ہو جاؤ- آنے والا وقت گزرے ہوئے وقت کی بہ نسبت انتہائی کٹھن ہے- جو لوگ اللہ کے رسول کے زیادہ قریب رہے ہیں ان کی صحبت اختیار کرو اور اپنے آپ کو مضبوط اور مستحکم بنانے کی کوشش کرو-

حضرت یسیرہ رضی اللہ عنہا سے آنحضرت کی گیارہ احادیث مروی ہیں- پھر ان کے تلامذہ کا حلقہ اچھا خاصا ہے- بہت سے لوگوں نے ان سے سماع حدیث کا شرف حاصل کیا' جن میں بعض معروف اور نامور شخصیتیں شامل ہیں- مردوں میں سے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص' عروہ بن زبیر' مروان بن حکم' حضرت سعید بن میبّب اور حمید بن عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں اور عورتوں سے ام کلثوم بنت جحمہ بن ابی معیط رضی اللہ عنہا کا اسم گرامی شامل ہے-

ان سے روایت کرنے والے حضرات اپنی جگہ نہایت اہمیت کے حامل تھے اور آگے چل کر انھوں نے مختلف میدانوں میں بڑا نام پایا- مروان بن حکم کو خلیفہ مقرر کیا گیا اور سعید بن میبّب رحمتہ اللہ علیہ مشہور تابعی تھے جو صالحیت میں اپنی مثال آپ تھے- تعبیر رؤیا میں ان کو خاص درک حاصل تھا- اس سلسلے میں ان کے متعدد واقعات

کتابوں میں منضبط ہیں۔

حضرت یسیرہ رضی اللہ عنہا سے جن بزرگوں نے روایت حدیث کی۔ان کو انھوں نے وقتاً فوقتاً کئی قسم کی نصیحتوں سے بھی سرفراز کیا' مثلاً مروان بن حکم سے کہا:

مروان! یہ دنیا عارضی ہے۔اس کا سازو سامان تو بے شک ترقی کرے گا اور اس میں روز افزوں اضافہ ہو گا لیکن لوگ ختم ہوتے جائیں گے' جو گروہ اس سطح ارض پر نمودار ہو گا' اپنے نقوش واثرات چھوڑ کر فنا کی وادی میں روپوش ہو جائے گا۔یہاں نہ حاکم رہے گا نہ محکوم' نہ رعیت رہے گی نہ راعی۔سب لوگ اس دنیا کی رعنائیوں اور خوب صورتیوں کو خیر باد کہہ کر سفر آخرت اختیار کرلیں گے۔آخرت میں صرف وہی چیزیں کار آمد ثابت ہوں گی جو اللہ کی رضاجوئی کے لیے کی جائیں گی اور جن میں لوگوں کی خدمت کا جذبہ کار فرما ہو گا۔اللہ سے ڈرو اور اس کے بندوں کی بھلائی کا خیال رکھو۔

حضرت سعید بن میب رحمتہ اللہ علیہ سے فرمایا:

معلوم ہوتا ہے تم اللہ کے دین کی خدمت کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔اللہ کی رضاجوئی مطلوب ہے تو اس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور آپؐ کی اطاعت اولین شرط ہے۔جس کام میں اخلاص اور اللہ کا خوف نہ ہو گا وہ رائیگاں جائے گا۔ہر عمل میں مخلصانہ جذبات اور نیت کی صفائی ضروری ہے۔جن لوگوں کے سامنے رسول اللہ کی حدیث بیان کرو انھیں اعمال حسنہ کی تاکید کرو اور سچائی ودیانت کے فوائد سے آگاہ کرو۔جو شخص سچ بولتا ہے اور لوگوں کے مال میں خیانت سے اجتناب کرتا ہے' وہ ہمیشہ اللہ کی حفاظت اور اعانت میں رہتا ہے۔یاد رکھو اصحاب حدیث کے لیے اصحاب صدق ہونا ضروری ہے۔

حضرت یسیرہ رضی اللہ عنہا کی وفات کی صحیح تاریخ کا تو علم نہیں ہو سکا' البتہ ان کے جو حالات تاریخ وسیر کی مختلف کتابوں میں مذکور ہیں' ان سے پتا چلتا ہے کہ ان کی وفات

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں مدینہ منورہ میں ہوئی۔

ان سے ایک یہ حدیث مروی ہے' جس میں وہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا:

سبحان اللہ اور لا الہ الا اللہ اور سبحان الملک القدوس یا سبوح یا قدوس ربنا و رب الملائکۃ والروح پڑھنے کو اپنے آپ پر لازم قرار دے لو۔ اسے انگلیوں پر شمار کرو اس لیے کہ انگلیوں سے پوچھا جائے گا۔ انگلیاں یہ جواب دیں گی۔ اس میں غفلت نہ کرنا ورنہ اللہ کی رحمت تمھیں بھلا دے گی۔ یہ حدیث ترمذی اور ابوداؤد میں ہے۔

حضرت بسیرہ

حضرت بسیرہ رضی اللہ عنہا مکہ مکرمہ کی رہنے والی تھیں اور عرب کے جس قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں' وہ ایک جنگ جو قبیلہ تھا۔ عربوں کی روایات کے مطابق وہ اونٹ رکھتے اور بکریاں پالتے تھے۔ کچھ لوگ تجارت بھی کرتے تھے جو شام کے علاقے سے مختلف مال لاتے اور مکہ' طائف اور اس کے قرب وجوار میں فروخت کرتے تھے۔ بعض لوگ بصریٰ جاتے تھے اور وہاں سے کچھ مال لاتے اور کچھ مال وہاں لے کر جاتے تھے۔ اس قبیلے کے بعض ایسے افراد بھی تھے جن کا تعلق راہبوں اور تارک الدنیا زاہدوں کے گروہ سے تھا۔ یہ راہب اس بات کے قائل اور مبلغ تھے کہ کتب الٰہی کے مطابق ایک ایسا نبی آنے والا ہے جو آخری نبی ہوگا۔ وہ سرزمین عرب میں پیدا ہوگا اور تھوڑے عرصے میں تمام مذہبوں کے متبعین پر غلبہ حاصل کرلے گا اور دنیا اس کی تابع فرمان ہو جائے گی۔

راہبوں کی یہ باتیں واپس آکر یہ اپنے قبیلے کے لوگوں کو سناتے اور ایک آنے والے مصلح اور پیغمبر کے بارے میں تعجب و حیرانی کا اظہار کرتے۔ عرب قبائل میں قریش سب سے زوردار اور مرجع خلائق تھے۔ لوگ انھیں مستحق تعظیم گردانتے تھے اور ان کی بات مانتے تھے۔ حضرت بسیرہ رضی اللہ عنہا کے قبیلے کے ایک شخص نے جو شام کے سفر سے واپس آیا تھا کہا کہ میں ایک راہب سے یہ سن کر آیا ہوں کہ عرب میں ایک پیغمبر پیدا ہوگا' ممکن ہے وہ پیغمبر قریش ہی میں پیدا ہو۔ بہرحال یہ باتیں یہودیوں اور عیسائیوں میں خاصی مشہور تھیں اور ان کے راہب و تارک الدنیا بزرگ یہ باتیں عام طور پر اپنی مجلسوں میں بیان کیا کرتے تھے' جو عرب کے ان قبائل میں بھی پہنچ چکی تھیں جو اپنے آپ کو دین ابراہیمی کے متبع گردانتے تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کا ظہور ہوا تو عرب کے بعض لوگوں نے ان راہبوں کی باتوں کا ذکر کیا اور اس مسئلے کو سنجیدگی سے موضوع فکر بنایا کہ ممکن ہے یہی آخری نبی اور دنیا کے مصلح ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے زمانے میں حضرت بسیرہ مکے سے باہر تھیں اور طائف کے علاقے میں اپنے بعض اعزہ سے ملاقات کے لیے گئی تھیں۔ تین مہینے کے بعد واپس آرہی تھیں کہ معلوم ہوا مکے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے رسالت و نبوت کا دعوی کیا ہے اور وہ خود کو اللہ کا فرستادہ قرار دیتے ہیں اور کچھ لوگ ان پر ایمان بھی لا چکے ہیں' جن میں بوڑھے بھی شامل ہیں اور جوان بھی' بچے بھی اور عورتیں بھی' پڑھے لکھے بھی اور ان پڑھ بھی' امیر بھی ہیں اور مفلس و قلاش بھی' غلام بھی ہیں اور آزاد بھی' تجارت پیشہ بھی اور ملازم و مزدور بھی۔

اب حضرت بسیرہ کے دل میں بھی ایک تحریک سی پیدا ہوئی اور غور و فکر کے نئے زاویوں نے کروٹ لی۔ چپکے چپکے چند عورتوں سے ملیں اور اسلام کے بارے میں کچھ باتیں سمجھنے کی کوشش کی' جس سے اس نتیجے پر پہنچیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے نبی ہیں' ان کی دعوت صحیح ہے' ان کی باتیں مبنی بر حق ہیں' ان کے اصول حقیقت کے آئینہ دار ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں وہ فی الواقع اللہ کا پیغام ہے اور جن عادات و اطوار کے حامل ہیں وہ واقعی صحت و استواری لیے ہوئے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و مناقب سن کر اور آپؐ کے متعلق ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد حضرت بسیرہ ایک روز آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ اس وقت آپؐ ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مکان پر تشریف فرما تھے اور کچھ جان نثار آپ کی خدمت میں حاضر تھے۔ حضرت بسیرہ نے سلام کیا اور ایک کونے میں بیٹھ گئیں۔ آپ نے آنے کا مقصد پوچھا تو عرض کیا چند باتیں دریافت کرنے کے لیے آئی ہوں۔۔۔ فرمایا کہو کیا کہنا چاہتی ہو۔

عرض کیا: اسلام کیا ہے؟

فرمایا: اللہ' اس کے فرشتوں' اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو سچا ماننے

اور ان پر ایمان لانے کا نام اسلام ہے۔
کہا: آپ لوگوں کو کیا تعلیم دیتے ہیں؟
فرمایا: یہ کہ کسی پر ظلم نہ کرو، مظلوم کی مدد کرو، ہمسائے کی ضرورتیں پوری کرو، اپنے ہاتھ اور اپنی زبان سے کسی کو تکلیف نہ پہنچاؤ، جو چیز اپنے لیے پسند کرتے ہو وہ دوسرے کے لیے بھی پسند کرو، زبان قابو میں رکھو، سچ بولو، کسی پر اتہام نہ باندھو، خدا کو ایک مانو اور اس کے رسول کی تابعداری کرو۔

یہ چند سیدھی سادی اور صاف باتیں تھیں جو بسیرہ کے دل میں اتر گئیں اور وہ کلمہ شہادت پڑھ کر اسی وقت دائرہ اسلام میں داخل ہو گئیں۔

مسلمانوں کے لیے مکی زندگی آزمائش اور امتحان کی زندگی تھی۔ قبول اسلام کے بعد وہ باہر نکلیں تو حالات بالکل مختلف تھے اور لوگوں کی نظریں ان کے بارے میں بدلی ہوئی تھیں۔ اس وقت وہ جوانی کی حدود سے نکل کر کہولت کی سرحد میں داخل ہو رہی تھیں اور لوگوں پر ان کا خاصا اثر تھا۔ مگر اب انھوں نے دیکھا کہ جو لوگ چند لمحے قبل مدحت سرائی میں رطب اللسان تھے، اب یکایک مذمت پر اتر آئے ہیں اور جو معاون و مددگار تھے، وہ دشمن اور درپے آزار ہو گئے ہیں۔ گھر اور باہر کی فضا متغیر ہو گئی ہے اور چھوٹے سے لے کر بڑے تک سب کا لب و لہجہ تبدیل ہو گیا ہے۔ اب یہ اہل مکہ اور اپنے اعزہ و اقارب سب کے نزدیک اجنبی تھیں اور ان کا کوئی بھی ہمدرد نہ تھا۔ گھر والوں نے روٹی پانی تک بند کر دیا اور شدید تکلیفیں دینا شروع کر دیں۔ ایک روز جب تمام رشتے دار اور اہل محلہ ان کے اردگرد جمع تھے اور انھیں مار پیٹ رہے تھے تو بولیں:

کیا تم مجھے محض اس لیے تکلیفیں پہنچا رہے ہو کہ میں مسلمان ہو گئی ہوں۔ یاد رکھو اللہ ایک ہے، وہ وحدہ لا شریک ہے، اس کے پیغمبر برحق ہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سچے رسول ہیں، ان کی اطاعت ہر شخص پر فرض ہے۔ میں صدق قلب سے ان کی اطاعت قبول کر چکی ہوں، اسلام میرے دل کی گہرائیوں میں اتر چکا ہے، مجھے دنیا کی کوئی طاقت اب اسلام کے دائرے سے باہر نہیں نکال سکتی۔

میں تمھارے ہاتھوں مر جانا قبول کر سکتی ہوں' لیکن اسلام کی دولت کو اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دوں گی۔ میں یہ برداشت کر سکتی ہوں کہ تم میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دو' مجھے آگ میں جلادو اور میری راکھ فضا میں اڑادو' لیکن یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتی کہ توحید کی نعمت کو چھوڑ کر دوبارہ کفر و شرک کی آلودگیوں کو قبول کر لوں۔ میں نے اپنے ان کانوں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات عالیہ کو سنا ہے اور میری ان آنکھوں نے ان کو دیکھنے کا شرف حاصل کیا ہے' میں یقین رکھتی ہوں کہ وہ اللہ کے سچے پیغمبر ہیں اور ان کی تمام باتیں صحیح ہیں۔ میں سچ سے دست بردار ہو کر جھوٹ کو نہیں اپنا سکتی اور نیکی کے دائرے سے نکل کر برائی کے حصار میں نہیں آ سکتی۔ تم جو جی چاہے کرو' میرے پائے استقلال میں لغزش نہیں آئے گی۔ میں ثابت قدم رہوں گی اور میرے دل میں جو بات راسخ ہو چکی ہے' اب کسی صورت میں اس میں تزلزل نہیں پیدا ہوگا۔ دیکھو میں تمھیں یہ بتادوں کہ میں سچی ہوں اور تم جھوٹے ہو۔ میں مظلوم ہوں اور تم ظالم ہو۔ مظلوم کی دعا اللہ کے ہاں شرف قبول سے محروم نہیں رہتی۔ اس کی دعا سے عرش خداوندی کانپ جاتا ہے۔

حضرت بسیرہ رضی اللہ عنہا کی یہ تقریر زوردار تھی اور اس کے ایک ایک لفظ میں صداقت و خلوص پایا جاتا تھا' اس لیے وہ پیچھے ہٹ گئے اور انھیں اپنے حال پر رہنے دیا' بلکہ کئی شخص یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ آخر اسلام میں ضرور صداقت ہوگی جو اتنے مصائب کے بعد بھی ایک عورت اسے ترک کرنا تو کجا اپنے مؤقف سے ذرا پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔ اس کے نتیجے میں بعض لوگ مسلمان بھی ہوگئے اور انھوں نے حضرت بسیرہ کے سامنے اپنے اس عمل پر ندامت کا اظہار کیا۔ ان کے عزیزوں میں سے جو لوگ مسلمان ہوئے وہ تبلیغ اسلام کے سلسلے میں اب ان کے بہت بڑے معاون تھے۔

جب مکے میں مسلمانوں کا رہنا ناممکن ہو گیا تو ہجرت مدینہ کی تیاری شروع ہوئی۔ حضرت بسیرہ بھی اپنے قرابت داروں اور متعلقین کے ساتھ ہجرت کی سعادت سے بہرہ مند ہوئیں۔ ہجرت کرنے والوں میں ان کے بھائی' بیٹے' بہنیں اور بعض دیگر

قریبی رشتے دار شامل تھے۔ان کے خاندان کے اکثر افراد اور خود انھوں نے مدینہ پہنچ کر ان جنگوں میں حصہ لیا جو مسلمانوں اور مخالفین اسلام کے درمیان لڑی گئیں۔انھوں نے ابتدائی معرکوں یعنی بدر اور احد میں بھی شرکت کی اور دوسری لڑائیوں میں بھی شامل رہے۔ ان کا خاندان جو ابتدا میں اسلام کا سخت دشمن تھا' بعد میں اسلام کا زبردست حامی ہوا اور یہ لوگ اسلام کی عزت و وقار کو محفوظ رکھنے کے لیے کوشاں ہوئے اور میدان عمل میں نکلے۔

حضرت بسیرہ رضی اللہ عنہا راویہ حدیث بھی ہیں اور ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ احادیث مروی ہیں۔پھر آگے ان کے شاگردوں کا سلسلہ چلا' جنھوں نے ارشادات پیغمبر سے لوگوں کو آگاہ کیا۔

اپنے دور کی یہ ایک عظیم خاتون تھیں جنھوں نے عمل و حرکت کے کئی میدانوں میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔

حضرت ام مجید

حضرت ام مجید رضی اللہ عنہا کے حالات طبقات ابن سعد اور الاستیعاب (ابن عبدالبر) وغیرہ میں مذکور ہیں- یہ مدینہ طیبہ کے قبیلہ انصار سے تعلق رکھتی تھیں اور قبیلہ بنو حارث کی رکن تھیں- حضرت یزید بن سکن انصاری کی بیٹی اور مشہور صحابیہ حضرت اسماء بنت یزید انصاریہ کی بہن تھیں- حلیم الطبع، متحمل مزاج اور بلند کردار خاتون تھیں- خوش گفتار، حسن اخلاق کی مالک اور لوگوں کی ہمدرد و معاون تھیں- ان کی پارسائی اور خدمت خلق کا یہ عالم تھا کہ خود لوگوں کے گھروں میں جاتیں اور ضعیف و معذور عورتوں کے کام کرتیں- یہ بذات خود کھاتے پیتے گھرانے سے منسلک تھیں اور ان کے خاندان کے لوگ اصحاب ثروت اور مال دار تھے- لیکن ان کے دل میں کبھی نہ درہم و دینار کے لیے رغبت پیدا ہوئی اور نہ مزاج میں نخوت و غرور اور تکبر نے راہ پائی- اپنے آپ کو ہمیشہ حقیر گردانا اور فقر و درویشی میں زندگی گزار دی-

فیاضی و سخاوت کے بارے میں مدینہ منورہ کی خواتین میں خاص شہرت رکھتی تھیں اور اس باب میں کوئی خاتون ان کی حریف نہ تھی- اس طرح کے کئی واقعات مشہور ہیں- ایک دفعہ اپنے کھجوروں کے باغ سے گھر آرہی تھیں اور سر پر کھجوروں کا ٹوکرا اٹھائے ہوئے تھیں، بچوں کے لیے گھر میں کھانے کی کوئی شے نہ تھی- یہی کھجوریں تھیں جو ان میں جاکر تقسیم کرنا تھیں- راستے میں نواح مدینہ کی چند عورتیں ملیں اور انھوں نے ان سے اپنی غربت و افلاس کا کچھ اس انداز سے ذکر کیا کہ کھجوروں کا ٹوکرا اتار کر وہیں بیٹھ گئیں، ان کے اہل و عیال کے بارے میں پوچھا اور تمام کھجوریں ان کے حوالے کر دیں- دوبارہ باغ گئیں تو اپنے بچوں کے لیے کھجوریں لائیں-

ایک دفعہ گھر کے سب افراد مکان پر موجود تھے- یہ کھانا پکا رہی تھیں، جب کھانا

تیار ہو چکا اور اہل خانہ میں اسے تقسیم کرنے لگیں تو دروازے پر دستک ہوئی۔ بچہ باہر گیا تو دیکھا کہ چند غریب اور مفلس عورتیں دروازے پر کھڑی ہیں اور حضرت ام عبید رضی اللہ عنہا کو یاد کر رہی ہیں۔ وہ اسی وقت جلدی سے دروازے پر گئیں۔ ان سے چند باتیں کیں اور سارا کھانا اٹھا کر ان کے حوالے کر دیا۔ وہ چلی گئیں تو اہل خانہ کے لیے دوبارہ کھانا تیار کیا۔

ایک مرتبہ ایک جنگ کے لیے نفیر عام اور مجاہدین کی امداد کے لیے اعلان ہوا' فوراً اٹھیں اور اپنا تمام سازوسامان لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئیں اور سب کچھ راہ خدا میں آنحضرت کے سامنے رکھ دیا۔ آپ نے ان کے لیے دعا کی اور اہل وعیال کی خیریت دریافت فرمائی۔

ایک مرتبہ نماز سے فارغ ہو کر مسجد نبوی سے باہر آ رہی تھیں کہ چند اجنبی آدمیوں پر نظر پڑی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مسافر ہیں اور مدینے سے خاصے فاصلے پر سکونت رکھتے ہیں۔ سیدھی گھر گئیں اور ان کے لیے کھانا تیار کر کے بھجوایا۔

حضرت ام عبید رضی اللہ عنہا راویہ حدیث بھی تھیں۔ انھوں نے آنحضرت سے پانچ احادیث روایت کیں جو احادیث کی مختلف کتابوں اور مجموعوں میں متعدد اسناد سے مندرج ہیں۔

بہرحال یہ اپنے اوصاف اور عادات کی بنا پر لوگوں میں عزت و احترام کی مالک تھیں اور ہر شخص ان کی توقیر کرتا تھا۔ پھر ہر شخص ان کا کام کرنے میں سعادت محسوس کرتا تھا۔ جس طرح یہ لوگوں کے کام کرتی تھیں' اسی طرح لوگ ان کا کام کرتے اور جس طرح یہ لوگوں کی خدمت اور عزت کے لیے کوشاں ہوتیں' اسی طرح لوگ بھی ان کی خدمت اور احترام کو اپنا فرض گردانتے۔

حضرت ام عبید رضی اللہ عنہا نے بعض جنگوں میں بھی شرکت کی۔ یہ جہاں بہت متواضع اور منکسر مزاج تھیں' وہاں بڑی بہادر اور جرات مند بھی تھیں۔ صاف گو اور اونچے ذہن و فکر کی مالک۔ ڈر' خوف' حرص' لالچ' طمع' بزدلی اور دشمن کی دہشت سے

بے خبر --- میدان جہاد میں جہاں انسانوں کے سر کٹ رہے تھے' کشتوں کے پشتے لگ رہے تھے' تلواروں سے خون نچڑ رہا تھا' تیر تیزی سے انسانی جسموں میں پیوست ہو رہے تھے اور زمین لہو سے رنگین ہو گئی تھی' ام حبید بے دھڑک میدان میں گھوم رہی تھیں۔ بلاخطر زخمیوں کی مرہم پٹی کر رہی تھیں۔ بے خوف مجاہدین کو پانی پلا رہی اور غازیوں کو اسلحہ دے رہی تھیں۔

غرض یہ نیکی کے ہر میدان میں پیش پیش رہتیں' نہ اپنی کسی تکلیف کا کوئی احساس کرتیں اور نہ کسی نوع کے نفع و نقصان کا خیال فرماتیں۔ ہر بات کا دینی نقطہ نگاہ سے جائزہ لیتیں' اسے دنیوی سود و زیاں کی میزان میں ہرگز نہ رکھتیں۔

ان کے بیٹے بھی بہادر اور شجاع تھے۔ خلافت راشدہ کے زمانے میں ایک مرتبہ ایک بیٹے کو میدان جہاد میں روانہ کرتے ہوئے نصیحت کرتی ہیں:

بیٹا! تم میدان جہاد میں جا رہے ہو' دعا کرو تمھیں جہاد کا صحیح لطف محسوس ہو اور تمھیں اللہ کی طرف سے شہادت سے نوازا جائے' اگر تم کو یہ سعادت میسر آ جائے تو تم انتہائی بلند بخت ہو گے' خود میں اور تمھارے آباؤ اجداد بت پرستی میں مبتلا تھے اور اللہ کی توحید اور اس کے احکام سے نا آشنا تھے' پتھروں کو پوجتے اور اللہ کی جو معبود حقیقی ہے' نافرمانی کرتے تھے۔ اللہ نے ہماری طرف نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا اور اپنی توحید کی راہ دکھائی۔

بیٹا! تم اسلام کی خدمت اور اس کی نشر و اشاعت کے لیے ہر وقت کمربستہ رہو' اگر اسلام زندہ ہے تو تم کامیاب ہو گے اور تمھاری ترقی کی راہیں کھلیں گی اور اگر خدانخواستہ صورت حال مختلف ہے تو تمھاری ذلت و نکبت لازمی ہے۔ اسلام عمل کا مذہب ہے' جو بہتر اخلاق اور اچھے کردار کی تعلیم دیتا ہے۔ محض قول اور باتوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

تم جہاد کے لیے کمربستہ ہو گئے ہو۔ یہ ایک افضل ترین عبادت ہے۔ روانہ ہونے سے پہلے صدق دل سے اللہ کے حضور گڑگڑاؤ اور گناہوں کی معافی مانگو' حقوق العباد کا

خصوصیت سے خیال رکھو۔ حقوق اللہ کا تعلق براہ راست اللہ سے ہے' وہ معاف کر دیتا ہے اور گناہوں کی آلودگیوں سے انسان کے باطن کو دھو دیتا ہے۔ لیکن حقوق العباد بندوں سے متعلق ہیں' ان گناہوں کو بندے ہی معاف کریں گے تو بارگاہِ خداوندی سے ان پر خطِ تنسیخ کھینچا جائے گا ورنہ نہیں۔

میں تمھیں آخری بات یہ کہتی ہوں کہ میدان جہاد میں تمھیں جو تکلیفیں پہنچیں ان سے گھبراؤ نہیں' اس راہ میں جتنی تکلیفیں پہنچیں گی تمھارے لیے مفید ہوں گی اور آخرت میں تم کامیاب قرار پاؤ گے۔

ان کی وفات کی صحیح تاریخ کا تو پتا نہیں چلا البتہ جو بات معلوم ہو سکی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی وفات خلیفہ ثانی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ہوئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ان کی ملاقاتوں کا بھی ثبوت ملتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض معاملات میں حضرت عمر نے ان سے مشورہ لیا اور ان کے مشورے کو اہمیت دی۔

حضرت بجینہ بنت حارث

حضرت بجینہ بنت حارث رضی اللہ عنہا عظیم المرتبت صحابیہ تھیں۔ عالمہ اور محدثہ ---! نماز عام طور پر مسجد نبوی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں ادا کرتی تھیں۔ گفتگو میں انتہائی محتاط' کسی ایسی مجلس میں نہ بیٹھتیں جس میں کسی کی غیبت کا اندیشہ ہو' تلاوت قرآن کثرت سے کرتیں' نفلی روزے رکھتیں' نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف مسائل دریافت کرتیں اور لوگوں کو سناتیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت تھیں اور اس بیعت کا مسرت انگیز لہجے میں ذکر کرتیں۔ اسلام کے بارے میں اس درجہ نازک احساس رکھتی تھیں کہ کوئی بات اس کے خلاف سننا گوارا نہ کرتیں۔

ایک مرتبہ کہیں جارہی تھیں کہ گلی میں مدینہ منورہ کی ایک یہودی عورت کھڑی تھی' اس نے حضرت بجینہ رضی اللہ عنہا کو دیکھ کر کہا:

> اسلام سچا مذہب نہیں ہے' مسلمانوں کا طریق عبادت غلط ہے اور جس شخص کی یہ اتباع کرتے ہیں' وہ اللہ کا پیغمبر نہیں۔ سچا مذہب یہودیت ہے اور ہمارا پیغمبر برحق ہے۔

یہ الفاظ سنتے ہی حضرت بجینہ طیش میں آگئیں' چہرہ سرخ ہو گیا' وہیں قدم روک لیے اور اس یہودی عورت سے مخاطب ہو کر کہا:

> تمھارے پیغمبر تو بلاشبہ سچے تھے اور اللہ کے اولوالعزم نبی تھے' تمھارا مذہب بھی اس زمانے میں صحیح تھا' مگر تم نے اپنے دین کو بگاڑ دیا' اپنے مذہب میں تحریف کر لی اور اس کے احکام کو بدل دیا' اپنے پیغمبر کی کتاب میں جو اللہ کی طرف سے نازل کی گئی تھی' نئی نئی باتیں داخل کر لیں۔ تمھاری کتاب میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا تھا تم نے ان کو حلال ٹھہرا لیا اور جن کو حلال

کیا گیا تھا انھیں حرام بنالیا- یہ صریحاً اللہ کی نافرمانی اور اس کے پیغمبر کے حکم کی خلاف ورزی تھی -اگر تم صداقت شعار ہوتے تو اپنے مذہب میں تبدیلی نہ کرتے اور اللہ کے احکام کو اسی طرح رہنے دیتے جس طرح تمھاری کتاب میں مذکور تھے-

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد تمھارے مذہب کی حیثیت بالکل بدل گئی ہے' آپ کی تشریف آوری کے بعد پہلے تمام مذاہب کے متبعین کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ آپ پر ایمان لائیں' آپ کی نبوت ورسالت کو صحیح تسلیم کریں اور قرآن مجید کو اللہ کی سچی کتاب مانیں-اگر تم نے ایسا نہ کیا تو سمجھ لو کہ تم صداقت سے دور ہو گئے ہو اور جھوٹ کو اپنا نصب العین ٹھہرالیا ہے- تم کس طرح یہ جسارت کرتے ہو کہ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ قرار دو' یہ دنیا اور آخرت میں صریحاً خسارے کا سودا ہے-اگر تم اللہ کے نزدیک اپنے آپ کو سچا ثابت کرنا چاہتے ہو تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ اور آپ کی تعلیمات پر عمل کرو' اللہ کی بارگاہ میں عمل کی قیمت پڑتی ہے باتوں کی نہیں-افسوس ہے تم عمل کو چھوڑ کر باتوں پر اتر آئے ہو' جس کی اللہ کے دربار میں کوئی حیثیت نہیں- یہودیوں میں جو سمجھ دار اور اصحاب فراست لوگ ہیں وہ آنحضرت کی رسالت پر ایمان لے آئے ہیں اور انھوں نے قرآن کی حقانیت کو تسلیم کر لیا ہے-ان لوگوں کو اللہ کے ہاں دوہرا اجر ملے گا' ایک اپنے پیغمبر کو ماننے کا' دوسرا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانے کا-

حضرت بجینہ رضی اللہ عنہا کی اس قسم کی گفتگو بڑی زوردار تھی اور انھوں نے اخلاص میں ڈوب کر باتیں کی تھیں' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ یہودی عورت خاموش ہو گئی اور یوں دیکھنے لگی جیسے کسی گہرے غور و فکر میں چلی گئی ہو- تھوڑی دیر بعد گھر گئی اور پھر واپس حضرت بجینہ کے پاس آئی اور کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو گئی-

حضرت بحینہ رضی اللہ عنہا سے احادیث بھی مروی ہیں۔انھوں نے یہ احادیث براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنیں اور روایت کیں۔ آپؐ کے ارشادات سننے کی غرض سے آپؐ کی خدمت میں آمدورفت رکھتی تھیں۔

حضرت بحینہ کے شاگرد جنھوں نے ان سے احادیث روایت کیں' خاصی تعداد میں ہیں' ان میں صفیہ بنت شیبہ اور عمیرہ بنت عبداللہ بن کعب بن مالک ایسی رفیع المنزلت خواتین کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ان کے شاگردوں کے جو شاگرد ہوئے اور جنھوں نے ان سے احادیث روایت کیں' ان کی فہرست بڑی طویل ہے۔ان میں سے بعض حضرات اپنی خصوصیات کے اعتبار سے بے نظیر اہمیت کے حامل ہیں۔

حضرت بحینہ رضی اللہ عنہا میدان جہاد میں بھی گئیں اور انھوں نے جنگوں میں حصہ لیا۔ان کے حالات طبقات ابن سعد اور ابن اثیر کی اسد الغابہ میں مرقوم ہیں' جن میں بتایا گیا ہے کہ انھوں نے غزوہ خیبر میں بھی شرکت کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال غنیمت میں سے انھیں تیس وسق عطا فرمائے (ایک وسق تقریباً پانچ من کا ہوتا ہے)۔

اس جنگ میں حضرت بحینہ نے بڑی خدمات انجام دیں اور مجاہدین کی امداد کی۔

ان سے جن لوگوں نے احادیث روایت کیں ان میں زیادہ تعداد عورتوں کی ہے' عورتیں فہم مسائل کے لیے ان کی خدمت میں آتیں اور یہ انھیں شوق و رغبت سے درس حدیث دیتیں۔

ایک مرتبہ ایک شاگرد خاتون نے ان کی بات کاٹ دی تو اسے سرزنش کی اور فرمایا کسی کے سلسلہ کلام کو منقطع کرنا سوئے ادب کے ذیل میں آتا ہے۔جب تک متکلم اپنی بات ختم نہ کرلے خاموشی اختیار کیے رکھو۔اگر کسی کی بات کے کسی پہلو پر اعتراض ہو تو اسے بعد میں بیان کرو' دوران کلام اس کی بات کو ٹوکنا مناسب نہیں۔

اسی طرح ایک دفعہ ایک حدیث بیان کررہی تھیں کہ ایک خاتون نے اس کے معانی کی تفصیلات بیان کرنے کی استدعا کی۔فرمایا خاموش رہو۔یہ حدیث رسول ہے۔

آنحضرت کے فرمان پر اپنی بات کو ترجیح نہ دو اور جس مجلس میں آپ کا ارشاد گرامی بیان کیا جا رہا ہو' اس میں اونچی آواز سے نہ بولو' سرور کائنات کی آواز پر اپنی آواز کو بلند کرنے سے قرآن نے منع فرمایا ہے۔

خدمت خلق کا بہت خیال رکھتی تھیں اور فرمایا کرتی تھیں کہ دوسروں کی خدمت کرنا اور اپنے کسی بھائی کے کام آنا بہت بڑی عبادت ہے۔ خود بھی ان کا یہ معمول تھا کہ دوسروں کے کام توجہ اور شوق سے کرتیں۔ ایک مرتبہ نماز فرض کے بعد عبادت میں مصروف تھیں کہ ایک عورت آئی اور اس نے اپنی کوئی ضرورت بیان کی۔ فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں اور اس عورت کے کام میں مشغول ہو گئیں۔

ایک دفعہ مسجد نبوی میں جا رہی تھیں کہ ایک مکان سے بچے کے رونے کی آواز آئی۔ اسی وقت اس مکان میں گئیں دیکھا کہ بچے کی ماں گھر کا کام کر رہی ہے اور بچہ رو رہا ہے' عورت سے کہا تم بچے کو پکڑو' میں تمھارا کام کرتی ہوں۔

حضرت ام اسحاق غنویہ

یہ جلیل القدر خاتون مکہ مکرمہ کی رہنے والی تھیں اور اچھے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ علامہ ابن عبدالبر نے اپنی مشہور کتاب الاستیعاب فی معرفتہ الاصحاب میں اور دیگر مورخین نے اپنی تصنیفات میں ان کے حالات بیان کیے ہیں---رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کرنے کے بعد مسلمان ہوئیں اور اس کے نتیجے میں انھیں بہت سی تکلیفیں پہنچائی گئیں۔

ابتدا میں ان کے قبول اسلام کا کسی کو پتا نہیں چلا۔ ایک روز اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھیں اور آہستہ آہستہ کچھ پڑھ رہی تھیں۔ ان کے پڑھنے کی آواز والد کے کانوں سے ٹکرائی' وہ بیدار ہوا اور کان ان کی طرف لگا دیئے۔ کچھ دیر تو وہ چپ چاپ سنتا رہا' لیکن تھوڑی دیر کے بعد اٹھ کر بیٹھ گیا اور بیٹی کو آواز دی' مگر کوئی جواب نہ آیا' اب باپ غصے سے بے تاب ہو گیا اور خشم گیں آواز میں بیٹی سے کہا۔

ام اسحاق ابھی ابھی تم یہ کیا پڑھ رہی تھی' کیا وہی جو یہاں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پڑھا کرتے تھے اور جس کی پاداش میں انھیں اپنے آبائی وطن اور خاندانی مکانات سے نکلنا پڑا۔ تم نہیں جانتی کہ انھیں اور ان کے ساتھیوں کو اس کے کس درجہ خوف ناک نتائج بھگتنا پڑے ہیں۔ انھیں اپنی جائدادوں سے دست کش ہونا پڑا اور اقربا و اعزہ سے جدائی اختیار کرنا پڑی اور دوسری جگہ جا کر پناہ لینا پڑی' تم اس کی تابعداری کر کے مجھے بدنام کرنا چاہتی ہو' اگر تم اس سے باز نہ آئیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت سے کنارہ کشی اختیار نہ کی تو میری برادری اور اہل شہر مجھے رسوا کریں گے۔

باپ نے سلسلۂ کلام جاری رکھا مگر بیٹی بالکل خاموش رہی۔ باپ نے یہ سمجھ کر کہ بیٹی نافرمانی کی مرتکب ہو رہی ہے اور میری بات کو نظر انداز کر رہی ہے مزید خفگی کا

اظہار کیا اور کہا۔

یاد رکھو میں برادری میں ذلیل نہیں ہو سکتا۔ میں باحمیت اور باغیرت آدمی ہوں اور لوگوں میں مجھے عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ آج تک کسی معاملے میں کسی کو مجھ پر شکایت کا موقع نہیں ملا۔ میں نے جن اصولوں کو اپنایا ہے' انھیں کبھی ترک نہیں کیا۔ میری زندگی آئینے کی طرح صاف ہے اور اس سلسلے میں مجھے خاص مقام حاصل ہے۔ آج تم میری عزت خاک میں ملا رہی ہو اور شہرت کو داغ دار کرنے کے درپے ہو۔ بہتر یہ ہے کہ اس نئے دین کو جس کا ہمارے آباواجداد کے دین اور طرز عمل سے کوئی تعلق نہیں' ترک کر دو' ورنہ میں تمھیں سنگین سزا دوں گا اور ایسی اذیتیں پہنچاؤں گا جن کا تم تصور بھی نہیں کر سکتی ہو۔ میں جس چیز کو صحیح سمجھتا ہوں اس پر عمل کرنے کے بارے میں نہایت سخت ہوں اور جسے اپنے نقطہ نگاہ سے غلط سمجھتا ہوں اسے حقارت سے ٹھکرا دیتا ہوں۔ اس ضمن میں کسی کی پسند یا ناپسند میرے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ اپنے آباواجداد کے دین کی روشنی میں میرے کچھ اصول ہیں جو میں نے اختیار کر رکھے ہیں۔ اگر اس راہ میں کوئی رکاوٹ حائل ہوگی تو میں اسے دور ہٹادوں گا۔

باپ کے ان آخری فقروں نے بیٹی کو چونکا دیا اور وہ باپ کی تقریر کا جواب دینے پر مجبور ہوگئی۔ اسلام کی دولت سے بہرور بیٹی نے سراپا نیاز ہو کر کہا:

آپ میرے لیے واجب التکریم شخصیت ہیں اور آپ کا احترام میرے لیے دو وجوہ سے ضروری ہے۔

اول: اس لیے کہ آپ میرے والد ہیں اور مجھے آپ کی توقیر کرنا چاہیے۔

دوم: اس لیے کہ میرے مذہب (اسلام) کا یہ حکم ہے کہ ماں باپ کی ہر حال میں عزت کی جائے اور کسی صورت میں ان کے احترام کے تقاضوں کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

یہ عزت واحترام ہی کے تقاضے تھے جو مجھے مجبور کرتے تھے کہ میں زبان کو حرکت نہ دوں اور خاموشی سے آپ کی بات سنتی رہوں۔اب بھی آپ کی عزت کرتی ہوں اور کرتی رہوں گی' لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری سمجھتی ہوں کہ صحیح آواز آپ کے کانوں تک پہنچادوں تاکہ اتمام حجت ہو جائے اور میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کی مرتکب نہ قرار پاؤں۔

اے میرے قابل احترام والد! بات یہ ہے کہ میں اسلام قبول کر چکی ہوں اور میں نے دین محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حقانیت کا اقرار کر لیا ہے۔میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ آباواجداد کا دین اور ان کے رسوم و عوائد کوئی حیثیت نہیں رکھتے' اصل شے صداقت ہے۔اگر صداقت ہمارے بڑوں کے مذہب میں نہیں پائی جاتی تو اسے ایک لمحے کے لیے بھی قبول نہیں کرنا چاہیے۔یہ بات اپنا وزن کھو بیٹھی ہے کہ جو کچھ بڑے کرتے رہے ہیں وہی صداقت ہے اور اسی کو اپنانا چاہیے۔عین ممکن ہے ہمارے بڑے غلط راہوں پر چلتے رہے ہوں' ہمیں ان کی اتباع کر کے اپنے آپ کو غلط راہوں پر نہیں ڈالے رکھنا چاہیے' حق کی تلاش اصل مسئلہ ہے۔اگر آج ہم حق کی تلاش میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور کسی شخص کی باتیں ہمارے ضمیر اور دل کو مطمئن کرتی ہیں تو انھیں قبول کرنے میں تامل نہیں کرنا چاہیے۔شروع شروع میں سچی بات کے اعلان میں واقعی کچھ اجنبیت سی محسوس ہوتی ہے اور ہمارے کان چونکہ اس سے آشنا نہیں ہوتے لہٰذا اس میں کچھ وحشت کا سا گمان ہونے لگتا ہے' مگر غور سے دیکھا جائے اور آباواجداد کے تصورات سے بالا ہو کر اصل معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی سعی کی جائے تو تمام عقدے کھل جاتے ہیں اور راستے کی رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں۔

اے میرے معزز باپ! میں نے جو دین قبول کیا اور اپنے لیے منتخب کیا ہے' اس

کی تعلیمات براہ راست دل کے دروازوں پر دستک دیتی ہیں-اس کا حکم ہے کہ چوری نہ کرو' کسی کو تنگ نہ کرو' دنیا میں خوں ریزی نہ کرو' اس عالم آب و گل میں فساد نہ پھیلاؤ' لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم نہ کرو' غصب و نہب کی عادتیں ترک کر دو' ہمسایہ کے حقوق پورے کرو' انھیں تکلیف نہ پہنچاؤ' بڑوں کی عزت کرو' چھوٹوں پر رحم کھاؤ اور ان کے ساتھ شفقت و مہربانی کا برتاؤ روا رکھو' ظلم و ستم سے باز آجاؤ' حلال و حرام کے درمیان امتیاز کرو' عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرو' سچ بولو اور جھوٹ کو ترک کر دو-

باپ جو چند لمحے پیشتر غضب ناک تھا اور بیٹی کو محض اسلام قبول کرنے کی وجہ سے ڈانٹ رہا تھا' اب حیرانی و تعجب کے عالم میں بیٹھا بیٹی کی باتیں سن رہا ہے اور اس کی کسی بات کو جھٹلانے کی جرات نہیں کرتا- جب بیٹی بات ختم کر چکی تو باپ نے حیرت سے پوچھا: اسلام کے بارے میں جو تم کہہ رہی ہو کیا وہ سچ ہے؟ بیٹی نے مسرت آمیز لہجے میں جواب دیا' کیوں نہیں' اسلام کی یہی تعلیم ہے اور وہ اپنے پیروؤں کو یہی سکھاتا ہے- باپ اسی وقت ایمان لے آیا-

حضرت ام اسحاق غنویہ رضی اللہ عنہا نے مدینہ منورہ کی ہجرت کا شرف بھی حاصل کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے خاصا عرصہ بعد تک زندہ رہیں- انھوں نے خلفاے راشدین کا زمانہ دیکھا اور کئی جنگوں میں شرکت کا شرف حاصل کیا-

اب حضرت ام اسحاق کی ہجرت کا واقعہ سنیے!

وہ اپنے بھائی کے ساتھ مکہ سے مدینہ کو روانہ ہوئیں- ایک جگہ پہنچے تو بھائی نے کہا:

تم یہاں ٹھہرو- "میں اپنا نفقہ مکہ میں بھول آیا ہوں' اسے لے آوں-"

انھوں نے کہا: مجھے اپنے مشرک شوہر سے خطرہ ہے' وہ تمھیں کوئی تکلیف نہ پہنچائے-

بھائی نے جواب دیا: اللہ نے چاہا تو میں اس کے شر سے محفوظ رہوں گا- کئی دن وہ راستے میں رکی رہیں' لیکن بھائی واپس نہ آیا- ایک دن وہاں سے ایک شخص گزرا جسے انھوں نے پہچان لیا- اس نے پوچھا:

ام اسحاق! تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟

جواب دیا: اپنے بھائی کے انتظار میں بیٹھی ہوں' جو کئی دن سے مکے گیا ہے' واپس نہیں آیا-

اس نے کہا: تیرے بھائی کو تیرے شوہر نے قتل کر دیا ہے-

یہ سن کر ام سحاق کو سخت افسوس ہوا' وہاں سے چلیں اور نہایت تکلیف کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچیں- مسجد نبوی میں گئیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم وضو کر رہے تھے--- روتے ہوئے آپؐ کو بھائی کے قتل کی اطلاع دی- آپؐ نے سن کر پانی کا چلو بھرا اور ان کے چہرے پر چھڑک دیا- آگے حضرت ام حکیم بیان کرتی ہیں کہ اس واقعہ کے بعد حضرت ام اسحاق کو ایسی تسکین حاصل ہوئی کہ ان پر کوئی بڑی سے بڑی مصیبت بھی آپڑتی تو روتی نہیں تھیں- اللہ انھیں صبر دیتا تھا-

حضرت ام حمید انصاریہ

حضرت ام حمیدہ انصاریہ رضی اللہ عنہا ایک گوشہ گیر' خاموش طبع' نرم طینت اور متانت پسند خاتون تھیں --- مدینہ منورہ کی ان خواتین میں ان کا شمار ہوتا تھا جو اسلام کے دور اول ہی میں مسلمان ہو گئی تھیں- ابن اثیر نے اسد الغابہ میں اور ابن عبوالبر نے الاستیعاب میں ان کے جو حالات قلم بند کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادت وزہد' تقوی وطہارت' حلم واحتیاط' گفتار وکردار اور پاکیزگی وزکاوت میں مشہور تھیں-

مدینہ طیبہ میں اسلام کی آواز کانوں میں پڑی تو نہایت متاثر ہوئیں اور جو خواتین ان سے قبل اسلام قبول کر چکی تھیں' ان کے پاس گئیں اور اسلام کے اصول اور تعلیمات کے بارے میں دریافت کیا-

اس کے بعد خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں' اس وقت آپ کے پاس کچھ لوگ بیٹھے تھے' دیکھ کر واپس آ گئیں' شرم وحیا کا ان پر اتنا غلبہ تھا کہ نہ آنحضرت کے پاس جا سکیں اور نہ کوئی بات زبان سے نکال سکیں- دوسرے روز پھر گئیں تو آنحضرت نے قریب بلا لیا اور فرمایا :

تم کون ہو ؟ کیا نام ہے اور کس کام سے آئی ہو ؟

عرض کیا : مدینہ کی رہنے والی ہوں- ام حمید نام ہے اور آپ کی خدمت میں اسلام قبول کرنے کی غرض سے حاضر ہوئی ہوں- میں نے کچھ خواتین سے آپ کے بارے میں سنا اور دریافت کیا ہے- انھوں نے آپ کی تعلیمات کی تعریف کی اور مجھے اسلام قبول کرنے کی ترغیب دی ہے- میں چاہتی تھی کہ خود آپ کی خدمت میں آؤں اور آپ کے ارشادات عالیہ اپنے کانوں سے سننے کی سعادت حاصل کروں-

یہ لفظ کہے اور کلمہ شہادت پڑھ کر دائرہ اسلام میں داخل ہو گئیں۔

حضرت ام حمید زہد و عبادت اور پارسائی میں مدینہ کے عہد اسلامی کے ابتدائی دور کی معروف ترین خاتون تھیں۔ ہر وقت گھر میں بیٹھی رہتیں، کہیں باہر نہ جاتیں، نہ زیادہ باتیں کرتیں اور نہ غیر محرم کے سامنے ہوتیں۔ مورخین نے ان کے حالات بیان کرتے اور ان کے زہد و عبادت کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے۔

عابدة من عابدات صدور الاسلام

یعنی اسلام کے دور آغاز کی عبادت گزار عورتوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

احادیث و سیر کی کتابوں میں منقول ہے کہ ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا:

یا رسول اللہ میں (مسجد نبوی میں حاضر ہو کر) آپ کی اقتدار میں نماز پڑھنے کی خواہاں ہوں۔

آپ نے فرمایا:

مجھے معلوم ہے، تم میری اقتدا میں نماز پڑھنے کی شدید طلب اور خواہش رکھتی ہو، لیکن میں تمھیں بتاؤں کہ تمھارا گھر کے سب سے اندر کے کمرے میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ کھلے کمرے میں نماز پڑھو، دالان میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ کھلے صحن میں نماز پڑھو، کھلے صحن میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ اپنے محلے کی مسجد میں نماز پڑھو اور محلے کی مسجد میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ میری مسجد (یعنی مسجد نبوی) میں نماز پڑھو۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کا مطلب یہ تھا کہ عورتوں کو نماز ایسی بنیادی عبادت چھپ کر کرنی چاہیے اور اسلام کے اس رکن اساسی پر عمل کرنے کے لیے ایسی جگہ کا انتخاب کرنا چاہیے جو زیادہ سے زیادہ محفوظ ہو اور لوگوں کی نظروں سے دور اور باپردہ ہو۔

چنانچہ حضرت ام حمید انصاریہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

اس ارشاد گرامی پر سختی سے عمل کیا- تاریخ نگاروں نے لکھا ہے کہ آنحضرت کے اس فرمان کے بعد انھوں نے اپنے مکان کے آخری کنارے پر جو کہ سب سے زیادہ باپردہ اور لوگوں کی نظر سے دور اور قدرے اندھیرے میں تھا' نماز کے لیے جگہ بنوائی اور زندگی کے آخری سانس تک وہیں نماز پڑھتی رہیں- اس سلسلے میں مورخین نے جو الفاظ لکھے ہیں وہ یہ ہیں:

وکانت تصلي فيه حتى لقيت الله تعالى

یعنی تادم مرگ ان کا یہ معمول رہا کہ وہ اسی جگہ نماز پڑھتی تھیں جو انھوں نے اپنے لیے اس مقصد کے لیے بنوائی تھیں-

گفتگو میں وہ انتہا درجے کی محتاط تھیں' کم گوئی اور اختصار کلام ان کا خاصہ تھا- وہ اس ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان پر عمل پیرا تھیں کہ بات کرنا ہو تو بہتر اور اچھی بات کرو ورنہ خاموش رہو-

وہ خود بھی کم گو تھیں اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتی تھیں' زیادہ بات کرنا اور ضرورت سے بڑھ کر زبان کو حرکت دینا ان کے نزدیک معیوب فعل تھا' جو خواتین ان کی خدمت میں حاضر ہوتیں اور ان سے استفادہ کی خواہش کرتیں ان کو وہ پہلی نصیحت یہ کرتیں کہ

کم بولو' اپنی بات مختصر الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کرو اور کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکالو جس سے دوسرے کو تکلیف پہنچے-

ان کا فرمان ہے کہ طول کلام سے غیبت کے دروازے کھلتے ہیں اور اختصار کلام سے پختگی فکر کی راہیں وا ہوتی ہیں-

عورتوں کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ جب یہ اکٹھی ہو جاتی ہیں تو ایک دوسری سے بڑھ کر باتیں کرتی ہیں اور بسا اوقات احتیاط و توازن کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیتی ہیں' جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نوبت غیبت تک جا پہنچتی ہے' جس سے نیکی ضائع ہوتی ہے اور گناہ لازم آتا ہے-

خلفاے راشدین ان کی نہایت توقیر کرتے تھے اور ان کی نظر میں ان کا مرتبہ بڑا بلند تھا- خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ خواتین کو ان کی خدمت میں بیٹھنے اور ان سے مستفید ہونے کی تاکید فرماتے اور کہتے کہ ام حمید ایک عابدہ و زاہدہ خاتون ہیں' عورتوں کو ان کی خدمت میں حاضر ہونا چاہیے اور ان کے ارشادات غور سے سننا چاہیے-

امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا بھی یہی معمول رہا' وہ بھی خواتین کو ان کی مجلس میں جانے کی تلقین کرتے- خود بھی ان کے مکان پر جاتے اور دروازے پر کھڑے ہو کر خیر خیریت دریافت کرتے-

ان کی وفات کی صحیح تاریخ کا تو علم نہیں ہو سکا البتہ تاریخ کی بعض کتابوں سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں زندہ تھیں- بعض کتابوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دور میں بھی مدینہ منورہ میں موجود تھیں-

حضرت جمیلہ بنت مصفح

حضرت جمیلہ بنت مصفح رضی اللہ عنہا کے حالات حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں اور بعض دیگر سوانح نگاروں نے اپنی تصانیف میں بیان کیے ہیں۔

ذہین و طباع خاتون تھیں جو ادب و شعر سے بھی دلچسپی رکھتی تھیں۔ اپنے بہادروں کی تعریف کرتے ہوئے ایک شعر میں کہتی ہیں:

جب ہمارے قبیلے کے بہادر چمکتی ہوئی تلواریں ہاتھ میں پکڑ کر گھوڑوں پر سوار ہوتے اور میدان دغا میں اترتے ہیں تو بڑے بڑے شہسوار میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ایک اور شعر میں ان کی تلوار کے بارے میں کہتی ہیں۔

ان کی تلوار کی دھار سے ایسا خون نچڑ رہا ہے جو دشمن کی بہادری پر دلالت کناں ہے۔

یعنی وہ دشمن کو حقیر اور کم زور نہیں خیال کرتیں بلکہ اسے بہادر اور شجاع بتاتی ہیں، کیونکہ کم زور اور بزدل دشمن سے مقابلہ کرنا بہادر کی شان کے خلاف ہے۔

اسی طرح ان کا ایک اور شعر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ

بلاشبہ دشمن بہت زور آور اور قوانین جنگ کے ماہر تھے، لیکن ہمارے بہادروں کی تلواروں کی مسلسل ضرب نے ان کا اس طرح تعاقب کیا کہ وہ بزدلوں کی طرح پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

آگے کہتی ہیں۔

ہمارے نیزے کی انی نے ان کے جسموں میں پیوست ہو کر ان کی ہڈیاں توڑ ڈالیں اور بڑے بڑے معزز اور جری انسان دیکھتے ہی دیکھتے مٹی کا ڈھیر بن

گئے۔

جمیلہ کب دائرہ اسلام میں داخل ہوئیں؟ اس سلسلے میں کوئی قطعی بات معلوم نہیں ہو سکی' البتہ اتنا معلوم ہوا ہے کہ ظہور اسلام کے کئی سال بعد مسلمان ہوئیں۔ قبول اسلام کے بعد تنہائی کی زندگی بسر کرنے لگی تھیں۔ ان کا بہت بڑا مشغلہ اللہ کی یاد' خدمت خلق اور لوگوں کی تعلیم و تربیت تھا۔ ان سے روایت حدیث کرنے والوں میں حضرت فضیل بن مرزوق ایسے جلیل القدر حضرات شامل ہیں۔ ایک مرتبہ دوران درس میں اپنے شاگردوں سے کہا:

جب تمھارے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی بیان ہو رہے ہوں تو پوری توجہ اور کامل غور سے سنو۔ جس مجلس میں آنحضرت اور آپ کے فرامین کا تذکرہ ہوتا ہے وہ بابرکت مجلس ہے۔ ایسی بابرکت اور پاکیزہ مجالس میں بیٹھنے کے لیے ہر وقت کوشاں رہو۔ اس سے تمھارے دلوں کی سیاہی دھل جائے گی اور قلب سے غلط اثرات ختم ہو جائیں گے۔

جن لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میسر ہوئی ہے وہ بلند بخت لوگ ہیں' ان سے حصول علم کی کوشش کرنا تمھارے فرائض میں داخل ہے۔ اب یہ لوگ دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں' ان سے کسب فیض کرو' ان کی باتیں ذہن میں محفوظ کر لو اور ان کے عمل کو اپنے لیے مشعل راہ ٹھہراؤ۔

یہ لوگ اس زمانے میں پیدا ہوئے ہیں جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہترین زمانہ قرار دیا ہے۔ فتنہ و فساد سے الگ ہو کر اس دور کے لوگوں سے جس قدر بھلائی حاصل ہو سکتی ہے' حاصل کرو۔

حضرت جمیلہ بنت مصبح رضی اللہ عنہا عمدہ ترین عادات اور بہترین اطوار کی حامل تھیں۔ کسی کی کوئی تکلیف دیکھتیں تو تڑپ اٹھتیں اور اس کی مدد کے لیے ساعی ہوتیں۔ غربا و مساکین کی اعانت کرتیں اور ان کی مجلس کو پسند فرماتیں۔ امرا سے میل جول اور

ان کے ہاں جانے سے احتراز کرتیں' کسی کے کام کاج کا موقع ملتا تو اس میں راحت محسوس کرتیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے دور کو اکثر یاد کرتیں اور اس دور کی باتوں کے تذکرے میں دلچسپی لیتیں۔ اگر کسی سے کوئی غلطی ہو جاتی اور وہ اپنی غلطی کی بنا پر مستوجب سزا بھی ہوتا تو معاف کر دیتیں۔ ہر شخص سے اس کی ذہنی رسائی کے مطابق بات کرتیں۔ اپنا کام خود انجام دیتیں۔ کسی سے سوال کرنے سے احتراز کرتیں۔ ازواج مطہرات اور خاندان نبوت کی انتہائی تکریم کرتیں۔

حضرت جمیلہ رضی اللہ عنہا کی ایک قابل رشک بات یہ تھی کہ تلاوت قرآن حکیم کثرت سے کرتیں' قرآن کے مطالب پر ان کی نظر تھی اس کے بعض مقامات کو سمجھنے کے لیے جو لوگ ان کے پاس آتے وہ وضاحت سے ان کو بتاتیں کہ قرآن کے ان مقامات کا کیا مطلب ہے اور کن کن صحابہ نے ان مقامات کو کس طرح سمجھا ہے۔

ایک مرتبہ قرآن پڑھ رہی تھیں کہ سورہ کہف کے ایک مقام پر زبان روک لی' ان کی ہم نشینوں نے دیکھا کہ تھوڑی دیر کے توقف کے بعد آنکھوں میں آنسو آگئے ہیں اور فرماتی ہیں۔

> یہ دنیا اور اس کے مال و منال ناپائیدار اور ختم ہونے والے ہیں۔ ان سے جس قدر وابستگی اختیار کرو گے اسی قدر منافع اخروی سے دور اور منافع دنیوی سے قریب ہوتے جاؤ گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تمھاری روحانیت کی دنیا تاریک ہو جائے گی' حرص و طمع تم پر مسلط ہو جائیں گے اور دنیا طلبی کی خواہش تمھاری شجاعت کو ختم کر کے تمھیں بزدل بنا دے گی' تمھارے اندر جنگ و جہاد کے جو جذبات موج زن ہیں اور جن سے متصف ہونا ایک مسلمان کے لیے بہر کیف ضروری ہے' وہ رخصت ہو جائیں گے اور آرام طلبی اور سہل پسندی تمھارا شیوہ بن جائے گی۔

انھوں نے خاصی عمر پا کر انتقال کیا۔ خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت کے آخری دور میں زندہ تھیں اور جب مدینہ منورہ میں فتنہ و فساد کی آگ

بھڑکنے کے لیے پر تول رہی تھی اور سازشوں کے جال بچھائے جا رہے تھے' ان دنوں یہ خواتین کو تحمل و بردباری اور انکسار و تواضع کا درس دیتی تھیں- ان کا کہنا ہے کہ فتنے کی آگ کو ہوا دینا اپنے آپ کو ہلاکت کے حوالے کر دینے کے مترادف ہے- جو شخص غیر مساعد حالات اور ناموافق فضا میں صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے' وہ عقل سے عاری اور فہم و فراست سے بے بہرہ ہے-

حضرت ام زیاد اشجعی

حضرت ام زیاد اشجعی رضی اللہ عنہا ان چھ خواتین میں سے ایک ہیں جن کی شجاعت و بہادری کی خصوصیت کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تعریف کی گئی اور بتایا گیا کہ ان کا شمار مدینہ کی ان صحابیات میں ہوتا ہے جو میدان جنگ میں اپنی خداداد بسالت کے جوہر بھی دکھاتی ہیں اور مجاہدین کی خدمت کے فرائض بھی انجام دیتی ہیں' چنانچہ ابن اثیر نے اسد الغابہ میں اور حافظ ابن حجر نے اصابہ اور تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ خیبر کے موقعے پر ان کو پیغام بھیجا اور اپنے ہاں طلب فرمایا۔ یہ حاضر ہوئیں تو آپ نے فرمایا:

میدان خیبر میں جاؤ گی؟

عرض کیا:

یارسول اللہ ضرور حاضر ہوں گی۔

فرمایا:

وہاں کیا خدمت انجام دو گی؟

کہا:

ہمارے پاس ایسی دوائیں ہیں جن سے زخمی مجاہدین کی مرہم پٹی کریں گی' انھیں تیر اٹھا اٹھا کر دیں گی اور ان کی کمانوں پر ڈالیں گی' ان کو پیاس محسوس ہو گی تو ستو پلائیں گی' ان کے حوصلے بڑھانے کے لیے شعر پڑھیں گی اور اللہ کی راہ میں دوسری ضروری خدمات انجام دیں گی۔

یہ سن کر آنحضرت نے فرمایا:

فوراً تیار ہو جاؤ اور میدان جنگ کی طرف چل پڑو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سن کر ام زیاد اسی وقت تیار ہو گئیں اور خیبر میں پہنچ گئیں۔ جب مجاہدین کی کوششوں اور اللہ کی نصرت سے خیبر فتح ہو گیا تو آنحضرت نے ان کو بھی اسی طرح مال غنیمت سے حصہ دیا جس طرح مردوں کو دیا' کیونکہ ان کی قربانیوں اور جدوجہد کو آنحضرت نے اسی نوعیت کی قربانیاں اور کوششیں قرار دیا جس نوعیت کی مردوں کی قربانیاں تھیں۔

حضرت ام زیاد اشجعی رضی اللہ عنہا نے خیبر کے علاوہ دیگر معرکوں میں بھی حصہ لیا اور ان میں بھی اسی قسم کی خدمات انجام دیں۔ مدینہ منورہ میں یہ خاص شہرت کی حامل تھیں۔ لوگوں پر مردوں کی طرح ان کا دبدبہ تھا۔ آواز میں زور تھا' کسی سے مرعوب نہ ہوتی تھیں' خلاف شریعت بات دیکھتیں تو تڑپ اٹھتیں' سچی بات کہنے میں کسی کی رعایت نہ کرتیں۔ فرمایا کرتیں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کلمہ حق کہنے میں کسی کی رعایت کرتے یا مصلحت کو ملحوظ رکھتے تو اسلام کبھی نہ پھیل سکتا۔ عمل میں ڈھیل اور سستی انھیں سخت ناگوار تھی۔ اگر کہیں قول و فعل میں تضاد دیکھتیں تو خفگی کا اظہار کرتیں۔ پاکیزگی کردار اور صدق مقال پر بہت زور دیتیں۔ عورتیں عمل کے سلسلے میں عام طور پر ڈھیلی ہوتی ہیں' اس لیے ان کو بالخصوص یہ نکتہ سمجھانے کی کوشش کرتیں کہ اللہ کے نزدیک اصل شے عمل ہے' جتنا کوئی عمل میں اونچا ہو گا اسی قدر اللہ کے ہاں عزت و احترام کا مستحق قرار پائے گا۔۔۔ انسان کے جوہر میدان جنگ میں کھلتے ہیں اور دشمن کے مقابلے میں جا کر معلوم ہوتا ہے کہ بہادری و شجاعت کیا شے ہے اور دل کی مضبوطی کس چیز کا نام ہے۔

اسی جنگ خیبر میں شامل ہونے کے لیے ان سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواہش ظاہر کی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ مرد عورتوں سے بہت آگے ہیں' وہ میدان جنگ میں تلوار چلاتے ہیں اور اسلام کی خدمت کے لیے سخت صعوبتیں برداشت کرتے ہیں' لیکن اس خیال میں پوری طرح ایسے لوگوں کے ہم آہنگ ہونا مشکل

ہے- حقیقت یہ ہے کہ عمل و حرکت کے میدان میں عورتیں مردوں سے پیچھے نہیں ہیں' بلاشبہ مرد شمشیر بکف ہوتے ہیں اور دشمن کے مقابلے میں نکل کر شہادت کا درجہ حاصل کرتے ہیں یا غازی کہلاتے ہیں' مگر اس ضمن میں عورتیں بھی ان کے برابر کی شریک ہیں- اگر مردوں کے ہاتھ میں تلوار ہے تو یہ بات کیوں نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ اس تلوار کی دھار کو تیز کرنے کے لیے عورت کے ہاتھ حرکت میں آتے ہیں- اگر وہ تیر چلاتے ہیں اور معرکہ کارزار گرم ہوتا ہے تو انھیں یہ تیر کمان میں جوڑنے کے لیے عورت عطا کرتی ہے- مجاہد پانی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو عورت کا ہاتھ آگے بڑھ کر پانی کا پیالہ ان کے منہ میں لگاتا ہے- وہ زخمی ہوتے ہیں تو عورت ان کی مرہم پٹی کے فرائض انجام دیتی ہے- مجاہد بھوک سے دوچار ہو تو عورت اس کے لیے روٹی مہیا کرتی ہے- عورت کی اہمیت کو کم نہ سمجھو اور انھیں کم زور و ناتواں نہ خیال کرو' عورت کا وجود اپنی جگہ مستقل حیثیت رکھتا ہے- فتح اور شکست کے معاملات مردوں پر بھی اثرانداز ہوتے ہیں اور عورتوں پر بھی- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کی حیثیت کا خاص طور سے خیال رکھا ہے- اس وقت آنحضرت کے فرمان کے مطابق میدان جنگ میں آتی تھیں اور خدمت انجام دیتی تھیں-

حضرت ام زیاد ایک بے خوف اور جری صحابیہ تھیں اور بلند افکار و خیالات کی مالک- وہ طب اور جراحت میں مہارت رکھتی تھیں ور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے کئی سال بعد تک زندہ رہیں' انھوں نے جہاد کے فضائل بیان کرنا اور لوگوں کو اس کے لیے آمادہ و تیار کرنا ایک طرح سے اپنے آپ پر فرض قرار دے لیا تھا- صحابہ ان کی جرات و بسالت کی بنا پر ان کی انتہائی تکریم کرتے تھے-

یہ قبیلہ بنو اشجع سے تعلق رکھتی تھیں- صحیح مسلم اور ابوداؤد میں بیان کیا گیا ہے کہ

جنگ خیبر میں انھوں نے پانچ دوسری صحابیات کی رفاقت میں چرخہ کات کر مجاہدین کی مدد کی تھی۔

حضرت فاطمہ بنت ولید

حضرت فاطمہ بنت ولید بن مغیرہ رضی اللہ عنہا کے حالات تاریخ طبری' طبقات ابن سعد' سیرت ابن ہشام' ابن اثیر کی اسد الغابہ اور حافظ ابن حجر کی الاصابہ میں مذکور ہیں- یہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی بہن تھیں جو عساکر اسلام کے مشہور سپہ سالار تھے اور جن کو بہادری اور جنگی صلاحیتوں کی بنا پر رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سیف من سیوف اللہ کا خطاب عطا فرمایا تھا-

ابتدا میں فاطمہ بنت ولید اسلام اور مسلمانوں کی شدید مخالف تھیں اور مسلمانوں پر کفار نے جو حملے کیے ان میں وہ باقاعدہ شریک ہوتی تھیں اور اپنے بھائی خالد کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف جنگ کرتی تھیں- غزوہ احد یعنی ۳ ہجری میں بھی انھوں نے شرکت کی اور مسلمانوں کے مقابلے میں کفار کا ساتھ دیا--- ۸ ہجری میں فتح مکہ کے موقعے پر حلقہ بگوش اسلام ہوئیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کا شرف حاصل کیا- قبول اسلام کے بعد ان کی دنیا بالکل بدل گئی- اسلام سے قبل جس زور کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کرتی تھیں' مسلمان ہونے کے بعد اسی زور اور شدت کے ساتھ ان کی حمایت اور مخالفین اسلام کی مخالفت کرنے لگیں- تبلیغ اسلام کے سلسلے میں اکثر مردوں سے بھی آگے نکل جاتیں- مدینہ منورہ کے قرب و نواح کی بستیوں اور مختلف قبائل میں جا کر لوگوں کو اسلام سے روشناس کراتیں اور اس میں شامل ہونے کی دعوت دیتیں- عالی حوصلہ اور جرات مند خاتون تھیں- کسی قسم کے خوف اور خطرے کا احساس نہ کرتیں-

فاطمہ بنت ولید فصیح البیان اور بلیغ اللسان خاتون تھیں- میدان جنگ میں فوجیوں کو دشمن کے مقابلے میں ابھارنے اور ڈٹ جانے کے لیے اس قسم کے شعر

پڑھتیں کہ لوگ تعجب کا اظہار کرتے- بسا اوقات دشمن انھیں جنگ میں دیکھ کر ہی پریشان ہو جاتے کیونکہ ان کے اشعار ان کے لیے شمشیر برہنہ سے کم نہ تھے- گفتار میں بڑی تیز اور مستعد تھیں-

عقل و فراست اور معاملہ فہمی میں بھی مشہور تھیں- ان کی شادی ایک شخص حارث بن ہشام کے ساتھ ہوئی تھی- فتح شام کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ شام کے علاقے میں چلی گئی تھیں- کس درجہ دور اندیش اور اصابت فکر و رائے کی مالک تھیں؟ اس سلسلے میں اتنا جان لینا کافی ہے کہ بعض جلیل القدر صحابہ اہم امور میں ان سے مشورہ کے طالب ہوتے اور پھر ان کی رائے اور مشورے پر عمل کرتے- خود ان کے بھائی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اکثر امور مہمہ میں ان سے مشورہ لیتے- چنانچہ تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جب امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید کو عساکر اسلام کی سپہ سالاری کے منصب سے معزول کر دیا تو وہ اپنی اس بہن حضرت فاطمہ کے پاس گئے اور ان سے پوچھا کہ اب انھیں کیا کرنا چاہیے؟ انھوں نے جواب دیا:

> امیر المومنین آپ کو معزول کر چکے ہیں اب وہ ہرگز یہ نہیں چاہیں گے کہ آپ کو دوبارہ اس منصب پر فائز کیا جائے اگر آپ نے ان کے حکم کی تعمیل میں تامل کیا تو وہ آپ پر عائد کردہ الزامات میں آپ کو مجرم ثابت کریں گے اور آپ ان کی جرح و تعدیل کے پیمانے پر پورے نہ اترے تو آپ سے جبراً یہ منصب چھین لیں گے اور آپ کو خطاوار ثابت کریں گے- اس سے مسلمانوں میں اختلاف کی راہیں کھلیں گی اور انتشار کے لیے فضا ہموار ہو گی- میں یہ مشورہ نہیں دے سکتی کہ آپ کی ذات مسلمانوں میں اختلاف و انتشار کا باعث بنے-

حضرت خالد رضی اللہ عنہ بہن کے اس مخلصانہ مشورے پر بہت خوش ہوئے اور ان کا سر چوم لیا اور بولے:

فاطمہ واللہ تم نے سچ کہا۔

اس کے بعد خاموشی سے اپنے منصب سے الگ ہو گئے اور اپنے آپ کو الزامات کی گرفت میں آنے سے بچالیا۔

حضرت فاطمہ بنت ولید رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث بھی روایت کیں جو کتب حدیث میں منقول ہیں اور پھر خود ان سے بھی بعض حضرات نے آنحضرت کی احادیث کا سماع کیا جو آگے اپنے شاگردوں سے بیان کیں۔ ان کے شاگردوں میں ان کے پوتے ابو بکر بن عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام بھی شامل ہیں۔ حدیث و سنت کے بیان کا انھیں بہت شوق تھا اور وہ اپنے شاگردوں کو آنحضرت کے فرامین واقوال تفصیل سے بتاتی تھیں۔

فاطمہ ایک شجاع خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس لیے بنیادی طور پر اسی موضوع سے ان کو زیادہ دلچسپی تھی۔ چنانچہ مختلف غزوات کے واقعات ذوق ورغبت سے بیان کرتیں اور اس کی تفصیلات ایک تسلسل کے ساتھ لوگوں کو بتاتیں۔

عورتوں کو ان صحابیات کے حالات بھی بتاتیں جنھوں نے جنگ بدر، جنگ احد، جنگ خیبر یا دوسری ان جنگوں میں شرکت کی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لڑی گئیں۔ ان کے واقعات سنانے کے بعد انھیں جہاد کی تلقین کرتیں اور کہتیں کہ تمھارے اسلاف (مردوں اور عورتوں) نے اسلام کی نشرواشاعت کے لیے جنگ و جہاد میں اتنا حصہ لیا کہ اس میں اپنی تمام کوششیں وقف کر دیں۔ بتاؤ اس کے مقابلے میں تمھاری کیا حالت ہے؟ تم بھی اس میدان میں اپنی جرات کے جوہر دکھاؤ اور اپنے بچوں کو بھی اسی قسم کی تربیت دو۔

ان کی وفات کب ہوئی اور کس سال ہوئی؟ اس کا پتا نہیں چل سکا۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ چونکہ یہ مدینہ منورہ سے شام کے علاقے میں تشریف لے گئی تھیں، اس لیے وہیں رہیں اور اسی علاقے میں خاصی عمر پا کر انتقال کیا۔

حضرت فاطمہ بنت عتبہ

متعدد صحابیات فاطمہ کے نام سے موسوم ہیں' جن میں سے بعض کے حالات بیان ہو چکے ہیں اور بعض کے آئندہ بیان ہوں گے۔ حضرت فاطمہ بنت عتبہ بن ربیعہ کا شمار بھی انہی خوش بخت صحابیات میں ہوتا ہے رضی اللہ عنھن۔

فاطمہ بنت عتبہ قبیلہ قریش سے تعلق رکھتی تھیں اور مکے کے مشہور مشرک رئیس عتبہ کی بیٹی تھیں۔ علامہ ابن عبدالبر نے الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کا پورا خاندان اور دوسرے تمام لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے شدید مخالف تھے اور جو تکلیف ان کو پہنچا سکتے تھے پہنچانے سے دریغ نہ کرتے تھے۔ خود حضرت فاطمہ مسلمانوں کے خلاف تھیں اور جو عورتیں اسلام قبول کر چکی تھیں' ان کی یہ مخالفت کرتی تھیں۔ ایک روایت کے مطابق یہ فتح مکہ کے زمانے میں مسلمان ہوئیں۔ دوسری روایت میں بتایا گیا ہے کہ ایک روز کہیں سے گزر رہی تھیں کہ کانوں میں قرآن کی آواز پڑی۔ وہیں رک گئیں۔ ابھی قاری نے چند آیات کی تلاوت کی تھی کہ اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ نہایت سمجھ دار خاتون تھیں۔ شعرائے جاہلیت کے کلام پر نظر رکھتی تھیں۔ جب انھوں نے قرآن کی آیات سنیں تو دل نے فیصلہ کیا کہ یہ انسانی کلام نہیں ہو سکتا' کوئی انسان اگرچہ کتنا بھی درجہ فصاحت پر فائز ہو' اس کا اس قسم کے کلام پر قادر ہونا ممکن نہیں۔ یقیناً یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اس فرمان میں کہ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے' صادق ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں' آپ سے بیعت کی سعادت حاصل کی اور کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو گئیں۔

جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ ولید بن عتبہ کی بیٹی فاطمہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

کے دین میں داخل ہو گئی ہیں اور انھوں نے قریش کے آباواجداد کے مذہب کو ترک کر دیا ہے تو مخالفین اسلام ان کی جان کے دشمن ہو گئے۔ باپ اور بھائیوں نے ان کے قبول اسلام کو اپنی توہین قرار دیا اور اعزہ واقارب نے ان کے اس اقدام کو اپنی تذلیل پر محمول کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس بے بس خاتون کو سخت سزائیں دینا شروع کر دی گئیں۔ پہلے تو ایک تنگ سے کمرے میں بند کیا گیا اور کھانے پینے کو کوئی چیز نہ دی گئی۔ اب بھی باز نہ آئیں اور دین محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ترک نہ کیا تو مار پیٹ کا آغاز کیا گیا۔ مار مار کے بے ہوش کر دیا جاتا، لیکن یہ برابر اشهد ان لا اله الا الله کا ورد کرتی رہتیں۔ پھر لوہے کی زنجیروں میں جکڑا گیا۔ یہ سزا بھی مؤثر ثابت نہ ہوئی تو سخت دھوپ میں تپتے ہوئے پتھروں پر لٹایا گیا۔ اس سے وہ بے ہوش ہو جاتیں، شدید تکلیف محسوس کرتیں مگر کلمہ شہادت پڑھنے سے باز نہ آتیں۔

ایک مرتبہ لوہے کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی گرم پتھروں پر لیٹی ہوئی تھیں کہ ان کی ماں ان کے پاس آئیں اور کہا۔

بیٹی میں تمھاری طرف سے سخت پریشان ہوں، تم نے محمد (علیہ الف الف تحیۃ وسلام) کا دین قبول کر کے اپنے آپ کو بھی مصیبت میں ڈال لیا ہے، ماں باپ کو بھی پریشان کر دیا ہے اور اپنے رشتے داروں کے لیے بھی ذلت کا سامان فراہم کر دیا ہے۔ تم اپنے خاندان کی عزت کا خیال کرو اور اس دین کو ترک کر دو، تمھاری تکلیف سے ہم انتہائی کرب میں مبتلا ہیں۔ اس دین میں آخر کیا پڑا ہے، تم کیوں اپنے آباواجداد کی رسوائی کا باعث بنی ہوئی ہو۔

بیٹی نے جواب دیا۔

مجھے معلوم ہے آپ کی ماں مامتا جوش مار رہی ہے اور آپ میری تکلیف سے بے چین ہیں، مگر آپ کو معلوم ہے یہ دنیا ختم ہونے والی ہے، تکلیف کا یہ دور عارضی ہے، حق و باطل کے درمیان ایک ایسا معرکہ کارزار گرم ہونے والا ہے جو جلد ہی فیصلہ کر دے گا کہ کون حق پر ہے اور کون باطل کی تبلیغ کے

لیے کوشاں ہے' یہ دین جو میں نے قبول کیا ہے' سراسر حق ہے اور جس مذہب کے تم پیرو ہو وہ بالکل باطل ہے۔ اللہ کے نزدیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں' ان کا مذہب حق ہے اور ان کی اطاعت کرنے والے اللہ کے محبوب بندے ہیں۔ میں نے یہ مذہب پورے غور و فکر کے بعد قبول کیا ہے' جس چیز کو صحیح سمجھتی ہوں اسے کبھی اور کسی صورت میں ترک نہیں کر سکتی۔ تم مجھے اس مذہب کے ترک کرنے کی تلقین کرتی ہو۔ حالانکہ میری خواہش یہ ہے کہ تم اپنے جھوٹے معبودوں کی اطاعت سے باز آ جاؤ اور اس دین میں داخل ہو جاؤ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں اور جس کے احکام صحیح ہیں۔

نہایت دھیمے مزاج کی خاتون تھیں۔ میل جول اور عادات و خصائل میں اخلاص نمایاں تھا۔ کسی سے عداوت نہ رکھتی تھیں۔ ان کے تعلق و عدم تعلق کی بنا محض اللہ کی ذات تھی۔ مسلمانوں کی دل کھول کر امداد کرتیں اور غیر مسلم سے کوئی رابطہ نہ رکھتیں۔ مسلمان خواتین کا اکثر ان کے ہاں آنا جانا تھا۔ جو شخص جتنا اسلام سے دور ہوتا اتنا ہی اس سے بعد رکھتیں اور جس قدر کوئی اسلام اور مسلمانوں سے محبت کا دم بھرتا اسی قدر اس سے الفت کا اظہار فرماتیں۔

ان کی وفات خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ہوئی۔

حضرت اروی بنت حارث

یہ خاندان بنو ہاشم کی رفیع المرتبت خاتون اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چچازاد بہن تھیں۔ فصاحت وبلاغت میں یگانہ روزگار تھیں اور ادبیہ وشاعرہ تھیں۔ ان کے حالات طیفور کی بلاغات النساء اور ابن عبدربہ کی العقد الفرید میں مرقوم ہیں۔ لیکن یہ حالات مختصر ہیں اور صرف وہی ہیں جن کا تعلق ان کی فصاحت وبلاغت اور ادب و شعر سے ہے' نیز ان کے ان واقعات کا تذکرہ کیا گیا ہے جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں ان کو پیش آئے۔ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئیں تو نہایت سختی سے پیش آئیں۔ اس وقت بہت بوڑھی ہو چکی تھیں اور ضعف و نقاہت نے پوری طرح اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ کمر جھک گئی تھی' سر ہلتا تھا اور چہرے پر جھریوں نے قبضہ جما لیا تھا۔ لیکن آواز گرج دار اور بارعب تھی۔ رگوں میں خون بنی ہاشم دوڑ رہا تھا' جس نے ڈر اور خوف کو دل سے نکال دیا تھا۔ لاٹھی کے سہارے چلتے ہوئے حضرت معاویہ کے مکان پر گئیں۔ دروازے پر دستک دی' حضرت معاویہ باہر آئے' اندر لے جا کر احترام سے بٹھایا اور عرض کیا۔

پھوپھی! مجھے آپ کی تشریف آوری سے بہت خوشی ہوئی۔ آپ نے یہاں آکر مجھے شکریے کا موقع دیا ہے۔ آپ نے آج مجھ پر جو احسان فرمایا ہے' اس پر اظہار تشکر کے لیے اپنے پاس الفاظ کی قلت محسوس کرتا ہوں۔ میرے متعلق کوئی حکم ہو تو ارشاد فرمایئے۔

حضرت معاویہ نے بات ختم کی تو تیزی سے بولیں:

بھتیجے تمھاری اب کیا حالت ہو گئی ہے۔ تم اپنے آپ کو کس دنیا کا انسان سمجھنے لگے ہو۔ تمھیں معلوم ہے تم وہی ستو پینے والے' اونٹ پر سوار ہونے

والے اور عرب کے تپتے ہوئے صحرا میں سورج کی تیز دھوپ میں سفر کرنے والے ایک عرب ہو- تم اپنے گزشتہ دور کو بھول گئے ہو' امارت و خلافت نے تمھاری دنیا بدل ڈالی ہے- اللہ نے تم پر جو احسان کیا ہے اس کی ناقدری پر تلے ہوئے ہو' تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف حاصل کیا اور آپ کی رفاقت میں رہنے کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے' لیکن ان کے قوانین و احکام کو نظروں سے اوجھل کر دیا ہے- تم کو اللہ نے اقتدار بخشا تھا کہ لوگوں کی خدمت کرو' کم زوروں کا خیال رکھو' ضرورت مندوں کو بے نیاز کر دو' محتاجوں کو غنی کر دو' بے کاروں کو کاروبار مہیا کرو' اللہ کے ارشادات کی خود بھی پابندی کرو اور اپنے اہل و عیال اور خاندان کو بھی پابند رہنے کا حکم دو' متکبروں کا تکبر ختم کرو' مغروروں کے غرور کو مٹی میں ملا دو- اپنی اور اپنے خاندان کی ضروریات پر دوسروں کی ضروریات کو ترجیح دو' کسی کو تکلیف نہ پہنچاؤ' نیکی کو پھیلاؤ اور برائی کا خاتمہ کرو- مگر تم نے ان تمام چیزوں کو پس پشت ڈال دیا ہے- تمھاری حکومت میں تمھارے حواری اور تمھاری ہاں میں ہاں ملانے والے من مانی کارروائیاں کر رہے ہیں اور تمھارے اعزہ و اقربا نے لوگوں کو مصیبت میں ڈال رکھا ہے' تم ظلم و ستم کے تمام واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو اور خاموش ہو- آخر یہ کیوں ہے؟

معاویہ یاد رکھو! یہ حکومت ہمیشہ رہنے والی نہیں اور یہ دولت ناقابل اعتماد ہے- ایسا نہ ہو کہ خود یہی حکومت و فرماں روائی اور مال و دولت کی یہی کثرت تمھارے لیے مصیبت کا باعث بن جائے اور تمھیں اپنا دفاع کرنا آسان نہ رہے- یہ حکومت اللہ کی امانت ہے اور اللہ اسے ایسے لوگوں کے سپرد کرے گا جو اس کے اہل ہوں اور اس کے دین کی تبلیغ و اشاعت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیں اور ان کا مقصد وحید' اللہ کے کلمہ کو بلند کرنا ہو' تمھیں یہ بات

یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ کے دین اور اس کے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہمیشہ غالب رہے گا اور اس کے مدد گاروں سے کبھی دنیا خالی نہ ہو گی۔اس کا دین ہی منصور ہو گا' اگرچہ اس کے مخالف کتنا ہی برا سمجھیں۔ ہم اہل بیت ہیں اور ہمارا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ہم نے اللہ کے دین کی ہر موقعے پر مدد کی ہے' تم عام لوگوں کی طرح کے ایک ادنیٰ آدمی تھے' ہماری وجہ سے تمھیں حکومت و اقتدار کی یہ مسند نصیب ہوئی' آج تم ہو کہ ہم لوگوں کی مخالفت پر اتر آئے ہو۔ جو حکمران کم زور کا خیال نہیں رکھتا' مظلوم کی مدد کو نہیں پہنچتا اور خوش حالی کے مواقع دوسروں کو نہیں دیتا بلکہ خود ہی دولت و ثروت کو سمیٹنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھاتا ہے' اس کا اقتدار عارضی ہے اور اس کی امارت و خلافت کی مدت مختصر ہے۔ دوسرے کے حقوق غصب کرنا سب سے بڑی برائی ہے۔ اگر تمھارے دل میں اللہ کا ذرا بھی خوف باقی ہے تو سیدھی راہ پر آجاؤ اور سلطنت کے تمام لوگوں کو ایک سا درجہ دو' کسی کو کم زور اور کسی کو اونچا سمجھنا ناقابل عفو جرم ہے۔

جب یہ باتیں ہو رہی تھیں' حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بھی اس وقت موجود تھے۔ حضرت اروی بنت حارث رضی اللہ عنہا کی یہ تقریر انھیں ناگوار گزری اور کہا:

بڑھیا زبان بند کرو اور نظریں نیچی کرو۔

حضرت اروی رضی اللہ عنہا اس تلخ کلامی کو برداشت نہ کر سکیں اور غصے سے عرب کے مروجہ محاورے کو استعمال کرتی ہوئی بولیں:

تمہاری ماں تمھیں گم پائے' تم کون ہو؟

کہا: میں عمرو بن عاص ہوں۔

بولیں: تم مجھ سے مخاطب ہونے کی جرات کرتے ہو' تم معمولی حیثیت کے آدمی تھے اور تم میں کوئی نمایاں خوبی نہ تھی' نہ تم قریش میں معزز تھے' نہ

تمھیں اور جگہ کہیں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا' نہ تم سخی تھے اور نہ بہادر و جری تھے- تمھیں کہیں گورنر (عامل) بنادیا گیا' تو آپے سے باہر ہو گئے ہو اور معززین سے اس انداز سے بات کرتے ہو' میں تمھارے خاندان اور حسب و نسب کو اچھی طرح جانتی ہوں- تم اس قابل نہیں کہ مجھ سے مخاطب ہونے کی جرات کرو-

مروان بن حکم بھی اسی مجلس میں بیٹھے تھے- انھوں نے سختی سے کہا:

بڑھیا تم اب عمر کی اس منزل میں پہنچ گئی ہو کہ تمھاری عقل رخت سفر باندھ گئی ہے' تم اتنے بڑے لوگوں کو آنکھیں دکھاتی ہو' خاموش ہو جاؤ' تم زندگی کے اس موڑ پر ہو کہ تم میں خرد و دانش باقی نہیں رہی- لہٰذا تمھاری شہادت بھی ناقابل قبول ہے-

بولیں: بیٹا میں تم سے اور تمھارے خاندان سے خوب آگاہ ہوں- میں نے تمھارے باپ حکم کو دیکھا ہے وہ جرأت و مردانگی کے کسی زاویہ میں بھی پورا نہیں اترتا تھا- کوئی شخص اس سے بات کرنا بھی گوارا نہ کرتا تھا- اب تم اقتدار میں ہو تو بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہے ہو' ہم اس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں' جن کے نزدیک تمھیں کوئی وقعت حاصل نہیں اور میں تمھیں لائق التفات نہیں سمجھتی-

اس کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئیں اور کہا:

معاویہ! ان لوگوں نے جو میری بے عزتی کی ہے' اس کے ذمہ دار تم ہو' تمھیں معلوم ہے جنگ احد کے وقت مسلمانوں میں آثار ہزیمت پیدا ہوئے تو تمھاری ماں نے وہ شعر کہے تھے جن میں مخالفین اسلام کی فتح اور مسلمانوں کی شکست پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ آج ہم نے جنگ بدر کا انتقام لے لیا ہے- ہم اتنے بہادر اور تیغ زن ہیں کہ مخالف ہم سے مقابلے کی تاب نہیں لا سکتا- جو بھی ہمارے سامنے آئے گا شکست سے دوچار ہو گا-

اس طرح اس نے متعدد اشعار میں مسلمانوں کو ہدف طعن ٹھہرایا تھا اور اپنی شجاعت کے کارنامے گنائے تھے اور پھر تم کو یاد ہے کہ میں نے اس کو جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ تمھاری یہ جیت عارضی ہے۔ آثار بتارہے ہیں کہ کفر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا اور اسلام کا جھنڈا بلند ہو گا' جس طرح تمھیں بدر کے میدان میں ذلت آمیز شکست ہوئی تھی' اسی طرح دوسرے معرکوں میں بھی تمھیں ہزیمت و نکبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہمارے بہادر تمھیں ختم کر کے رکھ دیں گے اور ہماری تلواریں تمھارے سروں کو تن سے جدا کرنے میں تاخیر سے کام نہیں لیں گی۔

اس موقعے پر حضرت اروی بنت حارث رضی اللہ عنہا نے ہند کے اشعار بھی پڑھ کر سنائے جو اس نے جنگ احد کے دن مسرت آمیز لہجے اور فخریہ انداز میں پڑھے تھے۔ وہ شعر بھی پڑھے جو اس کے جواب میں خود انھوں نے پڑھے تھے۔

اب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ 'عمرو بن عاص اور مروان بن حکم کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا تم کیسے آدمی ہو' تم نے ایک ناخوش گوار بحث کا آغاز کر کے حضرت اروی رضی اللہ عنہا کو بات کہنے کا موقع دیا اور ان کی زبان سے مجھے ایسی باتیں کہلوائیں جو میں سننا نہیں چاہتا تھا۔

بعد ازاں اروی سے کہا پھوپھی فرمایئے کس طرح تشریف آوری ہوئی؟ آپ کا جو مقصد ہو وہ بلا تکلف بیان کیجیے۔ انھوں نے آنے کا مقصد بتایا اور بات ختم ہو گئی۔

حضرت معاویہ نے کہا: بنو ہاشم کی عورتیں مردوں سے کہیں زیادہ فصیح ہیں اور بلاغت ان کی گھٹی میں رچی ہوئی ہے۔ ان کی زبان میں روانی اور کلام میں جوش ہے' کوئی شخص اگرچہ کتنا بھی فصیح ہو' ان سے تاب مکالمت نہیں رکھتا۔ اس خاندان میں شجاعت و جرات بھی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ نبوت کے لیے بھی اللہ نے اسی خاندان کو منتخب فرمایا' جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس میں فصاحت و بلاغت کے جو جوہر پائے جاتے ہیں وہ عرب کے کسی خاندان میں نہیں پائے جاتے۔ ان سے گفتگو کے لیے

ضروری ہے کہ انسان خاندانی کمزوریوں سے بھی پاک ہو اور ادب و زبان کے مختلف پہلوؤں پر بھی اس کا غلبہ ہو۔ان کی عورتوں سے اندازہ کیجیے' ان کے مرد کتنے جری اور فصیح و بلیغ ہوں گے۔ میں اپنے آپ کو قادر الکلام سمجھتا ہوں اور ہر شخص کو پورا پورا جواب دے سکتا ہوں' لیکن بنو ہاشم کی اس معمر خاتون کے سامنے خود کو بے بس پاتا ہوں۔اس کی زبان کی کاٹ تلوار سے تیز ہے اور اس کی باتیں صداقت پر مبنی ہیں۔

جب وہ جانے لگیں تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے چھ ہزار دینار ان کی خدمت میں پیش کیے اور کہا میں آپ کا معمولی خادم ہوں' آپ کی نیک دعاؤں کا متمنی ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ آپ مجھے یاد رکھیں گی۔ آپ جس خاندان سے تعلق رکھتی ہیں' وہ معزز خاندان ہے اور اللہ نے اسے بہت سے اعزاز بخشے ہیں۔حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ انھیں دور تک چھوڑنے گئے اور اپنے عجز و انکسار اور ان کے علو مرتبت کا اظہار کیا۔

حضرت ام العلاء انصاریہ

حضرت ام العلاء رضی اللہ عنہا مدینہ کے انصار سے تعلق رکھتی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکے سے مدینے ہجرت کر کے تشریف لائے تو یہ اسلام سے نا آشنا تھیں۔ آنحضرت اور دیگر صحابہ کی آمد اور اہل مدینہ کے اسلام قبول کرنے کے بعد فضا بالکل بدل گئی۔ مدینہ کے گلی کوچوں میں اسلام کے نعرے بلند ہونے لگے اور باشندگان مدینہ آنحضرت کی خدمت میں جوق در جوق حاضر ہونے لگے تو حضرت ام العلاء کے کانوں میں بھی اس کی بھنک پڑی۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ ہمارے شہر میں ایسے لوگ آئے ہیں جنھوں نے ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی ہے تو یہ بھی آنحضرت الی دای کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ آنحضرت کی زیارت کے بعد یہ ان خواتین سے ملیں جو مکہ سے ہجرت کر کے آئی تھیں۔ قدرتی طور پر عورتوں کے دل میں عورتوں کے بارے میں ہم دردی کے جذبات موج زن ہوتے ہیں اور وہ مظلوم عورتوں کو دیکھ کر تڑپ اٹھتی ہیں۔ حضرت ام العلاء رضی اللہ عنہا بھی چونکہ ایک عورت کے جذبات رکھتی تھیں' اس لیے وہ ان مہاجر خواتین کے عمل اور ان کی اولوالعزمی اور استقلال سے بہت متاثر ہوئیں۔

ان میں سے ایک مہاجر خاتون کے پاس یہ خاصی دیر ٹھہریں اور ان سے مختلف مسائل پر گفتگو کی اور تعجب سے پوچھا:

آپ کو آپ کے شہر سے نکال دیا گیا ہے؟

انھوں نے کہا: جی ہاں ہمیں نکال دیا گیا ہے۔

کہا: آپ نے کون سا ایسا جرم کیا ہے جس کی پاداش میں آپ کو یہ صعوبتیں اٹھانا پڑیں اور گھر سے بے گھر اور ملک سے بے ملک ہونا پڑا؟

جواب دیا: ہمارا جرم صرف یہ ہے کہ ہم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کی' اللہ کی توحید کا اقرار کیا' غیر اللہ کے سامنے سر جھکانے سے انکار کیا- جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو ہم پتھر کے بنے ہوئے بتوں کی پرستش کرتے تھے' حرام چیزوں کو حلال قرار دیتے تھے اور ایسے امور کے مرتکب ہوتے تھے جن سے اللہ نے اپنے بندوں کو روک رکھا ہے- آنحضرت نے ہمیں اس سے روکا' انھوں نے ہمیں نیک کام کرنے کی تلقین کی اور برے کاموں سے منع فرمایا- انھوں نے ہمیں تعلیم دی کہ ایک اللہ کی عبادت کرو' چوری نہ کرو' غصب و نہب کی عادتیں ترک کر دو' بڑے کو معزز سمجھو اور چھوٹے سے شفقت و مہربانی کا برتاؤ کرو' غریب و نادار کی امداد کرو' کسی کو تکلیف نہ پہنچاؤ' تمھارے کسی عمل سے کسی کو اذیت نہیں پہنچنی چاہیے- امانت میں خیانت نہ کرو' ناحق کسی کو قتل نہ کرو' منکرات و فواحش کا ارتکاب نہ کرو' ہمسائے کی تکریم کرو' بھوکے کو کھانا کھلاؤ' ہر انسان سے بہتر سلوک روا رکھو' ظلم کی آواز کو دبانے کی کوشش کرو' کسی کی حق تلفی نہ کرو' کسی پر ناروا رعب نہ ڈالو' جابر اور ظالم کی مخالفت کرو' وغیرہ وغیرہ-

بس ہمارا جرم یہی تھا کہ ہمارے رسول نے جو ہم ہی میں سے ہیں' ہمیں اس قسم کی اچھی باتوں کا حکم دیا اور غلط باتوں سے روکا اور ہم نے ان کی بات کو صحیح سمجھ کر قبول کر لیا- اتنی سی بات تھی جس کی پاداش میں ہمیں سخت سے سخت تکلیفیں دی گئیں اور آخر ہمارا مال و متاع اپنے قبضے میں کر کے ہمیں اپنے شہر سے نکال دیا گیا-

اس نے کہا: بہن! یہ تو بالکل سیدھی اور صاف باتیں ہیں' ان پر تو ہر شخص کو عمل کرنا چاہیے' ان باتوں کو نہ ماننا اور ان کی تعلیم دینے والے اور ان پر عمل کرنے والوں کو تکلیفیں پہنچانا تو بہت بری بات ہے- ایسی بہتر تعلیم دینے

والے کا تو شکر گزار ہونا چاہیے' نہ یہ کہ الٹا اسے مورد عتاب قرار دیا جائے۔

یہ باتیں کرنے کے بعد مدینہ کی وہ خاتون واپس اپنے گھر چلی گئیں۔ اب انھوں نے خود اس مسئلے پر غور کیا' وہ جیسے جیسے اس مسئلے کو موضوع فکر ٹھہراتی جاتی تھیں' اسلام کی حقانیت کی قائل ہوتی جاتی تھیں۔ کئی دن اس حالت میں گزر گئے۔ آخر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ آپ سے چند باتیں دریافت کیں اور مسلمان ہو گئیں۔ آپ سے بیعت کا شرف بھی حاصل کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت حدیث کی سعادت سے بھی بہرہ ور ہوئیں۔ انھوں نے آنحضرت سے چھے احادیث روایت کیں' جو مختلف کتابوں میں منقول ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نہایت ادب واحترام سے حاضر ہوتی تھیں' جب تک آپ کی مجلس میں رہتیں خاموشی اختیار کیے رکھتیں۔ آپ کی مجلس میں کوئی زیادہ باتیں کرتا یا زیادہ سوالات پوچھتا تو ناگواری محسوس کرتیں۔

انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بعض غزوات میں بھی شرکت کی' جن میں غزوہ خیبر کا ذکر رجال وسیرت کی کتابوں میں مذکور ہے' مثلاً طبقات ابن سعد' تہذیب التہذیب (ابن حجر) اور الاستیعاب (ابن عبدالبر) میں مرقوم ہے کہ حضرت ام العلاء رضی اللہ عنہا نے آنحضرت کے ساتھ جنگ خیبر میں شرکت کی' اس جنگ میں متعدد صحابیات شریک ہوئی تھیں' جنھوں نے کئی قسم کی خدمات انجام دی تھیں۔ جن صحابیات نے جنگ خیبر میں شرکت کی اور حصہ لیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی بہت قدر کرتے تھے۔ حضرت ام العلاء کا شمار بھی انھی خوش بخت خواتین کی فہرست میں ہوتا ہے۔

ان سے بعض مشہور صحابہ اور تابعین نے روایت حدیث کی جن میں خارجہ بن زید' عبدالملک بن عمیر اور حزام بن حکیم انصاری ایسے جلیل القدر حضرات شامل ہیں۔

ان کی وفات کی صحیح تاریخ کا تعین کرنا تو مشکل ہے' البتہ اتنا معلوم ہے کہ حضرت

عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کے آخری دور میں زندہ تھیں۔ مسلمانوں میں جو اختلافات ابھر آئے تھے اور حالات کی رفتار نے جو رخ اختیار کر لیا تھا اس پر بڑی پریشانی کا اظہار کرتیں اور لوگوں کو فتنہ و فساد سے دامن کشاں رہنے کی تلقین فرماتیں۔

حضرت ام طفیل

ام طفیل رضی اللہ عنہا نہایت بلند سیرت، بلند کردار اور پاکیزہ اخلاق خاتون تھیں۔ مشہور شاعر امراء القیس کے قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں اور ان کے اقربا میں سے تھیں۔ ان کے خاندان کے لوگوں کا شمار اس دور کے بڑے تاجروں میں ہوتا تھا۔ یہ لوگ اپنے کاروبار سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ مکہ سے شام کو جو قافلے تجارت کی غرض سے جاتے عام طور پر ان کے ساتھ ہوتے۔ ایک مرتبہ اس خاندان کے ایک رکن جن کا نام عمیر تھا، ایک تجارتی قافلے کے ہمراہ جا رہے تھے کہ ان کا گزر ایک جنگل سے ہوا۔ جنگل میں قافلہ کو رہزنوں نے گھیر لیا۔ رہزنوں نے قافلے کے ایک ایک شخص کو لوٹنا شروع کیا۔ وہ لوٹتے لوٹتے عمیر کے پاس بھی آئے تو انھوں نے کہا میں شاعر ہوں اور امراء القیس کے اعزہ میں سے ہوں۔ ڈاکوؤں نے پہلے تو ان کی بات کی پروانہ کی اور ان کے مال و سامان پر قبضہ کر لیا، مگر بعد میں ایک ڈاکو ان کے پاس آیا جو امراء القیس کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے تفصیلات پوچھیں تو لوٹا ہوا مال واپس کر دیا اور ساتھ ہی کہا۔

عرب کا ہر شخص شاعر ہے، فرق صرف یہ ہے کہ کوئی اونچے پائے کا ہے اور کوئی کم درجے کا۔ بلا شبہ امراء القیس بہت بڑا شاعر ہے اور پورے عرب میں اسے عزت حاصل ہے، لیکن تمھیں محض اس کے نام پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے تھا، جرات کا ثبوت دے کر ہمارا مقابلہ کرنا چاہیے تھا۔ خود مقابلے پر نہ آنا اور دوسرے کا نام لے کر اپنا بچاؤ کرنا تمھارے خاندان کی روایات کے خلاف ہے۔

عمیر نے جواب دیا:

تم نے کون سا بہادری کا کام کیا ہے، نہتے اور غیر مسلح لوگوں کا محاصرہ کر کے

انھیں لوٹ لینا اور یہ خیال نہ کرنا کہ اس لوٹ کے بعد ان کے اہل و عیال کا کیا بنے گا' انتہا درجے کی سنگ دلی اور جبن کا مظاہرہ ہے۔ اگر تمھیں دولت مند بننے کی خواہش ہے تو لوگوں کا حق مار کر دولت مند نہیں بننا چاہیے بلکہ طویل و عریض صحراؤں کا سفر کر کے اور روپے خرچ کر کے خود کمانے اور محنت کرنے کی عادت ڈالنا چاہیے' تمھیں معلوم ہے اس لوٹ کے نتیجے میں کتنے خاندانوں کو نقصان پہنچا ہے اور کتنے لوگوں کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ان پریشان حال لوگوں میں عورتیں' بچے' بوڑھے اور بے سہارا لوگ بھی شامل ہیں۔

ڈاکو عمیر کی اس گفتگو سے بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے اس کا مال واپس کر دینا چاہا مگر اس نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا اس پورے گروہ میں صرف میری ہی حق تلفی نہیں ہوئی ہے تمام قافلہ لوٹا گیا ہے۔ اگر مال واپس کرنا ہے تو سب کا کرو' ورنہ میں اکیلا اپنا مال واپس نہیں لوں گا' آخر ڈاکوؤں نے سب کا مال واپس کر دیا۔

ام طفیل کے قبول اسلام کا واقعہ بڑا دلچسپ ہے۔ ان کے قبیلے کے کچھ لوگ مسلمان ہو گئے تھے' لیکن خود انھیں اسلام سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ یہ شاعرہ بھی تھیں۔ ایک مرتبہ ان کے خاندان کی چند خواتین آپس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام اور اسلام کے موضوع کے متعلق گفتگو کر رہی تھیں' یہ بھی ادھر آ نکلیں۔ انھوں نے اسلام کی حقانیت سے انکار کیا' اس پر ایک خاتون نے جو اسلام قبول کر چکی تھیں کہا :

> تم نے جس چیز پر غور ہی نہیں کیا اس کو موضوع بحث کیسے ٹھہرا سکتی ہو ؟ اگر تمھیں اسلام کے بارے میں رائے ظاہر کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو پہلے اس کو سمجھنے کی کوشش کرو' تمھیں معلوم ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو کیا تعلیم دیتے ہیں' ان کے رفقا اخلاق و کردار کے کس سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں' ان کا پیغام کس نوعیت کا ہے اور اللہ کی طرف سے جو کلام ان پر

نازل ہوتا ہے' وہ فصاحت وبلاغت اور صداقت وحقانیت کے لحاظ سے کس مرتبے کا حامل ہے؟ مجھے یقین ہے تم نے کبھی نہ ان باتوں پر غور کیا ہے اور نہ اسلام کو سمجھنے کی کوشش کی ہے' بلا سمجھے کسی چیز کے متعلق رائے ظاہر کرنا عقل مندوں کا شیوہ نہیں۔

یہ بات واقعی اپنے اندر وزن رکھتی تھی اور اخلاص سے کہی گئی تھی۔ اس کا ام طفیل پر خاطر خواہ اثر ہوا اور انھوں نے اسی وقت اپنے ذہن کی دنیا میں تبدیلی پیدا کرلی' اندر ہی اندر اسلام کو سمجھنے کی کوشش کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و ارشادات کے تمام پہلوؤں کو موضوع فکر ٹھہرایا۔

تاریخ وسیرت کی بعض کتابوں میں اس سلسلے کی تفصیلات درج ہیں۔ اس میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ کئی مہینے اسلام کو سمجھتی رہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سرگرمیوں کو بھی گہری نظر سے دیکھتی رہیں اور قرآن کی آیات بالالتزام سنتی رہیں اور آخر مسلمان ہوگئیں۔

ان کا نکاح خاندان ہی کے ایک شخص عمران بن عوف سے ہوا تھا۔ یہ شخص عام معاملات میں بہت اچھا تھا لیکن اسلام کی نعمت سے بہرہ مند نہ تھا۔ حضرت ام طفیل نے اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی اور کئی دفعہ جھگڑے تک بات پہنچی' مگر یہ اسلام قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوا' جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میاں بیوی میں تفریق ہوگئی۔ لیکن اس انقطاع وتفریق کے کچھ عرصے بعد عمران مسلمان ہوگئے اور بعض غزوات میں شرکت بھی کی' اس اثنا میں حضرت ام طفیل نے حضرت ابو کعب سے دوسرا نکاح کرلیا تھا۔

ان کے کئی بچے تھے جن میں ایک کا نام عمرو تھا۔ عمرو بڑے دلیر اور شجاع تھے۔ امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانے میں متعدد جنگوں میں شریک ہوئے۔ جنگ یرموک میں بھی شریک تھے۔ اس جنگ میں بھیجتے ہوئے ماں نے اس بلند ہمت بیٹے کو نصیحت کی کہ مسلمان کا اصل سرمایہ جہاد ہے اور جہاد کا بہترین نتیجہ شہادت ہے۔ تم مخالفین اسلام کے مقابلے میں شمشیر بکف ہوکر میدان میں نکل

رہے ہو۔اگر تم نے وہاں ذرا بھی کمزوری دکھائی اور بزدلی کا ثبوت دیا تو جہاں یہ حرکت تمھاری خاندانی روایات کے منافی ہو گی' وہاں اسلامی روایات کے بھی سراسر خلاف جائے گی۔اسلام اس شخص کو کبھی معاف نہیں کرتا جو مسلمان ہونے کا دعوی بھی کرتا ہے اور میدان جہاد میں دشمن کا مقابلہ کرنے سے گریز کی راہیں بھی تلاش کرتا ہے۔ اگر دل و جان سے اسلام کو صحیح سمجھتے ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر برحق تسلیم کرتے ہو تو دشمن سے ہرگز مرعوب نہیں ہونا چاہیے اور اسے شکست دینے کے لیے اپنی پوری طاقت صرف کر دینی چاہیے' اگر تم دشمن کی تلوار کا لقمہ بن گئے تو درجہ شہادت پر فائز ہو جاؤ گے اور یہی مسلمان کی آخری تمنا ہونی چاہیے۔

نہایت نیک سیرت اور بلند کردار خاتون تھیں۔ علامہ ابن عبدالبر نے الاستیعاب میں لکھا ہے کہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی راویہ بھی تھیں اور ان سے کئی احادیث مروی ہیں۔

ان سے احادیث روایت کرنے والے حضرات میں عمار بن عمیر اور محمد بن ابی کعب بھی شامل ہیں۔

حضرت ام طفیل رضی اللہ عنہا کی وفات حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ہوئی۔وفات کے وقت ان کی عمر ۵۸ برس تھی۔ان کے بیٹے محمد بن ابی کعب اور بھائیوں نے قبر میں اتارا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی نماز جنازہ میں شریک ہوئے۔

حضرت نوار بنت مالک

حضرت نوار بنت مالک بن حرمہ رضی اللہ عنہا انصار کے قبیلہ بنو نجار سے تعلق رکھتی تھیں۔ الاستیعاب اور الاصابہ میں ان کا نام نوار بنت مالک بن حرمہ لکھا ہے لیکن اسد الغابہ میں حرمہ مرقوم ہے۔

یہ خاتون زمانہ جاہلیت میں بھی اونچے کردار کی مالک اور عمدہ اخلاق کی حامل تھیں۔ اگرچہ فصاحت و بلاغت اور شعر و شاعری کے باب میں اپنے آباواجداد کی روایات کی وارث تھیں مگر عام مجلسوں میں جانے سے احتراز کرتیں، غیر مردوں سے میل جول اور اختلاط سے دامن کشاں رہتیں۔ مدینہ کے امیر اور نامور خاندان کی رکن تھیں۔ لیکن فخر و غرور سے طبیعت یکسر نا آشنا تھی اور دل کبر و نخوت کے جراثیم سے پاک--- تعلّی اور رعونت سے، جسے عام طور پر امیر اور پڑھی لکھی خواتین زندگی کا لازمی حصہ بنا لیتی ہیں، یہ بالکل نامانوس تھیں۔

دور جاہلیت میں امانت و دیانت کے ضمن میں خاص شہرت رکھتی تھیں۔ لوگ ان کو امیر سمجھ کر بڑی بڑی امانتیں ان کے پاس رکھتے تھے۔ عورتیں زیور اور قیمتی کپڑے ان کی تحویل میں دے جاتیں اور پھر ایک عرصے کے بعد ان سے اسی حالت میں واپس لے جاتیں۔ اس زمانے میں نہ بنکوں کا کوئی تصور تھا اور نہ روپے پیسے اور دیگر چیزوں کی حفاظت کی کوئی ایسی آسان صورت تھی جو موجودہ دور کے لوگوں کو حاصل ہے، اس وقت لوگوں کے مال و دولت کی حفاظت و صیانت کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ کچھ لوگ جو طبعی طور سے نیک اور امانت دار تھے اور اس وصف نے جن کو عوام کے لیے مرکز توجہ بنا دیا تھا، لوگ ان کے پاس آتے اور مختلف چیزیں ان کے سپرد کر دیتے۔ حضرت نوار بنت مالک رضی اللہ عنہا کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا تھا۔ عورتیں بالخصوص ان پر اعتماد

کرتیں اور بطور امانت اپنی چیزیں ان کے حوالے کر دیتیں-ان کی کسی چیز میں نہ کوئی کمی واقع ہوتی' نہ اسے اپنے مصرف میں لایا جاتا' نہ استعمال کے لیے کسی کو دیا جاتا' نہ ضائع کیا جاتا اور نہ عدم توجہی اور بے پروائی سے کسی حادثے کا شکار ہونے دیا جاتا' بلکہ پوری احتیاط سے رکھا جاتا اور مطالبے کے وقت بغیر کسی ادنی تامل کے فوراً واپس لوٹا دیا جاتا- یہ ان کی ایک ایسی خوبی تھی جس سے گرد و نواح کے تمام لوگ متاثر تھے اور ان کی نیک نامی کا یہ بہت بڑا سبب تھی-

ان کی شادی اپنے خاندان ہی کے ایک شخص عمرو بن اسعد سے ہوئی تھی- یہ شخص تجارت کرتا تھا اور اس کا مال عرب کے مختلف حصوں میں جاتا تھا- یہ خوش خلق اور خوش اطوار تاجر تھا اور بڑے اثر و رسوخ کا مالک تھا-اس کا مال مکہ شریف بھی جاتا تھا اور اس کے کاروباری اصولوں سے لوگ مطمئن تھے-اس سے حضرت نوار کی ایک لڑکی تھی- تجارت کے سلسلے میں یہ باہر گیا تھا کہ وفات پا گیا- اس کے انتقال کے بعد حضرت نوار نے دوسری شادی کی-

حضرت نوار رضی اللہ عنہا چونکہ نیک فطرت اور خوش خصال خاتون تھیں لہذا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے اور آپؐ کی دعوت ان کے کانوں میں پڑی تو اسی وقت مسلمان ہو گئیں-اسلام سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا :

یا رسول اللہ آپ کس چیز کی دعوت دیتے ہیں اور جو لوگ آپ کی اطاعت قبول کرتے ہیں ان پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں ؟

آپ نے فرمایا :

میں اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ اللہ کی توحید کا اقرار کرو' اس کے پیغمبروں کی تصدیق کرو اور فرشتوں پر ایمان لاؤ' جو کتابیں اللہ تعالی نے مختلف اوقات میں انبیا علیہم السلام پر نازل کی ہیں انھیں صحیح اور منزل من اللہ سمجھو' میری نبوت کا اقرار کرو اور مجھے اللہ کا فرستادہ اور سچا نبی مانو-

جو لوگ اسلام قبول کر لیتے ہیں ان پر یہ فرائض عائد ہوتے ہیں کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں' ان کے احکام کے آگے سر تسلیم خم کریں' سچ بولیں' کذب بیانی کو ترک کر دیں' ظالم کو ظلم سے روکیں' مظلوم کی مدد کریں' ایک دوسرے کو سب و شتم نہ کریں' اچھی باتیں کریں' باہم سلامتی اور امن کی دعا کریں' بہترین اخلاق کو اپنالیں' اپنے اندر اچھی عادتیں ڈالیں اور ایک دوسرے کی خیر خواہی کے لیے کوشاں ہوں۔ کسی کو تکلیف نہ پہنچائیں' کسی سے تعلقات استوار کریں یا تعلقات ختم کریں تو اس میں بنیادی شے اللہ کی رضا ہونی چاہیے' جو چیز اپنے لیے پسند کرتے ہیں وہی دوسرے کے لیے پسند کریں' مسلمان بھائی کے جذبات کا احترام کریں' اپنی ضروریات کو دوسرے کی ضروریات پر ترجیح نہ دیں' صدقات و خیرات کو اپنا معمول بنائیں چھوٹے سے مہربانی کے ساتھ پیش آئیں' بڑے کی عزت کریں' کسی کو ذہنی اور جسمانی تکلیف نہ پہنچائیں۔

یہ چیزیں چونکہ عام فہم اور دل میں اترنے والی تھیں اور ان میں سے بعض پہلے سے حضرت نوار رضی اللہ عنہا میں موجود تھیں' اس لیے وہ آپ کی تعلیمات سے بہت متاثر ہوئیں اور اس کی نشر و اشاعت میں مصروف ہو گئیں۔

ان سے کچھ احادیث بھی مروی ہیں اور انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت حدیث کا شرف حاصل ہے۔ پھر آگے ان سے بھی ان کے شاگردوں نے حدیث کی روایت کی۔ ان کے شاگردوں میں حضرت امام سعد بنت اسد بن زرارہ رضی اللہ عنہا کا اسم گرامی شامل ہے۔

حضرت نوار رضی اللہ عنہا کا انتقال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ہوا۔ وفات کے وقت ان کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ تھی۔

معاذہ بنت عبداللہ عدوی

معاذہ بنت عبداللہ عدوی بصرہ کی رہنے والی تھیں اور پہلی صدی ہجری کی ان خواتین میں سے تھیں جو فصاحت و بلاغت اور تفقہ میں خاص شہرت رکھتی تھیں۔ عبادت گزاری اور زہد میں ان کا شمار بصرہ کی ممتاز خواتین کے زمرے میں ہوتا تھا۔

صفوۃ الصفوہ' تہذیب التہذیب' طبقات الا تقیا' مسند ابی داؤد' مراۃ الجنان' البیان والتبیین' شذرات الذہب' طبقات ابن سعد' ذکر رجال الصحیحین' لواقع الانوار نی طبقات الاخیار اور کتاب الحیوان وغیرہ میں ان کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔

یہ تابعین کے دور کی خاتون ہیں اور اس مقدس جماعت میں ان کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ انھیں صحابہ اور تابعین کے اونچے لوگوں سے استفادے کا موقع ملا۔ ان کے اساتذہ میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ' ہشام بن عامر' ام عمرو بنت عبداللہ بن زبیر وغیرہ (رضی اللہ عنہم) شامل ہیں۔ ان سے انھیں سماع حدیث کا شرف حاصل ہوا۔

پھر جن حضرات نے خود ان سے تحصیل علم کی اور ان کی شاگردی کے دائرے میں آئے' وہ بھی اپنے دور کے جلیل القدر لوگ ہیں۔ ان میں سے ابو قلابہ' قتادہ' یزید الرشک' سلیمان بن عبداللہ بصری' اسحاق بن سعید' عاصم الاحول' ایوب' اسحاق بن سوید اور ابو بکر العدوی کی داوی ام الحسن وغیرہ لائق تذکرہ ہیں۔ یہ وہ حضرات ہیں جن کی رائے اور فکر و قول کو اس دور میں علم حدیث' اور ثقاہت میں حرف آخر سمجھا جاتا تھا۔

معاذہ بنت عبداللہ کے متعلق بڑے بڑے محدثین نے بہترین آراء کا اظہار کیا ہے۔ ایک بہت بڑی جماعت نے ان کی توثیق کی ہے اور انھیں مستند مانا ہے مثلاً یحیٰی بن

معین کہتے ہیں معاذہ بنت عبداللہ عدویہ مرتبہ ثقاہت پر فائز ہیں اور ان کی سند سے بیان کی ہوئی روایات قابل استناد ہیں۔ ابن حبان کا کہنا ہے کہ معاذہ کا شمار ثقات میں ہوتا ہے۔

ہر وقت موت کو یاد رکھتیں، کسی وقت بھی اسے دل سے نہ نکالتیں، سورج طلوع ہوتا اور دن کی روشنی پھیلتی تو کہتیں کیا معلوم یہ میری زندگی کا آخری دن ہو اور اس میں میری موت واقع ہو جائے۔ اس خیال سے تمام دن ذکر الٰہی میں مشغول رہتیں۔ اسی طرح جب سورج غروب ہوتا اور شب کی تاریکی پھیلنے لگتی تو فرماتیں ممکن ہے میں اسی رات موت کی آغوش میں چلی جاؤں، لہٰذا رات بھی جاگ کر گزارتیں اور صبح تک بیدار رہتیں۔

عبادت کھڑے ہو کر کرتیں، ہر آن یاد خدا میں مصروف رہتیں، قیام لیل کا اس درجہ اہتمام کرتیں کہ سخت سردیوں میں باریک کپڑے پہنتیں تاکہ وہ سردی کی شدت کو روک نہ سکیں اور نیند کا غلبہ نہ ہونے پائے۔ رات کو عبادت میں نیند کا اثر غالب آتا تو کھڑی ہو جاتیں اور گھر کے صحن میں ٹہلنا شروع کر دیتیں۔ اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتیں۔

نیند کا عالم تو تیرے آگے دنیوی زندگی کے بعد آنے والا ہے۔ اگر تم نے اس جہان کے لیے عمل صالحہ کیے اور نیکیوں کا ذخیرہ جمع کیا تو قبر میں آرام سے قیامت تک سوتی رہو گی، ورنہ قبر میں حسرت و یاس کے ساتھ جاگنا ہو گا۔ پھر صبح تک اسی کیفیت میں صحن میں چکر لگاتی رہتیں کہ ایسا نہ ہو میں سو جاؤں اور غفلت و نوم کی حالت میں موت واقع ہو جائے۔ وہ بالالتزام دن رات میں چھ سو رکعتیں پڑھتیں۔ نماز اور عبادت کے سوا دنیا کا کوئی کام نہ کرتیں۔ انھوں نے چالیس برس تک آسمان کی طرف منہ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ فرمایا کرتیں اللہ کو کس طرح منہ دکھاؤں، میں اس قابل نہیں کہ آسمان کی طرف منہ اٹھا کر دیکھوں۔ اس کثرت عبادت کے باوجود انکسار کا یہ عالم کہ فرماتیں برائیوں کا پلڑا نیکیوں سے بہت بھاری ہے۔

ان کا قول ہے کہ مجھے اس آنکھ پر سخت تعجب ہے جو سونے کے لیے بے قرار رہتی ہے' حالانکہ اسے معلوم ہے کہ وہ قبر کے اندھیروں میں طویل مدت تک جاگتی رہے گی۔

ایک عورت جسے بچپن کے زمانے میں معاذہ نے دودھ پلایا تھا' کہتی ہیں کہ حضرت معاذہ کہا کرتی تھیں کہ اللہ کی ملاقات کا انتظار ڈر اور امید کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کرو' مجھے یقین ہے اس کی رحمت کا امیدوار اس سے ملاقات کے روز بہتر مدارج میں ہوگا۔۔جس دن لوگ رب العالمین کے حضور پیش ہوں گے وہ ڈر کے مارے کانپ رہا ہوگا۔یہ کہہ کر رو پڑیں۔

جوانی کے عالم ہی میں ان کے شوہر فوت ہو گئے تھے۔ان کی وفات کے بعد تمام عمر اپنے لیے بستر کا اہتمام نہیں کیا۔

ان کی ایک بیٹی کا نام صہبا تھا' جس کے نام کی وجہ سے ان کی کنیت ام الصہبا تھی۔یہ لڑکی عالم طفولیت ہی میں وفات پا گئی تھی۔فرمایا کرتیں میں صرف اس بنا پر زندہ رہنا چاہتی ہوں کہ اس قدر نیک عمل کر لوں کہ جو جنت میں میرے اور میری بیٹی اور اس کے والد کے درمیان ملاقات کا ذریعہ بن جائیں۔

جب ستر سال کی عمر کو پہنچیں تو فرمایا: میں نے عمر کی ستر منزلیں طے کر لی ہیں' مگر گزشتہ ساری زندگی خواب کی مانند معلوم ہوتی ہے۔پچھلے تمام نقوش تیزی سے مٹتے جا رہے ہیں۔آنے والا وقت سخت معلوم ہوتا ہے اور بیتے ہوئے طویل ماہ و سال چند ثانیوں میں بدل گئے ہیں۔پوری زندگی ناپائیدار اور بے وقعت ہے۔جب مر جائیں گے تو پچھلی ساری عمر کل کی بات معلوم ہوگی۔میری ستر سال کی عمر میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا جس میں آنکھوں نے ٹھنڈک اور مسرت کی لہر دیکھی ہو۔

حضرت معاذہ بنت عبداللہ عددی رحمہا اللہ نے ۱۰۱ھ کو بصرہ میں وفات پائی۔ پانچویں خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کا انتقال بھی اسی سال ہوا۔

حضرت حبیبہ عدویہ

بصرہ میں پہلی صدی ہجری میں متعدد ایسی خواتین پیدا ہوئیں جو بہ درجہ غایت پرہیزگار تھیں- پورے عالم اسلامی میں ان خواتین کی شہرت تھی اور انھیں نہایت ذی مرتبت گردانا جاتا تھا' مثلاً رابعہ عدویہ' رابعہ قیسیہ' رابعہ بنت اسماعیل وغیرہ وہ خواتین تھیں جو صالحیت اور پرہیزگاری کے اونچے مقام پر فائز تھیں- ان کی پوری زندگی اللہ کی عبادت میں گزری اور خوف خدا اور تقوے کو انھوں نے اپنا شعار بنائے رکھا- ان پاک باز خواتین میں سے ایک بلند مرتبت خاتون حبیبہ عدویہ تھیں- ان کے حالات ابن جوزی نے صفوۃ الصفوہ میں بیان کیے ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی مافوق الفطرت عورت تھیں اور ان کے شب و روز کا ایک ایک ثانیہ اللہ کی عبادت میں صرف ہوتا تھا- یہ بصرہ کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھیں-

اصل بات یہ ہے کہ خلفاے راشدین کے بعد چاروں طرف فتنہ و فساد پھیل گیا تھا اور ہر سو برائیاں نظر آنے لگی تھیں- لوگوں میں خود غرضی اور مادیت زور پکڑ گئی تھی اور نیکی کی کیفیت ماند پڑ گئی تھی' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض لوگوں میں اس کا شدید رد عمل ہوا اور ان میں انتہا درجے کا تقوی پیدا ہو گیا- وہ دنیا ہی سے متنفر ہو گئے اور مادیت کو خیر باد کہہ دیا- یہ کیفیت جہاں مردوں میں پیدا ہوئی وہاں بہت سی عورتوں میں بھی اس کے آثار نمودار ہوئے اور انھوں نے دنیوی امور سے قطع علائق کر کے اللہ کی عبادت کے لیے اپنے کو خاص کر لیا- ان میں نہ حب جاہ کا جذبہ باقی رہا اور نہ دنیا طلبی کی حرص کا کوئی شائبہ ان کے اندر ابھرا- وہ اللہ کے مخلص بندوں میں سے ہو گئیں اور ان کی زندگی کا دھارا یکسر بدل گیا-

حبیبہ عدویہ کے زمانہ ولادت کے بارے میں یقین کے ساتھ تو نہیں کہا جا سکتا کہ

کون سا ہے، لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس دور میں پیدا ہوئیں جب صحابہ کرام ایک ایک کر کے دنیا سے رخصت ہو گئے تھے، نیکیوں کی جگہ برائیاں لے رہی تھیں اور فتنے مختلف شکلوں اور نئی نئی صورتوں میں ابھر رہے تھے۔ یہ اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ کہا تھا، وہ لوگ ختم ہو گئے ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و رفاقت کا شرف حاصل کیا تھا۔ وہ لوگ آسمان کے نیچے اور اس زمین کے اوپر نیک ترین اور اللہ کے برگزیدہ بندے تھے۔ اس فلک پیر نے اب تک ان جیسی بلند اخلاق اور عالی کردار نہ کوئی مخلوق دیکھی اور نہ قیامت تک دیکھے گا۔ وہ خدا کے عظیم المرتبت اور رفیع الشان بندے تھے۔ انھیں اللہ کے رسول کی رفاقت کا براہ راست شرف حاصل ہوا تھا۔ ان کے کانوں کے پردے سے بغیر کسی واسطے کے سرور کائنات کے ارشادات گرامی ٹکرائے۔ وہ غرور سے پاک اور فخر و رعونت سے مبرا تھے۔

پھر وہ لوگ بھی کس درجہ سعادت مند تھے، جن کی آنکھیں ان حضرات کی زیارت سے متمتع ہوئیں، جنھوں نے ان کی باتیں سنیں، جو ان کے افکار عالیہ سے مستفید ہوئے اور جنھیں ان کے ساتھ رہنے کے مواقع میسر آئے۔ وہ دور انتہائی تقوے کا دور تھا۔ اب چاروں طرف برائیاں ہی برائیاں نظر آ رہی ہیں، نیکی تک پہنچنے کے تمام راستے یکے بعد دیگرے تیزی سے بند ہو رہے ہیں۔

ان کی دعا ہے: اے پروردگار عالم! ہم تیرے گناہ گار بندے ہیں، ہم برائیوں کا بھاری بوجھ اٹھا کر تیرے دربار میں آ رہے ہیں، اس دنیا کو ہم نے شر کی مختلف قسموں سے بھر دیا ہے۔ تو ہم پر رحم فرما اور ہمیں صراط مستقیم پر لگائے رکھ۔

ان کے اس قسم کے فرامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تابعین کے دور کے بعد پیدا ہوئیں۔

معلوم ہوتا ہے انھوں نے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ ادبیت اور شعر و شاعری سے بھی اتنا لگاؤ نہیں تھا، البتہ پرہیزگار بہت تھیں، ہر وقت اللہ سے خوف زدہ رہتیں۔

ان کے اساتذہ کی فہرست میں کسی اہم شخصیت کا نام نہیں ملتا' صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ گھر ہی میں تعلیم حاصل کی' ان کے دادا' والد اور والدہ تمام لوگ از حد متقی تھے اور حدیث وفقہ سے شغف رکھتے تھے- حبیبہ عدویہ نے انہی سے تعلیم حاصل کی اور انہی کے فیض سے دین داری کی راہوں پر گام فرسا ہوئیں-

ابن جوزی نے لکھا ہے کہ ان کا طریق عبادت یہ تھا کہ رات کو نماز کے لیے کھڑی ہوتیں تو چادر اور دوپٹے کو اچھی طرح جسم پر لپیٹ لیتیں اور کہتیں اے اللہ! ستارے اپنی منزل پوری کر کے واپس جا رہے ہیں' لوگوں کی آنکھوں پر نیند نے تسلط جما لیا ہے' بادشاہوں نے محلوں کے دروازے بند کر لیے ہیں' صرف ایک دروازہ کھلا ہے جس پر میں اپنے نحیف و کم زور ہاتھوں سے دستک دے رہی ہوں اور وہ تیرا دروازہ ہے- تیرے سوا اب کوئی سننے والا نہیں' سب کے کان بند ہو گئے ہیں- اے پروردگار عالم! مجھ عاجز و ناتواں کی دعا سن لے اور میرے لیے اپنی رحمت کے باب کھول دے- تمام مخلوق محو استراحت ہے' مگر میں تیرے سامنے پورے عجز و انکسار کے ساتھ ہاتھ پھیلائے کھڑی ہوں- تو ہی میرا مالک' تو ہی مغفرت فرمانے والا اور تو ہی فضل و کرم کی بارش کرنے والا ہے-

جب رات ڈھل جاتی اور ردائے سیاہ چہرۂ شب سے سرک جاتی اور سحری کا وقت قریب آ جاتا تو ہاتھوں کو بارگاہ خداوندی میں مزید پھیلا دیتیں اور کہتیں اے میرے مالک! رات کے اندھیرے چھٹ گئے ہیں اور دن کی روشنی نمودار ہو رہی ہے- کاش کہ میں تیری بارگاہ میں کامیاب ہو جاؤں' کیا میری رات کی عبادت نے تیرے حضور درجہ قبولیت حاصل کر لیا؟ کیا ایسا تو نہیں کہ تو نے میری اس عاجزانہ التجا کو مسترد کر دیا ہو؟ اگر تو نے ایسا کر دیا اور میری دعا قبولیت سے محروم رہ گئی تو میرا کوئی ٹھکانا نہ ہو گا- میں راندہ درگاہ قرار پاؤں گی اور تیری مہربانیوں سے تہی دامن ہو جاؤں گی- اے اللہ! مجھے اپنے دربار میں عزت عطا فرمائیو اور خالی ہاتھ نہ لوٹائیو- میرے دل میں تیرے جود و کرم کی مسرتوں کے سوا اور کوئی شے نہیں ہے-

یہ خاتون رات کو قیام کرتیں اور دن کو روزے رکھتیں۔ اللہ کے حضور قیام کرتے کرتے ان کے پاؤں سوج جاتے لیکن کسی وقت اللہ کی یاد سے ان کا دل خالی نہ ہوتا۔

ان کے اندر لوگوں کی خدمت کا جذبہ بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا' کسی معذور کو دیکھتیں تو تڑپ اٹھتیں اور اس کی خدمت کے لیے دوڑتیں۔ عورتوں' بوڑھوں اور بے بس لوگوں کے کام آتیں۔ ان کے لیے کھانا تیار کرتیں اور ان کے گھر کے کام کاج کرتیں۔

اللہ نے ان کو قرآن فہمی کا پاکیزہ ذوق عطا فرمایا تھا۔ بے شمار بچوں اور عورتوں نے ان سے قرآن کی تعلیم حاصل کی' تعلیم اگرچہ زیادہ نہ تھی مگر قرآن کثرت سے پڑھتی تھیں اور اس کے مطالب و معانی پر نظر رکھتی تھیں۔

ان کی اولاد کو بھی اللہ نے اسی طرح تقویٰ و تدین سے نوازا تھا' جس طرح کہ خود ان کو نوازا تھا۔ ان کی ایک بیٹی نے گھر میں چھوٹا سا مدرسہ قائم کر رکھا تھا' جس میں وہ بصرہ کی عورتوں کو قرآن اور علوم دینیہ کی تعلیم سے آراستہ کرتی تھیں۔ ان کی شاگرد خواتین کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ ان کی شاگردوں میں بصرہ کے حکام اور اونچے خاندانوں کی لڑکیاں شامل تھیں۔ جو عورت ایک مرتبہ ان کے درس میں شریک ہو جاتی' وہ دوسری مرتبہ آنے کے لیے بے تاب رہتی۔ یہ بھی اپنی والدہ حبیبہ عدویہ کی طرح متدین اور پرہیزگار تھیں' سوائے تلاوت قرآن اور اس کی تعلیم و تعلم کے کسی کام سے انھیں دلچسپی نہ تھی۔

حضرت حبیبہ عدویہ رحمتہ اللہ علیہا لوگوں کی سفارش بھی کرتیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کسی کی جائز سفارش ضرور کرنا چاہیے۔ کیونکہ جو شخص دوسرے کے کام آتا ہے' اللہ اس کے کام آتا ہے۔ جو دوسرے کی بدخواہی کرتا اور ایذا رسانی کے درپے رہتا ہے' اللہ اسے ایذا پہنچاتا ہے۔

ان کی وفات ۱۰۰ھ کے لگ بھگ ہوئی۔ تذکرہ نویسوں نے ان کی عمر ۶۵ برس لکھی ہے۔

بکارہ ہلالیہ

حضرت بکارہ ہلالیہ کا شمار عرب کی ان خواتین میں ہوتا ہے جو شجاعت وبسالت اور فصاحت وبلاغت میں خاص شہرت کی مالک تھیں اور جن کی یہ خوبیاں زبان زد عام تھیں۔ شعروشاعری' نظم ونثر' خطابت اور انتخاب الفاظ میں وہ اپنا جواب نہ رکھتی تھیں۔

یہ بہادر خاتون جنگ صفین میں شریک ہوئیں اور خوب داد شجاعت دی۔ اس جنگ میں یہ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حامیوں میں سے تھیں۔ انھوں نے اس جنگ میں حضرت علی کے حامیوں میں زوردار تقریریں کیں اور جب معرکہ کارزار گرم تھا' بلا خوف وخطر ایسے مقامات پر پہنچتیں جہاں موت کی وادی بالکل قریب نظر آنے لگتی' نہ ان کے دل میں کوئی دہشت پیدا ہوتی اور نہ مخالفین کی تلواریں ان کا راستہ روک سکتیں۔

بکارہ میں صرف یہی خوبی نہ تھی کہ فصاحت وبلاغت اور بہادری وبے خوفی میں ان کا کوئی حریف نہ تھا بلکہ زہد وعبادت اور خوف خدا میں بھی اپنی نظیر نہ رکھتی تھیں۔ صادق القول اور حد درجے کی حق گو تھیں۔ جان بچانے یا اپنے تحفظ کے لیے کوئی ایسا قدم نہ اٹھاتیں جو کسی صورت میں غیرت ایمانی اور عزت نفس کے خلاف ہوتا۔ عہد طفولیت بھی نیکی کے ماحول میں گزرا' جوانی بھی بہترین حالات میں بسر ہوئی اور کہولت کی منزلیں بھی صاف ستھرے انداز سے طے کیں۔

ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس مروان بن حکم اور عمرو بن العاص بیٹھے تھے' انھوں نے دیکھا کہ ایک عورت آرہی ہے' عمر کے بوجھ سے جس کی کمر جھکی ہوئی ہے' ہڈیوں سے گوشت اتر چکا ہے' آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہیں' ہاتھ میں چھڑی پکڑ رکھی ہے اور دو خادم سہارا دیے ہوئے ہیں۔ حضرت معاویہ کے

قریب آئیں تو وقار و تمکنت کے ساتھ بولیں :

السلام علیکم

معاویہ دیکھ کر احتراما کھڑے ہو گئے۔ نہایت تکریم کے الفاظ میں سلام کا جواب دیا اور ادب سے عرض کیا :

تشریف رکھیے۔

مروان نے کہا امیر المومنین : انھیں پہچانتے ہیں' یہ کون ہیں ؟

معاویہ نے پوچھا :

کون ہیں ؟

کہا : وہی جو صفین کی جنگ میں ہماری مخالفت کر رہی تھیں اور جب معرکہ کارزار گرم تھا تو یہ شعر پڑھے تھے۔

"اے وہ لوگو جو ہماری امداد کے لیے گھروں سے نکلے ہو' تیز اور کاٹ دینے والی تلواروں کو میان سے نکال لو۔"

"اور ان تلواروں کو اس زور اور عجلت سے چلاؤ کہ دشمن کو ختم کر دیں اور ان کی لاشیں مٹی میں تڑپنے لگیں۔"

"آج فیصلے کا دن ہے' اس میں طاقت کے جوہر دکھاؤ اور مخالفوں کو ہرگز دم نہ لینے دو۔"

"اپنی صفیں آراستہ کر لو' مضبوط دیوار کی طرح کھڑے ہو جاؤ اور دشمن کے سینے چیر دو۔"

عمرو بن العاص نے کہا : امیر المومنین یہ وہی بڑھیا تو ہے جس نے کہا تھا۔

"کیا ابن ہند (معاویہ) بھی کہیں خلافت کا مستحق ہو سکتا ہے۔ سخت افسوس ہے اس کے ارادے صحیح نہیں۔"

"وہ انتہائی خود فریبی میں مبتلا ہے۔ عمرو اسے دھوکا دے رہا ہے اور سعید اس کا غلط مشیر ہے۔"

"اس کے اس خیال کی بلند پروازی کا خاتمہ کر دو۔ بہادر واس کے مقابلے میں علی (رضی اللہ عنہ) بے مثال اور بہترین انسان ہیں۔"

سعید نے عرض کیا: امیر المومنین یہ اشعار اسی نے تو پڑھے تھے۔

"بنو امیہ حق دار خلافت نہیں ہیں۔ یہ اتنا بڑا اعزاز انھیں زیب نہیں دیتا۔"

"زمانے نے کیسی عجیب و غریب کروٹ بدلی ہے کہ اب یہ لوگ ہمارے مقابلے کو نکلے ہیں۔ ان کو ہر گز کامیابی سے ہم کنار نہ ہونے دو اور ہر صورت میں آل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امداد کرو۔"

"یاد رکھو: محمد اور آل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھوکے رہ کر شجر اسلام کی آب یاری کی ہے' انھیں کبھی دھوکا نہ دو۔"

جب وہ خاموش ہو گئے تو حضرت بکارہ ہلالیہ بولیں: معاویہ! تم نے ان کی زبانی میرا کلام سن لیا۔ میں نے نہ صرف یہ اشعار پڑھے تھے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر بہت باتیں کہی تھیں اور میں اسے صحیح سمجھتی تھی۔ افسوس ہے ان لوگوں نے سب باتیں بیان نہیں کیں اور ان کے حافظے نے میرے ضروری اشعار بھی یاد نہیں رکھے۔ میں معذرت کے لیے تمھارے پاس نہیں آئی اور نہ کسی نوع کی ندامت کا اظہار کرتی ہوں۔ میں ان باتوں کی تردید نہیں کرتی' تصدیق کرتی ہوں۔ مجھے افسوس ہے' اب میرے خون میں وہ روانی باقی نہیں رہی' میری صحت جسمانی جواب دے گئی ہے اور میری بینائی کم زور پڑ گئی ہے۔ تم جو جی چاہے کر لو' میں نے تمھاری مخالفت میں کوئی دقیقہ فرد گزاشت نہیں کیا۔

اس خاتون کی جرات کی داد دیجیے اور ساتھ ہی حضرت معاویہ رضی اللہ کا حوصلہ دیکھیے' فرماتے ہیں:

بکارہ! آپ میرے نزدیک بدرجہ غایت قابل احترام ہیں۔ میں آپ کی توقیر کو حاصل زندگی سمجھتا ہوں۔ آپ کو نہ صرف میں کچھ نہیں کہوں گا بلکہ کوئی بھی آپ کے خلاف زبان کو حرکت نہیں دے گا' آپ جو جی چاہے کہیے'

آپ کی تمام باتیں خندہ پیشانی سے برداشت کی جائیں گی- آپ کی ہر قسم کی ضروریات پوری کی جائیں گی-

اس کے بعد ان کی خدمت میں متعدد قسم کے تحائف پیش کیے اور عزت کے ساتھ انھیں رخصت کیا-

حضرت بکارہ ہلالیہ رحمتہ اللہ علیہا کی عمر اور سن وفات کا علم نہیں ہو سکا-

عائشہ بنت عثمان

حضرت عائشہ رحمتہ اللہ علیہا خلیفہ ثالث حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی صاحب زادی تھیں۔ حضرت عثمان، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ صحابی تھے جنھوں نے ہر موقعے پر اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کی۔ مختلف جنگوں میں دل کھول کر چندہ دیا اور مجاہدین کی امداد کی۔ انھیں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد خلیفہ مقرر کیا گیا تھا۔ انھوں نے بارہ سال خلافت کے فرائض انجام دیے۔ خلافت کے ابتدائی چھے سال بڑے آرام وسکون سے گزرے، لیکن آخری چھے سالوں میں ہنگامہ آرائی شروع ہوگئی جو ان کی شہادت پر منتج ہوئی۔ بلوائیوں نے ان کے مکان کا محاصرہ کر لیا اور امداد و اعانت کے تمام راستے بند کر دیے۔ صحابہ نے امداد کرنا اور بلوائیوں کا مقابلہ کرنا چاہا۔ مگر حضرت عثمان نے روک دیا اور فرمایا میں اپنی ذاتی حفاظت کے لیے مسلمانوں کی جانیں تلف نہیں کرنا چاہتا۔ مسلمانوں کا فرض اسلام کی حفاظت ہے، کسی خلیفہ یا امیر کا ذاتی تحفظ ودفاع ہرگز ان کے فرائض میں داخل نہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کو بھیجا کہ ان کی امداد کی جائے، مگر حضرت عثمان نے شکریے کے ساتھ دونوں بھائیوں کو واپس کر دیا اور فرمایا اللہ ہی میرا حافظ و ناصر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بلوائی پورے مدینے پر قابض ہوگئے اور حضرت عثمان کے مکان کے اندر جا گھسے۔ حضرت عثمان قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے کہ انھیں شہید کر دیا گیا اور اس وقت ظلم وستم کی حد ہوگئی جب کہ رسول پاک کے اس داماد اور مسلمانوں کے خلیفہ راشد کو قبرستان میں دفن کرنے سے بھی روک دیا گیا۔ ان کا جنازہ چند صحابہ نے رات کی تاریکی میں اٹھایا اور بڑی مشکل سے تدفین کے مراحل طے کیے۔

یہ حضرت عائشہ رحمتہ اللہ علیہا انہی کی لڑکی تھیں۔ان کے بارے میں ابن قتیبہ کی الامامتہ والسیاستہ' جاحظ کی البیان والتبیین' ابن عبداللہ کی العقد الفرید اور طیفور کی بلاغات النساء میں بعض باتیں بیان کی گئی ہیں' مگر تفصیلی حالات کہیں سے نہیں مل سکے' صرف ان کی ایک تقریر ملتی ہے جو انھوں نے اپنے جلیل القدر باپ کی شہادت کے موقعے پر بلوائیوں اور دیگر مسلمانوں کے سامنے کی۔اس تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قادر الکلام اور صاف گو خاتون تھیں اور ان کی زبان فصاحت وبلاغت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔

فرماتی ہیں :

''اے ماتم گساران عثمان اور اے قاتلین خلیفہ راشد! آج ہم پر غم وافسوس کی گھٹائیں چھا گئی ہیں' حزن وملال نے ہمیں گھیر رکھا ہے اور غم واندوہ کی کیفیتیں ہم پر طاری ہیں۔ عثمان اس دنیا سے رخصت ہو گئے' انا للہ وانا الیہ راجعون۔بے دردی سے ان کا خون بہایا گیا اور حرم رسول میں ان پر عین اس وقت تلوار چلائی گئی جب وہ کلام پاک کی تلاوت میں مصروف تھے۔یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ ان کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے سے بھی روک دیا گیا۔وہ اس درجہ مسلمانوں کے جان ومال کے تحفظ کے خواہاں تھے کہ انھوں نے اپنی حفاظت ومدافعت کے لیے کوئی کوشش نہیں کی۔وہ چاہتے تو اللہ عزوجل کے حضور بلوائیوں کی تباہی کے لیے دعا کرتے۔ مسلمانوں سے اعانت ونصرت کے طالب ہوتے اور مہاجرین کو اپنی صداقت شعاری کے لیے بطور شاہد کے پیش کرتے اور ان کی تلواروں کو اپنے لیے استعمال میں لاتے' مگر انھوں نے اس قسم کا کوئی قدم نہیں اٹھایا اور اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا۔

''اے درندہ صفت انسانو! تم نے ان کے خون کو ارزاں کیا اور اس وحشت ناک درندگی کا مظاہرہ کیا کہ زمین وآسمان کانپ اٹھے۔ جن لوگوں نے اس

منظر کو دیکھا یا تمھاری ان ستم رانیوں کے بارے میں کچھ سنا' وہ انگشت بدنداں رہ گئے اور ان کے کلیجے منہ کو آنے لگے۔

"تم نے عثمان کے اہل خانہ کے سامنے ان کو قتل کیا' تم نے ان کی داڑھی نوچی' ان کو گالیاں دیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خلیفہ کے ساتھ تم نے وہ سلوک روا رکھا جو کسی بڑے سے بڑے دشمن کے ساتھ بھی روا نہیں رکھا جاسکتا۔"

"تم نے اللہ کی حدود سے تجاوز کیا' اس کی فرماں برداری کے تمام تقاضوں کو خیر باد کہا۔ اس کے رسول کے دائرہ اطاعت سے باہر قدم رکھا اور انسانیت کے حقوق کو پامال کیا۔ تم کس منہ سے اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو؟ تمھیں رسول کی محبت کا دم بھرتے ہوئے شرم نہیں آتی اور اپنے جذبہ اطاعت کو اللہ کی طرف منسوب کرتے ہوئے تمھاری گردنیں ندامت سے جھک نہیں جاتیں؟ تم ظلم کے مجسمے اور ستم کے پیکر ہو' تمھاری ہر حرکت حدود اسلام سے باہر اور ہر قدم ایمان کے تقاضوں کے منافی ہے۔"

"میرے باپ نے مسلمانوں کی سب سے زیادہ مدد کی۔ اللہ کے رسول کی اطاعت میں پیش پیش رہے' انھوں نے اپنی تمام مساعی خدمت اسلام کے لیے وقف کر دیں۔ جب مسلمانوں کی ضروریات نے ان کے دروازے پر دستک دی' وہ حاضر ہو گئے اور گھر کا سارا اثاثہ ان کی خدمت کے لیے آنحضرت فداہ ابی وامی کے حضور پیش کر دیا۔ کیا تم میں سے کوئی ایک شخص بھی ان خوبیوں سے بہرہ مندی اور ان اوصاف حسنہ سے متصف ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے؟

"وہ اس دنیا میں اللہ کی اطاعت کا نشان تھے۔ انھیں دیکھ کر سخت سے سخت دل بھی نرمی ولینت کی تصویر بن جاتا تھا۔ وہ سختی سے نفور اور رقاقت سے قریب تر تھے۔ انھوں نے کبھی کسی کو ہدف ستم نہیں ٹھہرایا' کبھی کسی ستم

راں کی اعانت نہیں کی، کبھی کسی کو تنگ نہیں کیا، کبھی کسی کے در پے آزار نہیں ہوئے، کبھی اللہ کی نافرمانی کے مرتکب نہیں ہوئے، کبھی کسی کو سب و شتم نہیں کیا، کبھی کسی کو قتل نہیں کیا۔ جب ان کی کیفیت یہ تھی تو تم نے کیوں ان پر ظلم و ستم کی ٹھانی؟ اور کیوں انھیں موت کا لقمہ بنایا؟ تمھارا یہ اتنا بڑا گناہ ہے جس کی کوئی تلافی نہیں ہو سکتی۔

"پھر تعجب و حیرت کی بات یہ ہے کہ اس ہولناک اقدام کی وجہ سے تمھارے چہروں پر ندامت کے آثار بھی نظر نہیں آتے، جس کا ظاہر مطلب یہ ہے کہ تم اس پر خوش ہو اور خلیفہ راشد کو نشانہ ستم بنا کر بزعم خویش تم نے کوئی بہت اچھا کام کیا ہے۔

"حضرت عثمان بے گناہ تھے، وہ یقیناً حق دار مغفرت ہیں اور اللہ نے اپنے رسول پاک کی زبانی دنیا ہی میں انھیں جنت کی خوش خبری سنادی تھی اور وہ عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ لیکن تم بتاؤ تم نے اتنے بڑے انسان کو اس بے دردی کے ساتھ موت کی وادی میں دھکیل کر اسلام کی کیا خدمت انجام دی؟ کیا تم نے ہمیشہ کے لیے ملامت کو اپنے لیے ضروری نہیں قرار دے لیا اور اپنے دامن کو معصیت سے آلودہ نہیں کر لیا؟"

کتابوں میں مرقوم ہے کہ اس تقریر سے دشمن و دوست زار و قطار رونے لگے اور کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔

۴۱ھ میں حضرت امیر معاویہ مدینہ منورہ تشریف لائے اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے مکان میں داخل ہوئے تو حضرت عائشہ بنت عثمان رحمتہ اللہ علیہا ان کے پاس آکر رونے لگیں اور اپنے باپ کی موت کا دردناک الفاظ میں تذکرہ کیا۔

امیر معاویہ نے جواب دیا:

لوگوں نے ہماری اطاعت قبول کر لی ہے، جس کے بدلے میں ہم نے ان کو امان و تحفظ کی ضمانت دے دی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اب ہم نرمی و رافت کا

ثبوت دیں اور عملاً یا قولاً ظلم و زیادتی سے بالکل باز رہیں۔ تلوار ہر شخص کے ہاتھ میں ہے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس تلوار کا نشانہ کون بنتا ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ظالم اور مظلوم کے فرق کو ملحوظ رکھا جائے۔

"بھتیجی! تم صبر سے کام لو اور کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکالو جو کسی موقعے پر بھی کسی کے لیے نقصان کا باعث بن سکتی ہو۔"

بنانہ بنت ابی یزید

بنانہ بنت ابی یزید بن عاصم الازدی' قبیلہ ازد سے تعلق رکھتی تھیں اور اس قبیلے کے ایک اونچے خاندان کی نامور خاتون تھیں۔ تاریخ طبری میں ان کے حالات بیان کیے گئے ہیں جو بڑے نصیحت آموز ہیں۔

بنانہ ۱۹ یا ۲۰ھ میں امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں پیدا ہوئیں۔ ان کا قبیلہ نواحی مدینہ میں سکونت پذیر تھا اور اپنی خصوصیات کی بنا پر خاص شہرت واہمیت کا مالک تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ بنانہ کی ولادت کے بعد اس قبیلے کی اہمیت مزید بڑھ گئی تھی۔

حضرت بنانہ رحمتہ اللہ علیہا کی تعلیم وتربیت بہت اچھے طریقے سے کی گئی اور متعدد صحابہ اور صحابیات سے انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ یہ احادیث کی راویہ تھیں اور روایت حدیث میں ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ جن حضرات سے انھوں نے اخذ علم کیا' ان میں بعض امہات المومنین اور صحابیات شامل ہیں۔ صحابہ میں سے جن حضرات سے انھوں نے تعلیم حاصل کی ان میں حضرت ابوہریرہ' حضرت عبداللہ بن عمر' حضرت عبداللہ بن عباس' حضرت ابوالدردا اور حضرت عمرو بن العاص کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

راویہ حدیث ہونے کے علاوہ عادات وخصائل کے اعتبار سے بھی یہ اونچے مقام پر فائز تھیں۔ لوگوں کی ہمدرد' یتیموں اور مسکینوں کی خیر خواہ اور محتاجوں کی معاون تھیں۔ بڑوں کی تکریم ان کا خاصہ تھا۔ بوڑھی اور معذور عورتوں کی خدمت ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی۔ گفتار میں نہایت نرم تھیں اور رہن سہن کا انداز بہت سادہ تھا۔ جھگڑے جھمیلے کو سخت برا سمجھتی تھیں۔

حضرت بنانہ رحمتہ اللہ علیہا نے قرآن مجید بڑی محنت و اہتمام سے پڑھا اور اس سلسلے میں حبر امت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے شرف شاگردی حاصل کیا' جن کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو قرآن مجید کے بہت بڑے عالم تھے اور علوم قرآنی سے بے حد شغف رکھتے تھے- ان سے قرآن حکیم کی تعلیم کے لیے دور دراز سے لوگ آتے اور مفسر قرآن بن کر واپس جاتے-

بنانہ فصاحت و بلاغت میں بھی یکتا تھیں اور شعر و شاعری کا پاکیزہ ذوق رکھتی تھیں- ان کے آباو اجداد میں سے بعض لوگ زمانۂ جاہلیت کے عظیم شعرا میں شمار ہوتے تھے اور فصاحت و بلاغت میں ان اوصاف سے متصف تھے جو عربوں کی قبائلی زندگی کا ضروری جز تھے- قبائلی عرب زمانۂ جاہلیت میں بھی اور زمانۂ اسلام میں بھی شعر و شاعری سے نہایت دلچسپی رکھتے تھے اور فصاحت و بلاغت ان کا اصل سرمایۂ حیات تھا- اس سلسلے میں ان کے باہمی مقابلے ہوتے رہتے تھے- ان کے بچوں اور عورتوں کو بھی اس موضوع سے گہرا تعلق تھا اور ان کی تربیت اس انداز سے کی جاتی تھی کہ وہ زبان پر عبور میں کسی سے پیچھے نہ رہیں اور اس موضوع کی تمام خوبیاں ان میں سمٹ آئیں- حضرت بنانہ بنت ابی یزید بھی ان اوصاف کی مالک تھیں اور اس موضوع کی وہ تمام خوبیاں ان میں جمع تھیں جو ان کے آباو اجداد میں پائی جاتی تھیں- لیکن انھوں نے اس سے کبھی زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کیا' کیونکہ ان کی تمام تر توجہ تحصیل حدیث اور فہم قرآن کی طرف مبذول ہو گئی تھی اور ان کے شب و روز یاد الٰہی میں بسر ہوتے تھے- تاریخ کی بعض کتابوں میں ان کے اشعار مرقوم ہیں' مگر ان کی تعداد بہت کم ہے-

طبری نے لکھا ہے کہ بنانہ تہجد گزار' قیام اللیل کی پابند' کثرت سے قرآن پڑھنے والی' راویہ حدیث' شعر و شاعری اور فصاحت و بلاغت سے تعلق رکھنے والی خاتون نہایت خوب صورت بھی تھیں-

حضرت بنانہ کے عہد میں خوارج نے سر اٹھا لیا تھا' لیکن بنانہ خارجیت کی سخت مخالف تھیں اور خارجیوں کی سرگرمیوں کو اسلام سے متصادم قرار دیتی تھیں- یہ کسی

ایسی چیز کو پسند نہ کرتی تھیں جو اسلامی تعلیمات کے بنیادی مقاصد سے ٹکراتی ہو۔ خارجی بھی انھیں اپنی دشمن قرار دیتے تھے اور ان کی ایذا رسانی کے درپے رہتے تھے۔ اتفاق ملاحظہ ہو کہ ایک روز یہ تنہا جا رہی تھیں کہ انھیں چند خارجیوں نے پہچان لیا اور ان کا راستہ روک کر انھیں مارنے کو دوڑے۔ انھوں نے بھی قدم روک لیے اور کھڑی ہو گئیں۔ اس اثنا میں ان کے اور خارجیوں کے درمیان مندرجہ ذیل گفتگو ہوئی۔

ایک خارجی: ہم تمھیں آج زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ کیونکہ تم ہر جگہ ہماری مخالفت کرتی ہو۔

بنانہ: افسوس ہے تم مرد ہو کر عورتوں کو قتل کرتے ہو' کیا تم اس اسلامی اخلاق اور بہادرانہ اوصاف سے واقف نہیں کہ عورتوں' بچوں' بوڑھوں اور معذوروں کو قتل کرنا شجاعت کی توہین اور اسلامی کی مخالفت ہے۔

دوسرا خارجی اپنے ساتھیوں سے: اس کا راستہ چھوڑ دو' اسے قتل نہ کرو' یہ سچ کہتی ہے۔ عورت کو قتل کرنا واقعی مردانہ بہادری کے منافی ہے۔

تیسرا خارجی اپنے ساتھی سے: کیا تم اس لیے اس کے قتل سے روک رہے ہو کہ تمھیں اس کا حسن بھا گیا ہے اور تم اس سے تعلقات محبت استوار کرنا چاہتے ہو اور سمجھتے ہو کہ اس اخلاقی امداد سے یہ تمھاری گرویدہ ہو جائے گی؟

خارجی: ہرگز نہیں! میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ عورت کو قتل کر کے اپنی بہادری کو مجروح نہ کیا جائے۔

بنانہ: تم بدتمیز ہو اور تمھاری حرکات اسلام کے منافی ہیں۔ نہ تم انسانیت کے تقاضوں کو سمجھتے ہو اور نہ اسلام کے احکام کو درخور اعتنا ٹھہراتے ہو۔ تم اچھی طرح سمجھ لو کہ میں تمھارے ساتھ کسی نوع کے قلبی اور روحانی مراسم نہیں رکھتی اور میں تمھاری شدید مخالف ہوں۔ میرے نزدیک تم سخت قابل ملامت ہو۔ میں تم سے صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ کس درجہ افسوس کی بات ہے کہ تم ایک عورت کو گردن زدنی قرار دیتے ہو اور پھر ایسی

عورت کو جو نہ تمھیں تکلیف پہنچانا چاہتی ہے' نہ تم پر تلوار اٹھانے کے لیے تیار ہے اور نہ کسی مجمع عام میں تمھاری مخالفت کرتی ہے- وہ ایک گھریلو عورت ہے اور اس کا دائرہ کار سمٹا ہوا اور محدود ہے-

ایک خارجی تلوار بے نیام کر کے : ہم تمھیں ضرور قتل کریں گے اور ہمارے نقطہ نظر سے تمھیں موت کے گھاٹ اتارنا ضروری ہے-

بنانہ : گرج دار آواز سے : تم معاملے کے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور کر لو' میں پھر کہتی ہوں کہ کم زوروں' عورتوں' بوڑھوں' بچوں اور معذوروں کو قتل کرنا کسی صورت میں بھی مستحسن نہیں- اگر تم ایسا کرو گے تو یہ قتل تمھاری اخلاقی موت کے مترادف ہو گا اور تم ذلیل و نامراد قرار پاؤ گے' کیونکہ بے بس لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنا ہرگز لائق تائید نہیں-

اتنے میں ایک خارجی جلدی سے تلوار کو میان سے نکالتا ہے اور آگے بڑھ کر حضرت بنانہ بنت ابی یزید کی گردن تن سے جدا کر دیتا ہے-

یہ واقعہ ۶۸ھ کو پیش آیا-

حفصہ بنت سیرین

حفصہ بنت سیرین کے حالات تاریخ ورجال کی کتابوں میں مذکور ہیں مثلاً صفوۃ الصفوہ میں ابن جوزی نے' تہذیب التہذیب میں حافظ ابن حجر نے' الکمال فی معرفتہ الرجال میں عبدالغنی مقدسی نے' التہذیب میں ذہبی نے' مرأۃ الجنان میں یافعی نے' شذرات الذہب میں ابن العماد نے اور الوافی بالوفیات میں صفدی نے ان کا تذکرہ کیا ہے۔

حفصہ بنت سیرین ۳۱ھ میں پیدا ہوئیں۔ایک روایت میں ۲۰ھ بتایا گیا ہے۔ تابعی حضرت محمد بن سیرین رحمتہ اللہ علیہ کی بہن تھیں۔ان کے والد کا نام سیرین تھا جو عراق کے ایک مقام جرجرایا کے باشندے تھے اور عین التمر میں ٹھٹھرے کا کام کرتے تھے۔اسی عین التمر کی جنگ میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھ گرفتار ہوئے اور مال غنیمت کی تقسیم میں غلام کی حیثیت سے کسی مجاہد کے حصے میں آئے۔ بعد میں مشہور صحابی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی غلامی میں آگئے۔انھوں نے بیس ہزار درہم پر مکاتبت کر کے انھیں آزاد کر دیا۔یہ سب باتیں ابن خلکان کی وفیات الاعیان کی جلد اول میں مذکور ہیں۔

شذرات الذہب کی پہلی جلد میں لکھا ہے کہ محمد بن سیرین (اور حفصہ بن سیرین) کی والدہ کا نام صفیہ تھا اور وہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی کنیز تھیں' لیکن وہ کنیز اس عزت واحترام کی مالک تھیں کہ جب ان کے نکاح کا وقت آیا تو تین ازواج مطہرات نے ان کی مشاطگی کا فریضہ انجام دیا اور اٹھارہ بدری صحابہ جن میں حضرت ابی بن کعب بھی شامل تھے' ان کے نکاح کی تقریب میں شریک ہوئے۔ آراستگی وتیاری کے بعد امہات المومنین نے حضرت صفیہ کے لیے دعا مانگی۔ مردانہ

مجلس میں حضرت ابی بن کعب دعا مانگتے جاتے تھے اور صحابہ آمین کہتے جاتے تھے۔

ابن خلکان کے بقول حضرت حفصہ کے والد سیرین کثیر الاولاد بزرگ تھے۔ ان کی یہ صاحب زادی حضرت حفصہ ۳۱ھ میں خلیفہ ثالث حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے چار سال قبل پیدا ہوئیں۔ یہ غلام خاندان کی بیٹی تھیں، لیکن انتہائی عابدہ وزاہدہ اور پرہیزگار خاتون تھیں۔ اور اس باب میں یہ تابعی خواتین میں ایک بلند مقام رکھتی تھیں۔ عبادت گزاری و تقویٰ شعاری کے ساتھ ساتھ علوم قرآن اور حدیث وفقہ کی بہت بڑی عالمہ تھی۔

معروف تابعی ایاس بن معاویہ کہتے ہیں: میں نے حفصہ بنت سیرین سے بڑھ کر کسی کو افضل اور بہتر نہیں پایا۔

ان سے پوچھا گیا: کیا وہ حسن بصری اور (اپنے بھائی) محمد بن سیرین سے بھی برتر حیثیت کی مالک تھیں؟

جواب دیا: میں ان میں سے کسی کو کسی پر فضیلت دینے کو تیار نہیں۔

علمانے ان کو سیدات التابعیات میں شمار کیا ہے۔ ابن ابی داؤد کا کہنا ہے کہ حفصہ بنت سیرین، عمرہ بنت عبدالرحمٰن اور ام الدرداصغریٰ تینوں علم و معرفت اور تقویٰ و پرہیزگاری میں اپنا جواب نہ رکھتی تھیں۔

حفصہ نہایت ذہین خاتون تھیں۔ بارہ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا اور قرأت کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو گئی تھیں۔ اس کے معانی و مطالب پر بھی عبور حاصل کر لیا تھا۔ ان کے بھائی محمد بن سیرین بے شک بہت بڑے عالم تھے، لیکن انھیں قرآن حکیم کا کوئی مشکل مقام پیش آتا تو کہتے 'اس کے بارے میں حفصہ سے پوچھو اور یہ بھی دریافت کرو کہ وہ اس کی قرأت کس طرح کرتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ حفصہ قرآن کی سب سے بڑی عالمہ اور قاریہ ہیں۔

عبادت سے انھیں انتہائی شغف تھا۔ نمازیں کثرت سے پڑھتی تھیں۔ مکان کے ایک کونے میں نماز کے لیے مسجد کی صورت میں ایک جگہ مقرر کر رکھی تھی، اس مسجد

میں نماز ظہر کے لیے جاتیں تو ظہر' عصر' مغرب اور عشا کی نمازیں پڑھ کر باہر نکلتیں۔ تہجد اور نماز فجر بھی وہیں ادا کرتیں اور کافی سورج نکلنے تک اس مسجد میں عبادت کرتی رہتیں۔ نماز اشراق پڑھ کر باہر آتیں۔ ظہر کی اذان کی آواز کانوں میں پڑتی تو پھر مسجد میں چلی جاتیں۔ ان کا زیادہ تر وقت مکان کی اسی مسجد میں گزرتا تھا۔ مہدی بن میمون کہتے ہیں کہ حفصہ متواتر تیس برس اس مسجد میں رہیں اور شدید ضرورت کے بغیر کبھی اس سے باہر قدم نہیں نکالا۔

قرآن مجید کی تلاوت کثرت سے کرتیں اور ایک ایک لفظ کے معنی و مطلب کو غور و فکر کے زاویوں میں لاتیں۔ کہا جاتا ہے کہ حفصہ ہر رات نصف قرآن کی تلاوت فرماتیں۔ قرآن پاک سے انھیں بے حد لگاؤ تھا۔ بات بات میں قرآن کی آیات پڑھتیں۔ لوگوں کو اس کا مطلب سمجھاتیں اور اس کے فضائل بیان کرتیں۔

روزے کثرت سے رکھتیں۔ ایک جگہ مرقوم ہے کہ عیدین' ایام تشریق اور بعض دیگر ایام کے علاوہ ہمیشہ روزے سے رہتیں۔ صفوۃ الصفوہ میں ابن جوزی لکھتے ہیں کہ حفصہ صائمۃ الدہر تھیں۔ بہت کم لوگوں نے ان کو روزے کے بغیر دیکھا ہے۔

کہتے ہیں انھوں نے ایک کفن بنا رکھا تھا' جسے حج کے موقعے پر پہنتی تھیں' اسی سے احرام باندھتیں' رمضان المبارک کا آخری عشرہ آتا تو رات کو قیام کرتیں اور یہ کفن اس عشرے میں بالالتزام زیب تن کرتیں۔

ایک مرتبہ انھوں نے نوجوانوں (مردوں اور عورتوں) سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

نوجوانو تمھارا شباب کا عالم ہے۔ اس عمر میں کثرت سے عبادت کرو اور اللہ کے ذکر میں اپنے آپ کو مشغول رکھو۔ اس عمر کا نیک عمل زیادہ وقیع اور اللہ کے نزدیک زیادہ قابل احترام ہے۔ میں نے اپنی ساری جوانی اللہ کی راہ میں وقف کر دی ہے۔ اٹھو اللہ کی رضاجوئی کو اپنا شعار بنالو۔

ان کے اساتذہ کا حلقہ بہت وسیع ہے' جن حضرات سے انھوں نے قرآن و

حدیث کی تعلیم حاصل کی اور شرف روایت حاصل کیا' ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں جن میں کئی صحابہ کرام بھی شامل ہیں۔ ان کے بھائی یحییٰ' حضرت انس بن مالک' حضرت ام عطیہ انصاریہ' رباب ام الرائح' ابو العالیہ' ابوذبیان' خلیفہ بن کعب' ربیع بن زیاد حارثی' حضرت حسن بصری کی والدہ محترمہ حضرت خیرہ' طبقات ابن سعد میں لکھا ہے کہ حسن بصری کی والدہ حضرت خیرہ رحمتہ اللہ علیہا ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی کنیز تھیں اور خود حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ نے ام المومنین حضرت ام سلمہ کے گھر میں تربیت پائی۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ خیرہ کسی کام سے گھر سے باہر جاتیں یا کسی ضروری کام میں مشغول ہوتیں تو حضرت ام سلمہ حضرت حسن بصری کو اپنا دودھ پلاتیں۔ یہ بات تہذیب الاسماء واللغات کی جلد اول میں مرقوم ہے۔ بہرحال ان کے علاوہ حضرت حفصہ بنت سیرین نے سلمان بن عامر ضبی اور ایک جماعت سے روایت کی ہے۔

حفصہ کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے' جن میں ان کے بھائی محمد بن سیرین' قتادہ' عاصم الاحول' ایوب بن خالد الحداء' ابن عون' ہشام بن حسان خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

حضرت حفصہ ثقہ راویہ تھیں۔ یحییٰ بن معین نے ان کو ثقہ اور ان سے مروی روایت کو لائق حجت گردانا ہے۔ احمد بن عبداللہ نے ان کو ثقات میں شمار کیا ہے۔ ابن حبان نے ان کا تذکرہ ثقات اصحاب حدیث میں کیا ہے۔

ان کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ ایک روایت کے مطابق ستر برس عمر پا کر ۱۰۱ھ میں فوت ہوئیں۔ یہ حافظ ابن حجر کی تحقیق ہے جو تہذیب التہذیب میں مرقوم ہے۔ ایک روایت کی رو سے ۹۲ھ میں وفات پائی۔ یہ روایت امام ابن جوزی نے صفوۃ الصفوہ میں بیان کی ہے۔

حمیدہ بنت عبید

حمیدہ بنت عبید بن رفاعہ انصاریہ کے حالات تاریخ ورجال کی مختلف کتابوں میں بیان ہوئے ہیں، مثلاً تہذیب التہذیب میں حافظ ابن حجر نے، طبقات الا تقیا میں ابن سحبان نے اور الکمال فی معرفتہ الرجال میں علامہ عبدالغنی مقدسی نے ان کے واقعات اور ان کی علمی ودینی سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے۔

یہ ۷۰ھ یا ۷۲ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئیں۔ مدینہ اس زمانے میں فقہا کا مرکز، محدثین کا گہوارہ اور علمائے دین کا مرجع تھا۔ اہل مدینہ کی رائے کو دینی معاملات میں قطعی سمجھا جاتا تھا اور شرعی امور میں ان کے فیصلے اور فتوے اور رائے کو حرف آخر گردانا جاتا تھا۔ مدینہ منورہ میں اس وقت متعدد صحابہ کرام موجود تھے اور حصول علم کے لیے لوگ دور دراز سے سفر کر کے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ حضرت حمیدہ بنت عبید رحمتہ اللہ علیہا جس خاندان میں پیدا ہوئیں وہ بھی علم اور صلاح و تقویٰ کے اعتبار سے اونچے درجے کا خاندان تھا۔ لوگ اس خاندان کے افراد کی قدر کرتے تھے اور فہم مسائل اور تحصیل علم کے لیے بعض اوقات طویل مسافت طے کر کے ان کے پاس آتے اور ان سے فیض یاب ہوتے تھے۔ اس خاندان کی علمی فیض رسانیوں کی وجہ سے ان کی ہم نشینی کو بڑی سعادت خیال کیا جاتا تھا۔

حضرت حمیدہ بنت عبید رحمتہ اللہ علیہا کی تربیت بھی اسی انداز سے ہوئی تھی اور ان کی تعلیم کے لیے بڑا اہتمام کیا گیا تھا اور انھیں جلیل القدر محدثین سے سماع حدیث کا شرف حاصل ہوا تھا، حتیٰ کہ متعدد صحابہ سے بھی انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث روایت کیں۔ اندازہ کیجیے یہ کس قدر خوش قسمت خاتون ہیں جنھیں ان حضرات کی زیارت اور ان سے حدیث روایت کرنے کی سعادت حاصل ہوئی جنھوں

نے براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا' آپ سے گفتگو کی تھی' آپ کی خدمت میں رہے تھے اور آپ کی معیت میں سفر و حضر کی مبارک گھڑیاں گزاری تھیں- پھر ان کو ان بلند بخت لوگوں سے ملاقات اور ان کے تلمذ کا بھی موقع ملا' جنھیں صحابہ کرام کی شاگردی و ہم نشینی کی سعادت میسر آئی اور وہ تابعین کہلائے- غرض یہ نہایت کریم النفس اور بلند اطوار خاتون تھیں اور روایت حدیث اور خاندانی علو مرتبت کی بنا پر انھیں مدینے اور اس کے نواح میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا- انھوں نے مشہور صحابیہ حضرت عائشہ بنت کعب بن مالک رضی اللہ عنہا سے احادیث روایت کیں اور کافی عرصہ ان کی خدمت میں رہ کر علم حدیث حاصل کیا- ان کے علاوہ بھی بعض صحابیات سے انھیں احادیث سننے اور روایت کرنے کے مواقع میسر آئے-

حضرت حمیدہ بلند اخلاق اور اونچے کردار کی خاتون تھیں- حدیث کی لوگوں کو تعلیم دیتیں اور گفتار میں نرمی و عذوبیت اختیار کرتیں' اگر کسی کی آپس میں عداوت اور خصومت ہوتی تو دونوں فریقوں کے درمیان صلح کے لیے کوشاں ہوتیں- بڑوں کی تکریم اور چھوٹوں پر شفقت کے بارے میں ممتاز تھیں' کبھی کوئی ایسی بات نہ کرتیں جس سے دوسروں کو ذہنی تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہو- نازک سے نازک موقعے پر بھی کسی سے جھگڑا نہ کرتیں- سخت سے سخت تکلیف کا بھی کسی کے سامنے اظہار نہ فرماتیں- اگر کوئی طبیعت کے خلاف بات کرتا تو صبر و تحمل سے کام لیتیں- بڑی قوت برداشت پائی تھی- کسی میں کوئی غلط بات دیکھتیں تو ٹوک دیتیں' کسی کی ناجائز حمایت نہ کرتیں' قریبی رشتہ دار بھی بے راہ روی اختیار کرتے تو ان کی تائید سے ہاتھ کھینچ لیتیں-

ان کا حلقہ تلامذہ بھی تھا' ان سے روایت کرنے والوں اور ان کے شاگردوں میں بعض اہم شخصیتیں شامل ہیں' جن میں اسحاق بن عبداللہ بن ابی طلحہ اور ان کے بیٹے یحییٰ بن اسحاق بن عبداللہ بن ابی طلحہ کے نام آتے ہیں-

ان کی شادی اسحاق بن عبداللہ بن ابی طلحہ سے ہوئی جو ان کے شاگرد اور راوی بھی ہیں- یہ وہ عظیم المرتبت شخص تھے جو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص شغف رکھتے تھے- انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے روایت کی اور تابعی کہلائے-

ان کی تمام اولاد کا تو علم نہیں' البتہ ان کے ایک بیٹے کا نام یحییٰ تھا جو اپنے والدین کی طرح بہت نیک اور حلیم الطبع تھے- ان کا پورا وقت یاد خدا میں گزرتا' تلاوت قرآن کثرت سے کرتے اور ایک ایک آیت بار بار پڑھتے اور اس کے مطالب کو ذہن میں لاتے- اہل خانہ اور بچوں کو اس کا درس دیتے اور اس کے معانی سمجھاتے- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے حصول کے لیے بڑے بڑے محدثین کی خدمت میں حاضری دیتے- والدہ اور والد سے صحابہ کے بارے میں دریافت کرتے اور اس ضمن میں پوری تفصیلات جاننے کی کوشش فرماتے-

حضرت حمیدہ بنت عبید کی وفات ۱۳۲ھ میں ہوئی-

جمانہ بنت مہاجر

حضرت جمانہ بنت مہاجر بن خالد بن ولید کے حالات طیفور کی بلاغات النساء میں درج ہیں-یہ خاتون مشہور صحابی اور عہد اسلام کے ابتدائی دور کے معروف جنگ جو اور بہادر جرنیل حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی پوتی تھیں-

ان کی ولادت مدینہ منورہ میں ہوئی-اس وقت ان کے دادا حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ زندہ تھے-ان کی ولادت پر ان کے والدین نے نہایت مسرت کا اظہار کیا اور تمام رشتے داروں نے خوشیاں منائیں-والدین کو ہر طرف سے مبارک باد کے پیغام موصول ہوئے-

حضرت جمانہ کو شجاعت و بہادری کے اوصاف ورثے میں ملے تھے' اس کے ساتھ ہی طیفور کے الفاظ میں یہ کانت من ربات الفصاحۃ والبلاغۃ یعنی ان کا شمار ان خواتین میں ہوتا تھا جو فصاحت وبلاغت میں ید طولی رکھتی تھیں اور ادب وانشا میں ممتاز تھیں-طیفور ان کی شجاعت کے بارے میں کہتا ہے وکانت فی الشجاعۃ مشھورہ کہ وہ شجاعت میں مشہور تھیں-علاوہ ازیں صداقت و بے باکی اور صاف گوئی میں بھی ممتاز تھیں-بقول طیفور کانت صادقۃ اللھجہ کہ صدق مقال اور راست گفتار میں خاص شہرت کی مالک تھیں-طیفور نے ان کے بہت سے اوصاف بیان کیے ہیں-وہ کہتا ہے حاضر جوابی اور فہم و فراست میں بھی وہ اپنے دور کی خواتین سے سبقت لے گئی تھیں-

حضرت جمانہ بنت مہاجر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے دور کی خاتون تھیں-عبداللہ بن زبیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت زبیر بن عوام کے فرزند ارجمند تھے اور حضرت زبیر عشرہ مبشرہ میں سے تھے-یعنی یہ وہ بلند

بخت صحابی تھے جنھیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی زندگی ہی میں جنت کی بشارت دے دی تھی۔ عبداللہ بن زبیر کا شمار بھی صحابہ کی مقدس جماعت میں ہوتا ہے۔ان کی والدہ حضرت اسما رضی اللہ عنہا تھیں جو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی اور حضرت عائشہ صدیقہ کی بہن تھیں۔ان کی دادی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا تھیں۔

عبداللہ بن زبیر' آنحضرت کے مدینہ منورہ میں ہجرت کر کے تشریف لانے کے بیس مہینے بعد پیدا ہوئے۔وہ مدینہ منورہ میں مہاجرین کی پہلی اولاد تھے۔ان کی ولادت سے مہاجرین میں انتہائی مسرت کا اظہار کیا گیا' کیونکہ ہجرت کے بعد مسلمانوں کے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی اور مدینہ کے یہودیوں نے مشہور کر دیا تھا کہ اب مسلمان اولاد سے محروم رہیں گے' ہم نے ان کو جادو کر دیا ہے۔ مسلمانوں کے گھر یہ لڑکا پیدا ہوا تو قدرتی طور پر انھوں نے خوشیاں منائیں اور عجیب بات یہ ہے کہ جس طرح مسلمانوں نے اس پر خوشی کا اظہار کیا اسی طرح یہودیوں کو اس سے افسوس ہوا۔ پیدا ہوتے ہی انھیں آنحضرت کی خدمت میں لایا گیا اور آپؐ نے اپنے منہ سے کھجور چبا کر ان کے حلق کو لگائی۔

حضرت عبداللہ بن زبیر بہت سے اوصاف کے حامل تھے۔حضرت معاویہ کی وفات کے بعد ہی مکہ مکرمہ میں انھوں نے اپنی خلافت کا اعلان کر دیا تھا۔انھوں نے یزید کے عہد حکومت میں مکہ مکرمہ میں بھی ان کی حکومت قائم نہیں ہونے دی۔یزید کی موت کے بعد انھوں نے لوگوں سے بیعت خلافت لی اور بہت جلد شام کے بعض مقامات کے علاوہ انھیں تمام عالم اسلامی کے خلیفہ تسلیم کیا گیا۔

بہر حال وہ اولوالعزم' شجاع' دور اندیش' معاملہ فہم' حساس' مسلمانوں کے بہی خواہ اور بلند سیرت انسان تھے۔وہ حالات کے تقاضوں سے آگاہ اور عظیم الشان شخصیت کے مالک تھے۔تمام مسلمانوں کی ہمدردیاں ان کے ساتھ تھیں۔ایک روز جمعہ کے دن مکہ مکرمہ میں منبر پر کھڑے خطبہ دے رہے تھے کہ جمانہ بنت مہاجر نے انھیں

دیکھ لیا- قریب آئیں اور کہنے لگیں اے رفیع المرتبت انسان پورا عالم اسلام تیرے لیے اللہ کے حضور دست بدعا ہے' تیری نیکیوں کا پلڑا بھاری اور برائیوں کا پلڑا خالی ہے' تمھیں نہ بنوامیہ خوف زدہ کر سکتے ہیں اور نہ ان کے حواری تیری فتح مندیوں کا راستہ روکنے کی طاقت رکھتے ہیں- تو دشمن کے لیے شمشیر خارا شگاف کی حیثیت رکھتا ہے اور تیری ہمتوں کا دائرہ نہایت وسیع ہے-

عبداللہ بن زبیر جمانہ کی پوری بات نہ سن سکے' کیونکہ وہ ان سے دور تھیں- کسی نے قریب آکر انھیں بتایا کہ جمانہ نے آپ کو مخاطب کر کے یہ الفاظ کہے ہیں- منبر سے اترے اور جمانہ کو بلا کر کہا:

اے عظیم القدر دادے کی بہادر پوتی' کیا کہہ رہی ہو؟

کہنے لگیں امیر المومنین حق آپ کی زبان پر جاری ہو گیا ہے' آپ کو گھبرانے کی قطعاً ضرورت نہیں- اللہ کی نصرت آپ کے ساتھ ہے' وہی شخص کامیاب رہے گا جو آپ کو سچا سمجھے گا اور آپ کی مساعی کی تائید کرے گا- آپ ان اسلاف کے بلند مرتبت خلیفہ ہیں جنھوں نے اسلام کی ترقی اور دین کی ترویج واشاعت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا- جن لوگوں نے آپ کی مخالفت شروع کر رکھی ہے اور آپ کے درپے آزار ہیں وہ ناکام و نامراد رہیں گے اور ان کی تمام کوششیں رائیگاں جائیں گی- عین ممکن ہے آپ کو اللہ کی راہ میں جام شہادت نوش کرنا پڑے' مگر یقین جانیے آپ کے دشمنوں کو ہمیشہ ذلت کا سامنا کرنا پڑے گا اور انھیں حقارت سے یاد کیا جائے گا- آنے والی نسلیں آپ کو خراج تحسین پیش کریں گی اور آپ کی کوششوں کو بہتر الفاظ سے یاد کریں گی- جو لوگ آپ سے غلط برتاؤ کر رہے ہیں انھیں نفرت کی نگاہ سے دیکھیں گی-

عبداللہ بن زبیر نے کہا' جمانہ میں اللہ کا ایک حقیر ترین بندہ ہوں- میری تگ ودو کا مقصد محض رضائے الٰہی اور اللہ کے دین کی خدمت ہے- میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو اور خلافت کا یہ سلسلہ برے ہاتھوں میں نہ رہے بلکہ اس میں

نیک لوگوں کا عمل دخل ہو۔ یہ اللہ کی ایک امانت ہے جو ہمارے سپرد کی گئی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس میں خیانت نہ کریں' لوگوں کو مشکلات میں نہ ڈالیں' خدا کی نافرمانی نہ کریں اور اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے رہیں۔ اگر ہم نیکی کی طرف رجوع کریں گے اور شر کے ارتکاب سے اپنے آپ کو بچا کر رکھیں گے تو اللہ کی مدد ہمارے شامل حال ہوگی اور ہم فوز و فلاح سے سرفراز ہوں گے' اور اگر ہم اللہ کے احکام کو ماننے سے انکار کریں گے تو سخت سزا کے مستحق قرار پائیں گے اور ذلت و خواری ہمارا مقدر بنے گی۔

جمانہ بولیں: امیر المومنین آپ اللہ کے دین کے حامی ہیں اور ہم آپ کے معاون ہیں۔ آپ مسلمانوں کے بارے میں عفو و درگزر سے کام لیجیے اور مخالفوں کے ساتھ سختی کا مظاہرہ کیجیے' لوگوں کے طعن نہ آپ کی عزت کو گھٹا سکتے ہیں اور نہ آپ کے راستے میں رکاوٹ ڈال سکتے ہیں۔ قریش کو خوب معلوم ہے کہ آپ ان میں سب سے زیادہ عابد' سب سے زیادہ شجاع' سب سے زیادہ فہیم اور سب سے زیادہ متقی ہیں۔ انھیں آپ کی مدد کو آنا چاہیے اور آپ جو مقصد لے کر میدان میں اترے ہیں' اس میں آپ سے تعاون کرنا چاہیے۔

بہر حال حضرت جمانہ بنت مہاجر بن خالد بن ولید رحمتہ اللہ علیہا نہایت فصیح اللسان بہادر خاتون تھیں۔ کسی قسم کے خوف و خطر کا احساس نہ کرتی تھیں۔ صداقت ان کا شعار تھا اور حق گوئی ان کے خمیر میں داخل تھی۔

حضرت فاطمہ بنت عبدالملک

حضرت فاطمہ رحمتہ اللہ علیہا مشہور اموی حکمران عبدالملک بن مروان کی بیٹی تھیں جو ۶۷ ہجری کے پس و پیش پیدا ہوئیں۔ یہ وہ خاتون ہیں' جس نے سلطنت و فرماں روائی کی آغوش میں پرورش پائی اور زندگی کی تمام منزلیں ارباب حکومت کی رفاقت اور قصر خلافت میں طے کیں۔ ان کا دادا بھی حکمران' باپ بھی حکمران' بھائی بھی حکمران' اور شوہر بھی حکمران تھا۔ سسر عبدالعزیز بن مروان (جو ان کے حقیقی چچا بھی تھے) مصر کے گورنر تھے اور بیس سال سے زیادہ عرصہ اس منصب پر فائز رہے۔ کہتے ہیں اتنی طویل مدت ان کے سوا کوئی اور شخص اس اہم عہدے پر فائز نہیں رہا۔

فاطمہ بنت عبدالملک کئی خوبیوں کا مجموعہ تھیں اور متعدد اوصاف ان کی ذات میں سمٹ آئے تھے۔ وہ بہ یک وقت عالمہ و فاضلہ بھی تھیں' حلیم الطبع اور منکسر المزاج بھی تھیں' فیاضی اور سخاوت کے وصف سے بھی متصف تھیں اور نہایت نیک اور صابرہ بھی تھیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ یہ خاتون ناز و نعمت میں پلی بڑھیں اور ہوش سنبھالتے ہی زندگی کو شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ میں پایا' مگر چہرے پر کبھی نخوت و غرور کے آثار ظاہر نہیں ہوئے اور کبھی کسی قسم کے پندار سے اپنے ذہن کو آلودہ نہیں ہونے دیا۔ علم بھی حاصل کیا تو بہت محنت سے اور اساتذہ کے سامنے باقاعدہ زانوئے شاگردی تہہ کر کے' حلم و انکسار کے جوہر سے آراستہ ہوئیں تو وہ بھی طبعی اقتضا سے۔

فیاضی و سخاوت میں بہت مشہور تھیں۔ مورخین کا کہنا ہے کہ دمشق میں ان کے مکان کو دارالضیافت کی حیثیت حاصل تھی۔ کثیر تعداد میں محتاج و مستحقین ان کے ہاں آتے اور وہ ان کی ضروریات کی تکمیل کرتیں' اصحاب ثروت اور امرا و عمال حکومت ان کے دستر خوان کی وسعت سے کام و دہن کی تواضع کرتے۔ وہ سب کا خندہ جبینی سے

استقبال کرتیں اور سب کی تکمیل حاجت کے لیے کوشاں ہوتیں۔

ان کے تلامذہ کا حلقہ بھی خاصا وسیع ہے' جن میں بڑی بڑی علمی اور مشہور شخصیتیں شامل ہیں۔ ان سے تحصیل حدیث کرنے والوں میں مغیرہ بن حکیم صغانی یمانی' عطاء بن ابی رباح' ابو عبیدہ بن عقبہ بن نافع فہری اور مزاحم (غلام عمر) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے زمانے میں علمی اعتبار سے خاص شہرت کے مالک تھے اور حدیث کے بارے میں جن کی رائے اور خیالات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ پھر ان حضرات کا سلسلہ اسناد بھی بڑا وسیع ہے جن کے تلامذہ اور فیض یافتگان کا یہ حال ہے' اندازہ کیجیے خود اس خاتون کا اپنا مرتبہ کس درجہ بلند ہوگا اور وہ علم و فضل کی کن رفعتوں پر فائز ہوں گی۔

ان کی شادی حضرت عمر بن عبدالعزیز بن مروان سے ہوئی' جو ان کے چچازاد تھے اور غالباً اس زمانے میں خناصرہ کے گورنر تھے' یہ ۸۶ھ کی بات ہے۔ اس شادی سے عمر بن عبدالعزیز بہت خوش ہوئے اور اپنے سسر (عبدالملک بن مروان) کا نہایت بلیغ و فصیح الفاظ میں شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ نے فاطمہ کو میرے حبالہ عقد میں دے کر میری قلبی تمناؤں کی حوصلہ افزائی کی ہے اور میری روحانی مسرتوں کو پروان چڑھنے کا موقع دیا ہے۔ اس تشکر و امتنان کی وجہ یہ ہے کہ خود حضرت عمر بن عبدالعزیز بھی بہت بڑے محدث اور متقی و پرہیز گار تھے اور فاطمہ بھی ان اوصاف سے متصف تھیں' یعنی طبعی رجحانات میں دونوں ہم آہنگ تھے' چنانچہ یہ ذہنی ہم آہنگی اور فکری اتحاد ہمیشہ قائم رہا اور بلند کردار بیوی نے ہر موقعے پر عظیم شوہر کی ہم نوائی کی۔ ازدواجی زندگی میں کسی موقعے پر بھی دونوں میں بعد یا اختلاف کے آثار پیدا نہیں ہوئے۔ بیوی نے شوہر کے زمانہ خلافت میں بھی وہی کچھ کیا' جس کا شوہر نے اظہار کیا یا جس بات کو شوہر کی مرضی کے مطابق سمجھا۔

شوہر کی وفاداری کے سلسلے میں ان کے بے شمار واقعات کتب سیر و تراجم میں منقول ہیں' جن سے ان کے ایثار اور قربانی کا پتا چلتا ہے۔ چند واقعات ملاحظہ ہوں۔

عمر بن عبدالعزیز' اموی حکمران سلیمان بن عبدالملک کی وفات کے بعد ۱۰صفر ۹۹ھ کو خلیفہ مقرر ہوئے تو بنوامیہ کی تمام جائدادیں اور جاگیریں ضبط کر لیں- بیوی کی وہ جاگیر بھی بحق بیت المال ضبط کر لی جو اسے باپ اور بھائیوں نے دی تھی- لیکن بیوی نے کسی قسم کے ملال کا اظہار نہیں کیا بلکہ اس باب میں شوہر کی ہم نوائی کی-

اس زمانے میں فاطمہ کے پاس ایک نہایت قیمتی ہیرا تھا جو ان کے باپ عبدالملک نے ان کو دیا تھا- حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان کو بلایا اور فرمایا تمھیں دو باتوں میں سے ایک کو اختیار کرنے کی اجازت دیتا ہوں' یا تو یہ ہیرا واپس کر دو اور مجھے دے دو تاکہ میں اسے بیت المال میں جمع کر دوں' یا پھر مجھ سے علیحدگی اختیار کر لو- فاطمہ نے جواب دیا میں آپ کو اس ہیرے پر اور اس سے کئی گناہ زیادہ ہیروں پر ترجیح دیتی ہوں' چنانچہ عمر بن عبدالعزیز نے یہ ہیرا بیت المال میں جمع کرا دیا- عمر بن عبدالعزیز کی وفات کے بعد جب یزید بن عبدالملک خلیفہ مقرر ہوا تو اس نے یہ ہیرا بیت المال سے نکال کر فاطمہ کو دینا چاہا- مگر انھوں نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا یہ میرا مال نہیں- یہ تمام مسلمانوں کا مال ہے' اسے واپس لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا-

جب عمر بن عبدالعزیز پر نزع کی کیفیت طاری ہوئی تو یہ قریب بیٹھی تھیں' نہایت صبر و شکر سے اس جلیل القدر شوہر کو دنیا سے رخصت ہوتا دیکھ رہی تھیں' لیکن کسی قسم کی آہ و زاری نہیں کی' کیونکہ شوہر نے اس سے روک دیا تھا اور انھوں نے شوہر کے حکم کی پوری تعمیل کی-

ایک بار بچوں نے کھانے کے لیے کسی بہتر چیز کا مطالبہ کیا تو کہا: اپنے باپ کو دیکھو انھوں نے دنیا کی ناز و نعمت سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے اور خلیفۃ المسلمین ہونے کے باوجود سادہ زندگی بسر کرتے ہیں' تمھیں بھی اپنے آپ کو اسی قالب میں ڈھالنا چاہیے اور باپ کی طبیعت سے ہم آہنگ ہونا چاہیے-

بہر حال یہ نہایت پرہیزگار اور سادہ مزاج خاتون تھیں اور شوہر کی طبیعت کی ہر آن رعایت رکھتی تھیں-

ایک بار کسی نے پوچھا: اپنے شوہر کی کوئی بات سنائیں تو کہنے لگیں وہ دنیا سے بے نیاز ہیں' انھوں نے اپنے آپ کو مسلمانوں کے لیے فارغ کر لیا ہے اور اپنی ذات کو ان کی مشکلات و مسائل کا مرکز بنالیا ہے۔ صبح و شام وہ انہی کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں اور میں اس ضمن میں ان کی پوری پوری معاون ہوں۔

ایک مرتبہ خاندان بنوامیہ کی عورتوں نے ان سے عمر بن عبدالعزیز کے رویے کی شکایت کی تو فرمایا تم اللہ کی مخلوق پر ظلم کر کے اور ان کے مال غصب کر کے اپنے لیے سامان عیش مہیا کرنا چاہتی ہو' میرا شوہر اللہ کے سامنے جواب دہ ہے' کیونکہ وہ مسلمانوں کا خلیفہ ہے' وہ تمھارے عیش و آرام کے لیے لوگوں کو بھوک اور تنگ دستی کے حوالے نہیں کرنا چاہتا۔

حضرت زینب بنت معدان

"آپ کو اگر اللہ سے پیار ہے تو اس سے ڈرتے اور خوف زدہ کیوں ہوتے ہو۔ قرآن تو کہتا ہے اللہ رحمٰن اور رحیم ہے' غفور اور غفار ہے' یعنی وہ انتہائی رحم کرنے والا اور حد سے زیادہ مہربان ہے اور اس کے عفوو کرم اور عطاو مغفرت کا دائرہ بدرجہ غایت وسیع ہے' وہ نہ خود کسی پر ظلم کرتا ہے اور نہ کسی کو ظلم واستبداد کی اجازت دیتا ہے' لیکن آپ اس سے اس طرح ڈرتے اور یاد کر کے روتے ہیں جیسے وہ نعوذ باللہ ان اوصاف سے خالی ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جس سے محبت اور دلی لگاؤ ہو' اس سے ڈرا نہیں جاتا اور جو لغزشوں کو نظر انداز کر دینے والا ہو اور رحم و کرم کا مالک ہو' اس سے مایوس نہیں ہوا جاتا۔ آپ اپنے کسی دوست کو یاد کر کے روتے ہیں یا خوش ہوتے ہیں؟ اپنے محبّ سے قریب ہو کر خوف محسوس کرتے ہیں یا اظہار مسرت؟

"یہ بات میری سمجھ سے بالا ہے کہ اللہ کو یاد کر کے آنسو بہائے جائیں اور اس کا ذکر ہوتے ہی کانپنا شروع کر دیا جائے۔ اگر آپ اللہ کی یاد اور اس کے ذکر میں مخلص ہیں تو اس سے آپ کو شادمانی حاصل ہونی چاہیے' نہ کہ ڈر اور خوف کی چادر اپنے اوپر اوڑھ لی جائے۔ پھر آپ کو یہ نکتہ نہیں بھولنا چاہیے کہ رونے اور آنسو بہانے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے اور جو غم ذہن یا دل پر مسلط ہوتا ہے' ختم ہو جاتا ہے۔ کیا آپ اللہ کو یاد کر کے اس لیے روتے ہیں کہ اس کی یاد کا ایک غم ہے جو آپ رو کر اس غم سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ اگر حقیقت یہی ہے تو آپ کا یہ عمل صحیح نہیں اور یہ اللہ کی حقیقی یاد کو سطح قلب سے محو کرنے کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ اللہ کی یاد کا بوجھ تو ہر وقت دل پر رہنا چاہیے' نہ کہ اسے آنسوؤں کے راستے دل سے نکال دیا جائے۔"

یہ الفاظ زینب بنت معدان نے حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ کو اس

وقت کہے تھے' جب وہ اللہ کے خوف سے زار و قطار رو رہے تھے۔

حضرت ذوالنون مصری مشہور بزرگ تھے جو ہر وقت یاد خدا اور عبادت الٰہی میں مستغرق رہتے تھے۔ ان کا نام ثوبان تھا اور باپ کا نام ابراہیم تھا' بہت بڑے عالم اور محدث تھے۔ ان کا شمار ان حضرات میں ہوتا ہے جو غلام ہونے کے باوجود علم و فضل' زہد و تقویٰ اور عبادت و تصوف کے بہت اونچے مقام پر فائز ہوئے۔ یہ اس لیے مصری کہلائے کہ مصر کے ایک گاؤں "اخمیم" کے رہنے والے تھے' جہاں حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کا مزار پرانوار ہے۔ ان کی وفات ۲ ذیقعدہ ۲۴۶ھ کو پیر کے روز کو جیزہ کے مقام پر ہوئی۔

انھیں ذوالنون اس لیے کہا جانے لگا کہ یہ ایک مرتبہ کشتی میں سفر کر رہے تھے۔ ایک اور شخص بھی اس کشتی میں سوار تھا جو بہت بڑا تاجر تھا اور بے شمار جواہر اور سونا لیے جا رہا تھا۔ اتفاق سے اس تاجر کے تمام جواہر چوری ہو گئے' کشتی میں جو لوگ سفر کر رہے تھے' ان میں سب سے زیادہ غریب اور نادار ذوالنون تھے' لہٰذا لوگوں کو انھی پر شبہ ہوا۔ ان کو ملزم قرار دے کر پکڑ لیا گیا اور وہ انھیں سزا دینے پر اتر آئے۔ حضرت ذوالنون جو بالکل سچے تھے اور جن کا چوری سے کوئی تعلق نہ تھا' اس صورت حال سے سخت پریشان ہوئے۔ انھوں نے حالت اضطراب میں دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور خدا سے دردمندانہ الفاظ میں التجا کی :

"اے اللہ تو حقیقت حال کو اچھی طرح جانتا ہے۔"

ان الفاظ کا زبان سے نکلنا تھا کہ بہت سی مچھلیوں نے پانی سے باہر سر نکالے' ان سب کے منہ میں ایک ایک موتی تھا اور وہ یہ موتی حضرت ذوالنون کی خدمت میں پیش کر رہی تھیں۔ انھوں نے یہ موتی مچھلیوں کے منہ سے نکالے اور مسافر تاجر کے حوالے کر دیے۔ اس عجیب و غریب واقعہ سے تمام مسافر انتہائی متعجب ہوئے اور سب نے گردن جھکا کر ان سے معافی مانگی۔ عربی زبان میں نون مچھلی کو کہتے ہیں۔ اسی بنا پر لوگ ان کو ذوالنون یعنی مچھلی والا کہنے لگے اور یہی لقب ان کے اصل نام (ثوبان بن

ابراہیم) پر غالب آگیا۔

حضرت ذوالنون رحمتہ اللہ علیہ کے زمانے میں حضرت زینب بنت معدان ایک بے حد نیک اور متدین خاتون تھیں جو تصوف کے نہایت باریک اور عمدہ نکات بیان کرتیں اور ایسی ایسی باتیں کہتیں جو بڑے سے بڑے صوفیا کو بھی نہ سوجھتی تھیں۔ یہ اکثر حضرت ذوالنون مصری سے ملتیں اور ان سے مختلف مسائل پر بحث کرتیں۔ ذوالنون ان کی باتوں سے بہت متاثر ہوتے اور ان سے گفتگو جاری رکھنے کی التجا کرتے۔

تاریخ کی کتابوں میں مرقوم ہے کہ زینب کا ذہن اللہ کے انوار و تجلیات سے بھرپور تھا۔ ان کے قلب کی دنیا نیکی و صالحیت سے آباد تھی' ان کا ضمیر اطمینان کی دولت سے مالا مال تھا اور انھوں نے اپنے آپ کو اللہ کی عبادت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان کی فراست و بصیرت کا یہ عالم تھا کہ کسی شخص پر ایک نظر ڈال کر بتا دیتیں کہ یہ نیکی کے کس درجے پر فائز ہے اور اس کی دنیا کا کیا حال ہے۔

خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں ایک واقعہ درج کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ذوالنون مصری حضرت زینب سے کس درجہ متاثر تھے اور ان کے حکیمانہ ارشادات کو تصوف کے باب میں کتنی اہمیت دیتے تھے۔ خطیب بغدادی ان دونوں کے ایک مرتبہ کے باہم سوال وجواب کے بارے میں لکھتے ہیں :

زینب : آپ کہاں سے آرہے ہیں ؟

ذوالنون : میں ایک پردیسی مسافر اور غریب الدیار شخص ہوں۔

زینب : بڑے افسوس کی بات ہے' اللہ کے موجود ہوتے ہوئے بھی غریب الدیار لوگ پائے جاتے ہیں۔ اللہ تو سب کا مونس اور ہر شخص کا معاون و غم خوار ہے' جب تمام دنیا پر اس کی رحمت کا شامیانہ سایہ فگن ہے تو کسی کے پردیسی اور مسافر اور بے وطن ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ذوالنون ایک عورت کی زبان سے یہ حکیمانہ فقرہ سن کر رونے لگے۔ اس پر زینب نے سوال کیا۔

آپ روتے کیوں ہیں؟

ذوالنون: میری بیماری کے لیے جس نے ایک ناسور کی صورت اختیار کر لی تھی، بہت جلد دوا مل گئی۔

زینب: اگر آپ سچ کہہ رہے ہیں تو روئے کیوں؟

ذوالنون: کیا سچا آدمی نہیں روتا؟

زینب: نہیں۔

ذوالنون: یہ کیوں؟

زینب: اس لیے کہ رونے اور آنسو بہانے سے دل کو آرام ملتا ہے اور اطمینان نصیب ہوتا ہے اور گریہ و بکا دل کے لیے امن و راحت کا باعث ہے۔ دل کا راز مخفی رکھنے کے لیے اس سے زیادہ فائدہ مند کوئی صورت نہیں کہ انسان آہ و زاری کو دل کے نہاں خانے میں چھپائے رکھے، آنسو بہانے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے اور دل کی یہ راحت اور سبک باری اصحاب عقل اور اہل قلب کے نزدیک ایک بہت بڑی کم زوری ہے اور اولیاء اللہ کا فرض ہے کہ وہ اس کم زوری سے دامن کشاں ہوں۔

حضرت ذوالنون زینب کی یہ بات سن کر بہت متحیر ہوئے اور غور و فکر میں ڈوب گئے، ان کی حیرانی اور پریشانی دیکھ کر زینب نے سوال کیا۔

آپ کس کیفیت سے دوچار ہو گئے ہیں؟

ذوالنون: میں آپ کی بات سے بہت حیران اور متعجب ہوں۔

ساتھ ہی سوال کیا

کوئی ایسی بات بتایئے جس کی وجہ سے اللہ مجھے دینی اور اخروی نفع عطا فرمائے۔

زینب: تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اب تک آپ کو جو فوائد بوقلموں اللہ کی طرف سے حاصل ہوئے ہیں، ان کے باوجود آپ زوائد کی طمع رکھتے ہیں۔

اللہ کی عنایات تو سب پر غالب اور فائق تر ہیں' اگر اللہ نے آپ کو کچھ عنایت فرمایا ہے تو اسی پر قناعت کرنی چاہیے' دوسروں کے دروازوں پر دستک دینے کی آخر کیا ضرورت پڑی؟

ذوالنون : میں زوائد کی طمع رکھتا ہوں اور اس سے اپنے آپ کو مستغنی نہیں پاتا۔

زینب : آپ سچ کہتے ہیں' اپنے اللہ سے محبت کیجیے اور اس کی عبادت کا شوق دل میں جاگزین کیجیے' ایک دن آئے گا جب اللہ کرسی پر اپنے اولیا و احبا کے لیے جلوہ فگن ہو گا اور انھیں اپنی محبت و الفت کا ایک ایسا پیالہ عطا فرمائے گا کہ اس کے بعد ان کو قطعی طور پر کسی قسم کی تشنگی کا احساس نہیں ہو گا۔

حضرت ذوالنون ایک عورت کی زبان سے یہ فقرہ سن کر پھر رونے لگے اور زینب نے ایک اور فقرہ کہا اور حضرت ذوالنون رحمتہ اللہ علیہ کو اسی حالت میں چھوڑ کر روانہ ہو گئیں۔

حضرت ابنتہ ابی حثمہ

"عمر تو بہت اونچا آدمی تھا' بحیثیت انسان اور بحیثیت امیر المومنین کے تیرا مرتبہ بڑا بلند ہے- جو بہترین کارنامے تو نے انجام دیے وہ تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ نقش رہیں گے اور آنے والی نسلیں تیرا بہترین الفاظ سے تذکرہ کریں گی- تو غریبوں کا ہمدرد اور کم زور کا دوست تھا- تو وہ تھا جس نے بیواؤں کی حفاظت کی' یتیموں کو مستحق امداد گردانا' اسلام کی بنیادوں کو مضبوط کیا' فتنوں کو دبادیا اور سنت رسول کو زندہ رکھا اور تمام عیوب ونقائص سے اس طرح دامن بچا کر پاک وصاف دنیا سے رخصت ہوا جس طرح دھونے کے بعد کپڑا میل کچیل سے پاک ہو جاتا ہے- عمر تو نے انسانوں کے حقوق تو پورے کیے ہی تھے' تو نے حیوانوں کی رکھوالی بھی کی- تو بڑا بہادر اور میدان جنگ کا عظیم سپاہی تھا- تو نے اسلام اور مسلمانوں کی نگاہ داشت کے حقوق بطریق احسن پورے کیے- کفر تیرے سامنے لرزلرز گیا اور شرک نے تیرے حضور گھٹنے ٹیک دیے- تیری قربانیوں کا دائرہ غیر محدود اور تیری فتوحات کا سلسلہ لامتناہی ہے- غیر اسلامی طاقتیں تیرے مقابلے میں قدم نہ جما سکیں اور بڑے بڑے غیر مسلم بہادر تیری تلوار کی تاب نہ لا سکے- تو نے حق داروں کو پورا پورا حق دلایا اور ظالموں کو قرار واقعی سزائیں دیں- تیرے اندر نرمی اور سختی دونوں مناسب مقدار میں جمع ہو گئی تھیں- تو وہ مرد دانا تھا کہ نرمی کے محل استعمال کو بھی خوب جانتا تھا اور سختی کے بھی.... باطل نے تیرے مقابلے میں منہ کی کھائی اور ستم رانوں کو تو نے ہر مقام پر شکست دی-"

یہ وہ الفاظ ہیں جو ابنتہ ابی حثمہ رحمتہ اللہ علیہا نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت کہے- طبری نے اپنی کتاب تاریخ طبری میں ان کے حالات بیان کیے ہیں- طبری نے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

ابنتہ ابی حثمہ کانت من بنات الفصاحتہ والبلاغتہ

یعنی ابنتہ ابی حثمہ فصیح و بلیغ خواتین میں سے تھیں۔

یہ امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانے کی خاتون ہیں۔ حضرت عمر کی انتہائی مداح تھیں۔ ان کا شمار تابعی عورتوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے متعدد صحابیات کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا اور ان سے علم حدیث سیکھنے اور پڑھنے کی سعادت حاصل کی۔ جب انھوں نے مندرجہ بالا الفاظ روتے ہوئے حضرت عمر کی میت پر کہے تو کہتے ہیں کہ وہ تمام صحابہ اشک بار ہو گئے تھے جو اس وقت وہاں موجود تھے۔ بقول طبری کے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سب سے زیادہ متاثر ہوئے اور ایک خاتون کی زبان سے یہ الفاظ سن کر زار زار رونے لگے اور کہا:

> اللہ عمر بن خطاب پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے۔ وہ فی الواقع انہی اوصاف کے حامل تھے۔ ان کے بارے میں اس خاتون نے جو کچھ کہا صحیح کہا۔ ان کی خوبیاں الفاظ میں بیان کرنا آسان نہیں۔ وہ ہر قسم کی نیکیاں سمیٹ کر اپنے ساتھ لے گئے ہیں اور برائیوں سے نجات پا گئے ہیں۔ ابنتہ ابی حثمہ ان کے متعلق کچھ اور بھی کہے گی تو وہ بھی صحیح ہو گا۔ واللہ یہ باتیں انھوں نے تکلف سے نہیں کہیں بلکہ خود بخود ان کی زبان پر طاری ہو گئی ہیں' کیونکہ حق کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ یاد رہتا ہے اور از خود زبان پر طاری ہو جاتا ہے۔ عمر جن خوبیوں کے مالک تھے' وہ بغیر کسی کے کہنے کے الفاظ کے قالب میں ڈھل گئیں۔ اللہ ابی حثمہ کی بیٹی کی عمر دراز فرمائے' جس نے عمر رضی اللہ عنہ کی صحیح صحیح تعریف کی اور چند الفاظ میں ان کے تعارف کا حق ادا کر دیا۔

یہ لائق احترام خاتون مدینہ منورہ کی رہنے والی تھیں اور ابنتہ ابی حثمہ کے نام سے مشہور تھیں یعنی ابی حثمہ کی بیٹی۔ ان کا اصل نام کیا تھا؟ یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ ۱۱ ہجری میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت کے بالکل ابتدائی دور میں پیدا

ہوئیں- بچپن ہی سے علم کی طرف رغبت تھی- ذہانت و فطانت میں اپنے سب ہم عمروں سے بڑھی ہوئی تھیں- حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت صرف بارہ تیرہ سال کی تھیں- مگر نہایت زیرک' تیز معاملہ فہم اور حاضر جواب تھیں- ساتھ ہی فصاحت و بلاغت کی نعمت سے اس قدر بہرہ ور تھیں کہ بعض اہم شخصیتیں اس سلسلے میں ان سے استفادہ کرتیں اور لوگ اپنے مکتوبات کے مضامین درست کرانے کے لیے ان کے پاس آتے- بعض بڑی عمر کی خواتین اس نوعمر سے تقریر کرنے کا فن سیکھتیں اور دو زانو ہو کر ادب سے ان کے سامنے بیٹھیں- یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہ خود بھی حصول حدیث کے لیے مختلف صحابہ رسول کی خدمت میں حاضری دیتی تھیں- مدینہ منورہ کی عورتیں اور مرد ان کی قابلیت اور ذہانت سے بہت متاثر تھے- بچے تلے مختصر جملے بولتیں اور چند الفاظ میں بڑی بات کہہ دیتیں-

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت ان کے سامنے ہوئی- اس سانحہ سے بہت مغموم تھیں- وہ اس درجہ فتنے کا دور تھا کہ پورے مدینے پر بلوائیوں کا قبضہ تھا اور نیکی و شرافت کی کوئی قیمت نہ تھی- دوسرے حضرات کی طرح یہ بھی حضرت عثمان کی حامی تھیں- لیکن بے بس تھیں اور ان کی حمایت میں کوئی عملی اقدام نہ کر سکتی تھیں- جب بلوائیوں اور فتنہ پرور لوگوں نے حضرت عثمان کا اجتماعی طور سے جنازہ اٹھانے اور پڑھنے سے بھی روک دیا تو ایک محدود مجلس میں انتہائی تاسف اور حزن و ملال کے عالم میں کہا:

"ان آنکھوں کو یہ دن بھی دیکھنا تھے- یہ وہ شہر ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کی مقدس جماعت کی نصرت و اعانت کا شرف حاصل کیا اور اسی بنا پر یہاں کے باشندے انصار کہلائے- مکہ مکرمہ کے بعد مدینہ منورہ ہی وہ مقام ہے جہاں سے اسلام کی اشاعت کے لیے راہیں ہموار ہوئیں اور فتوحات کے سلسلے کا آغاز ہوا- اسی شہر میں رسول اللہ محو استراحت ہیں' اسی میں ابوبکر اور عمر آرام فرما ہیں- ان کے علاوہ بے شمار صحابہ اس میں مدفون ہیں- اس شہر کے مکینوں نے ہر موقعے پر اسلام اور

مسلمانوں کی حمایت اور خدمت کی' مگر کتنے افسوس کی بات ہے کہ آج اسی شہر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک بلند مرتبہ صحابی اور مسلمانوں کے امیر کو بے دردی کے ساتھ شہید کر دیا گیا اور پھر اس پر بھی افسوس یہ کہ لوگوں کو ان کی نماز جنازہ پڑھنے کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ مسلمانوں کی بدقسمتی کا نقطہ آغاز ہے۔ فتنوں کا دروازہ کھل گیا ہے اور اتفاق و اتحاد کے دروازے بند ہو گئے ہیں۔ معلوم نہیں آئندہ حالات کیا رخ اختیار کریں گے اور ہمیں کیا دن دیکھنا پڑیں گے۔ کیا اب ہمیں رسوا کن گھڑیوں کا انتظار کرنا چاہیے اور اپنی شان و شوکت کے زوال کے منتظر رہنا چاہیے۔"

ان ایام پر فتن میں یہ متعدد صحابہ کے ہاں گئیں اور حالات کو معمول پر لانے کے لیے ان سے فریاد کناں ہوئیں۔ انہی دنوں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت اقدس میں بھی حاضر ہوئیں اور عرض کیا۔

"آپ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد اور آپ کے داماد ہیں۔ آپ کو اولین مسلمان ہونے کا شرف حاصل ہے۔ آپ کی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت تعریف فرمائی ہے اور آپ بے شمار فضائل و مناقب کے حامل ہیں۔ اسلام کی خدمت میں آپ کا حصہ بہت زیادہ ہے۔ آپ جرات و شجاعت کے پیکر اور عزم و تدبر میں بے مثل ہیں۔ آپ حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر کے نزدیک بھی انتہائی اہمیت کے حامل تھے۔ یہ موقع بڑا نازک ہے اور لوگ آپ کی رہنمائی کے طالب ہیں۔ میں امید رکھتی ہوں کہ مسلمان آپ کی ذات گرامی سے مایوس نہیں ہوں گے۔ وہ آپ پر نگاہیں جمائے ہوئے ہیں اور آپ ہی کو اپنا سہارا سمجھتے ہیں۔ ان کو یاس و ناامیدی کی اس فضا سے نکالنے اور تحمل و تدبر سے حالات کو پرامن بنانے میں ان کی قیادت فرمایئے۔"

یہ الفاظ ابنۃ ابی حثمہ نے اس دردناک لہجے میں کہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے-وہ پہلے ہی واقعات کی رفتار سے مغموم تھے‘اب تو ان کے غم اور تاثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا اور ایک عورت کے ان مخلصانہ جذبات سے بے ساختہ آب دیدہ ہو گئے-

اس عظیم المرتبت خاتون کی وفات حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں مدینہ منورہ میں ہوئی-وفات سے قبل انھوں نے اپنے بچوں کو وصیت کرتے ہوئے کہا:

یہ دنیا اخلاص کی دولت سے محروم ہو گئی ہے‘ تقوی دلوں سے نکل گیا ہے‘ اللہ کا خوف باقی نہیں رہا‘اس دور میں نیکی کرنا آسان نہیں‘نہ حکمرانوں میں خوف خدا باقی رہا ہے اور نہ عام لوگوں میں.... ہر شخص اپنے ذاتی مفاد کی طرف لپکتا ہے-اخلاق حسنہ کی کوئی قدر و قیمت نہیں-خدا جانے مستقبل کے پردے سے کیا ظہور میں آئے گا-یہ دنیا آخر ختم ہونے والی ہے-میں تمھیں اللہ کے تقوے کی وصیت کرتی ہوں اور حقوق العباد کی ادائیگی پر زور دیتی ہوں-یاد رکھو کسی کو تنگ نہ کرنا‘مسلمان کے خلاف تلوار نہ اٹھانا‘معمولی سے اختلاف کی بنا پر بہت بڑے فتنے کا سامان نہ فراہم کرنا-اگر کوئی مسلمان بھائی زیادتی بھی کرے تو اس سے نرمی کا برتاؤ کرنا‘گفتگو میں کبھی ایسا پہلو نہ اختیار کرنا جو دوسرے کے لیے ذہنی کوفت کا باعث بنتا ہو-زبان کو دل کے آئینے کی حیثیت حاصل ہے-اس سے جو کچھ نکلتا ہے وہ انسان کے اندرونی جذبات کا اظہار ہوتا ہے-اس لیے ہر معاملے میں زبان کو نہایت احتیاط سے حرکت دو اور گفتگو میں اعتدال اور میانہ روی کو ہاتھ سے نہ جانے دو-اسلام ترحم‘ محبت اور ایک دوسرے سے ہمدردی کا سبق دیتا ہے-نیز آپس میں اتفاق کی تلقین کرتا ہے-اسلام کی اس تعلیم پر عمل پیرا ہو گے تو فلاح پاؤ گے-اپنے آپ پر قرآن کی تلاوت کو لازم پکڑو-رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر عمل کرو- آپ کے صحابہ کے عمل کو مشعل راہ

ٹھہراؤ۔ میری زندگی چند روزہ ہے۔ میرے بعد میرے لیے دعا کرنا کہ اللہ مجھ پر اپنی رحمت فرمائے۔

جیسا کہ اوپر بتایا گیا' ان کی وفات مدینہ منورہ میں ہوئی' لیکن ایک روایت یہ بھی ہے کہ ان کے ایک بیٹے مکہ مکرمہ میں رہائش پذیر تھے۔ انھیں ملنے کے لیے مکہ آئی تھیں کہ مختصر سی علالت کے بعد وہیں انتقال کر گئیں۔

حسنہ عابدہ

خلیفہ ثانی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ خلافت میں جو شہر آباد کیے گئے' ان میں بصرہ کو خاص اہمیت حاصل ہے- یہ شہر جسے ایک مضبوط فوجی چھاؤنی کی حیثیت حاصل تھی ۱۴ھ میں آباد کیا گیا اور اس کی آبادی وغیرہ کے تمام انتظامات پر حضرت عمر نے عتبہ بن غزوان کو متعین کیا جو آٹھ سو افراد کو ساتھ لے کر خربیہ کے مقام پر پہنچے' جہاں آج کل بصرہ آباد ہے- اس سے پہلے یہ ایک صحرا اور کف دست مقام تھا- یہ کنکریلی زمین تھی اور آس پاس پانی اور چارے کا وافر سامان موجود تھا' جو عربوں کی طبیعت اور مزاج کے عین مطابق تھا- پھر حضرت عمر نے ایک اور شخص عاصم بن دلف کو اس کام پر مقرر کیا کہ جہاں عرب کے جس قبیلے کو اتارنا مناسب ہو' اتاریں اور کسی کو تکلیف نہ ہونے دیں- عام مکانوں کے علاوہ اس شہر میں سرکاری عمارتیں تعمیر کی گئیں- ایوان حکومت بنایا گیا- مختلف دفاتر قائم کیے گئے- قید خانہ تیار کیا گیا' بہترین جامع مسجد تعمیر کی گئی' فوجی بارکیں بنائی گئیں اور دیگر ضروری امور کا پورا خیال رکھا گیا اور روزانہ کی ضرورت کی تمام چیزیں بطریق احسن مہیا کی گئیں-

بصرہ میں عظیم المرتبت محدث بھی آباد تھے اور جلیل القدر فقیہ بھی' زاہد شب زندہ دار بھی تھے اور نامور سپاہی اور فوجی بھی' اصحاب نحو بھی فروکش تھے اور ارباب علم و فن بھی' بلند مرتبہ شاعر بھی قیام فرما تھے اور ماہرین لغت بھی- غرض ہر قسم کے لوگ اس شہر میں موجود تھے-

پھر متعدد علوم کا آغاز اسی شہر سے ہوا' مثلاً علم نحو' موسیقی اور عروض کی ابتدا بصرہ ہی سے ہوئی اور اسے ان علوم کا مرکز قرار دیا گیا-

صلحا اور زہاد بھی بہت بڑی تعداد میں اس شہر میں پیدا ہوئے اور اس کی طرف ان

کا انتساب ہوا' مثلاً حسن بصری اور رابعہ بصریہ ایسے عظیم القدر بزرگ اسی شہر سے تعلق رکھتے تھے- لطف کی بات یہ کہ اگرچہ مختلف ذہن وفکر کے لوگوں کے جمع ہونے کی وجہ سے اس شہر کا رنگ روپ بدل گیا تھا اور حضرت عمر ہی کے زمانے میں اس کی حالت میں تبدیلی کے آثار نمودار ہوگئے تھے' مگر بایں ہمہ واقعہ یہ ہے کہ علوم وفنون اور زہد و تقوی کا جو زور اس شہر میں رہا' اسے اپنی جگہ بڑی اہمیت حاصل ہے- یہاں کے لوگ بدرجہ غایت نیک تھے اور حد درجہ کے عابد وزاہد تھے- حضرت حسنہ عابدہ رحمتہ اللہ علیہا اسی شہر سے تعلق رکھتی تھیں- یہ ایک ایسے خاندان کی فرد تھیں جو مکہ مکرمہ سے آکر یہاں آباد ہوا تھا- یہ خاتون جہاں زہد وعبادت اور تقوی وصالحیت میں عدیم المثال تھیں' وہاں علم وفضل میں بھی فقید النظیر تھیں- دور دراز سے آکر لوگ ان کی خدمت میں حاضری دیتے اور ان کے خیالات وافکار سے مستفید ہوتے-

ان پر اس درجہ زہد و تقوی کا غلبہ تھا کہ دنیا کی تمام نعمتوں سے کلیتہً دست کش ہو گئی تھیں اور پوری توجہ عبادت پر مرکوز کر دی تھی- دن کو روزہ رکھتیں اور رات کو مصلے پر بیٹھ کر اللہ کی عبادت کرتیں- انھوں نے اپنے گھر میں کوئی ایسی چیز نہ رہنے دی جو ان کے خیال میں عبادت کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہو-

کہتے ہیں یہ خوب صورت خاتون تھیں- شادی نہیں کی تھی اور ان کا کام صرف اللہ کی عبادت تھا- ان کے حالات جو صفوہ الصفوہ میں ابن جوزی نے لکھے ہیں' ان میں مرقوم ہے کہ ایک دفعہ انھیں شاید پیاس لگی' مگر گھر میں نہ پانی تھا اور نہ کوئی برتن' جس سے کچھ کھایا یا پیا جاسکے- مکان سے تھوڑے فاصلہ پر نہر بہتی تھی- یہ پیاس کی شدت سے مجبور ہو کر نہر کی طرف دوڑیں اور کنارے پر بیٹھ کر پانی پینے لگیں- جب اوک میں پانی ڈالا اور منہ کو لگایا تو اچانک ایک عورت آگئی جو انھیں اچھی طرح جانتی تھی- اس عورت نے ان کے حسن وجمال اور بے چارگی کو دیکھ کر رحمت وشفقت کے انداز سے کہا:

"آپ شادی کرلیجیے"-

بولیں! "تم جانتی ہو' میں کس طبیعت کی مالک ہوں اور میرے خیالات کس قسم کے ہیں۔"

عورت نے جواب دیا: میں آپ سے خوب واقف ہوں اور آپ کی طبیعت کے تمام گوشوں سے آگاہی رکھتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے آپ کون ہیں اور آپ کے شب و روز کس طرح گزرتے ہیں۔

کہنے لگیں: اگر تم مجھ سے واقفیت رکھتی ہو تو پھر زیادہ بات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں شادی کرنے کو تیار ہوں بشرطیکہ میرے لیے کوئی ایسا مرد مہیا کر دو جو زہد و عبادت میں پکا ہو اور مجھے دنیا کی کوئی تکلیف نہ پہنچائے۔

عورت نے کہا: ایسے مرد کا ملنا تو بہت مشکل ہے' بلکہ کہنا چاہیے کہ اس دور میں ناممکن ہے۔

بولیں: میرا خیال بھی یہی ہے کہ ان اوصاف کا حامل مرد نہیں مل سکے گا۔

عورت نے کہا: تو آپ کسی کم درجے کے آدمی سے شادی کر لیجیے اور دنیا کی ان مصیبتوں سے نجات حاصل کیجیے۔

کہا: مجھے یقین ہے کہ میرے لیے تم میرے شعار کا شوہر حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکو گی۔ میں سچ کہتی ہوں کہ میرے دل میں یہ چیز نہیں ہے کہ میں وقتی منافع پر نظر رکھوں اور اس دنیائے فانی میں اپنے آپ کو الجھالوں۔ میں کسی دنیاوار مرد سے کبھی کوئی دنیوی مفاد حاصل کرنے کی تمنا نہیں رکھتی۔ میں نے اپنے آپ کو اللہ کی تحویل میں دے دیا ہے اور چاہتی ہوں کہ میرے لیل و نہار اسی کی یاد اور عبادت میں بسر ہوں۔

اس عورت نے کہا: آپ کے خیالات بہت بلند ہیں اور آپ کا مطمح نظر سب سے مختلف ہے۔ آپ نے دنیا کو ترک کر کے آخرت کو متاع اصلی قرار دے دیا ہے' خدا آپ کو یہ خیالات اور یہ بلند نقطہ نظر مبارک کرے۔

بولیں! میں شادی سے گریزاں نہیں ہوں' اگر تم کوئی ایسا شخص پاؤ جو خود بھی اللہ

کے خوف سے گریہ وزاری کرتا ہو اور مجھے بھی یہی تعلیم دے' خود بھی روزے رکھے اور مجھے بھی روزہ دار رہنے کی تلقین کرے' خود بھی رات کو جاگ کر اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو اور مجھے بھی یہی حکم دے' خود بھی اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرے اور مجھے بھی شاکر رہنے کا درس دے' خود بھی صدقہ و خیرات کرے اور مجھے بھی اسی راہ پر لگائے' خود بھی معذوروں اور مستحق لوگوں کی خدمت کرے اور مجھے بھی یہی تعلیم دے' تو میں ایسے شخص سے شادی کرنے کو تیار ہوں اور اگر ایسا شخص نہ مل سکے تو میرا مردوں کو دور سے سلام۔

یہ بصرہ کی عظیم الشان خاتون تھیں اور مستجاب الدعوات تھیں۔ اللہ ان کی التجاؤں اور دعاؤں کو شرف قبول بخشتا تھا۔ دور دور سے لوگ ان کی خدمت میں مختلف امور سے متعلق دعا کی درخواستیں لے کر حاضر ہوتے اور اللہ ان کی مخلصانہ دعائیں قبول فرماتا۔

ان کے والدین اور رشتے دار بھی نہایت نیک اور عبادت و زہد میں بے مثل تھے۔ انھیں کسی کے کسی کام سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کا اوڑھنا بچھونا محض یاد الٰہی تھا۔

یہ خاصی بڑی عمر کو پہنچ کر فوت ہوئیں۔ ان کے جنازے میں بصرہ کے بے شمار لوگوں نے شرکت کی' اگرچہ اس زمانے میں آمد ورفت اور پیغام رسانی کی زیادہ سہولتیں حاصل نہ تھیں اور حمل و نقل کے ذرائع محدود تھے' پھر بھی تیزی کے ساتھ گردونواح میں ان کی وفات کی خبر پہنچ گئی اور بصرہ کے قریبی قبائل اور دیہات کے بہت سے لوگ ان کے جنازے میں شریک ہوئے۔

مخہ بنت حارث حافی

حضرت مخہ رحمتہ اللہ علیہا کے حالات و فیات الاعیان' تاریخ بغداد' اور طبقات الحنابلہ میں مرقوم ہیں- یہ مشہور بزرگ بشر بن حارث حافی کی بہن تھیں اور نہایت عبادت گزار خاتون تھیں- خود بشر بن حارث بھی حد درجہ کے زاہد اور متقی تھے- ان کا کہنا ہے کہ زہد و تقویٰ اور خوف خدا کی تمام ادائیں میں نے اپنی بہن مخہ سے سیکھیں- بشر بن حارث کی پرہیز گاری اور خشیت الٰہی کی یہ کیفیت تھی کہ ان کی بہن زبدہ کہتی ہیں' ایک مرتبہ رات کو گھر آ رہے تھے' جوں ہی دہلیز پر قدم رکھا' ایک گہری سوچ نے آگھیرا- رات بھر اسی طرح کھڑے رہے' فجر کی اذان ہوئی تو سکر کا یہ عالم دور ہوا اور صحو د ہوش نے کروٹ بدلی- زبدہ کہتی ہیں میں نے عرض کیا :

بھائی کس فکر میں ڈوبے ہوئے تھے؟

فرمایا : بہن! اللہ تعالیٰ کے ایک بہت بڑے انعام کی طرف اچانک عنان خیال منتقل ہو گئی- میں سوچ رہا تھا کہ میرے کئی ہم نام اور بھی ہیں- ایک بشر عیسائی ہے' ایک بشر یہودی ہے' ایک بشر مجوسی ہے- اللہ تعالیٰ کا یہ کتنا بڑا کرم ہے کہ مجھے اس نے اپنی رحمت خاص سے نوازا' اپنی محبت کا ذوق بخشا' اپنے لطف و کرم کی دولت عطا فرمائی اور اپنے دوستوں کے حلقے میں جگہ دی- میں اسی خوشی و سرمستی کی کیفیتوں میں سرشار تھا کہ صبح کی اذان کی آواز کانوں میں پڑی- ان کا کہنا ہے کہ زہد و اطاعت کا یہ عاطفہ میرے اندر اپنی بہن مخہ کی رفاقت میں رہنے سے پیدا ہوا-

مخہ کھانے پینے کے بارے میں انتہائی محتاط تھیں- اکل حلال کے معاملے میں ان کی احتیاط غلو کی حد تک پہنچی ہوئی تھی' یعنی کھانا کھاتیں تو سو مصیبتیں جھیل کر خود جا کر

جو خرید تیں، خود پیستیں اور اپنے ہاتھ سے پکاتیں۔

مخہ محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتی تھیں۔ان کا اصل سرمایہ یا راس المال دو دانق پر مشتمل تھا (ایک دانق) سے روئی خرید تیں، ایک جمعے سے دوسرے جمعے تک اسے کاتتیں تو ایک دانق نفع حاصل ہوتا۔ان کے مکان کے آگے سے ہاتھ میں مشعل لیے ایک چوکیدار ابن طاہر گزرتا اور وہ بعض لوگوں کے ساتھ وہاں کھڑا ہو کر باتیں شروع کر دیتا۔مخہ اس موقعے کو غنیمت جانتیں اور تیزی سے سوت کاتنا شروع کر دیتیں۔ مشعل کی روشنی میں کاتا ہوا سوت ظاہر ہے قدرے صاف اور باریک ہوتا اور جو اندھیرے میں کاتا جاتا وہ کچھ موٹا ہوتا۔

مخہ کو دو قسم کے اس مال سے یہ تشویش لاحق ہوئی کہ اسے کیوں کر فروخت کیا جائے اور گاہک سے اس بارے میں کیا کہا جائے۔اس خلش کو دور کرنے کی غرض سے وہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔مورخین نے لکھا ہے کہ وہ ان کے مکان پر گئیں، دروازہ کھٹکھٹایا، امام احمد نے اپنے صاحب زادہ عبداللہ سے کہا دیکھو تو باہر کون ہے، معلوم ہوتا ہے کوئی خاتون ہیں اور اندر آنے کی اجازت چاہتی ہیں۔باہر نکل کر عبداللہ نے دیکھا تو واقعی ایک خاتون سر جھکائے کھڑی تھیں۔امام نے اندر بلایا۔وہ آئیں سلام کر کے مودب ہو کر بیٹھ گئیں۔

عرض کیا: حضرت دو باتیں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں۔

فرمایا کہو۔

عرض کیا: پہلی بات تو یہ ہے کہ میں سوت کات کر گزر بسر کرتی ہوں۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی کے چراغ کی روشنی میں کات لیتی ہوں، کبھی پیسے ہوں تو اپنا چراغ جلا لیتی ہوں، لیکن کبھی تیل کم ہونے یا نہ ہونے کی وجہ سے چراغ بجھ جاتا ہے، لیکن میں اپنا کام جاری رکھتی ہوں اور چاند کی روشنی میں چرخہ چلاتی اور سوت کاتتی ہوں۔دریافت طلب بات یہ ہے کہ جب میں سوت بیچوں تو کیا گاہک کو صاف صاف بتا دینا چاہیے کہ سوت دو حصوں

میں منقسم ہے- یہ حصہ چراغ کی روشنی میں کاتا گیا ہے اور یہ چاند کی ضو میں تیار ہوا ہے-

امام نے فرمایا: دونوں میں کچھ فرق ہوتا ہے؟

عرض کیا: جی ہاں! چاند کی روشنی چونکہ کم ہوتی ہے' اس لیے اس میں کاتا ہوا سوت ذرا موٹا ہوتا ہے اور دوسرا باریک-

امام فرماتے ہیں: **فعليك ان تبيني** (یعنی تمھارا فرض ہے کہ اتنا فرق بھی کھول کر بیان کردو-)

معاملات میں دیانت کے تقاضوں کا اندازہ کیجیے اور سوال کرنے والی اور جواب دینے والے کی دینی ذمہ داریوں کے شدت احساس کو ملاحظہ فرمایے- غور کیجیے دیانت اور تقوی کا معیار کتنا اونچا ہے--- خاتون کی اس جواب سے تشفی ہو جاتی ہے-

اب وہ دوسرا سوال پوچھتی ہیں--- اگر مریض تکلیف سے کراہنے لگے اور شدت الم سے چیخ پکار کرے تو اللہ کے حضور یہ شکوہ تو متصور نہیں ہو گا؟

امام احمد جواب دیتے ہیں ارجوا ان لایکون (میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہو گا) یعنی اللہ کی رحمتوں سے یہی توقع ہے کہ وہ ہماری مجبوریوں اور کمزوریوں کے پیش نظر اسے شکوہ قرار نہیں دے گا' بلکہ اسے اپنی طرف رجوع والتجاہی کا ایک پیرایہ ٹھہرائے گا اور اپنی یاد اور دعا سے تعبیر کرے گا کیونکہ اس حالت میں انسان یاد تو بہر حال اللہ ہی کو کرتا ہے اور یہ اقرار کرتا ہے کہ تکلیفوں' مصیبتوں اور بیماریوں کو وہی رفع کرنے والا ہے-

دونوں سوالوں کا جواب پا کر خاتون عرض کرتی ہیں-

حضور: اجازت ہے-

امام فرماتے ہیں: آپ جاسکتی ہیں-

وہ رخصت ہو جاتی ہیں تو امام اپنے بیٹے عبداللہ سے کہتے ہیں-

جس عورت کی دیانت اور تقوے کا یہ حال ہے' معلوم تو کرو یہ کون ہے؟

عبداللہ اس کے پیچھے جاتے ہیں اور جب وہ مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی بشر بن حارث کے مکان میں داخل ہوتی ہیں تو وہ لوٹ آتے ہیں اور باپ سے کہتے ہیں۔

یہ خاتون بشر بن حارث کی بہن ہیں اور ان کا نام مخہ ہے۔

امام فرماتے ہیں میرا ابھی یہی خیال تھا' یقیناً یہ بشر کی بہن مخہ ہی ہو سکتی ہے۔

عجردہ عمیہ

حضرت عجردہ عمیہ بصرہ کی ایک عابدہ وزاہدہ خاتون تھیں۔ابن جوزی نے صفوۃ الصفوہ میں ان کا تذکرہ کیا ہے' لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کی تاریخ ولادت کیا ہے۔ بچپن کا زمانہ کس حالت میں گزرا' کہاں اور کن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اور کب موت کی آغوش میں گئیں۔ جو حالات معلوم ہو سکے ہیں' وہ یہ ہیں۔

یہ بصرہ کی رہنے والی تھیں اور عبادت وزہد میں اپنی مثال آپ تھیں' شب زندہ دار تھیں' تمام رات اللہ کی عبادت میں مصروف رہتیں اور نوافل پڑھنے میں رات بسر کر دیتیں۔ بسا اوقات یہ ہوتا کہ ادھر سورج غروب ہوا' رات کی تاریکی چھانے لگی اور ادھر یہ عبادت میں مصروف ہو گئیں اور پھر اذان فجر تک اسی عالم میں کھڑی رہیں۔ بعض دفعہ سحر کی تنہائیوں میں جب دل کلیتہً اللہ کی یاد میں مستغرق ہو جاتا اور یہ عبادت میں کھو جاتیں تو نہایت غم ناک دردانگیز آواز سے پکارتیں۔

اے پروردگار عالم! تیرے عبادت گزار بندے تمام دنیا سے منقطع ہو کر تیرے دروازے پر حاضر ہو گئے ہیں' تو ہی ان کا مالک اور ان کی مغفرت کے اسباب پیدا کرنے والا ہے۔ یہ عاجز وناتواں بندے ہیں' تیرے سوا ان کا کوئی ٹھکانا نہیں' تو ان کی آرزوؤں کو قبول فرما اور انھیں دین ودنیا کی نعمتوں سے سرفراز کر۔

یہ دردناک آواز جب شب کی تاریکیوں کو چیر کر لوگوں کے کانوں سے ٹکراتی تو لوگ بے تاب ہو ہو جاتے اور تمام تر توجہ یاد خدا میں لگا دیتے۔ اس کے اس انداز عبادت سے متاثر ہو کر اور ذکر الٰہی کی اس ادائے خاص سے اثر پذیر ہو کر بے شمار لوگ اسلام کی نعمت سے مالا مال ہوئے اور اپنے آپ کو اللہ کی تحویل میں دے دیا۔

پھر عبادت کا یہ سلسلہ گنتی کے چند ہفتوں یا چند مہینوں تک ہی جاری نہیں رہا'

بلکہ اس نے متواتر تیس سال تک طول کھینچا' یعنی جب سے شروع کیا' موت کے دروازے تک اسے جاری رکھا اور اس پر التزام کیا- قلب پر اس قدر رقت طاری ہو گئی تھی کہ ہر وقت خوف خدا سے روتی رہتیں اور کسی آن آنکھوں سے پانی خشک نہ ہوتا-

عجردہ عمیہ صرف عابدہ وزاہدہ ہی نہ تھیں' ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ جہاں رات مصلے پر صرف کرتیں اور یاد خدا میں مشغول رہتیں' وہاں سورج نکلتے ہی لوگوں کی خدمت میں مصروف ہو جاتیں' بچوں اور عورتوں کو قرآن وحدیث کی تعلیم دیتیں اور کام کاج میں ان کا ہاتھ بٹاتیں-

آمدنی کا کوئی معقول ذریعہ نہ تھا' تاہم دل کی بہت سخی تھیں اور سخاوت کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتیں' ضرورت مندوں کی درہم و دینار سے مدد کرتیں- بھوکے کو کھانا کھلاتیں' کسی کے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں تو لباس کا انتظام فرماتیں' جوتی نہیں ہے تو مہیا کرتیں' یہاں تک کہ مجاہدین کے لیے چندہ فراہم کرتیں اور اپنی گرہ سے بھی ان کی اعانت کے لیے ساعی ہوتیں- اور اس دور کی خواتین کی یہ صفت تھی کہ وہ ہر ضرورت مند کا سہارا بنتیں اور ان کی امداد و نصرت کے لیے اپنی تمام کوششیں وقف کر دیتیں- اس زمانے میں تنظیموں اور اداروں کا یہ ہمہ گیر سلسلہ تو نہ تھا جو اب نظر آرہا ہے' البتہ انفرادی مدد میں وہ لوگ بہت پیش پیش رہتے اور مجموعی حیثیت سے لوگوں کی اعانت میں ان کے قدم آگے ہی ہوتے-

عجردہ عمیہ کی عبادت و ریاضت اور اعانت و نصرت کے سلسلے میں حضرت آمنہ بنت یعلی بن سہل کا کہنا ہے کہ جب فضائے بسیط پر رات کی سیاہ چادر تن جاتی تو خاص لباس زیب تن کر لیتیں اور ایک خاص انداز سے عبادت میں مصروف ہو جاتیں اور پھر سحری تک برابر یہ سلسلۂ عبادت جاری رہتا- سحری کے بعد مصلے پر بیٹھ جاتیں اور ایک ہیئت خاص میں طلوع فجر تک حالت جلسہ میں رہتیں- پھر فجر کی نماز ادا فرماتیں' بعد ازاں تلاوت قرآن کرتیں' بچوں اور عورتوں کو درس دیتیں اور اس سے فارغ ہو کر کچھ کھا پی کر گھریلو کاموں میں عورتوں کی مدد کرتیں-

حضرت آمنہ بنت یعلی ان کے اس روزانہ کے معمول کی شہادت دیتے ہوئے کہتی ہیں کہ میں نے کئی دفعہ انھیں اس کیفیت میں دیکھا اور محسوس کیا کہ شب بیداری یا دن کے کاموں کی تھکاوٹ کے کوئی آثار ان کے چہرے پر نہیں ہوتے تھے۔

نہایت سادہ زندگی بسر کرتی تھیں۔ لباس اور اکل وشرب کے باب میں کسی نوع کا تکلف نہ کرتیں، حتی کہ عید کے روز بھی سادہ لباس میں ملبوس ہوتیں۔ جن لوگوں نے انھیں عید کے دن دیکھا وہ کہتے ہیں کہ وہ عید پڑھنے کے لیے نکلیں تو صوف کا جبہ، صوف کی چادر اور صوف کی عبا زیب تن کیے ہوئے تھیں اور یہ لباس اتنا موٹا تھا کہ دور سے اس پر چمڑے کا شبہ ہوتا تھا۔

دوسری عبادات کے ساتھ وہ روزے بھی التزام سے رکھتیں۔ فرض روزے تو خیر رکھتی ہی تھیں، اس کے علاوہ نفلی روزے بھی ممنوعہ ایام کے علاوہ ترک نہ کرتیں۔ منقول ہے کہ انھوں نے متواتر ساٹھ سال روزے رکھے، البتہ ساٹھ سالوں میں وہ دن مستثنیٰ ہیں جن میں روزے رکھنا حرمت کے ذیل میں آتا ہے، مثلاً ایام عید وغیرہ۔

اس سے زیادہ ان کے بارے میں کوئی بات تاریخ ورجال کی کتابوں سے معلوم نہ ہو سکی۔

ام عاصم بنت عاصم

ایک رات خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ حسب معمول مدینہ منورہ کی گلیوں میں گشت لگا رہے تھے۔ ان کا غلام اسلم بھی ساتھ تھا۔ گشت لگاتے لگاتے تھک گئے تو ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ مکان کے اندر ایک عورت اپنی لڑکی سے کہہ رہی تھی۔

بیٹی! اٹھو اور دودھ میں پانی ملا دو۔

لڑکی نے کہا: امیر المومنین نے شہر میں منادی کرا دی ہے کہ دودھ میں پانی نہ ملایا جائے۔

ماں نے جواب دیا: بیٹی یہ رات کا وقت ہے' اس وقت نہ امیر المومنین دیکھ سکتے ہیں اور نہ منادی کرنے والے۔ تم جلدی سے اٹھو اور دودھ میں پانی ملا دو۔

لڑکی نے نہایت سختی سے کہا: امی خدا کی قسم یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ بہ ظاہر تو امیر المومنین کی اطاعت کا دم بھرا جائے اور بہ باطن ان کی نافرمانی اور عدم اطاعت کے بدنما داغ سے اپنا دامن آلودہ کیا جائے۔

امیر المومنین عمر فاروق دروازے پر بیٹھے ماں بیٹی کی یہ گفتگو سن رہے تھے' چلنے لگے تو غلام اسلم سے کہا اس دروازے اور جگہ کو یاد رکھو۔ صبح ہوئی تو اسے بھیجا کہ پتا کرو یہ کون عورتیں تھیں' نیز معلوم کرو کہ ان کے شوہر ہیں یا نہیں۔ غلام نے پتا کر کے بتایا کہ لڑکی کنواری ہے اور ماں بیوہ ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے تمام بیٹوں کو جمع کیا اور کہا اگر مجھے نکاح کی ضرورت ہوتی تو میں اس لڑکی سے نکاح کر لیتا' لیکن تم میں سے جو پسند کرے' میں اس سے اس کا نکاح کرا سکتا ہوں۔

ان کے لڑکوں میں سے عبداللہ اور عبدالرحمان کی بیویاں موجود تھیں' اس لیے انھیں نکاح کی ضرورت نہ تھی' البتہ عاصم بن عمر کنوارے تھے' لہٰذا انھوں نے اس لڑکی سے عقد کرلیا اور اسی کے بطن سے خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز کی ماں ام عاصم پیدا ہوئیں۔

ایک روایت یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود حضرت عاصم رضی اللہ عنہ ہی کو اس لڑکی کا پتا لگانے کے لیے بھیجا اور ان سے کہا کہ تم اس سے نکاح کرلو' کیونکہ اس سے ایک ایسا شہسوار پیدا ہوگا جو تمام عرب کا سردار ہوگا' چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس سے حضرت عمر بن عبدالعزیز پیدا ہوئے۔

ان کے شوہر حضرت عاصم بن عمر فاروق رضی اللہ عنہما ۷۰ھ میں اور ایک روایت کے مطابق ۷۳ھ میں فوت ہوئے۔

حضرت ام عاصم رحمتہ اللہ علیہا اپنے دور کی عظیم الشان خاتون تھیں' نیکی و پاک بازی میں سب سے آگے تھیں۔ حلیم الطبع' پاک طینت' عالمہ حدیث' اور نہایت اونچے مرتبے کی عورت تھیں۔ بہت بڑی محدثہ اور فقیہہ تھیں۔ انھوں نے اپنے باپ حضرت عاصم بن عمر سے بھی احادیث روایت کیں اور بعض دیگر صحابہ سے بھی روایت کا شرف حاصل کیا۔

ان کے شوہر نامدار عبدالعزیز بن مروان مصر کے گورنر تھے۔ جب عمر بن عبدالعزیز پیدا ہوئے تو ام عاصم مدینہ منورہ میں تھیں۔ عمر بن عبدالعزیز بڑے ہوئے تو عبدالعزیز بن مروان نے اپنی بیوی ام عاصم کو خط لکھا کہ بچے کو لے کر مصر آجائیں۔ وہ اپنے چچا حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس آئیں اور اپنے شوہر کے خط کی اطلاع دی۔ انھوں نے فرمایا تم چلی جاؤ' لیکن اس بچے کو یہیں رہنے دو' کیونکہ ہم بہتر طریقے سے اس کی تعلیم و تربیت کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

یہ مصر پہنچیں تو بچہ یعنی عمر ان کے ساتھ نہ تھا۔ ان کے شوہر عبدالعزیز بن مروان نے ان کو بغیر بچے کے دیکھا تو پریشانی کے عالم میں پوچھا! ''عمر کہاں ہے؟

انھوں نے جواب دیا: میرے چچا حضرت عبداللہ بن عمر نے اس کو اپنے پاس رکھ لیا ہے تاکہ بہتر انداز سے ان کی نگرانی میں اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے۔

اس سے عبدالعزیز بن مردان بہت خوش ہوئے اور فرمایا تم نے بہت اچھا کیا یہاں کی بہ نسبت وہاں (مدینہ منورہ میں) اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام زیادہ اچھا اور عمدہ ہو سکے گا۔

حضرت ام عاصم بنت حضرت عاصم، امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی پوتی تھیں۔ خاندانی اور ذاتی اعتبار سے ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ یہی وہ نیک بخت خاتون ہیں جن کو خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز کی ماں ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہ راویہ حدیث بھی تھیں۔ انھوں نے اپنے باپ عاصم سے حدیث کی روایت و سماع کی۔ پھر آگے ان کے تلامذہ کا بھی حلقہ پیدا ہوا جس میں خود ان کے عظیم القدر بیٹے حضرت عمر بن عبدالعزیز بھی شامل ہیں جو ۳۹ سال عمر پاکر ۲۵ رجب ۱۰۱ھ کو فوت ہوئے۔

حضرت ام عاصم بنت عاصم نہایت بلند اخلاق اور ہم درد خلائق خاتون تھیں، منقول ہے کہ ان کی ذات سے کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچی۔ وہ سب کی خیر خواہ تھیں۔ میل جول اور اخلاقی بلندی میں کوئی ان کا حریف نہ تھا، گفتار اور کردار میں سب سے ممتاز تھیں، لوگوں کی مدد کرنا اور مستحقین و مساکین کا خیال رکھنا ان کا شیوہ تھا۔ جرأت و بسالت میں بھی اپنا جواب نہ رکھتی تھیں۔ ان کی رگوں میں خاندان فاروقی کا جو لہو دوڑ رہا تھا، اس کا اثر ان کے ہر عمل اور ہر قول میں نمایاں تھا۔

ان کی وفات اپنے شوہر عبدالعزیز بن مردان کے پاس ہوئی۔ یہ وہ خاتون ہیں جن کے ننھیال بھی بلند مرتبت تھے، شوہر بھی بڑی عزت و شان کے مالک تھے اور لوگوں میں ان کو خاص قدر و منزلت حاصل تھی۔ پھر اللہ نے ان کو جو بیٹا (عمر بن عبدالعزیز) عطا فرمایا وہ بھی عدیم النظیر صلاحیتوں کا حامل تھا۔ علاوہ ازیں یہ ذاتی طور پر بھی تقویٰ و طہارت کا مجسمہ تھیں اور کوئی ان کی ہم سری کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔ اس

حیثیت سے یہ خاتون بہت خوش بخت تھیں جو اللہ کے گوناگوں انعامات کی مستحق قرار پائیں۔

فاطمہ بنت مروان

حضرت فاطمہ بنت مروان' حضرت عمر بن عبدالعزیز کی پھوپھی تھیں اور نہایت متوازن ذہن کی خاتون تھیں۔ ان کے جذبات واحساسات کو سمجھنے کے لیے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد پر ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے جنھیں بجا طور پر خلیفہ راشد کہا جاتا ہے' اصلاح احوال اور معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے نہایت اہم اور بنیادی قدم اٹھائے۔ انھوں نے اس سلسلے کا آغاز اپنے گھر سے کیا۔ مسند خلافت پر متمکن ہوتے ہی سب سے پہلے اپنی اس جائداد اور اموال واسباب کو بیت المال کے حوالے کیا جو خاندانی اعتبار سے خود انھیں حاصل ہوئی تھی۔ پھر اپنی بیوی کی وہ جائداد بحق سرکار ضبط کی جو انھیں والد یا بھائیوں کی طرف سے ملی تھی۔ پھر خاندان کے دوسرے شہزادوں اور رئیسوں کی طرف عنان توجہ مبذول کی اور ان سے وہ تمام جاگیریں چھین لیں جو انھیں وراثت میں عطا ہوئی تھیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا موقف یہ تھا کہ یہ مال مقصوبہ ہے' اس کے اصل مالک بنوامیہ کے شہزادے یا اس خاندان کے افراد نہیں' بلکہ یہ پوری مسلمان امت کا مال ہے' اس سے صرف ایک ہی خاندان کو متمتع نہیں ہونے دیا جائے گا' سب مسلمان اس سے برابر فائدہ اٹھائیں گے۔

ان کا فرمان تھا کہ میرے دور خلافت میں کسی کو نشانہ ستم نہیں بنایا جائے گا' کسی پر ظلم وجور نہیں کیا جائے گا۔ یہ کبھی نہیں ہوگا کہ ایک شخص تو غیر محدود زمین کا مالک ہو' اس کی جاگیریں میلوں کے رقبے میں پھیلی ہوئی ہوں اور اس کے سیم وزر کی کوئی انتہا نہ ہو' وہ اپنی بے پناہ سرمایہ داری کے بل بوتے پر من مانی کارروائیاں کرتا پھرے' کوئی اسے پوچھنے والا نہ ہو۔ وہ فلک بوس محلات وقصور کا مالک ہو اور لوگ محض سرمائے کی بنا

پر اس کی عزت واحترام کے لیے مجبور ہوں۔ مگر دوسری طرف ایسے لوگ ہوں جو غربت وافلاس کی زندگی بسر کرتے ہوں' ان کے بچے ایک ایک پیسے کے محتاج ہوں' انھیں صرف اس لیے نظر انداز کر دیا جائے کہ ان کی جیبیں درہم و دینار کے بوجھ سے خالی ہیں' وہ جھونپڑیوں میں رہ کر زندگی کے دن پورے کرتے ہوں اور ایک انچ زمین کے بھی مالک نہ ہوں۔ یہاں یہ فرق و امتیاز ہرگز برداشت نہیں کیا جائے گا اور کسی کو محض پیسے کی بنا پر قابل احترام نہیں گردانا جائے گا۔ عزت واحترام کا پیمانہ روپیہ پیسہ یا جاگیر نہیں' انسانیت ہے' لوگوں کو انسانیت کی ترازو میں تولا جائے گا' جاگیرداری یا سرمایہ داری کی ترازو میں نہیں۔

ظاہر ہے اس نقطہ نظر کو بنوامیہ کے وہ شہزادے برداشت نہیں کر سکتے تھے جن کی پرورش مال و دولت کے ماحول میں ہوئی تھی اور جن کی زندگی کا دارومدار محض روپیہ پیسہ تھا' چنانچہ جب ان کی سرمایہ داری پر زد پڑی' جاگیریں ضبط ہونے لگیں اور آمدنیوں کا دائرہ سمٹنے لگا تو وہ ایک دم حضرت عمر بن عبدالعزیز کی مخالفت پر اتر آئے اور ان کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔ ان لوگوں نے کچھ ایسے افراد سے بھی رابطہ قائم کیا جو حضرت عمر بن عبدالعزیز سے بہت زیادہ تعلق رکھتے تھے اور وہ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ بنوامیہ نے اس کے لیے جن افراد کو منتخب کیا' ان میں ان کی حقیقی پھوپھی فاطمہ بنت مروان رضی اللہ عنہا خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں۔

فاطمہ بنت مروان کاروبار حکومت میں خاص اہمیت رکھتی تھیں اور سلاطین بنوامیہ تمام اہم مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ یہ خلیفہ کی بیٹی' خلیفوں کی بہن اور خلیفہ کی پھوپھی تھیں اور امور سلطنت کے نشیب و فراز کو خوب سمجھتی تھیں۔ ان کے مشورے بڑے صائب اور رائے بڑی صحیح ہوتی تھی۔ مروان جسے ایک طرح سے سلطنت بنوامیہ کے بانی کی حیثیت حاصل ہے' اپنی اس بیٹی کو بہت عقل مند سمجھتا تھا۔ اس کے زمانے میں یہ اگرچہ کم سن تھیں' مگر عقل و فہم میں بڑی تیز تھیں اور بہترین مشورے دیتی تھیں۔ یہ بنوامیہ کی ان خواتین میں سے ہیں جو حکومت میں بھی

اثر و رسوخ رکھتی تھیں اور عوام میں بھی احترام کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں۔ غریبوں کی ہم درد، عوام کی خیر خواہ، تیموں کی معاون، بے کسوں، بے نواؤں اور بیواؤں کی مددگار۔۔۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ جو حکومت چھوٹے طبقے کا خیال نہیں رکھے گی اور عوام کی ضروریات پوری نہیں کرے گی، وہ لوگوں کے دلوں میں اپنے لیے جگہ نہیں بنا سکے گی اور کبھی کامیابی کی منزلیں طے نہیں کر سکے گی۔ عوام سے بے نیاز حکمرانوں کے دن بہت تھوڑے ہوتے ہیں اور ان کا تخت حکومت ہمیشہ ڈگمگاتا رہتا ہے۔

یہ خاتون بڑی خوبیوں کی مالک تھیں۔ اگرچہ یہ حکومت و سلطنت کے ماحول میں پروان چڑھی تھیں اور انھوں نے یوم پیدائش ہی سے آرام و آسائش کی زندگی بسر کی تھی اور ناز و نعمت میں پلی بڑھی تھیں، مگر ان کی عادتیں بالکل مختلف تھیں، وہ نہ کبھی شہزادی بن کر رہیں اور نہ شہزادیوں کی عادات کو اپنایا اور نہ ان کی حوصلہ افزائی کی، ہمیشہ عوامی زندگی بسر کی اور غریبوں سے تعلق و ربط اور ان کی معاونت و حمایت کو اپنا شعار بنائے رکھا۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ حکمرانوں، بادشاہوں اور امیروں کے گھروں میں پلی ہوئی عورتوں کی دنیا بالکل بدل جاتی ہے اور وہ فخر و غرور کا پیکر بن جاتی ہیں۔ نہ ان میں کم زوروں سے ہم دردی کا جذبہ باقی رہتا ہے اور نہ یتامیٰ و مساکین کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتی ہیں۔ ان کا وقت اپنے ہی بناؤ سنگھار اور نئے سے نئے فیشن ایجاد کرنے میں صرف ہوتا ہے۔ لیکن فاطمہ بنت مروان میں یہ بات نہ تھی، ان کی طبیعت میں سادگی اور فطرت میں نیکی کا جذبہ موجزن تھا اور یہی وجہ ہے کہ سب لوگ ان کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ تمام معاملات میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے اور ان کے مشوروں پر عمل پیرا ہوتے تھے۔

یہ حضرت عمر بن عبدالعزیز (خلیفہ راشد) کی حقیقی پھوپھی تھیں۔ جب عمر بن عبدالعزیز نے وہ جاگیریں ضبط کر لیں جو بنو امیہ کے خاندان کے لوگوں کو دی گئی تھیں تو خاندان کے تمام افراد حضرت فاطمہ بنت مروان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا

کہ وہ اپنے بھتیجے کے پاس جا کر ان کی نمائندگی کریں اور ان کی جائدادیں اور جاگیریں انھیں واپس دلائیں- چنانچہ وہ عمر بن عبدالعزیز کے پاس گئیں اور جا کر بیٹھ گئیں-

عمر بن عبدالعزیز نے انھیں دیکھ کر فرمایا: پھوپھی کس طرح تشریف آوری ہوئی؟

کہا: یوں ہی آئی ہوں-

فرمایا: اگر کوئی بات ہے تو فرمائیے' آپ چونکہ میرے پاس تشریف لائی ہیں' اس لیے پہلے آپ کو بات شروع کرنا اور اپنا مدعا بیان کرنا چاہیے-

فاطمہ نے کہا: مجھے خاندان کے تمام لوگوں نے نمائندہ بنا کر آپ کے پا بھیجا ہے اور یہ سب لوگ تمھارے قرابت دار ہیں اور انھیں شکایت ہے کہ تم نے ان سے وہ روٹی چھین لی ہے جو بنوامیہ کے خلفا نے انھیں دی تھی-

فرمایا: میں نے ان کا نہ کوئی حق غصب کیا ہے اور نہ ان کی روٹی چھینی ہے-

بولیں: سب لوگ اس سلسلے میں شاکی ہیں اور مجھے خطرہ ہے کہ وہ تمھارے خلاف بغاوت کردیں گے-

فرمایا: اگر میں قیامت کے سوا کسی اور دن سے خوف محسوس کروں تو خدا مجھے اس کی تکلیف سے محفوظ نہ رکھے-

اس کے بعد ایک اشرفی اور گوشت کا ایک ٹکڑا اور ایک انگیٹھی منگوائی- اشرفی آگ میں ڈال دی- جب وہ سرخ ہوگئی تو اسے اٹھا کر گوشت کے ٹکڑے پر رکھ دیا جس سے وہ بھن گیا- اب پھوپھی سے مخاطب ہو کر کہا-

کیا اپنے بھتیجے کے لیے آپ اس قسم کے عذاب سے پناہ نہیں مانگتیں؟

دوسری روایت میں ہے کہ انھوں نے کہا-

اے پھوپھی! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ایک نہر پر چھوڑ دیا- پھر ایک شخص (ابوبکر) اس نہر کا محافظ ہوا' جس نے اس کو جوں کا توں رہنے دیا اور اس میں کسی نوع کی تبدیلی نہیں کی- پھر ایک دوسرا شخص (عمر) اس کا نگران مقرر ہوا' اس نے بھی اس کو اسی طرح رہنے دیا اور اپنے پیشرو کے نقش قدم پر چلا- پھر تیسرے شخص

(عثمان) کو اس کی تولیت حاصل ہوئی' اس نے اس سے ایک چھوٹی سی نہر نکالی' پھر یہ نہر معاویہ کے قبضے میں آئی' انھوں نے اس سے متعدد نہریں نکالیں- بعد ازاں یہ نہر یکے بعد دیگرے یزید' مروان' عبدالملک' ولید اور سلیمان کے تسلط میں آئی- اب اس نہر کا نگران مجھے مقرر کیا گیا ہے اور یہ نہر خشک ہو چکی ہے اور اس میں پانی کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں رہا ہے- خدا کی قسم اگر میں زندہ رہا تو تمام ذیلی نہروں کو پاٹ کر وہ نہر جاری کر دوں گا جو بہت بڑی اور عظیم الشان نہر تھی-

کہا: عمر تم میرے قابل قدر بھتیجے ہو' تمھارے ارادے بہت نیک ہیں اور تم برسر حق ہو- آئندہ میں تمھارے ساتھ کبھی اس موضوع پر بات نہیں کروں گی- میں جانتی ہوں کہ تم سچے ہو اور تم کو اسی طرح کرنا چاہیے تھا- میری دعا ہے اللہ تعالیٰ تمھیں اس نیک مقصد میں کامیابی عطا فرمائے- بنو امیہ نے جو جائدادیں غصب کر رکھی ہیں اور لوگوں کے جو حق چھین لیے ہیں' انھیں ان سے چھین کر اصل مالکوں کو واپس کرنا یا بیت المال کے لیے ضبط کرنا نہایت ضروری تھا-

عاتکہ بنت مروان

عاتکہ بنت مروان بن حکم خاندان بنوامیہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ مروان کو اس خاندان میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ معاویہ بن یزید بن معاویہ بن ابوسفیان کی وفات کے بعد ایسے حالات پیدا ہوگئے تھے کہ معلوم ہوتا تھا حکومت بنوامیہ کے خاندان کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ لیکن مروان اس طرح میدان میں آیا کہ حکومت دوبارہ مستحکم ہوگئی اور جو خطرات ابھر آئے تھے وہ ختم ہوگئے۔

مروان ۲ ہجری میں پیدا ہوئے تھے' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں میر منشی اور وزارت کے منصب پر فائز رہے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں کئی مرتبہ مدینہ منورہ کے عامل مقرر ہوئے۔ معاویہ بن یزید کی وفات کے بعد چھ مہینے تنہا حضرت عبداللہ بن زبیر ہی خلیفہ رہے تھے۔ ان کے سوا اور کوئی شخص مدعی خلافت نہ تھا۔ حضرت معاویہ کے دور کے اور ان کے پوتے معاویہ بن یزید کے زمانے کے تمام عمال و حکام نے حضرت عبداللہ بن زبیر کی حکومت کو تسلیم کر لیا تھا' لیکن اس اثنا میں مروان بن حکم منصب خلافت پر فائز ہونے کے لیے کوشاں رہے' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چھ سات مہینے کی مسلسل بھاگ دوڑ اور کوشش کے بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے اور ملک شام پر قبضہ کر لیا۔ اس حیثیت سے مروان کو ایک باغی بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور بنوامیہ کی حکومت و سلطنت کا مجدد بھی۔

باغی اس لیے کہ اس نے حضرت عبداللہ بن زبیر کی شدید مخالفت کر کے اور ان سے تصادم کے بعد حکومت حاصل کی اور حکومت بنوامیہ کا بانی یا مجدد اس بنا پر کہ اس نے اس وقت حکومت کے دروبست پر قبضہ کیا جب اس خاندان کے ہاتھ سے حکومت کی باگ ڈور نکل چکی تھی۔ یزید کی موت کے بعد مروان نے اس کی بیوی ام خالد سے

نکاح کر لیا تھا اور خالد بن یزید کو اس بات کا سخت افسوس اور قلق تھا کہ اس کے باپ (یزید) کے مرنے کے بعد حکومت اس کے ہاتھ سے نکل کر مروان کے قبضے میں چلی گئی ہے- اس نے اس کا تذکرہ اپنی ماں (ام خالد) سے کیا- اس نے کہا تم خاموش رہو' میں انتقام لے لوں گی' چنانچہ اس نے اپنی چار پانچ باندیوں کو آمادہ کیا' رات کو مروان محل میں آ کر لیٹا تو ام خالد کے حکم سے انھوں نے مروان کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا' جس سے وہ بالکل عاجز آ گیا' آواز بھی نہ نکال سکا' ایک اور عورت نے آگے بڑھ کر جلدی سے اس کا گلا گھونٹ دیا- یہ واقعہ ۳ر مضان المبارک ۶۵ ہجری کا ہے- مروان بن حکم نے ۶۳ سال عمر پائی اور ساڑھے نو مہینے حکومت کی- یہ عاتکہ اسی مروان کی بیٹی تھی جو بڑی عقل مند اور دور اندیش عورت تھی-

مروان کے بعد علی الترتیب عبدلملک بن مروان' ولید بن عبدالملک اور سلیمان بن عبدالملک تخت حکومت پر متمکن ہوئے- سلیمان بن عبدالملک کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز کو خلیفہ مقرر کیا گیا- حضرت عمر بن عبدالعزیز کو خلیفہ راشد کہا جاتا ہے- وہ نہایت پرہیز گار اور خداترس خلیفہ تھے وہ ۱۰ صفر ۹۹ھ کو خلیفہ مقرر ہوئے اور دو برس پانچ مہینے چار دن کی خلافت کے بعد انھوں نے ۲۵ رجب ۱۰۱ھ کو وفات پائی- ان کے دور خلافت کو بہترین دور سے تعبیر کیا جاتا ہے-

خاندان بنو امیہ نے اپنے زمانہ حکومت میں بہت سی جاگیروں پر قبضہ کر لیا تھا' تمام شہزادوں نے بڑے بڑے قطعات اراضی اور باغات پر تسلط جما لیا تھا- بیت المال کو اپنی ذاتی ملکیت قرار دے لیا تھا اور ذرائع آمدنی کو اپنے تصرف میں لے آئے تھے' جس سے دوسرے مسلمانوں کی حق تلفی ہوتی تھی اور وہ سخت پریشان تھے' لیکن بنو امیہ کے ڈر سے کچھ کہنے کی جرات نہ کرتے تھے- حضرت عمر بن عبدالعزیز سریر آرائے خلافت ہوئے تو انھوں نے تمام معاملات کا از سر نو جائزہ لیا- سب سے پہلے انھوں نے اپنی بیوی فاطمہ بنت عبدالملک کے زیورات ان سے چھین کر بیت المال کی تحویل میں دیے اور فرمایا یہ زیورات تمام مسلمانوں کی ملکیت ہیں اور سب اس میں برابر کے شریک

ہیں۔ان کی بیوی ایک خلیفے کی پوتی' ایک خلیفے کی بیٹی' دو خلیفوں کی بہن اور ایک خلیفے (عمر بن عبدالعزیز) کی بیوی تھیں۔

عمر بن عبدالعزیز کا نقطہ نظر یہ تھا کہ ان کے تمام تر زیورات قومی ملکیت ہیں' کیونکہ یہ زیورات ان خلفا نے دیے ہیں جو بیت المال کو اپنا ذاتی خزانہ سمجھتے تھے۔اسی طرح انھوں نے وہ تمام جاگیریں بھی بحق بیت المال ضبط کر لی تھیں جو مختلف لوگوں کو ان کی ذاتی اور خاندانی وجاہت کی بنا پر دی گئی تھیں۔ملازمتوں میں بھی انھیں جو غیر معمولی اہمیت حاصل تھی وہ ختم کر دی۔ان کے ماہانہ اور سالانہ وظائف بھی بند کر دیے گئے' جو اموال واسباب انھیں دیے گئے تھے' وہ بھی واپس لے لیے گئے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے اس اقدام سے بنو امیہ سخت پریشان اور نالاں تھے اور چاہتے تھے کہ انھیں وہ تمام مراعات حاصل رہیں جو انھیں پہلے حاصل تھیں' لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیز نے صاف انکار کر دیا اور واضح لفظوں میں انھیں ان کی بدعنوانیوں اور غلط کاریوں سے آگاہ فرما دیا' اس سے بنو امیہ کی خاندانی تعلّی اور جذبہ حکمرانی کو سخت ٹھیس لگی اور ان کی زندگی کے شب وروز عوامی سطح پر آ گئے۔اس کی شکایت انھوں نے عاتکہ بنت مروان بن حکم سے کی اور کہا کہ آپ ایک معزز اور قابل احترام خاتون ہیں۔ آپ عمر بن عبدالعزیز کے پاس جائیں اور ان سے ہم سب کی نمائندگی کرتے ہوئے کہیں کہ وہ ہمارے حقوق بحال کر دیں اور ہماری جاگیریں اور زمینیں ہمیں واپس لوٹا دیں۔۔۔ نیز وہ ہمارے آبا واجداد کے کردار کو معیوب قرار دیتے ہیں' اس سے رک جائیں۔

عاتکہ بنت مروان حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور بنو امیہ کے خاندان کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا کہ آپ ایک متقی اور نیک خلیفہ ہیں' بحیثیت انسان کے بھی آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے اور بحیثیت خلیفہ کے بھی آپ کو سب سے فوقیت حاصل ہے' بہتر یہ ہے کہ آپ بنو امیہ کی شکایات کا ازالہ کر دیں اور ان کے اموال واسباب جو بحق بیت المال ضبط کیے جا چکے ہیں انھیں واپس کر دیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جواب دیا: اے پھوپھی اسلام ایک صاف شفاف سرچشمہ ہے' اس سے بے شمار لوگوں نے روحانی فائدہ اٹھایا' بعض لوگوں نے اسے اپنی ذات کے لیے بھی استعمال کیا- خلفاے راشدین کے زمانے تک کسی کو ذاتی مفاد حاصل کرنے کی جرات نہ ہو سکی' لیکن ان کے بعد حالات یکسر بدل گئے' جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آیا انھوں نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور اسلامی احکام پر عمل کرنے کے بجائے اس سے انحراف کی راہیں تلاش کیں اور اجتماعی مفاد پر اپنی ذات کو ترجیح دینا ضروری سمجھا- مجھے افسوس ہے میرے پیشرو خلفا نے اپنی صحیح ذمہ داریاں اور بنیادی فرائض انجام دینے میں کوتاہی سے کام لیا- میں نے ان کی جو جاگیریں اور اموال و اسباب ضبط کر کے بیت المال کے حوالے کیے ہیں ان پر ان کا کوئی استحقاق نہ تھا- نہ یہ اخلاقی طور پر اس کے مجاز تھے' نہ اسلامی طور پر--- میں نے اس سلسلے میں صحیح قدم اٹھایا ہے اور میں اس باب میں حق بجانب ہوں-

عاتکہ بنت مروان نے کہا' اگر یہ لوگ آپ کو تکلیف پہنچانے کی کوشش کریں تو آپ کا کیا جواب ہوگا اور آپ اپنا تحفظ کس طرح کریں گے؟

فرمایا: میں اللہ سے دعا کروں گا' سچ کی حمایت کے لیے مضبوطی سے کام کروں گا اور اس ضمن میں کسی کی نہ رعایت کروں گا اور نہ کسی سے خوف زدہ ہوں گا-

عاتکہ نے جواب دیا: بھتیجے تم سچے ہو' تمھارے تمام اقدامات حق و صداقت پر مبنی ہیں' میں تمھارے مخالفوں کو غلط سمجھتی ہوں' ان کے مقابلے میں تمھاری حمایت میرا فرض ہے- میں اپنی استعداد کے مطابق تمھاری ہر ممکن مدد کروں گی' تمھارا فرض ہے کہ ان غلط اندیش لوگوں کے مقابلے میں ڈٹے رہو اور ان کے ناروا مطالبے سے ہرگز کسی پریشانی کا شکار نہ ہو' میں ان کو سمجھانے کی کوشش کروں گی' اگر وہ مان گئے تو ٹھیک ورنہ تم ثابت قدم رہو-

عاتکہ بنوامیہ میں بڑی قدر و منزلت کی حامل تھیں- اولاد خلفا میں ہونے کے باوجود سادہ مزاج اور غرور و تعلّی سے پاک تھیں- حضرت عمر بن عبدالعزیز کی حامی اور

نیک کاموں میں پیش پیش رہتی تھیں۔

نفیسہ بنت حسن

حضرت نفیسہ بنت حسن بن زید بن حسن بن علی بن ابی طالب رحمتہ اللہ علیہا خاندان نبوت کی جلیل القدر خاتون تھیں' زہد و عبادت' ورع و تقویٰ اور نیکی و صالحیت کے اونچے مرتبے پر فائز تھیں- یافعی نے مراۃ الجنان میں' سخاوی نے تحفتہ الاحباب میں' سیوطی نے حسن المحاضرہ میں' ابن زیات نے الکواکب السیرہ میں' ابن العماد نے شذرات الذہب میں' الشبیعی نے المستطرف میں اور ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں ان کے حالات بیان کیے ہیں- مورخین نے ان کے واقعات حیات کو اس نہج سے بیان کیا ہے کہ ان کی زندگی کے تمام ضروری گوشے واضح ہو گئے ہیں-

حضرت نفیسہ بنت حسن رحمتہ اللہ علیہا ایک روایت کے مطابق ۱۳۴ھ میں اور ایک روایت کی رو سے ۱۴۵ھ میں مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئیں اور مدینہ منورہ کی علمی فضاؤں میں تعلیم و تربیت کی منزلیں طے کیں- اللہ نے ان کو خاندانی شرف و مجد سے تو نوازا ہی تھا' اس کے ساتھ اپنے دور کے بلند پایہ اساتذہ سے حصول علم کے مواقع بھی بہم پہنچائے- اپنے عظیم باپ حضرت حسن بن زید سے تعلیم حاصل کی- علاوہ ازیں خانوادہ نبوت کے دیگر اولوالعزم افراد سے بھی لقا اور کسب علم کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئیں- ان کی شادی امام جعفر صادق علیہ السلام کے صاحب زادے اسحاق رحمتہ اللہ کے ساتھ ہوئی تھی-

ان کے والد حضرت حسن بن زید اس زمانے میں عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور کی طرف سے مصر کے گورنر تھے' جو پانچ سال اس منصب پر فائز رہے- ایک روایت کے مطابق حضرت نفیسہ اپنے والد محترم کے ساتھ مصر گئیں اور ایک روایت کی رو سے اپنے شوہر نامدار اسحاق بن امام جعفر صادق کی معیت میں وارد مصر ہوئیں- لیکن اسی

اثنا میں خلیفہ منصور کی وجہ سے والئی مصر حضرت حسن بن زید سے ناراض ہو گیا اور اس ناراضی نے اتنی شدت اختیار کی کہ خلیفہ نے انھیں اس عہدے سے معزول کر کے تمام اختیارات چھین لیے۔ ان کا پورا اثاثہ ضبط کر لیا اور بغداد میں بلوا کر انھیں حوالہ زنداں کر دیا۔ اس خاندان کے لیے یہ بڑی اذیت کا دور تھا۔ حضرت حسن بن زید رحمتہ اللہ علیہ منصور کی موت تک قید کی صعوبتوں میں مبتلا رہے۔ منصور کے بعد اس کا بیٹا مہدی مسند خلافت پر متمکن ہوا تو انھیں جیل سے نکالا اور اسی پہلے منصب پر بحال کیا۔ اور وہ تمام جائداد بھی واپس کر دی جو منصور نے بحق سرکار ضبط کر لی تھی۔

حضرت نفیسہ بنت حسن قرآن کریم کی حافظہ اور اس کی تفسیر پر عبور رکھتی تھیں ان کے علم و فضل کی وسعتوں کا یہ عالم تھا کہ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ مصر گئے تو حضرت نفیسہ کی خدمت میں آئے اور ان سے بعض احادیث کی سماعت کا شرف حاصل کیا۔

ان کے کثرتِ علم و معرفت کی وجہ سے لوگ انھیں "نفیسۃ العلم والمعرفۃ" کہا کرتے تھے۔ ان کے زہد و تقویٰ اور کثرت عبادت کے بارے میں متعدد باتیں رجال و تاریخ کی کتابوں میں مسطور ہیں۔

مروی ہے کہ یہ اللہ کے ڈر سے اکثر روتی رہتیں ' ہمیشہ رات کو قیام کرتیں اور دن کو روزے رکھتیں۔ کھانے میں قلت کا یہ حال تھا کہ ہر تیسری رات چند لقمے حلق میں اتارتیں ' پھر ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ شوہر کی غیر موجودگی میں کھانے کے دستر خوان پر نہ بیٹھتیں۔ جب کچھ کھانا ہوتا شوہر کی موجودگی میں اور ان کے ساتھ کھاتیں۔ انھوں نے تیس حج کیے اور حج کے موقعے پر غلاف کعبہ سے لپٹ جاتیں اور دعا مانگتیں اور یہ الفاظ کہتیں :

الهی و سیدی و مولای متعنی و فرحنی برضاك عنی

زینب بنت یحییٰ کہتی ہیں کہ مجھے متواتر چالیس برس اپنی پھوپھی نفیسہ کی خدمت میں رہنے کا شرف حاصل ہوا۔ اس اثنا میں کبھی میں نے انھیں شب کو سوتے اور دن کو بغیر روزے کے نہیں دیکھا۔ ایک روز میں نے ان سے کہا کیا آپ اپنے آپ

پر ترس نہیں کرتیں؟ فرمایا کیسے ترس کروں جب کہ میرے آگے دور تک ایسی خوف ناک وادیاں پھیلی ہوئی ہیں جنھیں کوئی آرام طلب طے نہیں کر سکتا۔

بشر بن حارث حافی ان کی خدمت میں بالالتزام حاضر ہوتے۔ایک مرتبہ بشر بیمار ہوئے تو حضرت نفیسہ عیادت کے لیے گئیں۔اس وقت امام احمد بن حنبل بھی وہاں تشریف فرما تھے جو ان کی عیادت کے لیے آئے تھے۔انھوں نے نفیسہ کو دیکھا تو حضرت بشر سے پوچھا یہ کون خاتون ہیں؟ انھوں نے کہا نفیسہ بنت حسن ہیں جو میری عیادت کے لیے آئی ہیں۔امام احمد نے بشر سے کہا یہ نفیسہ ہیں تو ان سے دعا کے لیے عرض کیجیے۔چنانچہ بشر نے دعا کے لیے درخواست کی تو نفیسہ نے ان الفاظ میں دعا مانگی:

"اے اللہ بشر بن حارث اور احمد بن حنبل تجھ سے دوزخ کی آگ سے محفوظ رہنے کی التجا کرتے ہیں' ارحم الراحمین ان کو دوزخ کی آگ سے محفوظ رکھیو۔"

حضرت نفیسہ دولت مند خاتون تھیں اور ان کا تمام مال و دولت مریضوں' جذامیوں اور حاجت مندوں پر خرچ ہوتا تھا۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ دیار مصر میں گئے تو حضرت نفیسہ نے ان کی مالی امداد کی۔بعض دفعہ امام شافعی کے ہاں نماز پڑھنے کے لیے بھی تشریف لے جاتیں۔کہتے ہیں امام شافعی ان کی زیارت کو گئے تو پردے کی اوٹ میں بات کی اور دعا کے لیے بھی ملتجی ہوئے۔اس وقت ان کے ساتھ عبداللہ بن حکم بھی تھے۔امام شافعی فوت ہوئے اور ان کا جنازہ پڑھا گیا تو حضرت نفیسہ بھی گئیں اور الگ نماز جنازہ ادا کی۔

ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ امام شافعی نے وصیت کی تھی کہ ان کا جنازہ حضرت نفیسہ کے گھر کے سامنے سے لے جایا جائے۔چنانچہ وصیت کے مطابق ان کا جنازہ حضرت نفیسہ کے گھر کے سامنے پہنچا تو انھوں نے گھر میں ان کی نماز جنازہ پڑھی۔

ایک مرتبہ ان کے پاس لوگوں نے مصر کے ایک حکمران کی ستم رانیوں کی شکایت کی اور فریاد کناں ہوئے کہ اس کو ظلم سے روکا جائے۔ فرمایا وہ کب باہر نکلے گا؟ لوگوں نے عرض کیا کل۔ نفیسہ نے اسی وقت قلم پکڑا' ایک رقعہ لکھا اور اس کے راستے میں پھینک دیا اور اسے آواز دی۔ جب اس نے حضرت نفیسہ کو دیکھا تو آداب بجالایا' گھوڑے سے اترا' رقعہ ہاتھ میں لیا اور اسے پڑھا۔ اس میں مرقوم تھا تم بادشاہ بن گئے ہو' تم نے لوگوں کو قید کر ڈالا ہے' ان پر تسلط جمالیا ہے' ظلم وقہر پر اتر آئے ہو' خودسری کو پیشہ بنالیا ہے' سرکشی سے لوگوں کو دبانا شروع کر دیا ہے' لوگوں کی روزی پر قابض ہو کر اسے ضائع کرنے کو اپنا وطیرہ بنالیا ہے۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ سحری کے وقت لوگوں کی زبانوں سے جو آہوں کے تیر نکلتے ہیں وہ کبھی خطا نہیں جاتے۔ وہ ٹھیک نشانے پر بیٹھتے ہیں' بالخصوص وہ تیر تو قطعاً خطا نہیں جاتے جو ان دلوں سے نکلے ہوں جن کو تم نے ظلم کی بے پناہیوں سے مجروح کر ڈالا ہے' جن کے سینوں کو چھلنی کر دیا ہے' بھوک کی شدت سے جن کے معدے سکڑ گئے ہیں اور جن کے جسم تمھاری حد سے بڑھی ہوئی الم ناکیوں سے عریاں ہو گئے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ مظلوم مر جائے اور ظلم آب وتاب کے ساتھ دنیا میں باقی رہے۔ تم جو جی چاہے کرو ہم بہرحال صبر وضبط سے کام لیں گے۔ تم ظلم ڈھاؤ ہم اس کی فریاد اللہ سے کریں گے۔ تم ستم رانی کا مظاہرہ کرو ہم اس کا بدلہ لینے کے لیے اللہ کو پکاریں گے۔ قرآن نے بالکل صحیح کہا ہے

وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔

اس رقعے کا یہ اثر ہوا کہ وہ حکمران اسی وقت واپس چلا گیا۔

نفیسہ سات سال مصر میں رہیں۔ اس کے بعد انھیں بیماری نے آگھیرا۔ تکلیف زیادہ بڑھی تو اپنے شوہر اسحاق کو خط لکھا اور بیماری کی اطلاع دی۔ اس اثنا میں انھوں نے اپنے مکان ہی میں اپنے ہاتھ سے اپنی قبر کھودی۔ روزانہ اس قبر میں اترتیں اور قرآن پڑھتیں۔ اس قبر میں انھوں نے ایک سو نوے قرآن ختم کیے' وہ روزے سے تھیں کہ ایک روایت کے مطابق ۶۳ اور ایک کے مطابق ۴۷ برس عمر پاکر ۲۰۸ھ میں انتقال

کر گئیں۔وقت موت قریب پہنچا تو لوگ دوڑے ہوئے آئے اور روزہ چھوڑنے اور پانی پینے پر مجبور کیا۔لوگوں کے اصرار سے تنگ آ کر فرمایا میں تیس سال سے اللہ کے حضور دعا مانگ رہی ہوں کہ اسے روزے کی حالت میں ملوں کیا تم چاہتے ہو کہ اب روزہ چھوڑ دوں؟ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔اس وقت رات کی تاریکی چھا رہی تھی۔انھوں نے سورہ الانعام کی تلاوت شروع کی۔جب **لھم دار السلام عند ربھم وھو ولیھم بما کانوا یعملون** (یہ سورہ الانعام کی آیت نمبر ۱۲۷ ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے۔ان کے لیے ان کے اعمال کے صلے میں پروردگار کے ہاں سلامتی کا گھر ہے اور وہی ان کا دوست دار ہے) پر پہنچیں تو بے ہوشی طاری ہو گئی۔پھر فرشتہ موت نے دستک دی اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔وفات کے بعد اسی روز ان کے شوہر مدینہ طیبہ سے مصر آ گئے۔

شوہر نے لوگوں سے کہا کہ میں ان کی میت مدینہ منورہ لے جانا اور جنت البقیع میں دفن کرنا چاہتا ہوں' لیکن اہل مصر نے امیر شہر کی طرف رجوع کیا اور عرض کیا کہ وہ اسحاق سے التجا کریں کہ وہ ان کی میت کو مدینہ منورہ نہ لے جائیں اور یہیں دفن کریں۔مگر اسحاق نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور میت کو مدینہ لے جانے پر مصر رہے۔ان کے انکار سے لوگوں کو سخت صدمہ پہنچا۔انھوں نے اکٹھے ہو کر بہت سا مال جمع کیا اور جس اونٹ پر وہ مدینہ منورہ سے آئے تھے اس کی خرجیاں مال و دولت سے بھر ڈالیں۔لیکن وہ صبح کو اسحاق کے پاس آئے تو اسحاق کا ارادہ بدل چکا تھا۔لوگوں نے کہا ہم نے آپ کو بہت سا ساز و سامان اور زاد راہ دے دیا ہے۔کہا ہاں میں نے اسے دیکھ لیا' مگر میں تمھیں بتاؤں کہ رات میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔آپ مجھے حکم دے رہے تھے کہ ان کا مال و منال انھیں واپس کر دو اور نفیسہ کو یہیں مصر میں دفن کرو۔چنانچہ جس مکان میں وہ سکونت پذیر تھیں وہیں دفن کی گئیں۔جس محلے میں ان کا مکان تھا' اس کا قدیم نام "درب السباع" تھا۔بعد میں وہ پورا محلّہ مسمار ہو گیا اور صرف ان کی قبر باقی رہ گئی۔باشندگان مصر کو اس قبر اور مکان سے سخت عقیدت

تھی۔ان کا عقیدہ تھا کہ یہاں دعا قبول ہوتی ہے اور مرادیں بر آتی ہیں۔ذہبی کا کہنا ہے کہ لوگ وہاں سجدہ ریز ہوتے تھے اور معاملہ شرک کی حد تک پہنچ گیا تھا' جہاں وہ کئی قسم کی مشرکانہ حرکتیں کرتے تھے۔

یافعی کہتے ہیں وہ بہت بڑا مزار ہے' میں وہاں گیا تو دیکھا کہ عورتوں' مردوں' تندرستوں' مریضوں اور اندھوں کا ایک ہجوم جمع ہے۔مزار کا نگران یا متولی کرسی پر بیٹھا ہے۔مجھے دیکھ کر کھڑا ہوا لیکن میں نے اس کی طرف التفاف نہیں کیا اور قبر کی زیارت کے لیے آگے نکل گیا۔میری یہ بے نیازی اسے ناگوار گزری اور مجھ پر خفگی کا اظہار کیا۔میں نے اس سے کہا میں اصحاب عزو جاہ اور ارباب حشم و مناصب کی طرف کبھی ملتفت نہیں ہوا۔

یافعی کہتے ہیں وہ یہ سن کر خاموش ہو گیا اور میں واپس آگیا۔

امتہ الجلیل بنت عمرو عدوی

حضرت امتہ الجلیل بن عمرو عدوی بصرہ کی رہنے والی تھیں اور نہایت پرہیز گار خاتون تھیں' ان کے قبیلے میں پرہیز گاری میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔

کہتے ہیں وہ بصرہ کی تمام خواتین سے زیادہ عبادت گزار اور پارسا تھیں۔ حلیم الطبع اور منکسر المزاج تھیں۔ گفتگو میں محتاط اور میل جول میں بلند اوصاف کی حامل تھیں۔ سب کی خیر خواہ تھیں۔ کھانا بہت کم کھاتی تھیں۔ دن رات میں ایک روٹی پر گزر کرتی تھیں۔

لڑائی جھگڑے سے سخت متنفر تھیں' سب سے خوش اخلاقی سے پیش آتی تھیں' کسی کی مخالفت نہ کرتیں' کوئی نقصان بھی پہنچاتا تو خاموش رہتیں' کسی پر کوئی اعتراض نہ کرتیں۔ حلم و انکسار کا پیکر اور نرمی و رافت کا مجسمہ تھیں۔ لوگوں کی امداد میں پیش پیش رہتیں' درہم و دینار کے ذریعے کوئی انھیں متاثر کرنا چاہتا تو مقابلے پر اتر آتیں اور اس کے سرمایے کو کوئی اہمیت نہ دیتیں۔ نرم گفتار اور بلند کردار تھیں۔ بوڑھی عورتوں اور نادار افراد کی خدمت ان کا شیوہ تھا۔ بچوں سے پیار اور محبت کا برتاؤ فرماتیں۔

عبادت گزاری کا یہ حال تھا کہ دن کو قرآن پڑھتیں اور لوگوں کی خدمت کے لیے وقف رہتیں اور شب کو اللہ کے حضور کھڑی ہو جاتیں۔ تہجد اور نوافل کی پابند تھیں۔ ان کا فرمان ہے کہ بہترین لوگ وہ ہیں جو شب کی تنہائیوں میں اللہ کی عبادت کرتے اور اس کے سامنے سر بسجود ہوتے ہیں۔ کہا کرتی تھیں کہ جب سحری کا وقت آتا ہے تو میرے قلب میں ایک نئی روح کروٹ لینے لگتی ہے اور میرا دل کچھ اور ہی کیفیتوں سے معمور ہو جاتا ہے۔

ان سے بہت سے اقوال مروی ہیں مثلاً ان سے روایت ہے کہ عبادت گزار لوگ

عبادت کے سلسلے میں مختلف رجحانات رکھتے ہیں اور یہ کہ انسان درجہ ولایت پر کب متمکن ہوتا ہے اور اس منزل پر پہنچنے کے کیا ذرائع ہیں۔ فرماتی ہیں اس ضمن میں بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ انسان اس وقت اس بلند منصب پر فائز ہوتا ہے جب اسے دنیا کی کسی مشکل کا کوئی احساس ہو اور دین کی خدمت کرتے ہوئے اسے جو تکلیفیں پہنچیں انھیں خندہ پیشانی سے برداشت کرے۔

ان کا کہنا ہے کہ ولی وہ ہے جو یہ طے کر لے کہ دنیا میں جن آفات سے بھی وہ دوچار ہوگا' ان پر گھبرانے کے بجائے اطمینان کا اظہار کرے گا اور ناموافق حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرے گا' جب دنیا کی مشکلات اس کے دل کے دروازے پر دستک دیں گی تو وہ بے تابی سے ان کی طرف لپکے گا اور انھیں اس طرح برداشت کرے گا کہ گویا ان کے انتظار میں تھا۔

ان کے بقول ولایت کا استحقاق اس شخص کو پہنچتا ہے جو دنیا کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دیتا ہو اور اس کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو چکی ہو کہ دنیا عارضی شے ہے' اس کے سازوسامان چند روزہ ہیں اور یہ مال و دولت آخر ختم ہونے والے ہیں۔ اس کے برعکس آخرت دائمی اور لازوال ہے' اس کی نعمتیں دنیا کی نعمتوں سے ہزاروں گنا زیادہ ہیں' آخرت کو دنیا پر بہرحال ترجیح حاصل ہے۔

فرماتی ہیں: ایک گروہ کہتا ہے ولی کی تعریف یہ ہے کہ اللہ کو ہر چیز کا مالک سمجھے' اپنے مال و دولت کو زوال پذیر تصور کرے' غریب کی امداد کرے' مسکین سے تعاون کرے' جو لوگ سرمایہ کے بل بوتے پر غربا کو تنگ کرتے ہیں انھیں راہ راست پر لائے۔ کسی کو صرف اس بنا پر قابل احترام نہ گردانے کہ وہ سیم و زر کے ڈھیروں پر قابض ہے اور بے حدوحساب دولت کا مالک ہے۔

فرماتی ہیں: ولی وہ ہے جو دنیا کی نازونعمت سے کوئی تعلق نہ رکھے اور اس کے لیل و نہار کو عارضی اور ناپائیدار قرار دے۔

ان سے منقول ہے کہ کسی کے درپے آزاد ہونا' انسانیت کے منافی اور اسلام کے

تقاضوں کے خلاف ہے- جو شخص دوسروں پر اپنے آپ کو ترجیح دیتا ہے' وہ اسلام کی تعلیمات سے روگردانی کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے-

ایک مرتبہ فرمایا: ولایت کا اندازہ دل و زبان اور ہاتھ سے ہوتا ہے- ولی وہ ہے جو کسی کے خلاف دل میں کسی قسم کی کدورت اور حسد و بغض کو جگہ نہ دے' زبان سے کوئی ایسا لفظ نہ نکالے جو دوسروں کے لیے تکلیف کا باعث ہو سکتا ہو اور جس سے سننے والے کو ذہنی اور روحانی تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہو-

ایک مرتبہ شاگردوں کے حلقے میں فرمایا: لوگوں کو فائدہ پہنچانا' ان کو مشکلات سے دور رکھنے کی کوشش کرنا' دوسروں کے لیے آرام و آسائش کا اہتمام کرنا' بنیادی نیکی اور بہترین خیر ہے-

ایک مجمع میں فرمایا: دوسروں کو اپنی ذات پر ترجیح دینا اور اپنے مفاد کے مقابلے میں دوسرے کے مفاد کا خیال رکھنا بہت بڑی نیکی ہے-

حضرت امتہ الجلیل بنت عمر و عدویہ کے شاگردوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا- دور دور سے لوگ کثیر تعداد میں ان کے پاس آتے اور روحانی فوائد حاصل کرتے- ان کا مکان بصرہ میں نیک لوگوں کا بہت بڑا مرکز تھا- ہر شخص سے اس کی ذہنی اور فکری سطح کے مطابق بات کرتیں اور ہر ممکن طریقے سے اس کو سمجھانے کی کوشش فرماتیں- ان کے علو اخلاق' خلوص قلب' تقویٰ' جذبہ ہمدردی خلائق اور نیکی سے لوگ انتہائی متاثر تھے اور یہ اپنے شاگردوں اور عقیدت مندوں کو یہی تعلیم دیتی تھیں' فرمایا کرتیں کہ کتابی علم کا سلسلہ بہت وسیع ہے اور بے شمار حضرات یہ بنیادی خدمت سرانجام دے رہے ہیں' لیکن للّٰہیت اور خشیت الٰہی کی تعلیم کا سلسلہ روبہ زوال ہے- اسے دوبارہ اسی نہج پر جاری کرنا چاہیے جس نہج پر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جاری تھا-

ایک مرتبہ اپنے شاگردوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا مفہوم کسی خاص دائرے تک محدود نہیں- یہ بہت ہی وسعت

پذیر ہے- عبادات سے لے کر خدمت خلق تک کے تمام گوشے اس میں شامل ہیں' آنحضرت کا اصل فرماں بردار وہ ہے جو لوگوں کی خدمت کو اپنا شعار بنالیتا ہے- عبادت صرف عابد کی ذات کو فائدہ پہنچاتی ہے' لیکن خدمت خلق ایسی شے ہے جس سے سب متمتع ہوتے ہیں اور یہ ایسی نیکی ہے جو اپنی ذات کی حدود سے نکل کر دوسروں تک ممتد ہوتی ہے- اگر تم اسلام کی صحیح روح کو سمجھنے اور آنحضرت کی اطاعت کو اپنا نصب العین بنانا چاہتے ہو تو دنیا میں پھیل جاؤ اور لوگوں کی خدمت کرو- آنحضرت کے خلفاے راشدین اور صحابہ کرام کا یہی معمول تھا- وہ اپنے کام کاج کا حرج کر کے اور اپنے مفاد کو نظر انداز کر کے دوسروں کے کام آتے اور انسانیت کی خدمت کو سب چیزوں پر مقدم ٹھہراتے تھے-

حضرت امتہ الجلیل رحمتہ اللہ علیہا کی وفات کب ہوئی؟ اس کا صحیح طور سے پتا نہیں چل سکا-

زبیدہ بنت جعفر

عباسی خلیفہ منصور کے دو بیٹے تھے۔ایک کا نام جعفر تھا اور ایک کا مہدی۔زبیدہ جعفر کی بیٹی تھیں' جو موصل میں پیدا ہوئیں۔جہاں ان کا باپ جعفر گورنر تھا۔ان کا اصل نام امتہ العزیز تھا۔یہ ابھی شیر خوار تھیں کہ باپ کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گئیں۔ان کی پرورش خلیفہ منصور عباسی نے کی جو ان کے دادا تھے۔انھوں نے ان کی تعلیم و تربیت خاص اہتمام سے کی۔انھیں زبیدہ اس لیے کہا جانے لگا کہ ان کے دادا منصور دونوں ہاتھ پکڑ کر انھیں گھمایا کرتے تھے۔لہٰذا یہ زبیدہ کے لقب سے مشہور ہو گئیں۔زبیدہ اس لکڑی کو کہا جاتا ہے جس سے مکھن نکالا جائے اور یہی لقب نام پر غالب آ گیا۔

خلیفہ منصور عباسی کے ایک بیٹے کا نام مہدی تھا۔مہدی کا بیٹا ہارون الرشید تھا جس کے ساتھ ۱۶۵ھ میں زبیدہ کی شادی ہوئی۔زبیدہ کی عمر اس وقت بیس برس تھی۔شادی بڑی دھوم دھام سے کی گئی۔اس میں مشک و عنبر کی گولیاں لٹائی گئیں اور انتہائی مسرت کا اظہار کیا گیا۔دعوت ولیمہ بہت پر تکلف تھی۔اس میں سونے چاندی کی خوب صورت چیزیں وسیع پیمانے پر تقسیم کی گئی تھیں۔قاضی القضاۃ امام ابویوسف کا کہنا ہے کہ ولیمے کی دعوت میں ستائیس کروڑ پچاس لاکھ درہم صرف ہوئے تھے۔

کہتے ہیں زبیدہ کو جو شادی کا جوڑا دیا گیا تھا اس میں بہت سے جواہرات ٹنکے ہوئے تھے اور وہ جوڑا جواہرات کی وجہ سے اس قدر بھاری تھا کہ اسے پہن کر چلنا مشکل ہو گیا تھا۔

زبیدہ سے شادی کے پانچ سال بعد ۱۷۰ھ میں ہارون الرشید سریر آرائے سلطنت ہوا۔اس وقت یہ شہزادی اسلامی عہد کی ایک جلیل القدر ملکہ تھیں۔ہارون الرشید نے

انھیں قصر اسلام میں اتارا جو بغداد کا عظیم الشان اور خوب صورت محل تھا۔

زبیدہ بے شمار خوبیوں کی مالک تھیں اور اپنی خوبیوں اور ذہانت کی بنا پر انھوں نے ہارون الرشید ایسے عظیم حکمران کو اپنا مطیع بنا لیا تھا۔ زبیدہ میں ایک کمال یہ تھا کہ انھوں نے کبھی سیاست میں حصہ نہیں لیا اور تمام عمر اپنے شوہر کی اطاعت شعار رہیں۔ ملکی معاملات میں ہارون الرشید نے بھی ان سے کبھی کوئی مشورہ نہیں لیا' البتہ گھریلو معاملات ہمیشہ انہی کے مشورے اور رائے سے انجام پائے۔ ہارون الرشید نے زبیدہ سے نکاح کے بعد کئی شادیاں کیں۔ لیکن زبیدہ نے شوہر کے اس قسم کے نجی معاملات میں نہ کبھی دخل دیا اور نہ کبھی کسی قسم کی ناراضی کا اظہار کیا۔ زبیدہ ہاشمیہ تھیں اور بڑے بلند کردار کی مالک تھیں۔ امین الرشید زبیدہ کا بہت پیارا بیٹا تھا اور نجیب الطرفین ہاشمی خلیفہ تھا۔

ہارون الرشید کے دور میں زبیدہ نے نہایت شان و شوکت کی زندگی بسر کی۔ ان کے لیے کئی کروڑ کی جاگیر مقرر تھی۔ زبیدہ کے کہنے سے ہارون الرشید نے امین الرشید کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا' حالانکہ مامون الرشید' امین الرشید سے زیادہ ذہین و فطین تھا' اور غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک --- مامون پر امین کو ترجیح دینے کی وجہ سے ان دونوں بھائیوں کے درمیان جنگ بھی ہوئی' جس کا نتیجہ امین کے قتل اور مامون کی جیت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ مگر مامون کی دور اندیشی اور فہم و فراست ملاحظہ ہو کہ اس نے زبیدہ کے احترام و اکرام میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ وہ اسی طرح ان کا اعزاز کرتا رہا جس طرح ہارون اور امین کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ زبیدہ بھی مامون کو صائب مشورے دیتی تھیں اور اپنے شوہر اور بیٹے کو قریب قریب بھول ہی گئی تھیں۔

مامون نے زبیدہ کو ماں کا درجہ دیا' قصر الخلافتہ میں آباد کیا' مصارف کے لیے ایک لاکھ اشرفیاں اور دس لاکھ درہم پیش کیے اور خود آکر قدم بوس ہوا۔ مامون کی اس خدمت اور اطاعت کی وجہ سے زبیدہ کا دل اس کی طرف سے بالکل صاف ہو گیا اور وہ اسے اپنے بچے کی طرح چاہنے لگیں۔

شوہر کی وفات کے بعد زبیدہ نے عیش و آرام کی زندگی بالکل ترک کر دی تھی اور وظائف و اوراد میں مشغول رہنے لگی تھیں۔

۲۰۸ھ میں زبیدہ نے مامون کی بیوی بوران سے حج بیت اللہ کے لیے جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ بوران نے مامون سے ذکر کیا اور مامون نے نہایت خوشی سے اجازت دے دی اور وسیع پیمانے پر سامان سفر بھی دیا اور بہت سے خدام بھی ساتھ کر دیے۔ خود زبیدہ بھی اپنے ذاتی خزانے سے لاکھوں روپے ساتھ لے گئی تھیں۔

زبیدہ نے عراق کا عام راستہ چھوڑ کر شام کی طرف سے مکہ مکرمہ جانے کا عزم کیا۔ راستے میں مسجدیں، سرائیں اور پل بنوائے، جن پر سترہ لاکھ اشرفیاں خرچ ہوئیں۔ بیت المقدس کو جاتے ہوئے جب زبیدہ کا یہ کارواں لبنان پہنچا تو لوگوں نے پانی کی قلت کی شکایت کی۔ زبیدہ نے اسی وقت ماہرین اور انجینئروں کو طلب کیا اور جبل لبنان سے ایک نہر جاری کرائی جس کے ذریعے بیروت تک بافراط پانی میسر آگیا۔ اس نہر پر جو پل بنائے گئے تھے، وہ اب بھی قناطر زبیدہ کے نام سے مشہور ہیں۔

مکہ مکرمہ جا کر معلوم ہوا کہ حج کے زمانے میں بعض اوقات پانی بالکل میسر نہیں آتا اور ایک مشکیزہ پانی کی قیمت ایک اشرفی تک پہنچ جاتی ہے، لہٰذا زبیدہ نے نہر نکالنے کا حکم دیا اور انجینئروں نے پیمائش کر کے مکہ کی سنگلاخ زمین کو ہموار کیا اور ایک نہر نکالی جس پر ایک کروڑ روپے صرف ہوئے۔ یہ نہر آج بھی نہر زبیدہ کے نام سے معروف ہے۔ اس نہر کی وجہ سے پانی کی قلت ختم ہو گئی۔

تاریخ بغداد میں خطیب بغدادی نے ایک محدث کا خواب بیان کیا ہے کہ انھوں نے خواب میں زبیدہ سے پوچھا: کہ اللہ نے تمھارے ساتھ کیا برتاؤ کیا؟

زبیدہ نے جواب دیا: نہر کی کھدائی کے سلسلے میں پہلی کدال جو سرزمین مکہ میں پڑی، اسی وقت میری مغفرت ہو گئی تھی۔

اس نہر کے علاوہ مسافروں اور عازمین حج کے آرام کے لیے زبیدہ نے بہت سے حوض اور تالاب بنوائے، جن سے آج تک عرب قافلے سیراب ہو رہے ہیں۔

زبیدہ کو تعمیرات کا خاص شوق تھا اور اس سلسلے میں ان کا ذہن بڑا تیز تھا- ایک روایت کے مطابق بدخشاں اور تبریز زبیدہ کے آباد کردہ شہر ہیں-

بغداد میں قصر اسلام کے قریب زبیدہ نے ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کرائی جس پر تیس ہزار اشرفیاں خرچ ہوئیں-

کہتے ہیں یورپ کے عجائب خانوں کے دور زریں کی بہت سی یادگاریں آج بھی محفوظ ہیں، جن میں سے زربفت کا ایک تھان بھی ہے جو صرف زبیدہ کے لیے بغداد کے کارخانوں میں تیار ہوا تھا اور جس کی قیمت پچاس لاکھ اشرفیاں تھی- قصر اسلام کے بڑے ہال کے لیے ایک ریشمی فرش زبیدہ نے تیار کرایا تھا' اس فرش پر دس لاکھ اشرفیاں خرچ ہوئی تھیں-

مورخین کا کہنا ہے کہ عبادت اور رسوم شرعیہ کی انجام دہی کے باب میں زبیدہ حضرت رابعہ بصریہ کے نقش قدم پر چلتی تھیں اور ان کے محل میں سو کنیزیں ایسی تھیں جو قرآن کی حافظہ تھیں اور روزانہ دس دس پارے تلاوت کرتی تھیں-

زبیدہ کی تعلیم و تربیت ان کے دادا خلیفہ منصور عباسی کے اہتمام میں ہوئی تھی- وہ ادب کا بھی صاف ستھرا ذوق رکھتی تھیں- ادب کی کتابوں میں ان کے ان خطوط کا بھی تذکرہ ہے جو انھوں نے مامون کو لکھے- زبیدہ شاعرہ نہ تھیں، لیکن اپنے بیٹے امین کا زوردار اور دردناک مرثیہ لکھ کر مامون الرشید کو بھیجا-

ہارون الرشید کی وفات کے بعد امین الرشید نے بغداد پر قبضہ کر کے کاروبار حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا- ۱۹۷ھ میں مامون الرشید کے جرنیل طاہر بن حسین نے بغداد کا محاصرہ کر لیا- ایک سال محاصرہ جاری رہا- آخر امین نے شکست کھائی- ۲۵ محرم ۱۹۸ھ کو طاہر بن حسین نے اسے گرفتار کر کے قتل کر دیا- اس کے بعد پوری اسلامی مملکت پر مامون الرشید کا قبضہ ہو گیا اور وہ نہایت اطمینان کے ساتھ حکومت کرنے لگا- ملکہ زبیدہ کو بیٹے کے قتل کی اطلاع پہنچی تو بے حد مغموم ہوئیں- وہ شاعرہ نہ تھیں لیکن شعری کا بھی ذوق رکھتی تھیں- ان کے ذوق شعری نے شدت

اختیار کی تو غم واندوہ کی وہ کیفیت جو سینے میں آگ کی صورت میں بھڑک رہی تھی' مندرجہ ذیل مرثیے کے قالب میں ڈھل گئی۔

الوارث علم الاولين و فهمهم وللملك المامون من ام جعفر	ام جعفر کی طرف سے یہ خط ہے خلیفہ مامون کے نام جو کہ پہلوں کے علم و فہم کا وارث ہے۔
كتبت و عيني مستعمل و موعها اليك ابن عمي من حضون و محجر	اے ابن عم میں تجھ کو لکھ رہی ہوں اور میری آنکھیں پلکوں سے خون بہاتی ہیں۔
و قد مستني ذل و ضر كابة وارق عيني يا بن عمي تفكر	مجھ کو ذلت اور اذیت وہ رنج پہنچا اور فکر نے میری آنکھوں کو بے خواب کر دیا۔
اتی طاهر لا طهر الله طاهرا فما طهر فيما اتى بمطهر	یہ طاہر کیا ہوا ہے خدا جس کو طاہر نے کرے اور جو کچھ اس نے کیا اس کے الزام سے پاک نہیں ہو سکتا۔
فاخرجني مكشوفة الوجه حاسرا و انهب اموالي و اخرب ادوری	اس نے مجھ کو برہنہ سر اور بے پردہ گھر سے نکالا اور میرا مال لوٹ لیا اور میرے مکانات برباد کر دیئے۔
يعز علي هارون ما قدلقيته وما مربي من ناقص الخق امور	اس یک چشم ناقص الخلقت کے ہاتھ سے مجھ پر جو گزری ہارون ہوتا تو اس پر گراں گزرتا۔
فان كان ما ابدى بحامرته صبرت لامر من مقدر	طاہر نے جو کچھ کیا اگر تیرے حکم سے کیا تو مقدر پر میں صبر کرتی ہوں

مامون کو یہ خط ملا اور اس نے یہ اشعار پڑھے تو وہ بے اختیار رو پڑا اور کہا: "واللہ میں خود اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لوں گا۔"

ہارون الرشید نے ۱۹۳ھ کو خراسان میں وفات پائی۔ اس طرح زبیدہ اٹھائیس برس خلیفہ ہارون الرشید کی رفیقہ حیات رہیں۔ ۷۱ سال عمر پا کر یکم جمادی الاولیٰ ۲۱۶ھ کو بغداد میں فوت ہوئیں۔

حضرت حسنیٰ

امام احمد بن حنبل آئمہ اربعہ میں سے ایک جلیل القدر امام تھے۔فقہیات میں حنبلی فقہ کی بنیاد انہی سے قائم ہوئی' ان کی قربانیوں کی حدود بہت وسیع ہیں۔ ان کا خشیت الٰہی کا جذبہ نہایت گہرا تھا اور وہ اللہ کے سوا کسی سے خوف زدہ نہ ہوتے تھے۔ جن لوگوں کو ان کی مجلس میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا' وہ بھی انہی اصولوں کے حامل بن گئے جن کے حامل یہ خود تھے۔ان کے ملازموں اور حلقہ نشینوں میں ایک خاتون حسنیٰ تھیں انھوں نے امام احمد سے باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور اخذ روایت کے شرف سے بہرہ مند ہوئیں۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ نے خلق قرآن کے مسئلے میں خلیفہ وقت کے نقطہ نظر کی مخالفت کی تو انھیں شدید ابتلاو آزمائش سے دوچار کیا گیا اور ایسی ایسی الم ناک تکلیفیں دی گئیں کہ جن کے تصور ہی سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔اپنے آقا کی آزمائش کے دور میں اس خاتون نے ان کا پورا ساتھ دیا۔ یہ باقاعدہ قید خانے میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتیں اور مزاج پرسی کرتیں۔جب حکومت کی طرف سے ملاقات کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا تو اس باہمت خاتون نے بغداد کے لوگوں میں امام کے عقیدے کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ حکومت کے کارندوں اور اہل کاروں نے انھیں اس سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ مگر انھوں نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ بعض ارکان حکومت نے انھیں بھی گرفتار کرنے کا ارادہ کیا' لیکن کچھ لوگ اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس مسئلے میں ایک عورت کو گرفتار کرنا اور اسے اتنی اہمیت دینا قرین عقل نہیں۔اس سے لوگوں میں یہ تاثر پیدا ہوگا کہ عورتیں بھی ان مسائل پر نظر رکھتی ہیں اور امام احمد کے موقف کی حامی ہیں۔

امام احمد کی اس کنیز یا ملازمہ کا شمار اس دور کے علما و فضلا میں ہوتا تھا اور وہ اپنے عہد کی تمام اصناف علم پر عبور رکھتی تھیں۔انھیں امام احمد سے ان کے بعض فتاوے اور بہت سے مسائل روایت کرنے کا فخر حاصل ہے۔یہ خواتین کی مبلغ تھیں اور گھر گھر جا کر اپنے استاد کے فقہی نقطہ نظر کی تبلیغ کرتی تھیں۔انھوں نے اپنے مکان کو ایک مدرسے کی حیثیت دے رکھی تھی، جس میں شہر کی عورتیں باقاعدہ تعلیم حاصل کرتی تھیں۔

یہ خاتون ایک نادار اور غریب خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، لیکن طبیعت کی بے نیاز تھیں، کسی کے آگے دست سوال دراز نہ کرتی تھیں۔عورتوں کو مفت تعلیم دیتی تھیں۔ان کا خیال تھا کہ تعلیم پر اجرت لینا گناہ ہے اور اللہ و رسول ﷺ کے احکام و فرامین کو دنیا کی حقیر متاع کے عوض فروخت کر دینے کے مترادف ہے۔ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ اپنی شاگردوں سے اپنا کوئی ذاتی کام نہ لیتی تھیں۔فرمایا کرتیں اس سے خود غرضی پیدا ہوتی ہے اور لوگوں کے ذہن میں یہ تاثر ابھر آنے کا خطرہ رہتا ہے کہ میں نے شاید تعلیم کا یہ سلسلہ لڑکیوں سے اپنے ذاتی اور گھریلو کام کرانے کی غرض سے شروع کیا ہے۔دوسروں سے کام لینے کا ایک نقصان تو یہ ہوتا ہے کہ انسان میں آرام طلبی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ خود اپنا کام انجام دینے کے قابل بھی نہیں رہتا۔دوسرے یہ کہ طبیعت میں دوسروں پر حکم چلانے کی عادت پیدا ہو جاتی ہے، جو کسی طرح بھی صحیح نہیں۔۔کہا کرتی تھیں بہتر آدمی وہ ہے جو اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرتا ہے کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ اگر تم گھوڑے پر سوار ہو اور ہاتھ سے لگام گر کر نیچے آجائے تو کسی سے نہ کہو کہ وہ تمھیں لگام اٹھا دے، خود ہی لگام اٹھاؤ۔امام احمد رحمتہ اللہ علیہ کی وفات (۱۲ ربیع الاول ۲۴۱ھ) کے بعد ان کی بیوہ نے (جو ان کے بیٹے عبداللہ کی ماں تھیں) حسنیٰ کی شادی ایک شخص سے کی، اس سے ان کے پانچ بچے ہوئے، جن میں چار لڑکے تھے اور ایک لڑکی۔لڑکوں کے نام علی الترتیب حسن، حسین، محمد اور سعید تھے۔اور لڑکی کا نام زینب تھا۔حسنیٰ کے یہ بچے بھی ماں کی طرح نیک اور سعادت مند تھے۔ماں نے احسن طریق سے ان کی تربیت کی اور انھیں خود ہی

ابتدائی تعلیم دی۔

لڑکے بڑے ہوئے تو ان کی انتہائی تعلیم کا خاص طور سے اہتمام کیا اور انھیں مشہور محدثین اور فقہا کی خدمت میں بھیجا۔ شادی کے بعد بھی حضرت حسنیٰ رحمتہ اللہ علیہا نے خواتین کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ تعلیم کے باب میں ان کا قول ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو عالم کامل سمجھتا ہے' وہ جہالت کی وادی میں گھومتا رہتا ہے۔ تعلیم کی سعادت اس شخص کو حاصل ہوتی ہے جو اس کی ضرورت محسوس کرتا اور اس کے لیے کوشاں ہوتا ہے۔

ایک مرتبہ فرمایا مغرور اور بدمزاج آدمی تعلیم کی لذت سے محروم رہتا ہے۔ اصل عالم وہ ہے جو اپنے اندر سے کبر و نخوت کے جراثیم نکال دے۔ جس ذہن پر رعونت نے قبضہ جما رکھا ہے' وہاں علم کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ ان کا کہنا ہے کہ غرور اور علم ایک دوسرے کی ضد ہیں' جس نے غرور سے رابطہ قائم کیا اس نے علم کو اپنے سے دور کر لیا۔ علم دوسرے کی احتیاج کا طالب ہے' جب تک احتیاج نہ ہو گی علم کی منزل کا ادراک ممکن نہیں ہو گا۔ غرض حسنیٰ عالمہ و فاضلہ اور صالحہ خاتون تھیں۔ فقہی لحاظ سے حنبلی مسلک پر عامل تھیں اور تعبیر مسائل میں عام طور پر اسی کو حق بجانب سمجھتی تھیں' لیکن ان کو یہ اصرار نہ تھا کہ ہر مسئلے میں یہی مسلک صحیح ہے' بلکہ متعدد مسائل میں امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کو ترجیح دیتی تھیں' کیونکہ عمل میں اہل مدینہ کو خاص اہمیت حاصل ہے اور امام مالک اس کے قائل تھے۔

حق گوئی میں بڑی بے باک تھیں۔ ایک مرتبہ عباسی حکمران مامون الرشید کے دربار میں گئیں اور اس کی لغزشوں پر شدید تنقید کی۔ مامون ایک عورت کے جراتمندانہ طرز کلام سے متاثر بھی ہوا اور حیران بھی۔ اہل دربار سے دریافت کرایا کہ یہ کون خاتون ہے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ ان کا نام حسنیٰ ہے تو رو پڑا اور کہا اگرچہ تم نے تمام باتیں میرے خلاف کہی ہیں اور میرے افکار و تصورات پر سخت ضرب لگائی ہے' لیکن مجھے اس پر کوئی خفگی نہیں' تم بات کر رہی تھیں تو مجھے یہ خیال آ رہا تھا کہ یہ کس

قدر بہادر اور حق گو خاتون ہے‘ کاش سبھی لوگ اس جیسے حق گو ہو جائیں اور ہر معاملے میں جرأت اور بہادری کا ثبوت دیں۔

حمیضہ بنت یاسر

حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں اور مقدسی نے الکمال فی معرفۃ الرجال میں ان کا ذکر کیا ہے-

حضرت حمیضہ بنت یاسر رحمتہ اللہ علیہا کم و بیش ۱۶۵ھ میں پیدا ہوئیں- ان کی دادی کا نام یسیرہ تھا جو نہایت متقی اور پرہیزگار خاتون تھیں- ان کے والد یاسر بھی بڑے عبادت گزار تھے' ان کے شب و روز اللہ کی عبادت اور ذکر الٰہی میں گزرتے تھے- اذان کی آواز کانوں میں پڑتے ہی دنیا کے کام چھوڑ دیتے اور نماز کے لیے مسجد کو روانہ ہو جاتے- فرمایا کرتے جب اذان کی صورت میں اللہ کا بلاوا آگیا تو اس کے مقابلے میں دنیا کے اہم سے اہم اور بڑے سے بڑے امور بھی ہیچ اور ناقابل اعتنا ہیں- یاسر کثیر المشاغل شخص تھے' لیکن اس کے باوجود تہجد التزام سے پڑھتے' روزے کثرت سے رکھتے اور نماز باجماعت ادا فرماتے- پھر ان میں صرف یہی بات نہ تھی کہ نیکی کے اس دائرے کو اپنی ذات تک محدود رکھتے تھے اور فقط نماز روزے پر اکتفا کرتے تھے- وہ نماز روزے کے ساتھ ساتھ بہت بڑی نیکی یہ کرتے تھے کہ غربا کی مدد کرتے' بیواؤں کی دست گیری فرماتے' مستحقین کا خیال رکھتے اور ہر وہ کام سرانجام دیتے جو لوگوں کی بھلائی کا موجب ہوتا-

حضرت حمیضہ نے اسی ماحول میں پرورش پائی تھی اور والد کے علاوہ انھوں نے دادی کو بھی انہی اوصاف سے متصف پایا تھا- ان کی دادی یسیرہ بھی نہایت عالی کردار اور لوگوں کی ہم درد و بہی خواہ تھیں اور ان کی تکلیفوں اور دکھ درد میں شریک رہتی تھیں-

یہ تمام خوبیاں حضرت حمیضہ کی ذات میں جمع ہو گئی تھیں اور وہ خیر کا پیکر بن

گئی تھیں۔ معاملات کی نہایت صاف تھیں' قرابت داروں اور پڑوسیوں کے حقوق ادا کرنے میں بہت تیز تھیں۔ کسی کو برائی کا ارتکاب کرتے دیکھتیں تو سخت نفرت کا اظہار کرتیں اور اس کے لیے دعا فرماتیں کہ اے اللہ! یہ شخص سیدھی راہ سے ہٹ گیا ہے' اسے صراط مستقیم پر قائم رکھ' اسے برائیوں سے پاک کر دے اور اس کی نیکیوں میں اضافہ فرما۔ یہ تیرا عاجز بندہ ہے' اس کی برائیاں دیکھ کر اس کے بارے میں دلوں میں نفرت و حقارت کے جذبات کروٹ لیتے ہیں' تو اسے برائیوں اور ان کے لوازم سے دور رکھ' اس کو اپنے مخلص بندوں میں شامل فرما۔ اس کے شب و روز کو بہتر بنا' اس کی عادات و اطوار میں پاکیزگی پیدا کر' اسے توفیق دے کہ یہ غلطیوں سے تائب ہو کر لوگوں کے لیے اور خود اپنی ذات کے لیے نفع و نقصان کا فیصلہ کر سکے اور یہ تمیز کر سکے کہ کون سا عمل مضرت رساں ہے اور کون سا فائدہ مند۔

بچوں کے بارے میں کہا کرتی تھیں کہ بچے اس صورت میں بلند اخلاق اور صاف کردار کے مالک ہو سکتے ہیں' جب کہ شروع ہی سے ان کی بہتر تربیت کا اہتمام کیا جائے اور انھیں تعلیم دی جائے کہ کن چیزوں سے انھیں دامن کشاں رہنا چاہیے اور کن امور پر عمل کی دیواریں استوار کرنی چاہئیں۔ انھیں ابتدا ہی سے یہ بھی بتانا چاہیے کہ وہ بڑوں کا احترام کریں اور ان کی تکریم کو اپنے لیے ضروری قرار دیں۔ جب تک بچوں کو یوم اول ہی سے بہتر راہ پر نہیں لگایا جائے گا اور نیکی اور برائی کے درمیان خط امتیاز کھینچ کر ان کی ذہنی سطح کے مطابق دونوں میں فرق کی نوعیت کو واضح نہیں کیا جائے گا' ان کی تربیت کا بہتر اہتمام نہیں ہو سکتا۔

عاقل و فہیم لوگوں کا کہنا ہے کہ بچوں کے سامنے کبھی غلط کام نہ کرو' کبھی کسی کے ساتھ سختی سے بات نہ کرو' کسی سے ناشائستہ گفتگو نہ کرو' بچوں کی موجودگی میں باہم بے تکلفی کا مظاہرہ نہ کرو' کیونکہ بچے کا ذہن آئینے کی طرح صاف ہوتا ہے' وہ جیسی حرکتیں دوسرے کو کرتے دیکھتا ہے' اسی کی نقل اتارنی شروع کر دیتا ہے' اس لیے بچے کے سامنے اچھی اور حسن اخلاق سے تعلق رکھنے والی باتیں کرو تا کہ اس میں بھی یہی

واعیہ پیدا ہو اور وہ اچھائی کو بچپن ہی سے اپنا نصب العین ٹھہرا لے۔

حضرت حمیضہ بنت یاسر روایت حدیث کے باب میں بھی ممتاز تھیں۔ انھوں نے اپنی دادی یسیرہ سے حدیث روایت کی جو ایک راویہ حدیث تھیں۔ حضرت حمیضہ نے بعض اور اصحاب حدیث سے بھی احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیں اور اس ضمن میں احتیاط کا ثبوت بہم پہنچایا۔

ان سے مروی روایات احادیث کی متعدد کتابوں میں مذکور ہیں مثلاً صحاح ستہ میں سے سنن ابی داؤد اور جامع ترمذی میں ان سے مروی حدیثیں مذکور ہیں۔ یہ ایک ثقہ اور روایت حدیث کے باب میں محتاط خاتون تھیں، چنانچہ ابن حبان نے ان کا ذکر ثقات میں کیا ہے۔

ان کی شادی بھی ایک محدث سے ہوئی تھی، جن کا نام عثمان تھا۔ یہ بھی نہایت پرہیزگار بزرگ تھے۔

ان کی وفات ۲۰۰ھ کے بعد ہوئی۔

اسما بنت اسد

''آئمہ دین میں سے آپ کے نزدیک سب سے بڑا امام کون ہے''؟

''امام ابو حنیفہ۔''

''اللہ ان پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے' وہ واقعی بہت بڑے امام تھے''؟

''ہاں! ان کی نظر بہت وسیع تھی اور فقاہت میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔''

''وہ فقہ پر عبور رکھتے تھے''؟

''عبور کا کیا مطلب؟ وہ فقہ کے ایک مستقل مکتب فکر کے بانی تھے۔''

''ان کا انداز فقاہت کیسا تھا''؟

''وہ مشکل سے مشکل مسائل کو نہایت آسانی سے حل کر دیتے اور مسائل کی چند الفاظ میں تشریح فرما دیتے تھے۔''

''ان کے مشہور شاگرد کون کون ہیں''؟

''امام ابو یوسف' امام محمد اور امام زفران کے مشہور تلاندہ میں سے ہیں۔''

حضرت اسما بنت اسد بن فرات رحمتہ اللہ علیہا کے ایک مشہور شاگرد عبداللہ بن یحیٰی نے حضرت امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اور ان کی فقہ کے بارے میں چند سوال کیے جن کے انھوں نے آسان اور عام فہم انداز میں یہ جواب دیے۔

اسما بنت اسد قیروان کی رہنے والی تھیں اور علم و فضل کے اعتبار سے اپنے دور میں نہ صرف سب خواتین سے آگے تھیں بلکہ اکثر مرد علما و فقہا بھی ان کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہ رکھتے تھے' ان کے حالات شہیرات التونسیات میں حسن حسنی عبدالوہاب نے بیان کیے ہیں۔

یہ جلیل القدر خاتون ۱۹۲ھ میں قیروان کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئیں۔

ان کے والد اسد بن فرات بہت بڑے فقیہ' محدث اور رجال و سیر کے عالم تھے۔ انھوں نے اپنی اس بیٹی کو بڑی محنت سے تعلیم دلائی اور بڑے بڑے علماو فقہا کی خدمت میں بھیجا۔ انھوں نے ان کی تربیت کا خاص طور سے اہتمام کیا اور تمام علوم کے حصول کے مواقع فراہم کیے۔ یہ عالم طفولیت میں تھیں کہ ان کے والد جناب اسد بن فرات انھیں علمی مجلسوں میں اپنے ساتھ لے جاتے اور انھیں حدیث و فقہ کے نکات سمجھاتے۔ فقہی مناظروں اور بحث و تمحیص کی مجلسوں میں بھی وہ انھیں اپنے ساتھ رکھتے' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ علم وادراک کے تمام گوشوں پر حاوی ہو گئیں۔ رجال و سیر پر عبور حاصل کر لیا اور حدیث و فقہ اور اس دور کے مروجہ علوم میں درجہ کمال کو پہنچیں۔

اس زمانے میں قیروان ایک عظیم علمی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا اور علمائے حدیث وفقہ کی بہت بڑی جماعت اس میں فروکش تھی۔ جابجا علمی محفلیں جمتی اور مختلف موضوعات پر آزادانہ گفتگو ہوتی۔ اسما کے والد ان سب میں شرکت کرتے اور اپنی اس بیٹی کو ساتھ رکھتے۔ قیروان میں امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے معتقد بھی خاصی تعداد میں تھے اور امام مالک اور امام شافعی کے متبعین بھی۔ اس زمانے میں امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ کی ان قربانیوں کی بڑی شہرت تھی جو انھوں نے خلق قرآن کے مسئلے سے متعلق دی تھیں اور جو عباسی حکمران مامون الرشید کے افکار و خیالات کے خلاف ایک زبردست چیلنج کی حیثیت رکھتی تھیں۔ امام احمد نے اپنی ان قربانیوں کی بدولت ہر طبقے کے علماو زعما کے دل جیت لیے تھے اور سب لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔

مامون الرشید کی کوششوں سے کلامی بحثوں کا بھی آغاز ہو چکا تھا اور فلسفہ و حکمت کی گرفت دلوں پر خاصی گہری ہو گئی تھی۔ اسما ان سب مباحث سے آشنا تھیں اور بسا اوقات ایک فریق کی حیثیت سے ان میں شریک ہوتی تھیں۔

یہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے متبعین میں سے تھیں اور ان کی فقہ پر عبور رکھتی تھیں۔ اس مسلک کے فقہا میں ان کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا

کیونکہ اس باب میں یہ بے حد معلومات رکھتی تھیں۔ مختلف علوم کی تحصیل کے بارے میں یہ خاتون بہت وسیع القلب تھیں اور ان کا عقیدہ تھا کہ علوم میں حد بندی قلت معلومات اور کم عقلی کا نتیجہ ہے۔ ہر شخص کو اپنے معلومات بڑھانے کے لیے ہر قسم کے علوم سے متمتع ہونا چاہیے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک مجلس میں فرمایا:

علم کی اپنی ایک تعریف ہے' علم کا خاصہ یہ ہے کہ وہ انسان کو تنگ نظری اور تعصب کی بیماری سے نجات دلاتا ہے۔ جو شخص جتنا وسیع المطالعہ اور وسعت معلومات کا حامل ہو گا' اس کا دل اسی نسبت سے حسد و کینہ اور بغض و عداوت کے جراثیم سے پاک ہو گا۔ علم ایک عظیم ورثہ ہے' جسے ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف منتقل ہوتے رہنا چاہیے۔ علم ذہن کو جلا بخشتا ہے' دماغ کو نور بصیرت عطا کرتا اور دل کو خاص قسم کی پاکیزگی سے نوازتا ہے۔ جو لوگ علم تفسیر حاصل کرتے اور فقہ سے جی چراتے ہیں' وہ بھی علم کے دشمن ہیں اور جو فقہ کو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ترجیح دیتے ہیں وہ بھی اپنی جہالت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں' اور جو فقہ سے اغماض کر کے تاریخ اور امم سابقہ کے واقعات پر عبور حاصل کرتے ہیں' وہ بھی انصاف کے تقاضوں سے منحرف ہوتے ہیں' جب تک قرأت' تفسیر' حدیث' فقہ اور تاریخ کے تمام علوم حاصل نہیں کیے جائیں گے' ذہن سمٹے اور سکڑے رہیں گے ان کے سامنے دلوں کی تازگی اور شگفتگی کے دریچے نہیں کھل سکیں گے۔ میں امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی متبع ہوں' ان کی فقہ اور ان کے فقہی رجحانات و افکار کو صحیح سمجھتی ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ امام ابو حنیفہ کی فقہ انسانی ذہن کے مطابق ہے اور مسائل کے بارے میں ان کی تعبیر و وضاحت پر اعتماد کرنا چاہیے۔ لیکن میں علم کو اسی دائرے میں محصور نہیں سمجھتی۔ میرے نزدیک علم کے حدود بہت وسیع ہیں اور اس کا دائرہ دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ ہر نیا سورج نئی ضرورتیں لے کر طلوع ہوتا ہے اور اس

کے ساتھ ہی غور و فکر کی سمتیں قدرتی طور پر بدل جاتی ہیں۔ بوقلموں ایجادات و ضروریات کے ساتھ لازمی طور پر بوقلموں علوم معرض ظہور میں آئیں گے، جن کی وجہ سے سوچ بچار کی نئی سے نئی راہیں کھلیں گی۔

ان کا کہنا ہے کہ مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی علوم وفنون سے بہرہ مند ہونا چاہیے اور اپنے فہم و فکر کے زاویوں کو بدلنے کے لیے کوشاں ہونا چاہیے۔ عورت جتنی زیادہ علم و فضل کی مالک ہو گی، اس کے بچے اسی قدر علوم سے دلچسپی رکھیں گے۔ اگر عورت اس نعمت عظمیٰ سے محروم رہے گی تو بچوں کے دل میں علم کی محبت جاگزین نہیں ہو سکے گی۔ وہ خوش قسمت ماں ہے جو اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے سازگار ماحول پیدا کرتی اور خود معلّمہ کے فرائض انجام دیتی ہے۔

اسما بنت اسد اگرچہ فقہ امام ابوحنیفہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ لیکن دیگر آئمہ محدثین وفقہا کی بھی دل سے قدر کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے ایک متبع سے گفتگو کرتے ہوئے کہا:

> امام شافعی کی فقہ بدرجہ غایت واضح اور منقح ہے۔ وہ بہت بڑے فقیہہ تھے اور ان کی نظر مسائل کے تمام گوشوں کو گھیرے ہوئے تھی۔ نیکی، تقویٰ، فقاہت، حدیث اور اسلوب بیان و اظہار میں امام شافعی سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ انھوں نے ان امور کو واضح کیا ہے جو وقت کے ساتھ پوری ہم آہنگی رکھتے ہیں اور جن کو لائق اعتنا قرار دینا ضروری تھا۔

اسی طرح امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں فرمایا:

> امام مالک اصحاب مدینہ کو خوب سمجھتے ہیں اور ان کے متعلق ان کی رائے بڑی صائب ہے۔ وہ تعامل اہل مدینہ کو خاص حیثیت دیتے ہیں اور ان کی یہ رائے بالکل صحیح ہے، کیونکہ مدینہ منورہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کا مسکن تھا۔ درحقیقت اسی بابرکت شہر سے اسلام کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس میں مسلمانوں نے بڑے بڑے معاملات سرانجام

دیے اور یہیں سے اسلام کی تبلیغ و ترویج کے لیے راہیں ہموار ہوئیں' لہٰذا اگر امام مالک یا کوئی اور بزرگ تعامل اہل مدینہ کو فوقیت دیتے ہیں تو ان کا یہ موقف بالکل صحیح ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ کے متعلق ان کی یہ رائے ہے کہ وہ ایک جلیل القدر امام ہیں۔ ان کا تعلق براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین و ارشادات سے ہے اور وہ اس سے شدید وابستگی رکھتے ہیں۔ خلق قرآن کے سلسلے میں انھوں نے جو قربانیاں دیں وہ اسلام کی عظیم خدمت ہے۔ اپنی جان اور مال کو کلیتہً اسلام کے حوالے کر دینا کوئی آسان کام نہیں۔

ایک شخص نے ان سے سوال کیا۔

آپ امام ابو حنیفہ کی متبع ہیں؟

جی ہاں۔

لیکن آپ دوسرے علماو فقہا کی بھی تعریف کرتی ہیں۔

کیوں نہ کروں' کیا انھوں نے اسلام کی خدمت نہیں کی؟

یہ حضرات ایک دوسرے کے مخالف نہیں تھے؟

بالکل نہیں۔ یہ مسلمانوں کے سچے خادم' اسلام کے نہایت مخلص دوست اور اللہ کے برگزیدہ بندے تھے۔

سوال ہوا کیا ان کی تکریم سب پر فرض ہے؟

سب کے لیے ضروری ہے کہ ان کا اکرام کریں اور انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھیں۔

اسما اسلام کی ایک جلیل القدر بیٹی تھیں' بزرگان دین کی انتہائی تعظیم کرتی تھیں' اگرچہ ان کا شمار فقہائے اہل عراق میں ہوتا ہے' مگر تمام فقہی مسالک پر نظر رکھتی تھیں۔ ان کا انتقال ۲۵۰ھ میں ہوا۔

خدیجہ بنت سحنون

خدیجہ بنت سحنون بن سعید تنوخی' تیونس کی رفیع المرتبت خواتین میں سے تھیں۔ حسن حسنی عبدالوہاب نے شہیرات التونسیات میں ان کا ذکر کیا ہے۔

وقائع نگاروں کے بیان کے مطابق ان کی ولادت ۲۱۰ سے ۲۱۵ھ تک کے درمیانی عرصے میں ہوئی۔ یہ عباسی خلیفہ مامون الرشید کی خلافت کا آخری دور تھا۔ مامون الرشید نے رجب ۲۱۸ھ میں وفات پائی اور اس کی وفات سے دوسرے دن یعنی ۱۹ رجب ۲۱۸ھ کو اس کے بھائی معتصم باللہ کی بیعت خلافت لی گئی۔ یہ دونوں عباسی خلیفے نہایت طاقت ور اور دور اندیش تھے۔ مامون الرشید خود بھی پڑھا لکھا تھا اور علما کا بھی قدر دان تھا۔ اس کے زمانے میں مختلف علوم و فنون نے بڑی ترقی کی۔ اس کا بھائی اور جانشین معتصم باللہ زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا' اس لیے جو علمی سرگرمیاں ہارون اور مامون کے زمانے میں عروج پر تھیں' اس کے زمانے میں روبزوال تھیں۔ معتصم ایک فوجی آدمی تھا اور اس کے زمانۂ خلافت میں روم' بلاد خزر' ماوراء النہر' کابل اور سیستان وغیرہ علاقوں کی طرف خوب فتوحات ہوئیں۔ قیصر روم پر بھی اس نے ایسی کاری ضرب لگائی کہ اب تک کسی مسلمان حکمران نے ایسی ضرب نہ لگائی تھی۔ جنگ روم اور فتح عموریہ میں معتصم نے تیس ہزار رومیوں کو قتل اور تیس ہزار کو گرفتار کیا' جس کی وجہ سے رومی اس سے بے حد خوف زدہ اور سراسیمہ تھے۔۔۔ یہ ایک مضبوط خلیفہ تھا' لیکن خلق قرآن کے بارے میں اس کے نظریات وہی تھے جو اس کے بھائی مامون الرشید کے تھے۔ اس مسئلے میں امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ کو مامون الرشید کی طرح اس نے بھی بہت اذیتیں پہنچائیں۔ ہمیں دراصل کہنا یہ ہے کہ جس دور میں خدیجہ بنت سحنون پیدا ہوئیں وہ مسلمانوں کی مادی ترقی کا دور تھا۔

خدیجہ بنت سحنون پڑھی لکھی خاتون تھیں-اس دور کے مشہور اساتذہ سے انھوں نے تعلیم حاصل کی تھی' شعر و شاعری کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتی تھیں' حدیث اور اس کے متعلقات پر ان کی نظر تھی- فہم و ادراک کا اللہ نے انھیں خاص جوہر عطا فرمایا تھا-

زیرک اور دور اندیش خاتون تھیں بڑے بڑے مشکل مسائل آن کی آن میں حل کر دیتی تھیں- ذہن رسا پایا تھا' جس کی کیفیت یہ تھی کہ ادھر ایک بات سامنے آئی' ادھر اس کے نشیب و فراز پر قابو پالیا-

نیکی اور تقوی شعاری میں بھی بے مثال تھیں- روزانہ دینی مسائل سمجھنے کے لیے لوگ ان کے پاس آتے- ہر وقت یاد خدا میں مشغول رہتیں- قرآن پر عبور تھا اور اس کا اکثر حصہ انھیں زبانی یاد تھا- بات بات پر قرآن کی آیات پڑھتیں اور اس کے مطالب کی وضاحت فرماتیں- فرائض کی پابند تو تھیں ہی' سنن و نوافل بھی اہتمام سے ادا کرتیں-

فقہی لحاظ سے مالکی مکتب فکر کی حامل تھیں اور مسائل میں حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کی تحقیق کو اہمیت دیتی تھیں- انھوں نے علم فقہہ اپنے والد محترم سحنون بن سعید تنوخی سے حاصل کیا تھا جو مغرب میں مذہب امام مالک کے بہت بڑے حامی اور متبع تھے- مغرب یعنی الجزائر' تیونس اور مراکش وغیرہ میں اس زمانے میں امام مالک کی فقہہ پر ہی عمل ہوتا تھا اور علمائے مالکیہ اس نواح میں بڑی قدر و منزلت کے حامل تھے- حضرت خدیجہ بنت سحنون بھی اس باب میں اپنے باپ سے متاثر تھیں- وہ فقہہ مالکی کے مطابق عمل کرتی اور فہم مسائل میں اسی فقہ کو لائق اعتنا گردانتی تھیں- اس نواح کی تمام خواتین مسائل میں خدیجہ کی طرف رجوع کرتیں اور انہی کے فتوے کو حرف آخر قرار دیتی تھیں-

خود حضرت خدیجہ رحمتہ اللہ علیہا کے والد جناب سحنون بن سعید تنوخی بیٹی کی بہت قدر کرتے تھے اور اہم معاملات میں وہ گھریلو ہوں یا علمی و فقہی ان سے مشورہ طلب کرتے اور اسی بات پر عمل کرتے تھے جس کا یہ انھیں مشورہ دیتیں- والد کے نزدیک یہ

نہایت صاحب الرائے اور بہتر مشیر تھیں۔ وہ ان کی نیکی اور دین داری کو بھی بہت اہمیت دیتے اور ان کی زندگی کے اس پہلو سے متاثر تھے اور کہا کرتے تھے کہ میری یہ بیٹی پرہیزگار، ذی علم اور معاملہ فہم ہے، اور فکر و تدبیر میں سب سے آگے ہے۔ ان سے مشورہ لینے والا دھوکا نہیں کھائے گا۔

شخصیات کے بارے میں بھی خدیجہ خوب علم و آگاہی رکھتی تھیں۔ کہتے ہیں ایک مرتبہ ایک شخص کا خط پڑھ کر بتادیا تھا کہ کس کردار کا مالک ہے اور اس کے رجحانات کیا ہیں۔ اس ضمن میں ان کے والد سحنون تنوخی انھیں قابل اعتماد سمجھتے تھے اور ان کی بات کو وزن دیتے تھے۔ ان کے والد اس نواح کے معززین میں سے تھے اور مالکی مکتب فکر میں ان کو اونچا مقام حاصل تھا۔ کہتے ہیں ایک مرتبہ دارالخلافہ سے انھیں عہدہ قضا پیش کیا گیا تو انھوں نے اس سلسلے میں اپنی اس بلند اطوار بیٹی سے مشورہ لیا۔ بیٹی نے عہدہ قضا قبول کرنے کا مشورہ تو دیا لیکن ساتھ ہی فرمایا کہ جو شخص خلیفہ کا یہ پیغام لے کر آپ کے پاس آیا ہے، اس کے تیور اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ اس سے میل جول سے احتراز کرنا چاہیے۔ سحنون بن سعید تنوخی نے یہ عہدہ تو بیٹی کے کہنے سے قبول کر لیا، لیکن اس پیغام رساں سے ہمیشہ الگ تھلگ رہے۔ وہ شخص بظاہر بڑا اچھا معلوم ہوتا تھا اور اس کے عام انداز گفتگو میں کوئی برائی نظر نہ آتی تھی، لیکن ایک عرصے کے بعد معلوم ہوا کہ اس کے ارادے سحنون کے بارے میں اچھے نہ تھے۔

حضرت خدیجہ بنت سحنون بن سعید تنوخی کی وفات ۲۷۰ھ میں ہوئی اور انھوں نے پچپن اور ساٹھ برس کے درمیان عمر پائی۔ انھیں شہر قیروان کے باہر اپنے خاندانی قبرستان میں دفن کیا گیا۔ قیروان ہی ان کا آبائی شہر تھا اور یہیں انھوں نے تعلیم و تربیت کی منزلیں طے کی تھیں اور وہ اسی شہر کی خاک میں دفن کی گئیں۔

بوران بنت حسن

بوران بنت حسن ادب واخلاق کے اعتبار سے بلند ترین خاتون تھیں اور علم و فضل میں اس دور کی خواتین میں اپنا جواب نہ رکھتی تھیں۔اس کا اصل نام خدیجہ تھا' بوران اس کا لقب تھا' اس نے اسی لقب سے شہرت پائی۔

یہ جس خاندان میں پیدا ہوئی وہ حکومت و فرماں روائی' تدبیر و سیاست اور شجاعت و بسالت میں نہ صرف عرب میں بلکہ تمام اسلامی ممالک بلکہ کہنا چاہیے کہ پوری دنیا میں خاص شہرت کا مالک تھا' جس کی تفصیل یہ ہے کہ فضل بن سہل اور حسن بن سہل دو بھائی تھے۔ فضل بن سہل عباسی خلیفہ مامون الرشید کا وزیر اور سلطنت عباسیہ کا مدار المہام تھا اور عباسی خاندان میں اسے قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔اس کی عقل و فراست اور بہادری سے متاثر ہو کر مامون الرشید نے اس کو ذوالریاستین کا لقب دے رکھا تھا یعنی فہم و دانش اور جرات و جواں مردی میں یہ اپنی مثال آپ ہے۔اس کا بھائی حسن بن سہل بھی بہت مدبر اور سیاست دان تھا اور اس کی سوچ بچار کا دائرہ بڑا وسیع تھا۔ابتدا میں یہ مامون الرشید کی طرف سے دیوان الخراج کا نگران اور منتظم اعلیٰ تھا۔بعد میں اسے فضل بن حسن کی سفارش پر جبال' فارس' اہواز' بصرہ' کوفہ' حجاز' یمن اور بعض نو مفتوحہ علاقوں کا حاکم مقرر کر دیا گیا تھا۔اس کا مرکزی مقام بغداد تھا' جہاں اس نے بہت بڑا دفتر قائم کر رکھا تھا اور وہاں سے تمام علاقوں کا انتظام کرتا تھا۔

مامون الرشید اور امین الرشید کا سلطنت کے معاملے میں جب جھگڑا ہوا اور یہ جھگڑا شدت اختیار کر کے لڑائی اور باقاعدہ جنگ کی صورت میں بدلا تو ان دونوں بھائیوں نے امین کے مقابلے میں مامون کی مدد کی جو آخر کار امین کے قتل اور مامون کی کامیابی پر منتج ہوئی۔اس جنگ کے بعد مامون کے دل و دماغ پر انھوں نے مزید تسلط

قائم کرایا اور سلطنت کے معاملات ان کی رائے اور مشورے سے طے ہونے لگے۔ اگرچہ خود مامون بھی بڑا ذی فہم اور صاحب عزم حکمران تھا' تاہم ان کی رائے کو بہت اہمیت دیتا تھا۔ مامون کی ملکی فتوحات اور نظام سلطنت میں ہر مقام پر انھیں خاص حیثیت حاصل تھی۔ بوران بنت حسن اسی خاندان کی فرد تھی اور عقل و دانش اور فہم و فراست کی دولت اسے ورثے میں ملی تھی۔

اب مامون الرشید اور اس کے عہد پر بھی ایک نظر ڈال لینا ضروری معلوم ہوتا ہے' کیونکہ بوران بنت حسن اسی کی بیوی تھی۔

یہ عباسی خلیفہ ہارون الرشید کا بیٹا تھا۔ اس کا اصل نام عبداللہ تھا' لیکن باپ نے اس کو مامون کا خطاب دیا۔ اس کی کنیت ابوالعباس تھی۔ یہ جمعہ کے روز ۱۵ ربیع الاول ۱۷۰ھ کو پیدا ہوا۔ اس کی ماں کا نام مراجل تھا جو مجوسی النسل ام ولد تھی۔ یہ نہایت ذہین شخص تھا۔ قرآن پاک کا حافظ اور متبحر عالم تھا۔ علما کا قدردان تھا۔ فصاحت کلام اور برجستہ گوئی میں اسے کمال حاصل تھا۔ تفسیر' حدیث' فقہ' کلام اور نحو وغیرہ علوم و فنون معروف اساتذہ سے پڑھے تھے۔ اپنے بھائی امین کے قتل کے بعد ۲۲ محرم ۱۹۸ھ کو مسند خلافت پر متمکن ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ۲۷ برس تھی۔ فلسفہ اور دیگر یونانی علوم سے بھی اسے گہرا لگاؤ تھا۔ اس نے فلسفے کی نشر و اشاعت اور کتب فلسفہ کو عربی میں منتقل کرانے میں بڑی کوشش کی اور اس مقصد میں کامیاب ہوا۔ تالیف و ترجمہ کے لیے اس نے ایک بہت بڑا کتب خانہ قائم کیا' جس کا نام بیت الحکمت رکھا اور اس اہم کام کی انجام دہی کے لیے اس نے بڑے بڑے اہل علم کی خدمات حاصل کیں۔ اس نے ترجمے کے سلسلے میں ہندوستان سے بھی بعض ماہرین فن کو بلایا اور ان سے بہت علمی کام لیا۔ خلافت و سلطنت کے زمانے میں فضل بن سہل اور حسن بن سہل اس کے بہت بڑے معاون تھے۔ علوم و فنون کی توسیع اشاعت میں بھی انھوں نے اس کی مدد کی۔ اس نے بیس سال حکومت کی مسند پر فائز رہنے کے بعد جمعرات کے روز ۱۸ رجب ۲۱۸ھ کو انتقال کیا۔ وفات کے وقت اس کی عمر ۴۸ برس تھی۔ بڑا بارعب' صاحب عزم و ارادہ

اور عالم و فاضل حکمران تھا۔

بوران بنت حسن بن سہل صفر ۱۹۲ھ کو پیدا ہوئی۔ عمر میں مامون الرشید سے بائیس سال چھوٹی تھی۔ نہایت عقل مند اور زیرک خاتون تھی' جیسا کہ عرض کیا گیا جس خاندان سے تعلق رکھتی تھی' وہ عقل و فہم میں ممتاز تھا۔

بوران کے والد حسن بن سہل اور چچا فضل بن سہل مامون پر خاص اثر ورسوخ رکھتے تھے اور کاروبار حکومت بہت حد تک انہی کے اشارے پر چلتا تھا۔ حسن بن سہل نے مامون پر اپنی گرفت زیادہ مضبوط کرنے کے لیے مناسب سمجھا کہ بوران کا عقد مامون سے کر دے' چنانچہ رمضان المبارک ۲۰۲ھ میں جب کہ بوران کی عمر دس گیارہ برس اور مامون کی چالیس برس تھی' اس کا نکاح کر دیا گیا' مامون نے اس نکاح پر بہت مال وزر خرچ کیا۔ بڑی دھوم دھام سے شادی کی اور لوگوں میں کثرت سے مال و دولت تقسیم کیا۔ وزرا کو خلعت پہنائے' اعیان حکومت کو درہم و دینار عطا کیے' شعرا کو انعامات سے نوازا' غربا و مساکین میں خوب دولت بانٹی۔ غرض اس شادی پر مامون نے انتہائی مسرت کا اظہار کیا اور لوگوں کو بہت کچھ دیا۔

طبری نے لکھا ہے کہ اس شادی کے موقعے پر مامون' حسن بن سہل کے ہاں انیس روز قیام پذیر رہا اور حسن نے مہمانوں کے مقام و مرتبہ کے مطابق ان کی بہت خدمت کی۔ روزانہ مختلف قسم کے کھانے پکتے رہے اور مہمانوں کی تواضع کا سلسلہ جاری رہا۔

تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے کہ انواع و اقسام کے ماکولات و مشروبات پر حسن بن سہل نے پچاس ہزار درہم خرچ کیے۔ بعض مورخین کا کہنا ہے کہ ۲۰۳ھ میں منگنی ہوئی تھی یا صرف نکاح ہوا تھا۔ شادی یا رخصتی ۲۱۰ھ میں ہوئی۔

شادی کی تقریب سے مامون جب واپس ہونے لگا تو اس نے عنان بن عباد کو حکم دیا کہ فارس کے مال سے حسن کو دس ہزار درہم دیے جائیں اور ساتھ ہی فم الصلح عطا کیا جائے۔ "فم الصلح" واسط کے بالائی علاقے میں ایک قصبہ ہے' وہاں ایک نہر ہے جو

دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے سے نکلتی اور اس علاقے کو سیراب کرتی ہے- یہ قصبہ بڑا سرسبز و شاداب تھا- جب یہ قصبہ حسن بن سہل کو دیا گیا تو حسن نے وہاں رہائش کے لیے شان دار محلات تعمیر کیے مامون اپنی بیوی بوران کے ساتھ وہاں اکثر آتا اور کئی کئی روز قیام کرتا-

بوران کی شادی میں بے شمار سرکردہ لوگوں اور مختلف علاقوں کے معززین کو باقاعدہ الگ الگ خط لکھ کر دعوت دی گئی تھی اور مدعوین کے نام اور ان لوگوں کے نام جنھوں نے بوران کو تحائف دیے تھے' ایک رجسٹر میں لکھے گئے تھے- بنو ہاشم کو بھی بہت بڑی تعداد میں مدعو کیا گیا تھا-

حسن بن سہل اور اس کا خاندان اہل بیت سے انتہائی محبت و عقیدت رکھتا تھا' خود مامون بھی اس خاندان کا گرویدہ تھا- بوران بنت حسن بھی اس خاندان کو انتہائی احترام کی نگاہ سے دیکھتی تھی- اسی بنا پر بوران کو تمام طبقوں میں محترم گردانا جاتا تھا-

بوران کی فراست اور عقل و دانش کا یہ عالم تھا کہ مامون امور مملکت میں اس سے باقاعدہ مشورے لیتا اور متعدد معاملوں میں اس کی رائے پر عمل کرتا تھا- بہت سی پیچیدہ گتھیوں کو یہ خاتون سلجھاتی اور مامون کی مدد کرتی تھی- مامون اس کے اس پہلو کا بہت مداح تھا اور اس سے متاثر تھا- بوران میں ایک خوبی یہ تھی کہ اتنی بڑی خاتون ہونے کے باوجود اس کا دل فخر و غرور سے خالی تھا- محلات میں رہنے اور ملکہ ہونے کے باوصف سادگی پسند اور نرم طبیعت تھی-

شادی سے صرف آٹھ سال بعد ۱۸ رجب ۲۱۸ھ کو مامون الرشید نے وفات پائی- بوران کی عمر اس وقت چھبیس برس تھی- اس کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا- اب وہ بغداد کے قصر مامون میں گوشہ نشین ہو گئی تھی- مامون کی وفات کے بعد ۵۴ سال زندہ رہی- ۸۰ برس عمر پا کر ۲۷۱ھ کو بغداد میں فوت ہوئی اور وہیں جامع السلطان کے قبے کے سامنے اسے دفن کیا گیا-

جوہر براثیہ

''ابو عبداللہ قافلہ چل پڑا ہے' مسافت بہت دور کی ہے اور تم محو استراحت ہو۔ سفر طویل ہے اور سامان سفر نہ ہونے کے برابر۔ تم نے انجام سے نظر ہٹالی ہے اور فوائد عاجلہ کو اپنا مطمع نظر ٹھہرالیا ہے۔ غفلت کی نیند سے بے دار ہو جاؤ' آرام وراحت کو تیاگ دو اور امور خیر میں منہمک ہو جاؤ' تعجب ہے تم نے جرس کارواں نہیں سنا۔ اگر ذہن و فکر اور غور و تعمق کی نعمت سے عاری نہیں ہوگئے ہو تو آنکھیں کھول کر حالات کا جائزہ لو اور بصیرت و بصارت دونوں سے کام لو۔ حال کے جھروکوں سے ماضی کی طرف دیکھو۔ اس دنیا کی طرف دھیان کرو' اس میں کتنی قومیں آئیں' آباد ہوئیں اور چلی گئیں۔ بے شمار لوگ اس میں اپنے آثار چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے رخت سفر باندھ گئے۔

''یہ کارگاہ حیات آہستہ آہستہ ایک وسعت پذیر آثار قدیمہ کی صورت اختیار کرتی جارہی ہے۔ اٹھو اپنے اعمال کا محاسبہ کرو' سونے والے سوتے ہی رہ جائیں گے اور جاگنے والے اپنی منزل پوری کرلیں گے۔''

یہ ہیں وہ الفاظ جو جوہر براثیہ نے ایک روز ہنگام سحر اپنے شوہر ابو عبداللہ کو نیند سے بے دار کرتے وقت کہے۔

جوہر براثیہ بغداد کی ایک عابدہ وزاہدہ خاتون تھیں۔ ان کی زندگی بڑے عجیب و غریب حالات میں بسر ہوئی اور یہ کئی مراحل سے گزر کر عبادت کی منزل پر پہنچیں۔ ان کی ولادت ۲۳۷ھ کو بغداد میں ہوئی۔ اس زمانے کا بغداد علم و فضل' ادب و انشا اور زہد و تقوی کے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ ابتدا میں یہ ایک عباسی خلیفہ کی کنیز تھیں اور نہایت ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرتی تھیں اور انھیں وہ تمام آسائشیں حاصل تھیں' جن سے اس دور کی کنیزیں بہرہ ور تھیں۔ لیکن اچانک ان کی حیات مستعار نے پلٹا کھایا اور دیکھتے

ہی دیکھتے زندگی نیکی کے قالب میں ڈھل گئی- ہوا یوں کہ ایک دن کہیں جا رہی تھیں کہ ایک بزرگ پر نگاہ پڑی جو دنیا اور اس کے جاہ و جلال سے بے نیاز درس حدیث میں مصروف تھے اور ان کے سامنے شائقین علوم حدیث کثیر تعداد میں بیٹھے قال اللہ و قال الرسول کے نغمے الاپ رہے تھے- ان کے کانوں میں یہ اثر انگیز آواز پڑی تو قدم خود بخود رک گئے اور فرامین رسالت مآب سے مستفید ہونے لگیں- ایک طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کانوں میں پڑا کہ امت میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو-

ساتھ ہی ایک اور آواز گونجی' دوسروں کے لیے بھی وہی کچھ پسند کرو جو اپنے لیے کرتے ہو-

ایک اور آواز آئی ہمسایہ کا خیال رکھنا سب سے بڑی نیکی ہے-

ساتھ ہی یہ حدیث پردہ سماع سے ٹکرائی' والدین سے حسن سلوک' عمر اور رزق میں برکت و فراوانی کا باعث ہے-

اب قدم آگے بڑھائے تو دیکھا بغداد کی جامع مسجد میں ایک محدث طلبا کو حدیث کا درس دے رہے ہیں اور طلبا کئی قطاروں میں بیٹھے احادیث لکھ رہے ہیں- حدیث رسول کی سماعت و کتابت کا یہ منظر اتنا جاذب اور پر کشش تھا کہ جوہر براثیہ نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اسی کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا اور خدمت حدیث اور تقوی و عبادت کو اپنا مستقل شعار قرار دے لیا- اس زمانے میں ابو عبداللہ براق ایک بہت بڑے محدث تھے اور مشہور محدث و فقیہ ابو جعفر کرینی کے استاد تھے جو کہ شہرہ آفاق عابد و زاہد جنید بغدادی کے معاصر تھے-

جوہر براثیہ کے حالات اگرچہ مختصر الفاظ میں صفوۃ الصفوہ میں ابن جوزی نے اور تاریخ بغداد میں خطیب بغدادی نے قلم بند کیے ہیں' مگر نہایت دلچسپ اور اثر انگیز ہیں- ان میں سے چند واقعات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں-

جب یہ احادیث سن کر واپس گئیں تو دنیا بدلی ہوئی تھی اور طبیعت میں ایک عظیم

انقلاب پیدا ہو چکا تھا- قصر خلافت میں داخل ہوئیں تو خاموشی سے جا کر بیٹھ گئیں- ایک دوسری کنیز نے اس خاموشی اور افسردگی کی وجہ پوچھی تو کہا:

"کوئی خاص بات نہیں-"

"آخر اس طویل سکوت کی چادر کب اتارو گی"؟

"نہیں- میں نے سکوت کی چادر تو نہیں اوڑھ رکھی ہے' تم کوئی بات کرو تو جواب دوں گی-"

"تم تو بہت باتیں کرنے کی عادی ہو' یکایک خاموشی کیوں اختیار کر لی ہے"؟

"باتوں میں کیا پڑا ہے- اپنے مفوضہ فرائض انجام دینے چاہئیں اور اللہ سے ڈرنا چاہیے-"

"یہ اللہ کا خوف کب سے دامن گیر ہو گیا ہے"؟

"جب سے اس کی نظر کرم ہوئی ہے-"

"کنیز کو خاموش تو نہیں رہنا چاہیے-"

"میں اللہ کی کنیز ہوں اور اسی کے احکام کی اطاعت میرے فرائض میں داخل ہے-"

"لیکن خلیفہ کو کیا جواب دو گی"؟

"یہی جو تم کو دیا ہے-"

رفتہ رفتہ بات خلیفہ تک پہنچی تو اس نے ان کو آزاد کر دیا اور وہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے لیے یکسو ہو گئیں-

ایک روز گھر میں مصروف عبادت تھیں کہ دروازے پر دستک ہوئی- دروازہ کھولا تو خلیفہ کا فرستادہ کھڑا تھا- اس نے جھک کر سلام کیا اور کوئی بوجھل سی چیز پیش خدمت کی- فرمایا:

یہ کیا ہے؟

کہا: امیر المومنین نے دس ہزار دینار کی تھیلی بھیجی ہے-

بولیں: میں ان دیناروں کا کیا کروں گی؟

مجھے معلوم نہیں، میں نے امیر المومنین کے حکم کی تعمیل کی ہے۔

اصل حکم تو اللہ کا ہے، نہ کہ امیر المومنین کا۔

اچھا آپ اسے رکھ لیجیے اور مجھے اجازت دیجیے۔

نہیں۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں، واپس لے جاؤ، درہم و دینار عارضی اور ناپائیدار چیز ہیں۔ ان کی موجودگی دل میں تکبر اور ذہن میں رعونت پیدا کرتی ہے اور میں اس سے دامن چھڑا چکی ہوں۔

ملازم تھیلی لے کر واپس چلا گیا اور سارا واقعہ خلیفہ کو سنایا۔ خلیفہ نے اس میں دس ہزار دینار کا اضافہ کیا اور کہا میری طرف سے جوہر سے کہنا کہ اسے رکھ لو اور غربا و مساکین میں تقسیم کر دو۔ مگر انھوں نے اس سے بھی انکار کر دیا اور کہا امیر المومنین کے پاس مستحقین کی فہرست ہونی چاہیے اور خود اپنے ہاتھ سے انھیں تقسیم کرنا چاہیے۔ میں ایک تارک الدنیا اور گوشہ نشین عورت ہوں۔ مجھے کیا معلوم مستحق کون ہے اور غیر مستحق کون۔ مبادا تقسیم میں مجھ سے غلطی ہو جائے اور میں اللہ کے نزدیک قابل گرفت قرار پاؤں۔

ایک روز والی بغداد کی بیوی آئیں اور حصول برکت کے لیے اپنے گھر تشریف لے جانے کی درخواست کی۔

فرمایا: میں تو ایک سیدھی سادی عورت ہوں، جس نے امرا سے تعلقات منقطع کر کے ایک چھوٹی سی جھونپڑی کو اپنا مسکن بنالیا ہے۔ آپ بلند و بالا محلوں میں سکونت پذیر ہیں۔ نہ میں آپ کو کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہوں نہ نقصان۔ آپ مجھ سے کسی قسم کی توقع نہ رکھیں اور اپنا کام کریں۔ میری دنیا یہی غریب و بے کس لوگ ہیں، جو میرے ارد گرد بیٹھے ہیں۔ میں انھیں چھوڑ کر کہیں جانا پسند نہیں کرتی۔ غریب کی مجلس میں جو اطمینان قلب حاصل ہے، وہ امیر کی محفل میں کہاں؟

ایک مرتبہ امیر المومنین نے پیغام بھیجا کہ قصر خلافت میں تشریف لا کر شکریے

کا موقع دیجیے۔

جواب دیا، قصر خلافت اور غربت دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ میں آپ کے ہاں آکر آپ کے عیش و راحت کو مکدر نہیں کرنا چاہتی۔ آپ مجھے اپنے ہاں بلا کر میری محدود دنیا میں مداخلت نہ فرمائیں۔

ان کی شادی ابو عبداللہ براثی سے ہوئی جو انہی کی طرح عابد و زاہد اور محدث و فقیہ تھے۔ اس نیک بخت خاتون نے ساٹھ برس عمر پا کر ۲۹۷ھ میں وفات پائی۔

ماجدہ قریشیہ

افکار و خیالات کی پاکیزگی اور نظریات و تصورات کی صفائی کے اعتبار سے حضرت ماجدہ رحمتہ اللہ علیہا بڑی مشہور تھیں۔ خاندان قریش سے تعلق رکھتی تھیں اور عالی مرتبہ خاتون تھیں۔ قریش کے کچھ لوگ بحرین میں سکونت پذیر ہو گئے تھے' یہ انہی میں سے تھیں۔

عادات و اطوار کے باب میں سب سے فائق تھیں' حرص و طمع سے سخت نفرت کرتی تھیں اور دل و دماغ میں زہد و اتقا کا خوب صورت گلستان سجا رکھا تھا۔ صفوۃ الصفوہ اور لواقع الانوار میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ طبیعت میں شرم و حیا کا جذبہ غالب تھا اور لوگوں سے بہت کم لگاؤ رکھتی تھیں۔ زبان کی بے حد نرم تھیں' ہر معاملے میں متوازن اور معتدل تھیں۔

طفولیت کا زمانہ اپنے والد محترم اور اپنے ماموں کی نگرانی اور تربیت میں گزرا۔ یہ دونوں بزرگ اس دور کے علما و فضلا میں سے تھے۔ پہلے قرآن مجید پڑھا۔ اس کے بعد تفسیر قرآن پر عبور حاصل کیا۔ باقی علوم کی تحصیل بھی باقاعدہ کی۔ شعر و شاعری سے بھی شغف تھا کہ اس دور کی عرب خواتین اس موضوع کو خصوصیت سے مرکز توجہ ٹھہراتی تھیں۔ انساب سے گہرا لگاؤ تھا اور اس باب میں ان کے والد اور ماموں ہی ان کے نگران و معلم تھے اور انہی کے التفات خصوصی سے علوم گوناگوں کے حصول کی منزلیں طے کی تھیں۔ بچپن میں کھیل کود اور دوسری چیزوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ صرف تعلیم ہی ان کا اصل مرکز تھا اور کتابوں کی رفاقت ہی میں شب و روز بسر ہوتے تھے۔

ان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ والد اور ماموں کے علاوہ بحرین اور گردو

نواح کے دیگر علما سے بھی کسب فیض کیا، لیکن کن کن علما سے کیا، اس کی تفصیلات نہیں مل سکیں۔ پھر رجال و تراجم کی کتابوں میں یہ بھی مرقوم ہے کہ بے شمار لوگوں نے خود حضرت ماجدہ قریشیہ رحمتہ اللہ علیہا سے تحصیل کی اور دور دراز کا سفر کر کے ان کے سامنے زانوے شاگردی تہہ کیا اور اس زمانے کی بعض اہم شخصیتوں نے اخذ علم کے لیے ان کے باب عالی پر دستک دی، مگر افسوس ہے تفصیلات ان کے ناموں کی نہیں مل سکیں۔

وہ سب سے پہلے طالب علم کی قابلیت کا اندازہ کرتیں اور اس بات کا جائزہ لیتیں کہ کس طالب علم کو کس مضمون سے دلچسپی ہے اور اس کی ذہنی سطح کس نوعیت کی ہے۔ پھر اس کے مطابق اس کی تعلیم کا انتظام کرتیں، اگر کسی کو تاریخ و رجال سے لگاؤ ہوتا تو اس طرف لگا دیتیں، اگر قرآن اور اس کے متعلقات سے رغبت ہوتی تو اس مضمون میں اس کی رہنمائی مہیا فرماتیں، اگر میلان طبعی انساب اور شعر کی طرف دیکھتیں تو اس انداز سے اس کو تکمیل کے مراحل طے کراتیں، اگر یہ محسوس کرتیں کہ طالب علم کو حصول حدیث کا شوق دامن گیر ہے تو اس کو ذخیرہ احادیث سے روشناس کراتیں۔ کسی کی طبیعت اور رجحان کے خلاف کوئی موضوع اس میں ٹھونسنے کی قائل نہ تھیں۔

ان کا یہ طریق تعلیم ایسا فطری اور صحت مندانہ تھا کہ ہر شخص اس کی داد دیتا اور اپنے علم کے قافلے کو اسی نہج پر آگے بڑھانے کی کوشش کرتا۔

طالب علم کی ضروریات کا بھی پورا خیال رکھتیں۔ ان کے اکل و شرب کی کفالت بھی کرتیں، ان کے لباس کا بھی انتظام کرتیں اور کتابیں بھی مہیا فرماتیں، پھر انھیں زہد و اتقا کی راہ پر بھی لگاتیں اور تلقین کرتیں کہ کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کیا جائے اور اپنی ضروریات کے لیے دوسرے کے دست نگر ہونے سے حتی الامکان بچنے کی سعی کی جائے۔

ان کے اقوال بڑے حکیمانہ ہیں۔ فرماتی ہیں:

جس شخص نے خواہشات کا دامن پھیلا لیا اس نے اعمال کو ضائع کر لیا۔
اگر دینی امور کو مطمع نظر ٹھہرایا جائے اور اس کے ساتھ تمناؤں کی چادر کو وسیع کر دیا جائے تو اخلاق و کردار کا پلڑا خالی ہو جاتا ہے۔
مومن کی صفت یہ ہے کہ وہ آخرت کے اہتمام پر زیادہ غور کرے ---اگر زاہد کی آنکھیں یہ دیکھ پائیں کہ متاع دنیا سے اعراض کرنے والوں کے لیے اللہ نے کیا کیا بو قلموں نعمتیں تیار کر رکھی ہیں تو وہ لا زما زندگی پر موت کو ترجیح دے۔

وہ فرمایا کرتیں :

پاؤں کی جو حرکت میرے پردہ سماع سے ٹکراتی ہے اور جتنے قدم میں زمین پر چلتی ہوں' وہ یقیناً مجھے موت کی وادی کی طرف بڑھا رہے ہیں۔

بہر حال حضرت ماجدہ قریشیہ رحمتہ اللہ علیہا ہر اعتبار سے بلند مرتبے کی حامل تھیں اور ان کے عمل و کردار کا دامن بڑا وسیع تھا۔ان کی تربیت نہایت اچھے ماحول میں ہوئی' جس کے آثار ان کی زندگی کے ہر قدم پر نمایاں نظر آتے ہیں۔

حضرت ام حبان سلمیہ

حضرت ام حبان سلمیہ رحمتہ اللہ علیہا بصرہ کی رہنے والی تھیں اور عبادت گزاری و پرہیزگاری میں معروف تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بصرہ کی سرزمین علم و فضل کا مرکز اور نیکی و یاد الٰہی کا سرچشمہ تھی۔ حدیث' فقہ' نحو' شعر و شاعری' قرأت' تفسیر' عروض وغیرہ تمام اصناف علم میں اس خطہ ارض کے لوگوں کو آگاہی حاصل تھی۔ یعنی ان امور میں باشندگان بصرہ بہت سے علاقوں کے لوگوں سے فائق تھے۔ اہل لغت کے نزدیک بصرہ کے معنی عربی زبان میں نرم پتھریلی زمین کے ہیں اور فی الواقع وہ اسی قسم کی زمین تھی' لیکن معجم البلدان میں اس ضمن میں ایک مجوسی فاضل کا جو قول نقل کیا گیا ہے وہ بھی قرین قیاس ہے' وہ کہتا ہے کہ یہ لفظ "بس راہ" ہے جس کے فارسی میں معنی ہیں بہت سے راستے۔ یعنی چونکہ اس جگہ سے بہت سی راہیں نکلتی تھیں' اس لیے اہل عجم اس کو "بس راہ" کے نام سے موسوم کرتے تھے جسے عربوں نے "بصرہ" میں بدل دیا۔

واقعہ یہ ہے کہ جس طرح یہاں سے مختلف مقامات کو جانے کے لیے بہت سی راہیں نکلتی تھیں' اسی طرح یہاں علم و فضل کی بھی بے شمار شاخوں نے جنم لیا اور پروان چڑھیں۔ علم اور تقویٰ کی وہ کون سی راہ ہے جو بصرہ سے نہیں نکلی۔ یہاں نیکی تھی تو سب سے زیادہ' تقویٰ تھا تو انتہا کو پہنچا ہوا' علم حدیث تھا تو حد درجہ کا' ثقاہت تھی تو لاجواب' علم نحو تھا تو بے نظیر۔ عربی لغت کا آغاز بھی اسی شہر سے ہوا' یعنی عربی لغت کی پہلی کتاب جو کتاب العین کے نام سے مشہور ہے اور خلیل بصری کی تصنیف ہے' اسی شہر میں لکھی گئی گویا اس کی تصنیف کا سہرا اسی بلدہ عظیم کے اہل علم خلیل بصری کے سر ہے۔ پھر بے شمار آئمہ مجتہدین اس خاک سے پیدا ہوئے جنھوں نے علم و اجتہاد کے میدان میں لازوال شہرت حاصل کی۔

فوج کی تعداد بھی اس شہر میں سب سے زیادہ تھی۔اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ زیاد بن ابی سفیان کے زمانۂ حکومت میں صرف ان لوگوں کی تعداد جن کے نام فوجی رجسٹر میں درج تھے اسی (۸۰) ہزار تھی اور ان کی آل اولاد ایک لاکھ بیس ہزار کی تعداد میں تھی۔

غرض بصرہ ہر اعتبار سے ایک عظیم شہر تھا اور اس کے باشندے علم وفن کے ہر گوشے میں درجہ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔انہی خوش قسمت لوگوں میں حضرت ام حبان سلمیہ رحمتہ اللہ علیہا کا اسم گرامی شامل ہے۔یہ خاتون انتہا درجے کی نیک اور نہایت عالمہ وفاضلہ تھیں۔ان کے حالات ابن جوزی نے صفوۃ الصفوہ میں قلم بند کیے ہیں، جن سے ان کی عظمت اور انفرادیت کا پتا چلتا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ اس دور کے بصرہ میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔

ام حبان میں صبر وضبط کا بے حد جذبہ پایا جاتا تھا، وہ نماز میں اتنا طویل قیام فرماتیں کہ بقول ابن جوزی کے ہر شخص اس کی استطاعت نہیں رکھتا۔وہ کم زور جسم کی خاتون تھیں، لیکن نماز میں بڑی قوی، حوصلہ مند اور طاقت ور معلوم ہوتی تھیں۔اس ضمن میں ابن جوزی کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے۔

"ام حبان بصری جو دبلے پتلے جسم کی خاتون تھیں اور دیکھنے میں دھان پان معلوم ہوتی تھیں، نماز کے لیے کھڑی ہوتیں تو (روحانی اعتبار سے) ایک مضبوط جسم کے مالک اور طاقت ور آدمی کے قالب میں ڈھل جاتیں۔ان کی نیکی اور خوف خدا کا یہ عالم تھا کہ جوں ہی نماز کی نیت باندھتیں، جسم قوی سے قوی تر ہو جاتا اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتیں، انھیں یہ خیال بھی نہ رہتا کہ اللہ کے خوف اور عبادت کے سوا کوئی اور کام بھی ہوتا ہے، وہ کھجور کے درخت کی طرح سیدھی جائے نماز پر کھڑی ہو جاتیں اور اگر کبھی ہوا تیز ہوتی تو جسمانی کم زوری کی وجہ سے دائیں بائیں اور جنوب وشمال کو حرکت کرتی دکھائی دیتیں۔"

ابن جوزی مزید لکھتے ہیں۔

بصرہ کی خاک نے جن لوگوں کو پیدا کیا' ان میں ام حبان سلمیہ کا درجہ نہایت بلند اور منفرد ہے۔ یوں تو بصرہ کو ہمیشہ مردم خیز خطے کی حیثیت حاصل رہی اور بے شمار معاملات میں اس کو روئے زمین کا ممتاز مقام دیا گیا' مگر بعض امور میں تو اس کو انتہائی فوقیت حاصل ہوئی مثلاً نیکی اور تقوے کی جو کیفیت بصرہ میں نظر آئی' وہ کسی اور مقام کے حصے میں نہ آئی۔ اسی ام حبان کو دیکھیے کہ وہ نیکی کے جس مقام رفیع پر پہنچیں اور تقوے کی جن بلندیوں کو انھوں نے چھوا' اس کی مثال کہاں ملے گی۔ یہ لاغر جسم کی طویل قامت خاتون اپنے زمانے کی نرالی عورت تھیں۔ نہ نیکی میں ان کے پائے کو کوئی پہنچا اور نہ علم میں کسی نے ان کا مقابلہ کیا۔ یوں تو دنیا میں کسی شے کی کمی نہیں' لیکن بعض لوگوں کو اللہ جس اسلوب سے سامان رحمت فراہم کرتا ہے' اس پر تعجب بھی ہوتا ہے اور اپنی حالت دیکھ کر ایسے لوگوں پر رشک بھی آتا ہے۔

صفوۃ الصفوہ میں ابن جوزی ہی کے الفاظ ہیں کہ ام حبان سلمیہ کو قرآن پاک سے انتہائی تعلق تھا اور وہ اس کثرت سے قرآن مجید کی تلاوت کرتیں کہ ایک ہی دن اور رات میں پورا قرآن ختم کر لیتیں۔ انھیں قرآن پر اس درجہ عبور تھا کہ بات بات میں قرآن کی آیات پڑھتیں اور لوگوں کو اس کے مطالب و معانی کی گہرائیوں سے آگاہ کرتیں۔

آگے چل کر ابن جوزی تحریر فرماتے ہیں:

ام حبان زیادہ باتیں کرنے کی عادی نہ تھیں' وہ کم گو اور خاموش طبع خاتون تھیں۔ انھوں نے ہر کام کے لیے کچھ اوقات مقرر کر رکھے تھے' یہاں تک گفتگو کے لیے بھی انھوں نے وقت مقرر کر رکھا تھا۔ وہ دن رات میں صرف تین مواقع پر کسی سے ہم کلام ہوتی تھیں۔ ایک نماز عصر کے بعد' دوسرے کسی اشد ضرورت کے وقت' تیسرے کسی ایسی چیز کے لیے جس کے بارے میں زبان کو حرکت دیے بغیر چارہ نہ ہو۔ اس کے علاوہ وہ کسی سے مخاطب نہ

ہوتیں۔

غرض حضرت ام حبان سلمیہ رحمتہ اللہ علیہا بہت سی خوبیوں کی مالک تھیں۔وہ کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکالتیں جس سے کسی کو ذہنی' روحانی یا مالی تکلیف پہنچنے کا احتمال ہو۔وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا صحیح نمونہ تھیں کہ اگر بات کرنا ہو تو بہتر اور صحیح بات کرو' ورنہ خاموش رہو۔ بات کرنے پر وہ خاموشی کو ترجیح دیتیں۔

ان کے حالات میں لکھا ہے کہ انھوں نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے کسی کو نقصان اٹھانا پڑا ہو یا کسی کو کوئی تکلیف پہنچی ہو۔وہ ہر معاملے میں محتاط تھیں' نہ کسی سے کوئی چیز مانگتیں اور نہ کسی سلسلے میں کسی کو کسی نوع کی آزمائش میں ڈالتیں۔

حضرت ام حبان سلمیہ کو بے شمار حدیثیں زبانی یاد تھیں اور ان کے علم وادراک کا دامن بہت وسیع تھا۔

انھوں نے پچاس یا پچپن سال کی عمر پا کر انتقال کیا۔ منقول ہے کہ انھوں نے خندہ پیشانی سے موت کا استقبال کیا۔جب ان کا وقت موت آیا تو ان کے متعدد عزیزان کے قریب کھڑے تھے۔انھوں نے ہر ایک کو پہچانا اور الگ الگ سب کو سلام کیا اور درخواست کی کہ وہ اللہ سے ان کے لیے مغفرت کی دعا کریں۔

ام الحسن بنت ابی جعفر طنجانی

اندلس کے مشہور شہر قرطبہ کی مغربی جانب ایک شہر آباد تھا جس کا نام لوشہ تھا- یہ شہر غرناطہ کی نہر سجل کے کنارے واقع تھا- اس کے اور قرطبہ کے درمیان ساٹھ میل کا فاصلہ تھا- آب و ہوا کی بہتری کے اعتبار سے یہ شہر پورے اندلس میں مشہور تھا- تعمیر' صفائی اور عمدگی کے لحاظ سے اس دور کا یہ بے نظیر مقام تھا- اس کا محل وقوع ایسا تھا کہ یہ بہترین صحت افزا مقامات میں گھرا ہوا تھا- اسے ادیبوں' شاعروں' فقیہوں' محدثوں اور طبیبوں کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی- اس میں متعدد تاریخی مقامات تھے جنھوں نے اس کی شہرت میں بہت اضافہ کر دیا تھا اور لوگ دور دراز علاقوں سے اس کی سیر کو آتے تھے- پھر یہ حسین تعمیر کا بھی اس وقت کے اندلس میں ایک نادر نمونہ تھا' جو سیاحوں کے لیے جاذبیت اور کشش کا باعث تھا-

اس شہر کی ایک بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کے باشندے مختلف النوع علوم سے شغف اور تعلق رکھنے کے ساتھ ساتھ بلند اخلاق' ملنسار اور عمدہ ترین کردار کے حامل تھے- یہاں کے نہ صرف مرد علم و فضل کے رسیا تھے بلکہ عورتیں بھی اس ضمن میں بہرہ وافر رکھتی تھیں- انھیں ادب و شعر اور دیگر اصناف علم سے گہرا لگاؤ تھا- ان ذی علم خواتین میں ام الحسن بنت ابی جعفر طنجانی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں- یہ خاتون قرآن کی تجوید و قرات کی بھی عالمہ تھیں' لغت عربی میں بھی درک رکھتی تھیں اور اس موضوع سے متعلق تمام مکاتب فکر سے باخبر تھیں- طب میں بھی یگانہ روزگار تھیں- ادب و شعر میں بھی فرید العصر تھیں اور اس سلسلے میں غزل' نظم' قطعات اور اشعار مدح و ذم میں یکتا تھیں- بعض مشاعروں میں بھی شامل ہوتیں اور داد و تحسین حاصل کرتیں- ان کی آواز بہت عمدہ تھی اور صحت تلفظ میں اپنا جواب نہ رکھتی تھیں- مرثیے

بھی کہتیں اور اس درد اور سوز سے پڑھتیں کہ حاضرین کے دل ہل جاتے۔ انھوں نے اپنے ایک جوان بھائی کی موت پر مرثیہ لکھا اور خاندان کے افراد کو پڑھ کر سنایا' کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو پر نم نہ ہو۔ اس دردناک مرثیے نے پورے شہر کو متاثر کیا اور سب لوگوں نے اس جوان موت پر آنسو بہائے۔

کہتے ہیں ان کے بھائی کی موت سے زیادہ لوگ ان کے پر درد مرثیے سے اثر پذیر تھے۔ ان کے حالات لسان الدین الخطیب نے الاحاطہ میں بیان کیے ہیں اور ان کا نمونہ کلام بھی دیا ہے' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کے میدان میں ان کا درجہ بڑا بلند تھا اور الفاظ کے انتخاب میں ید طولیٰ رکھتی تھیں۔

مناظرہ و خلافیات اور علمی مسائل میں مباحثہ و مجاولہ کے فن میں بھی خوب ماہر تھیں۔ اس دور کے بڑے بڑے لوگوں سے بحث کرتیں اور کامیاب رہتیں۔ نہایت شگفتہ مزاج تھیں اور گفتگو کا انداز بہت دھیما تھا' مگر گرفت بڑی مضبوط تھی۔ اگر کسی علمی معاملے میں ان کا پہلو کمزور ہوتا تو بلا تامل غلطی مان لیتیں اور اگر موقف میں استواری ہوتی تو خوب مقابلہ کرتیں اور مخاطب کو قائل معقول کرنے کی کوشش کرتیں۔

لسان الدین خطیب کہتے ہیں' اس زمانے کی تین عورتیں اندلس کے علمی حلقوں میں مشہور تھیں' جن میں ام الحسن کا نام نمایاں ہے۔ ان میں کمال یہ تھا کہ خشک سے خشک مباحث کو بھی ادبیت کے قالب میں ڈھال دیتیں اور اس نہج سے بات کرتیں کہ مخاطب ان کی قابلیت کا لوہا ماننے پر مجبور ہو جاتا۔ جودت و سخاوت میں بھی پورے اندلس میں ممتاز تھیں۔ ان کے حالات میں مرقوم ہے کہ جب محفل جمتی اور علماو فضلا اور ادبا و شعرا جمع ہوتے تو ان کی دل کھول کر تواضع کرتیں۔ بہت سے محاسن ان کی ذات میں جمع ہو گئے تھے اور وہ مختلف اوصاف کا عمدہ ترین مجموعہ تھیں۔

اندلس میں ان کے دور میں جو دو اور عورتیں علم و ادراک میں مشہور تھیں' ام الحسن کا درجہ ان میں بہت بلند تھا۔ ان میں ایک کا نام حمدہ تھا اور دوسری کا ولادہ۔ مگر

ندرت افکار اور رفعت خیال میں جو حیثیت ام الحسن کو حاصل تھی' وہ دوسری خواتین کو باوجود وسعت علم کے حاصل نہ ہو سکی- کہتے ہیں جب یہ زبان کو حرکت دیتیں اور مسئلہ زیر بحث کی وضاحت کرتیں تو یوں محسوس ہوتا کہ پیدائشی طور سے نابغہ روزگار ہیں اور علوم کی تمام انواع سمٹ کر ان کے ذہن میں جمع ہو گئی ہیں-

ان کے والد بھی بہت بڑے عالم تھے- انھوں نے اپنی اس بیٹی کو اونچے پیمانے پر تعلیم دلائی اور ہر شعبۂ علم میں ان کو آگے بڑھانے کی سعی کی- ام الحسن نے اپنے متعلق باپ کے بلند ارادوں کا اندازہ کر لیا تھا اور انھوں نے خود کو اسی سانچے میں ڈھال لیا تھا' جس میں باپ ڈھالنا چاہتے تھے-

طب میں بھی انھوں نے بڑا نام پایا اور اس میں وقت کے نامور اطبا نے ان کے علم و فن کا لوہا مانا- کہتے ہیں یہ مریض کی نبض پر ہاتھ رکھے بغیر محض اس کی آنکھیں اور چہرہ دیکھ کر مرض کی تفصیلات بیان کر دیتیں اور وضاحت سے بتا دیتیں کہ اس کو کیا مرض لاحق ہے' کب سے لاحق ہے اور کیوں لاحق ہوا ہے؟ نیز اس کا علاج کیا ہے؟ علم تشریح الطب پر کامل عبور رکھتی تھیں- اس ضمن میں امرا و وزرا تک ان کے پاس آتے اور صحت یاب ہو کر واپس جاتے- بڑی بڑی پرانی بیماریوں میں مبتلا مایوس العلاج اور زندگی سے اکتا جانے والے مریض چند روز میں ان کے علاج سے صحت و شفا کی نعمت سے بہرہ ور ہو جاتے-

ان کی شہرت کا دائرہ صرف اندلس کی سرزمین تک محدود نہ تھا' بلکہ پورا مغرب اقصیٰ ان کے علم و فضل سے متاثر اور مرعوب تھا اور اس نواح کے بے شمار اہل علم محض زیارت کے لیے ان کے شہر لوشہ کا سفر اختیار کرتے اور ان کی مجالس علمی سے مستفید ہوتے-

اس زمانے میں اندلس اسلامی علوم کا عظیم مرکز تھا اور اس کی آغوش میں بہت سے جلیل القدر اور عظیم الشان لوگوں نے پرورش پائی اور شہرت و ناموری کے بلند فرازوں تک پہنچے- اس وقت نہ آمدورفت کی آسانیاں حاصل تھیں' نہ سفر و

سیاحت کی سہولتیں میسر تھیں اور نہ خط و کتابت کے سلسلے زیادہ وسعت پذیر تھے' لیکن اس کے باوجود علم میں کچھ ایسی کشش تھی اور علما میں اس درجہ جاذبیت تھی کہ لوگ دور دراز سے کھنچے ہوئے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان کے فیض صحبت سے اپنی علمی تشنگی بجھاتے۔ ام الحسن کا مسکن لوشہ اگرچہ بہت اچھا شہر تھا' لیکن وہاں آمدورفت کی سہولتیں مفقود تھیں۔ بایں ہمہ بے شمار لوگ وہاں آتے اور اس عالمہ کی وسعت علم سے استفادہ کرتے۔ ان کا دروازہ آنے جانے والوں کے لیے ہر وقت کھلا رہتا۔

اس خاتون کے جدت فکر اور ندرت خیال کا یہ عالم تھا کہ بات سے بات پیدا کرتی تھیں اور جدید اسالیب بیان کو اپنانے میں شہرت رکھتی تھیں۔

ایک مرتبہ ان کے والد ابو جعفر طنجانی جو مشہور اہل علم تھے' مغربی ممالک کی سیاحت پر گئے تو اپنی اس بیٹی کی قابلیت' وسعت علم اور جودت طبع کے متعلق مختلف علماء و فصحا کو باخبر کیا اور ان کے بعض واقعات بیان کیے۔ واپس آئے تو متعدد سرکردہ لوگوں نے ان سے ملنے' ان کے تفصیلی حالات سے مطلع ہونے' ان کی دلچسپیوں کے محور کو جاننے اور اس کم سنی میں ان کے فہم و ادراک کے حدود سے آگاہ ہونے کی خواہش ظاہر کی اور کہا کہ وہ ان سے بعض مسائل سمجھنے کے خواہاں ہیں۔

ام الحسن کا خط اچھا نہ تھا اور ان کی تحریر پڑھنا بہت مشکل تھا۔ کسی نے ازراہ تفنن کہا کہ آپ اپنی بدخطی کو حسن خط میں بدلنے کی کوشش کیجیے۔ اس کے جواب میں پوری نظم کہہ ڈالی جس کا ایک شعر یہ ہے۔

الخط لیس له فی العلم فائدہ

والخط ھو تزئین قرطاس

یعنی علم کے میدان میں تحریر و کتابت کی عمدگی کو کوئی حیثیت حاصل نہیں' یہ تو محض تزئین قرطاس کا ایک ذریعہ ہے۔

ایک اور شعر میں کہتی ہیں کہ 'میرا مقصد اصلی تو طلب علم ہے' میں اس کے بدلے میں کسی اور شے کی خواہش مند نہیں' کیونکہ علم ہی انسان کو لوگوں پر

فوقیت عطا کرتا ہے۔

ایک شخص کی مدح کرتے ہوئے کہتی ہیں :

ان قیل من فی الناس رب فضیله
حازا لعلا والمجد منه افضل
فاقول رضوان وحید زمانه
ان الزمان بمثله لبخیل

یعنی اگر یہ کہا جائے کہ لوگوں میں سب سے بڑھ کر صاحب فضل و کمال کون ہے' جس نے رفعتوں اور مجد کو گھیر لیا ہے تو میں جواب دوں گی رضوان ہے جو اپنے دور میں تنہا اس مرتبہ بلند پر فائز ہے۔ زمانے نے اس کی مثل پیدا کرنے کے بارے میں بخل اختیار کر لیا ہے۔

غرض ام الحسن بے شمار اوصاف کی حامل اور تمام اصناف علم میں بے مثال تھیں۔ دنیائے علم میں ان کی نظیر کم ہی ملے گی۔ افسوس ہے ان کی تاریخ ولادت و وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

حضرت ام الحریش

بصرہ فنون نوع بنوع کا مرکز اور علوم بو قلموں کا معدن ہونے کی وجہ سے مرجع خلائق تھا۔ اس سرزمین نے جن لوگوں کو جنم دیا اور اس خاک علم پرور نے جن افراد کی پرورش کی وہ آسمان علم و دانش کے درخشاں ستارے بن کر چمکے اور ان کا طائر شہرت فضائے بسیط کی انتہائی رفعتوں پر پہنچا۔ ان میں سے جن ہستیوں نے علم و عرفان کی ہمہ گیریوں کے باعث زیادہ مقبولیت حاصل کی اور جو اپنی ذاتی اور علمی خصوصیات کی بنا پر لوگوں کی آماج گاہ بنے' ان میں بے شمار مرد بھی شامل ہیں اور لاتعداد عورتیں بھی۔ ان عورتوں میں حضرت ام الحریش رحمتہ اللہ علیہا کا اسم گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ یہ خاتون متعدد اوصاف سے متصف تھیں جو اپنے حالات بیان کرتی ہوئی خود کہتی ہیں۔

میں بچپن ہی میں سایہ پدری سے محروم ہو گئی تھی۔ میرا ایک بھائی تھا۔ باپ کی وفات کے بعد ہم گھر کے کل تین افراد تھے۔ والدہ' بھائی اور میں۔ والدہ جوان تھیں' بھائی تین سال کا معصوم بچہ تھا اور میں آٹھ برس کی تھی۔ میرے نانا جو بصرہ ہی میں فردکش تھے' اس علاقے کے مشہور تاجر تھے۔ ان کی مالی حالت بہت اچھی تھی اور وہ بصرہ میں ایک مخیر اور سخی کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں علم حدیث وفقہ میں ممتاز تھے۔ زہد و عبادت میں بھی ان کا مقام بڑا اونچا تھا۔ میرے والد بھی تجارت کرتے تھے اور ان کی وفات کے بعد ان کے کاروبار کی نگرانی میرے نانا کے ذمے تھی۔

اپنے والد کے کاروبار کے سلسلے میں ام الحریش کہتی ہیں:

وہ مختلف مقامات سے روغن زیتون منگواتے تھے اور بصرہ میں فروخت کرتے تھے۔ بصرہ کے بڑے بازار میں ان کی بہت بڑی دکان تھی' جہاں

روغن زیتون بیچنے اور خریدنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا- میرے والد بصرہ کی کھجوریں بھی اونٹوں کے ذریعے باہر بھیجتے تھے ان کی دکان سے کچھ فاصلے پر ایک جامع مسجد تھی جس کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ مسجد خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حکم سے اس وقت تعمیر کی گئی تھی جب بصرہ شہر بسایا گیا تھا- میرے والد دکان سے اٹھ کر نماز کے وقت اس مسجد میں نماز پڑھنے جایا کرتے تھے- یہ اس زمانے کی باتیں ہیں جب میں عہد طفولیت میں تھی- میرے والد نہایت شفیق تھے اور مجھ پر اور میرے بھائی پر انتہائی شفقت فرماتے تھے- ایسا مہربان شخص کم ہی پیدا ہوتا ہے-

باپ کی وفات کے متعلق ام الحریش کا بیان ہے :

مجھے اچھی طرح یاد ہے' ان کی صحت بہت اچھی تھی اور وہ بالکل جوان تھے- ایک شام وہ دکان سے آئے تو ان کا چہرہ اترا ہوا تھا- وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے- ان کا بایاں ہاتھ پیٹ پر رکھا ہوا تھا- وہ اندر گئے اور خاموشی سے چارپائی پر لیٹ گئے- میری والدہ اس وقت کھانا تیار کر رہی تھیں- وہ دوڑ کر اندر گئیں- میں بھی بھاگتی ہوئی ان کے ساتھ گئی- انھوں نے والد سے خیریت پوچھی- انھوں نے اثبات میں سر ہلایا یعنی کہا کہ میں ٹھیک ہوں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور وہ پیٹ کے شدید درد میں مبتلا تھے- انھوں نے لیٹے ہوئے عشا کی نماز ادا کی- میں نے ان کو اس سے پہلے کبھی اس حالت میں نہیں دیکھا تھا' نہ چارپائی پر لیٹے ہوئے نماز پڑھتے دیکھا تھا-

وہ مزید کہتی ہیں :

تھوڑی دیر کے بعد ان کی طبیعت اور خراب ہو گئی- والدہ دوڑ کر میرے نانا کو بلانے ان کے گھر گئیں- وہ گھبرائے ہوئے آئے- والد پر جھکے اور خیریت پوچھی- اس وقت میرے والد کی آنکھیں بند تھیں- انھوں نے اشارے

سے کہا ٹھیک ہوں اور ساتھ ہی آسمان کی طرف ہاتھ اٹھایا- میرے نانا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے- وہ ایک فہیم اور عقل مند شخص تھے- اتنے میں چند دیگر عزیز بھی آ گئے- چند ساعتیں گزری ہوں گی کہ میرے والد انتقال کر گئے- میرے نانا نے نہایت دردناک لہجے میں انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا- میری والدہ' میرے بھائی اور میرے سر پر دست شفقت پھیرا اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے- یہ سب چند ثانیوں میں ہو گیا اور وہ گھر جو چند ساعتیں قبل مسرتوں سے بھرپور تھا ماتم کدہ بن گیا اور حزن و ملال میں ڈوب گیا-

وہ کہتی ہیں :

اب ہماری کاروباری ذمہ داریاں بھی اور ہماری نگرانی کے فرائض بھی نانا کے سپرد تھے- انھوں نے بہتر طریقے سے ہماری پرورش کی- میری والدہ' میرے نانا کی انتہائی فرماں بردار تھیں اور میرے والد کی وفات کے وقت جوان تھیں- انھوں نے تمام عمر دوسری شادی نہیں کی اور پوری توجہ میری اور میرے بھائی کی تعلیم و تربیت پر مرکوز کر دی- میں نے پہلے قرآن مجید حفظ کیا' اس کے بعد دوسرے علوم حاصل کیے- والد کے انتقال کے بعد میری طبیعت دنیا اور اس کے معاملات سے متنفر ہو گئی اور میں نے یاد الٰہی اور حصول علم کو اپنا مرکز توجہ قرار دے لیا- یہی وجہ ہے کہ میری تعلیم بہتر انداز سے ہوئی اور میں نے دنیا کی ناز و نعمت کے تصور کو دل سے نکال پھینکا- اب میری کیفیت یہ ہے کہ مجھے اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے سوا اور کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں-

یہ باتیں حضرت ام الحریش رحمتہ اللہ علیہا نے خود بیان کی ہیں-

اس کے بعد آخر میں ابن جوزی لکھتے ہیں

ام الحریش جس طرح ددھیال اور ننھیال کی طرف سے اونچے اور نیک خاندان

سے تعلق رکھتی تھیں' اسی طرح خود بھی نیک اور عابدہ وزاہدہ خاتون تھیں' نیز مختلف علوم پر عبور رکھتی تھیں۔ بیس برس کی تھیں کہ والدہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اسی اثنا میں نانا بھی انتقال کر گئے۔ اب ان کے نگران ان کے ماموں تھے۔ انھوں نے کوشش کی کہ کہیں اچھی جگہ ان کی شادی کر دی جائے' مگر ام الحریش نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ وہ دنیا کے امور سے دست کش ہو چکی ہیں اور شادی وغیرہ سے ان کو کوئی تعلق نہیں۔ کہا کرتی تھیں شوہر کی ذمہ داریوں کو نباہنا بہت مشکل کام ہے۔ ممکن ہے شادی کے بعد حقوق الزوج پورے نہ ہو سکیں اور اللہ کے نزدیک قابل گرفت قرار پا جاؤں' اس لیے میں نہیں چاہتی کہ کوئی ایسا بوجھ سر پر رکھوں جس کا اٹھانا مشکل ہو جائے۔ میں نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا ہے' اب اسی کی تحویل میں رہنا چاہتی ہوں۔ اگر حقوق اللہ پورے ہو جائیں تو یہ بہت بڑی بات ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ شادی کے بعد انسان عجیب عجیب قسم کی الجھنوں میں پڑ جاتا اور نازک ذمہ داریوں میں گھر جاتا ہے۔ میں اپنے میں ان ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کی صلاحیت نہیں پاتی۔ انسان کو وہی کام کرنا چاہیے جسے وہ آسانی سے نبھا سکے' ناقابل برداشت بوجھ اٹھانا عقل مندوں کا شیوا نہیں۔

کہتے ہیں باپ کی وفات کے بعد ان کا دل دنیوی معاملات اور لوگوں کے ساتھ میل جول سے اکتا گیا تھا اور یہ گھر میں بیٹھی اللہ کی عبادت اور پڑھنے پڑھانے میں مستغرق رہتی تھیں' تادم واپسیں کبھی گھر کے دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا' نہ کسی کے ساتھ سختی سے پیش آئیں اور نہ کبھی کسی کو برا بھلا کہا۔ کبھی کسی کا حق نہیں مارا اور نہ کبھی ایسی بات زبان سے نکالی جو دوسرے کے لیے تکلیف کا باعث ہو سکتی ہو۔

امتہ الواحد بنت حسین

امتہ الواحد بنت حسین بن اسماعیل محاملی-ایک روایت کے مطابق ان کا نام آمنہ بنت حسین محاملی اور کنیت امتہ الواحد ہے-ایک روایت کی رو سے یہ بینہ بنت قاضی ابی عبداللہ محاملی ہیں--انھیں امتہ الواحد بھی کہا جاتا ہے-ان کے حالات خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد' ابن جوزی کی صفوۃ الصفوہ' ابن العماد کی شذرات الذہب' یافعی کی مرآۃ الجنان' جمال الدین سفوی کی طبقات الشافعیہ' ابن تغری بردی کی النجوم الزاہرہ' زبیدی کی تاج العروس اور ابن جوزی کی المنتظم میں مذکور ہیں-

فقہی مسلک کے لحاظ سے یہ شافعی تھیں اور اس مکتب فکر کی بہت بڑی عالمہ اور فقیہہ تھیں' یعنی شافعی فقہیات پر گہری نظر رکھتی تھیں- بڑے بڑے جلیل القدر شافعی علماو آئمہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور مشکل مسائل حل کراتے- فقہ شافعی کے علاوہ یہ دیگر آئمہ کی فقہیات پر بھی نظر رکھتی تھیں-وسیع القلب خاتون تھیں' اہل علم کی مجالس میں خود بھی جاتیں اور وہ بھی ان کے ہاں آتے-مردوں سے افادہ واستفادے کا سلسلہ پردے کی اوٹ میں چلتا تھا- علم کو کسی ایک ہی فقہ اور ایک ہی نقطہ فکر میں محدود نہ قرار دیتی تھیں-ان کا کہنا ہے کہ علم کی حدود بہت وسیع ہیں اور فکر و دانش کی دنیا نہایت فراخ ہے- کوئی شخص اگرچہ کتنا بڑا عالم ہو' علم کی وسعتوں کا احاطہ نہیں کر سکتا اور نہیں کہہ سکتا کہ حق اسی کے مسلک میں منحصر ہے- حق کوئی جامد شے نہیں کہ ایک ہی شخص کے تسلط میں آجانے کے بعد دوسری جگہ جانے اور حرکت کرنے سے عاجز آجائے- حق کا میدان بڑا وسیع ہے اور اس کا دائرہ انسان کی ذہنی اور فکری گرفت سے باہر ہے- حق کا مخلص متلاشی وہی ہو سکتا ہے جو اس کی تلاش کے لیے ہر دروازے پر دستک دے اور ہر معقول آدمی سے اس کی بھیک مانے- جو شخص تلاش حق کے لیے

دامن طلب نہیں پھیلاتا اور چند کتابوں اور اشخاص ہی میں اسے دائرہ سائر سمجھتا ہے' وہ صحت فکر اور حقانیت و صداقت کی منزل کو پا لینے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ بہر حال یہ ایک وسیع النظر خاتون تھیں' ان کا ذہن تعصب سے خالی اور دل فقہی مسالک کی کدورت سے پاک تھا۔ نہ خود اس ذہن کی مالک تھیں اور نہ دوسروں سے اس کی توقع رکھتی تھیں۔

علم کے ساتھ ساتھ زہد و اتقا کے اوصاف سے بھی بہ درجہ کمال بہرہ ور تھیں۔ عورتوں میں عام طور سے جو علمی غرور پیدا ہو جاتا ہے اور اپنے سوا سب کو کم تر سمجھنے کی بیماری جو ان کو لاحق ہو جاتی ہے' اس سے مبرا تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ علم غرور کا نہیں مسکنت اور تواضع کا درس دیتا ہے۔ جو علم تعلّی پیدا کرتا ہے' وہ جہل کے مترادف ہے۔ اس سے انسان کی صلاحیتوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے اور ذہن سوچ بچار کی پونجی سے محروم ہو جاتا ہے۔ علمی میدان میں ترقی اسی صورت میں ممکن ہے کہ عالم اپنے ذہنی کواڑوں کو بند نہ کرے اور حصول علم کے لیے ہر شخص کی مجلس میں جانے کے لیے اپنے آپ کو ہر وقت تیار رکھے۔ جو شخص یہ خواہش رکھتا ہے کہ فہم مسائل کے لیے لوگ اس کے پاس آئیں اور وہ خود کسی کے پاس نہ جائے' وہ علم کی لذتوں اور لطافتوں سے ناآشنا ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

ایک مرتبہ فرمایا: علم زہد و اتقا کی اولین سیڑھی ہے "جو شخص عالم وفقیہہ تو ہے لیکن زہد اور اتقا کی دولت سے بے بہرہ ہے' اس پر عالم کے لفظ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

ایک دفعہ شاگردوں کو مخاطب ہو کر کہا: علم کے کچھ تقاضے ہیں جنھیں پورا کرنا ضروری ہے۔ ان میں ایک تقاضا تقویٰ ہے۔ تقویٰ اور خوف الٰہی سے صرف نظر کر کے حصول علم کے لیے کوشاں ہونا ایسا ہی ہے جیسا زہر کے پیالے کو لبوں سے لگا لینا۔ تقوے کے بغیر علم انسان کے لیے ہلاکت کا باعث بنتا ہے۔

عالم و جاہل کا فرق بیان کرتے ہوئے فرمایا جو شخص علم کی وجہ سے تکبر اور نخوت کا اظہار کرتا ہے' اسے جاہل سمجھو اور جو عجز و انکسار سے پیش آتا ہے' اسے عالم قرار دو'

کیونکہ جہالت تکبر کا سبق دیتی ہے اور علم انکسار کی راہیں ہموار کرتا ہے۔

یہ خاتون وسعت علم کے ساتھ قرآن کی حافظہ و قاریہ بھی تھیں اور حدیث' فرائض' حساب' نحو اور معانی وغیرہ علوم میں مہارت رکھتی تھیں۔ فقہ شافعی کے تمام پہلوؤں سے باخبر تھیں بلکہ مذہب شافعی کی اپنے دور کے بہت سے لوگوں سے زیادہ جاننے والی تھیں۔

حدیث اور رجال میں مہارت رکھتی تھیں۔ انھوں نے متعدد اصحاب الحدیث سے احادیث روایت کیں اور پھر آگے ان سے مشاہیر محدثین نے احادیث بیان کیں۔ حدیث کے بارے میں ان کی بیان کردہ سند کو لائق اعتنا سمجھا جاتا تھا اور ان کی ثقاہت کا درجہ مسلمہ تھا۔

مسند افتا پر متمکن تھیں۔ لیکن اس سلسلے میں نہایت محتاط تھیں۔ ان کے فتادے کو قابل اعتبار اور لائق عمل ٹھہرایا جاتا تھا' مشہور فقیہہ و مفتی ابو علی بن ابوہریرہ کی معیت میں فتوی دیتیں' کیونکہ اس سے فتوے کی اہمیت بڑھ جاتی اور بات مسند ہو جاتی۔

قیام لیل اور تہجد کی پابند تھیں' صدقات و خیرات میں سبقت لے جانے کی کوشش کرتیں اور ہر کار خیر میں پیش پیش رہتیں' حسن اخلاق کا صاف ستھرا نمونہ اور بلندی اخلاق کی عمدہ ترین مثال تھیں۔ جو ہاتھ میں آتا خرچ کر دیتیں' کسی کو تکلیف پہنچتی تو تلملا اٹھتیں۔ دوسرے کی مشکل کو اپنی مشکل قرار دیتیں۔ ان کا بحر سخاوت ہر آن جاری رہتا اور کثیر تعداد میں مستحقین ان سے مستفیض ہوتے' غریبوں کا سہارا اور مسکینوں کا مرجع تھیں۔

علم حدیث اور علم فقہ اپنے دور کے معروف اساتذہ سے حاصل کیا' جن میں خود ان کے والد حسین بن اسماعیل محاملی شامل تھے۔ ان کے علاوہ اسماعیل بن عباس وراق' الفاخر بن سلامہ حمصی' ابوالحسن مصری اور حمزہ شافعی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

امتہ الواحد بنت حسین بن اسماعیل محاملی رحمتہ اللہ علیہا نے ۹۰ برس کی عمر میں رمضان ۳۷۷ھ کو وفات پائی۔

خدیجہ بنت محمد بغدادی

حضرت خدیجہ بنت محمد بن علی شاہ جہانی بغداد کی رہنے والی تھیں۔ ان کے حالات خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں' ابن جوزی نے المنتظم میں' ابن سمعون الواعظ نے امالی میں' صعدی نے الوافی بالوفیات میں' ابن العماد نے شذرات الذہب میں اور ابن تغری نے النجوم الزاہرہ میں بیان کیے ہیں۔

خدیجہ ۳۷۶ھ کو بغداد میں پیدا ہوئیں۔ اس زمانے میں بغداد میں خلیفہ طائع للہ حکمران تھا جس کا پورا نام ابو بکر عبدالکریم طائع للہ بن مطیع للہ تھا۔ سیاسی اعتبار سے یہ سخت فتنے کا زمانہ تھا اور بغداد کی حکومت کا نظم و ضبط اور استحکام ختم ہو گیا تھا۔ خلفا پر ترکوں کا غلبہ تھا اور غیر عربی اثرات پوری حکومت کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھے۔ اسلامی احکام اور ان کی نشر و اشاعت کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا تھا اور لوگ ذہنی اور عملی لحاظ سے اسلام سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ انفرادی طور سے البتہ کچھ لوگوں نے اپنی اپنی جگہ تبلیغ اسلام اور نیکی کی اشاعت و ترویج کی مہم شروع کر رکھی تھی۔ یہ لوگ اگرچہ محدود تعداد میں تھے' مگر نہایت سرگرم اور اپنے مقاصد کی تبلیغ میں انتہائی تیز تھے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ عورتیں عورتوں میں جا کر تبلیغ اسلام کے فرائض انجام دیتیں اور مرد مردوں کے مجمعوں میں جاتے۔ یہ لوگ اخلاص کے پیکر اور اخلاق و کردار کے بے مثال نمونے تھے۔ ان کی زبان میں اثر تھا اور عملی حالت اونچی تھی' اسی پاک باز جماعت میں حضرت خدیجہ بنت محمد شامل تھیں جو خدیجہ واعظہ کے نام سے مشہور تھیں۔

خدیجہ کی تعلیم بہت اچھے طریقے سے ہوئی تھی۔ ان کے والد محمد بن علی نے جہاں ان کی تعلیم کی طرف توجہ مبذول کی' وہاں ان کی تربیت کا بھی خاص خیال رکھا۔

اس دور کے بغداد میں ابوالحسین بن سمعون الواعظ ایک مشہور واعظ اور عالم تھے۔ محمد بن علی نے اپنی اس بیٹی کو ان سے تعلیم دلائی۔ خدیجہ نے اپنے اس استاد کے امالی کی جزو ثانی روایت کی اور اسے اپنے ہاتھ سے ضبط تحریر میں لائیں۔ ان امالی کو جو خدیجہ کے ہاتھ کی کتابت شدہ ہے' محدثین و فقہا اور واعظین کی ایک جماعت نے اپنے اپنے خط میں لکھا اور اس کی نقلیں کیں۔

شیخ ابوالحسین بن سمعون الواعظ کے مواعظ و نصائح بہت مشہور ہیں۔ کہتے ہیں یہ اس زمانے کے بہت بڑے واعظ تھے اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ ان کے وعظوں میں شریک ہوتے تھے۔ جب یہ وعظ کے لیے کھڑے ہوتے تو مجمع ہمہ تن متوجہ ہو جاتا۔ خطبہ مسنونہ پڑھتے تو لوگ جھوم جھوم جاتے اور جب ان کو مخاطب کرتے ہوئے یایھا الناس (اے لوگو) کا لفظ زبان سے نکالتے تو یہ لفظ اس درجہ اثر کرتا کہ سنتے ہی لوگوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔

ان کے وعظ کی بہت بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے وعظ کو قرآن کی آیات' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث' صحابہ کے آثار و اقوال اور آئمہ دین کے ارشادات و فرمودات سے مزین فرماتے۔ قرآن کی تلاوت کرتے تو مجمع پر وجد کا سا عالم طاری ہو جاتا اور فرط اثر سے لوگ تڑپ تڑپ جاتے لوگوں کو یہ ماضی کے واقعات اس لہجے سے سناتے کہ لوگ اس سے سخت متعجب بھی ہوتے اور انتہائی متاثر بھی۔ پھر ان واقعات میں باقاعدہ تاریخی تسلسل قائم رکھتے اور ہر بات باند از نصیحت بیان فرماتے۔ حضرت خدیجہ بنت محمد بن علی اپنے اس رفیع المرتبت استاد سے بہ درجہ غایت متاثر تھیں۔

خود خدیجہ بنت محمد بھی باقاعدہ درس دیتی تھیں اور ان کے شاگردوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ جن میں اس دور کے مشہور محدث ابو بکر اور بدر کرخی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے ان سے شیخ ابوالحسین بن سمعون الواعظ کی امالی بھی روایت کیں۔۔۔ ان کے علاوہ ان کے شاگردوں میں ابو غالب احمد بن حسن بن النبا کا اسم

گرامی لائق تذکرہ ہے۔ انھوں نے بھی ان سے امالی ابی الحسین روایت کی۔

خدیجہ کے وعظوں کے چند اقتباسات ان کے سوانح نگاروں نے نقل کیے ہیں۔

ایک مرتبہ خاندان خلافت کی خواتین کی طرف سے کچھ خواتین ان کے پاس آئیں اور محل سرا میں تشریف لے جانے کی التجا کی' مگر انھوں نے انکار کر دیا اور فرمایا میں ایک معمولی عورت ہوں اور معمولی خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ میں ان آداب سے واقف نہیں ہوں جن کا شاہی محلات میں بجالانا ضروری ہے۔ میں آپ لوگوں کے طرز خطاب کے طریقوں سے بھی واقف نہیں ہوں لہٰذا مجھے معاف فرمایا جائے۔ میں شاہی محل میں جانے اور شاہی خاندان کی خواتین سے ملنے سے معذرت خواہ ہوں۔ لیکن وہ عورتیں مصر تھیں کہ آپ ضرور محل سرا میں جائیں اور وہاں جا کر وعظ ارشاد فرمائیں۔ آخر انھیں مجبوراً وہاں جانا پڑا۔ محل سرا میں پہنچیں تو تمام خواتین احتراماً کھڑی ہو گئیں اور سب نے جھک کر سلام کیا۔ یہ تھوڑی دیر بیٹھیں' خیر خیریت دریافت کی اور وعظ وارشاد فرمایا جس کے چند جملے یہ ہیں۔

اے گروہ خواتین! تم اونچے خاندان سے تعلق رکھتی ہو اور شاہی خاندان سے وابستہ ہو' میں ایک مسکین و نادار عورت ہوں' دینوی لحاظ سے میرا تمھارا کوئی مقابلہ نہیں' لیکن میری دلی خواہش ہے اور اللہ سے دعا ہے کہ جس طرح تم دینوی اعتبار سے بلند مرتبے کی حامل ہو' اسی طرح دینی اعتبار سے بھی تمھارا مقام بلند ہو۔ تم یہ نہ دیکھو کہ تم دینوی جاہ و جلال کی مالک اور اصحاب عزو جاہ ہو' اصل دیکھنے کی شے یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک تمھارا کیا مرتبہ ہے اور نیکی میں تم کس مقام پر فائز ہو۔ اگر تم نیک ہو' مستحقین کا خیال رکھتی ہو' حقوق اللہ ادا کرتی ہو' حقوق العباد پورے کرتی ہو' کسی کو نشانہ ظلم نہیں بناتی' حلال و حرام میں امتیاز کرتی ہو' جائز و ناجائز میں خط امتیاز کھینچتی ہو اور علوم دینی کی ترویج و توسیع کا اہتمام کرتی ہو تو تم دنیا میں بھی کامیاب ہو اور آخرت میں بھی۔ اگر خدانخواستہ ان اوصاف سے محروم ہو تو تم اللہ کے دربار میں جواب دہ ہو گی اور ان نعمتوں کے بارے میں تم سے سوال کیا جائے گا جن سے تم کو نوازا جاتا ہے۔

ایک موقعے پر عورتوں کی جماعت میں وعظ کرتے ہوئے کہا: بہنو میں تمھاری خیر خواہ اور ہم درد ہوں' کیونکہ در حقیقت مسلمان وہ ہے جو دوسرے مسلمان کا بھی خواہ اور ہم درد ہے اور اس کی سلامتی اور عافیت کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ میں تمھیں نصیحت کرتی ہوں کہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تابع فرمان بن کر رہو' اللہ سے ڈرو' اس کے سوا کسی کے سامنے گردن نہ جھکاؤ اور نہ اپنی ضروریات کسی اور سے طلب کرو' وہی تمھارا مالک' وہی رازق' وہی خالق اور وہی سب کا معاون و ناصر ہے۔ اسے چھوڑ کر کسی کے دروازے پر دستک نہ دو' یہ مال و دولت اور یہ جاہ و جلال سب عارضی اور زوال پذیر ہے اور دنیا ہی میں رہ جانے والا ہے۔ تمھارے ساتھ صرف نیک اعمال جائیں گے۔ اگر تم اخروی کامیابی کی خواہاں ہو تو اعمال خیر کی طرف دوڑو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔

ایک اور موقع پر فرمایا: جو لوگ دنیا کے گرویدہ ہو گئے ہیں اور آخرت پر دنیا کو ترجیح دیتے ہیں' وہ ناکام و خاسر ہیں۔ اے دنیا کی دولت سمیٹنے والو اور لوگوں کو تنگ کر کے مال و زر جمع کرنے والو' تمھاری ایک ایک حرکت اللہ کے علم میں ہے اور وہ تمھاری فطرت کو خوب جانتا ہے۔ دنیا میں گھٹیا فطرت کا مظاہرہ نہ کرو اور دنیا کے حصول کی خاطر کسی کو تکلیف نہ پہنچاؤ۔ ایسی دنیا جو ظلم و جور سے حاصل کی گئی ہے' مردار سے بھی بدتر ہے۔ کیا تم مردار کھانا پسند کرو گے؟ یقیناً نہیں کرو گے۔ اگر واقعی یہی بات ہے تو پھر کسی پر ظلم کیوں کرتے ہو اور حصول دنیا کے لیے آخرت کو کیوں خراب کرتے ہو؟ اپنے قدموں کو روکو' خود کو برائی کے گڑھے میں نہ پھینکو۔

خدیجہ نہایت اونچے ذہن اور بلند فکر کی حامل تھیں اور بہت بڑی واعظہ تھیں۔ انھیں دنیا کے مال و دولت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ درویش صفت خاتون تھیں جو ہر وقت لوگوں کو نصیحت کرتی رہتی تھیں۔

ان کی وفات ۱۳ محرم ۴۶۰ھ میں ہوئی۔ ۸۴ برس عمر پا کر دائمی اجل کو لبیک کہا۔

ماوردیہ بصریہ

حضرت ماوردیہ جس خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، علم و فضل اور تقویٰ و صالحیت کے اعتبار سے وہ ممتاز اہمیت رکھتا تھا اور نہ صرف بصرہ میں بلکہ پورے عراق میں اسے عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس خاندان کے تمام لوگ بہتر اوصاف سے متصف تھے۔

ماوردیہ رحمتہ اللہ علیہا ۳۸۴ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئیں، ان کا ماحول علمی تھا اور گردوپیش کے سب لوگ عمدہ اخلاق اور اعلیٰ کردار کے مالک تھے۔ خود ماوردیہ کی تعلیم و تربیت بہترین طریقے سے ہوئی تھی۔ اچھے اساتذہ کی خدمت میں رہیں اور تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم میں عبور حاصل کیا۔ علاوہ ازیں زہد و عبادت کے اعتبار سے بھی اونچی منزلوں کو پہنچیں۔

ان کا ذوق عبادت بہت بلند تھا۔ کہتے ہیں چند برس کی عمر کو پہنچیں تو خیالات کا دھارا بدل گیا اور سطح ذہن عظیم انقلاب سے دوچار ہوئی، دنیا سے قلب کا رشتہ بالکل منقطع ہو گیا اور کھانے پینے کا کوئی شوق باقی نہ رہا۔ چنانچہ پچاس برس روزے رکھے۔ رات کو قیام کرتیں اور دن کو روزہ رکھتیں۔

اس اثنا میں کھانے سے بھی طبیعت اچاٹ ہو گئی اور اشیائے اکل و شرب سے کوئی رغبت باقی نہ رہی۔ آہستہ آہستہ صالحیت کے غلبے نے اتنی شدت اختیار کی کہ قدرے بہتر چیزیں کھانے سے بالکل دامن کشاں ہو گئیں، روٹی چھوڑ دی، کھجوریں کھانا ترک کر دیں اور مرغن اشیا کا استعمال اپنے لیے ممنوع قرار دے لیا۔

ابتدا میں عمدہ لباس زیب تن فرماتی تھیں۔ لیکن جب دل میں ذوق عبادت نے کروٹ لی تو لباس کے معاملے میں بے اعتنائی برتنے لگیں اور موٹا جھوٹا پہننا شروع کر

دیا- ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اچھے سے اچھا اور عمدہ سے عمدہ لباس پہننے میں شرعی اعتبار سے کوئی حرج نہیں' اللہ کے نزدیک اصل اہمیت دل اور ذہن کو حاصل ہے' لباس کو نہیں- عمدہ لباس پہننے والا حد درجہ نیک اور سادہ لباس پہننے والا انتہائی غلط کار ہو سکتا ہے- میں نے لباس کے سلسلے میں سادگی محض اس لیے اختیار کی ہے کہ میرا ضمیر یہ گوارا نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ مجھے لباس فاخرہ میں دیکھیں- میرا تجربہ یہ ہے کہ لباس کی عمدگی عبادت پر اثر انداز ہوتی ہے اور سادگی سے رجوع الی اللہ کی کیفیتیں زیادہ بیدار ہوتی ہیں- اگر لباس کی عمدگی کسی شخص کے ذوق عبادت کو مجروح نہ کرتی ہو تو اسے بلاشبہ عمدہ لباس زیب تن کرنا چاہیے اور اگر اس میں نقص پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو پھر اس سلسلے میں احتیاط و توازن کی ضرورت ہے-

غذا میں بھی بہت ہی سادگی کو معمول بنالیا تھا- دن رات میں منقی کے چند دانے اور دس پانچ انگور ان کی کل غذا تھی- بسا اوقات اسے بھی ترک کر دیتیں- عام طور پر لوبیا پیس کر روٹی پکاتیں اور کام و دہن کی تواضع کے لیے اسی پر اکتفا فرماتیں-

ان کا کہنا ہے کہ اگر کوئی پر تکلف غذا استعمال کر کے اللہ سے الفت و محبت کا رابطہ پیدا کر سکتا ہے تو وہ نہایت خوش قسمت ہے' مگر افسوس ہے بعض لوگ ایسا نہیں کر سکتے' مرغن غذائیں اور پر تکلف کھانے عام طور پر انسان کی حس عبادت پر برا اثر ڈالتے ہیں- ظاہر ہے عمدہ کھانا بہر حال زیادہ ہی کھایا جائے گا اور اس میں لازما بیداری میں کمی واقع ہوگی اور نیند کا غلبہ ہوگا' جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ عبادت کے سلسلے میں ذوق و شوق کی لہریں کماحقہ نہیں ابھر سکیں گی- میں جو کم کھاتی اور سادہ غذا پر اکتفا کرتی ہوں تو اس میں یہی راز مضمر ہے-

حضرت ماوردیہ بصریہ رحمتہ اللہ علیہا نے ۲۵ ذالحجہ ۴۶۶ھ کو بصرہ میں وفات پائی- وفات کے وقت ان کی عمر ۸۰ سال سے متجاوز ہو چکی تھی-

بلارہ بنت تمیم

بلارہ بنت تمیم بن مصر بن بادیس رحمتہ اللہ علیہا تونس کی رہنے والی تھیں اور وہاں کی مشہور اور ذی فہم خواتین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

بلارہ بنت تمیم ۴۵۰ھ کے لگ بھگ تونس کے ایک امیر اور صاحب اثر و نفوذ خاندان میں پیدا ہوئیں۔ جس مقام میں ان کی ولادت ہوئی اس کا نام مہدیہ تھا۔ ایک روایت کے مطابق یہ مقام مشہور عباسی حکمران خلیفہ مہدی کی طرف منسوب تھا۔ ان کی ولادت کے موقعے پر ان کے والد تمیم بن مصر بن بادیس نے نہایت خوشی کا اظہار کیا اور وفور مسرت سے بہ کثرت مال و دولت خرچ کیا۔

تمیم بڑا فیاض اور سخی تھا۔ جودت و غنایوں سمجھیے کہ اس کا پیشہ تھا۔ میل جول اور اخلاق و کردار میں بھی بے نظیر تھا۔ علم و عمل میں بھی پیش پیش تھا۔ اس دور کے تونس کے ہر حلقے میں اسے عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور سب لوگ اس کی تکریم کرتے تھے۔ معاملہ فہمی اور عقل و فراست میں اس نواح میں اس کا کوئی حریف نہ تھا۔ غریب سے لے کر بڑے بڑے امیر سب اس کے دروزے پر حاضری دیتے اور اس کی ہم نشینی کو بہت بڑی سعادت سمجھتے تھے۔ یہ شخص بڑے متوازن اور معتدل مزاج کا مالک تھا' نہ کسی بات پر اضطراب و پریشانی کا اظہار کرتا اور نہ کسی سلسلے میں ناروا غم و غصے میں آتا۔ اعتدال اور میانہ روی اس کی وہ خصوصیت تھی جو بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔

تمیم بن مصر چونکہ خود بہت سے اوصاف سے متصف تھا اور عالم و فاضل تھا اس لیے اس نے اپنی لڑکی بلارہ بنت تمیم کی تعلیم و تربیت کا خاص طور سے اہتمام کیا اور اس کے لیے اس عصر کے ممتاز اور بہترین اساتذہ کو مقرر کیا۔ تمیم میں ایک خوبی یہ تھی کہ

وہ خالص عرب تھا اور عربیت سے محبت اور لگاؤ اس کا سرمایہ زندگی تھا' لہٰذا اس نے بلارہ کی تعلیم و تربیت بھی خالص عربوں کے انداز پر کی اور علم کے ساتھ ساتھ دین داری میں اسے پختہ تر کیا- تفسیر' حدیث' بلاغت' فصاحت' نحو' ادبیت اور شعر و شاعری وغیرہ تمام مروجہ علوم سے انھیں بہرہ ور کیا اور ہر فن کے علیحدہ علیحدہ استاد مقرر کیے تاکہ وہ علم کے تمام گوشوں اور ہر فن میں کامل مہارت حاصل کر لیں اور مہارت حاصل کر لی-

علم و عمل کے علاوہ بلارہ عقل و فہم اور بصیرت و رائے میں بھی اپنا جواب نہ رکھتی تھیں- پھر علو ہمت اور شجاعت میں بھی یکتا تھیں- اخلاق و اتقا میں بھی انھیں اونچا مقام حاصل تھا- سخاوت اور غربا پروری میں بھی شہرت رکھتی تھیں- غرض یہ خاتون تمام خوبیوں کا مجموعہ اور تمام محاسن کا مرقع تھیں اور اسی وجہ سے انھیں سب حلقوں میں اکرام و اعزاز حاصل تھا- ان کی معاملہ فہمی کا یہ عالم تھا کہ ان کے والد اہم اور مشکل مسائل میں ان سے مشورہ لیتے اور ان کی رائے پر عمل کرتے-

جب یہ جوانی کو پہنچیں تو بہت سے امرا اور مختلف قبائل کے سرداروں اور اہم مناصب پر فائز حکام نے ان سے شادی کی خواہش کی اور متعدد لوگوں نے اس کے لیے ان کے باپ تمیم بن معز سے درخواست کی' مگر بلارہ کا چچا زاد ناصر بن علناس صنہاجی اس سلسلے میں سب سے آگے تھا اور وہ ان سے شادی کا شدید خواہش مند تھا- آخر اسی سے ان کی نسبت قرار پائی اور نسبت سے چند روز بعد شادی کے مراحل طے ہو گئے- ناصر بن علناس بہت بڑا سردار تھا اور قلعہ بنی حماد اور بجایہ کا مالک تھا- یہ شخص زیرک و فہیم بھی تھا اور شجاع و بہادر بھی' اور یہ شادی اس کے سیاسی مستقبل کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے بھی ضروری تھی-

نکاح کے وقت بلارہ کا مہر تیس ہزار طلائی دینار مقرر کیا گیا- اس کی وجہ یہ تھی کہ مہر فریقین کی مالی اور معاشرتی حیثیت کے مطابق مقرر کیا جاتا ہے اور یہ دونوں فریق مالی اعتبار سے خاص اہمیت رکھتے تھے' اس اعتبار سے یہ مہر بالکل موزوں تھا' لیکن مہر کی یہ

پوری رقم اسی وقت ناصر نے ادا کر دی تو بلارہ کے والد نے اس خطیر رقم میں سے صرف ایک دینار اٹھایا اور باقی رقم ناصر بن علناس کو واپس کر دی۔

نکاح کے بعد ۴۷۰ھ میں بلارہ کی رخصتی عمل میں آئی اور اسے مہدیہ سے عسکر کثیف میں منتقل کیا گیا۔ باپ نے بیٹی کی رخصتی کس شان سے کی؟ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ اسے بہت سے زیورات دیے گئے اور بے حد سامان عطا کیا گیا جس میں چھوٹی موٹی تمام چیزیں شامل تھیں۔ کہتے ہیں اس سے قبل اس نواح میں کوئی شادی اس شان سے نہیں ہوئی تھی جس شان سے بلارہ بنت تمیم کی شادی ہوئی۔

جس شان و شوکت سے باپ نے بیٹی کو رخصت کیا' سسرال کی طرف سے بھی اسی شان اور احترام کے ساتھ بلارہ کا استقبال کیا گیا۔ اس کے شوہر ناصر بن علناس صنہاجی نے اسے عظیم الشان محل میں ٹھہرایا اور اس کے قیام کے لیے بے حد اہتمام کیا۔ قلعہ بنی حماد اور بجایہ میں اس کے قیام کا انتظام کیا گیا اور ان کے باغات کے ایک ایک پتے کو معطر کیا گیا۔ بنی حماد کے قلعے میں ایک عمدہ ترین محل تعمیر کیا گیا جسے قصر بلارہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ افسوس ہے امتداد زمانہ اور وقت کی دست برد نے ان تمام محلات و قصور کو محو کر دیا ہے اور حالات کے ہاتھوں یہ سر بفلک عمارتیں زمین بوس ہو گئی ہیں۔

یہ واقعات مشہور مصنف حسن حسنی عبدالوہاب کی شہیرات التونسیات میں مذکور ہیں' اس کتاب میں تونس کی ان خواتین کے حالات درج کیے گئے ہیں جو کسی معاملے میں شہرت و فضیلت رکھتی تھیں' مثلاً تونس کی مفسرات' محدثات' شاعرات وغیرہ کے واقعات حسن و خوبی کے ساتھ اس میں بیان کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں تونس کی ان عورتوں کے سوانح بھی اس میں درج ہیں جو فہم و فراست' عقل و دانش' فقہ و اجتہاد' تصنیف و تالیف اور فصاحت و بلاغت میں ممتاز درجہ رکھتی تھیں۔

بلارہ اگرچہ اونچے گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں اور ان کے سسرال بھی اس علاقے میں بہت مشہور تھے' تاہم اس خاتون کی عزت و احترام کی وجہ مال و دولت نہ تھی

بلکہ اصل وجہ ان کا علم و فضل' زیرکی و دانائی اور غربا و مساکین سے تعلق تھا- ایک خاص حلقے سے تعلق رکھنے کے باوجود یہ خاتون عوام سے براہ راست رابطہ رکھتی تھیں اور ان کے مسائل سے گہری دلچسپی کا اظہار کرتی تھیں-

بلارہ نے ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ کر ۵۱۰ھ میں وفات پائی-

بنفشا بنت عبد اللہ

بنفشا بنت عبداللہ رومیہ' عباسی خلیفہ مستضیئ بامر اللہ کی کنیز تھیں اور نہایت متقی خاتون تھیں۔ اپنے زمانے میں امور خیر میں بڑی شہرت رکھتی تھیں۔

بنفشا بنت عبداللہ کے حالات سے پہلے اس خلیفہ کے بارے میں چند باتیں عرض کرنا ضروری ہے جس کی یہ کنیز تھیں۔

خلیفہ مستضیئ بامر اللہ عباسی خلیفہ تھا اور خلیفہ مستنجد باللہ کا بیٹا تھا۔ مستضیئ بامر اللہ ۵۳۶ھ میں ایک ارمنی ام ولد کے بطن سے پیدا ہوا اور تیس سال کی عمر میں ۵۶۶ھ کو تخت خلافت پر متمکن ہوا۔ یہ صاف کردار اور متدین خلیفہ تھا۔ تخت نشین ہوتے ہی اس نے عوام کے مسائل پر غور کیا اور ان کی مشکلات پر نظر ڈالی۔ اس نے وہ تمام ٹیکس معاف کر دیے جو اس سے قبل رعایا پر عائد کیے گئے تھے اور لوگوں سے وصول کیے جاتے تھے۔ اس کے زمانے میں عدل و انصاف عام ہو گیا اور لوگوں کی حالت بالکل بدل گئی۔ اس کی تخت نشینی کے پہلے سال ہی مصر میں عبیدیوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور سلطان صلاح الدین ایوبی کی حکومت مستحکم ہو گئی۔ سلطان نورالدین زنگی جو شام' جزیرہ اور موصل کا حکمران تھا اور جسے بعد میں مصر' دیار بکر' بلاد روم اور سواد عراق کا حکمران بھی خلیفہ مستضیئ بامر اللہ نے مقرر کر دیا تھا' اس عباسی خلیفہ کی انتہائی قدر کرتا تھا۔ اس کے زمانہ خلافت میں سلطان نورالدین زنگی نے سلطان صلاح الدین ایوبی کو مصر میں لکھا کہ اس عباسی خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا جائے' چنانچہ سلطان صلاح الدین نے اس کے نام کا خطبہ پڑھا۔ اس واقعہ کی اطلاع خلیفہ کو ہوئی تو اس نے بہت مسرت کا اظہار کیا اور سلطان نور الدین اور صلاح الدین کو بطور تحفہ کے صندل بھیجا اور دونوں کو خلعت روانہ کیے' نیز بغداد میں اس واقعہ کی خوشی میں نوبت بجائی گئی۔ سلطان

نور الدین زنگی نے بھی اس کے جواب میں جشن مسرت منایا اور خلیفہ کا شکریہ ادا کیا۔ خلیفہ مستضیئ بامر اللہ نے ساڑھے نو برس تخت خلافت پر متمکن رہنے کے بعد ماہ ذیقعدہ ۵۷۵ھ میں انتقال کیا۔ اس وقت اس کی عمر چالیس برس تھی۔

یہ خاتون اصلاً رومی نژاد تھیں، یعنی اس علاقے سے تعلق رکھتی تھیں جسے آج کل ترکی اور اس کے بعض علاقوں سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ ایک کنیز تھیں جنھیں خلیفہ مستضیئ بامر اللہ نے خرید لیا تھا اور نہایت اچھی طرح اس کی تربیت کی تھی۔ خلیفہ نے ان کی تعلیم کے لیے وقت کے مشہور اور بہترین علما کی خدمات حاصل کیں اور بہتر انداز سے ان کو تعلیم دلائی۔ ان کے حالات سیوطی کی المستظرف فی اخبار الجواری، ابن الساعی کی الجامع المختصر اور ابی شامہ کی الذیل علی الروضتین میں بیان کیے گئے ہیں۔

بنفشا بنت عبداللہ رومیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ یہ نہایت صالحہ اور کثیر الخیرات خاتون تھیں۔ لوگوں کو نیکی کا درس دیتیں اور برائیوں سے دامن کشاں رہنے کی تلقین فرماتیں۔ ان کا قول ہے کہ میٹھی زبان سے نیکی سکھاؤ، اگر سختی سے کام لو گے تو لوگ تم سے دور بھاگیں گے۔ لوگوں کو اپنے قریب لانے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ محبت اور نرمی کا برتاؤ کیا جائے۔ عورتیں انھیں اپنے گھروں میں لے جاتیں اور ان سے اعمال خیر سیکھتیں۔ جہاں یہ جاتیں خواتین کا بہت بڑا مجمع لگ جاتا جو انہماک اور توجہ سے ان کی نصیحت آموز باتیں سنتا۔

ایک مرتبہ فرمایا: نبوت کا زمانہ بہت دور جا چکا ہے۔ تابعین اور تبع تابعین کا دور بھی باقی نہیں رہا، آئمہ کرام کا زمانہ بھی گزر گیا۔ یہ دور خالص دنیاداروں کا ہے۔ دین دار حضرات رخصت ہو گئے ہیں۔ ان کا وجود تو باقی نہیں رہا مگر ان کی تعلیمات موجود ہیں، ان سے مستفید ہونا ہمارا فرض ہے۔ ہم اسی صورت میں کامیاب زندگی بسر کر سکتے اور دین و دنیا میں کامران ہو سکتے ہیں، جب کہ ان کے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل پیرا ہوں، ان کے فرامین کو مشعل راہ بنائیں اور ان کے اقوال و ارشاوات کو زیر مطالعہ رکھیں۔ اگر ہم ان کی تعلیمات و ارشادات کو پیش نگاہ نہیں رکھیں گے تو صراط مستقیم پر

قدم زن نہیں رہ سکیں گے- تقویٰ اختیار کرو کہ یہی تمھاری نجات کا ضامن ہے-

یہ خاتون اپنے دور کے مروجہ علوم پر نظر رکھتی تھیں- صحابہ کے واقعات اور آئمہ عظام کے حالات سے باخبر تھیں' حافظہ تیز تھا' زبان صاف تھی اور ذکاوت و فطانت سے بہرہ ور تھیں-اللہ نے ان کو بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا-انھوں نے خود بھی مشہور اہل علم سے استفادہ کیا تھا اور ان سے بھی بہت سے لوگوں نے تحصیل علم کی-ان کے شاگردوں میں مرد بھی شامل ہیں اور عورتیں بھی-

ہر نیک کام رغبت سے کرتیں اور خیر کی طرف سبقت لے جانے کی سعی فرماتیں-لوگوں کی ضروریات کا انھیں خیال رہتا اور ان کے فائدے کے لیے سرگرم عمل رہتیں-بغداد میں بہت سی سرائیں' مسجدیں اور پل تعمیر کرائے-کئی دینی مدارس ان کی کوشش سے قائم ہوئے-ان مدارس میں ایک بہت بڑا مدرسہ وہ ہے جو انھوں نے دریائے دجلہ کے کنارے قائم کرایا' یہ مدرسہ فقہائے حنابلہ کے لیے قائم کیا گیا تھا' جس میں فقہ حنبلی کے مطابق تعلیم دی جاتی تھی-اس مدرسے سے بے شمار لوگ فارغ التحصیل ہو کر نکلے-اس کے تمام اخراجات یہ خود اپنی گرہ سے ادا کرتی تھیں- اس میں کئی جید حنبلی استاد تعلیم دیتے تھے اور سینکڑوں طلباء علم حاصل کرتے تھے-اس مدرسے کے لیے ایک پرشکوہ عمارت تعمیر کی گئی تھی جس میں ہر فن کی تعلیم کے علیحدہ علیحدہ انتظام تھا-اس کے دارالاقامہ میں کئی سو طالب علم مقیم تھے اور ان کے روزانہ کے اکل و شرب اور دیگر ضروریات کی کفالت مدرسہ ہی کرتا تھا- معلمین کی تنخواہیں اور طلبا کے مصارف یہی خاتون ادا کرتی تھیں-

ابن النجار کا کہنا ہے کہ بنفشا ہر سال عید الفطر کے موقعے پر کھجوروں کا ایک صاع (تقریباً تین سیر) بطور صدقہ الفطر ادا کرتیں اور فرماتیں یہ تو وہ صدقہ ہے جو شرعی اعتبار سے ہم پر فرض ٹھہرایا گیا ہے' لیکن میں اس پر بس نہیں کرتی اور اسے کافی نہیں سمجھتی' بلکہ وہ یہ کرتیں کہ خالص سونے کے دیناروں کا ایک صاع فقرا و مساکین میں تقسیم کرتیں اور کہتیں کہ جب تک مستحقین کی ضرورتیں پوری نہ کی جائیں شریعت

کے تقاضوں کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ عید کے موقعے پر مستحقین کو بے نیاز کر دینا شریعت کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔

فقہی مسلک کے اعتبار سے حنبلی تھیں۔ فقہ حنبلی کی ترویج و اشاعت اور اس پر عمل کے سلسلے میں بڑی سرگرم تھیں' اس کی اشاعت کے لیے انھوں نے بغداد اور اس کے قرب وجوار میں متعدد مدرسے قائم کر رکھے تھے' جن میں سے بعض مدرسے بہت بڑے تھے۔

ان کی وفات جمعے کے روز ۹ ربیع الاول ۵۹۸ھ کو ہوئی۔

عائشہ بنت محمد حرانی

عائشہ بنت محمد بن مسلم ۶۴۰ھ میں حران میں پیدا ہوئیں' وہیں پلی بڑھیں اور اسی شہر کی آغوش میں تعلیم وتربیت کی ابتدائی منزلیں طے کیں۔

تعلیم کا آغاز حران ہی میں کیا اور وہاں کے مشہور اور ثقہ علمائے حدیث وفقہ سے تحصیل کی۔ یہ ان خواتین میں سے تھیں' جنھوں نے پوری توجہ سے علم حاصل کیا اور ہر طرف سے قطع تعلق کر کے اس کے لیے اپنے آپ کو وقف کیے رکھا۔ علم کا شوق بچپن ہی سے دامن گیر تھا۔ عام بچوں کی طرح کھیل کود میں کوئی دلچسپی نہ لیتیں' تمام وقت کتابوں کی رفاقت میں بسر کرتیں۔ کہتے ہیں علم سے محبت وانہماک کا یہ عالم تھا کہ جہاں جاتیں کتاب ساتھ رکھتیں اور اہل علم کی تلاش میں رہتیں۔ علمی استفادہ ان کی طبیعت کا لازمی جزبن گیا تھا۔

انھیں حدیث اور اس کے متعلقات سے گہری دلچسپی تھی اور ان کا شمار حران کے مشاہیر اصحاب حدیث میں ہوتا تھا۔ لوگ انھیں محدثہ حران کے نام سے یاد کرتے تھے۔ انھوں نے اس دور کے معروف محدثین سے علم حدیث حاصل کیا' جن میں اسماعیل بن الواتی' فرح القرطبی' محمد بن ابو بکر بلخی' محمد بن عبدالھادی' ابراہیم بن خلیل اور ابن عبدالدائم قابل ذکر ہیں۔ یہ وہ حضرات ہیں جن سے انھوں نے باقاعدہ حدیث پڑھی اور روایات بیان کرنے کا شرف حاصل کیا۔ یہ اس دور کے بلند مرتبت اصحاب الحدیث تھے اور لوگ دور دراز سے سفر کر کے حصول حدیث کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔

عائشہ بنت محمد نے حدیث کے سلسلے میں اپنے علم ومطالعہ کی رو سے اس درجہ اہمیت اختیار کر لی تھی کہ بعض مسائل میں وہ دیگر محدثین سے منفرد تھیں اور ان کے

تفردات کا بڑا شہرہ تھا- تفردات کے باب میں بعض اصحاب حدیث نے ان سے اختلاف بھی کیا اور معترض ہوئے' مگر یہ اپنے نقطہ نظر کو صائب اور صحیح سمجھتی تھیں اور ان اعتراضات کو اہمیت نہ دیتی تھیں- فرمایا کرتیں کہ میں نے اپنی صواب دید کے مطابق تحقیق کی روشنی میں ایک مؤقف اختیار کیا ہے' اگر کسی کو اس سے اختلاف ہے اور وہ میرے موقف کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تو بڑے شوق سے ایسا کر سکتا ہے' بر بنائے علم ہر شخص کو ہر شخص سے اختلاف و اتفاق کا حق پہنچتا ہے' کسی معاملے میں اگر کسی سے اختلاف کیا جائے تو اسے کھلے دل سے برداشت کرنا اور فراخ حوصلگی سے اس کا مقابلہ کرنا چاہیے-

ان کا کہنا ہے کہ جو لوگ اختلاف کو برداشت نہیں کر سکتے اور اپنے علم و تحقیق ہی کو حرف آخر سمجھتے ہیں' وہ در حقیقت لذت علم سے نا آشنا ہیں- فرمایا اختلاف کے بغیر علم جامد ہو کر رہ جاتا ہے اور آگے بڑھنے کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں- مشتاقان علم کے لیے فراخ حوصلہ ہونا ضروری ہے-

ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ علما کو اپنی تعریف سے خوش نہیں ہونا چاہیے' ان میں خود ستائی اور تعریف کرانے کا جذبہ پیدا ہو جائے تو علمی گہرائی ختم ہو جاتی ہے اور مزید تحقیق کا شوق رخصت ہو جاتا ہے- کم حوصلگی اور خود ستائی دونوں علم کے لیے سم قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں- دوسرے کو کم پایہ سمجھنا اور خود مدعی علم ہونا علما کا شیوہ نہیں- یہ غرور علم سخت نقصان دہ ہے- اس سے اہل علم کو ہر قیمت سے بچنا چاہیے-

اصحاب سیر و رجال نے لکھا ہے کہ پندار علم اور دوسروں کی تحقیر و تجہیل سب سے بڑی بیماری ہے' جو علم کو گھن کی طرح کھا جاتی ہے اور ترقی کے دروازوں کو بند کر دیتی ہے--- عائشہ بنت محمد اس سے مبرا تھیں' حالانکہ تعلیم یافتہ عورتوں کو یہ مرض زیادہ لاحق ہوتا ہے اور معمولی پڑھی لکھی عورتیں بھی نخوت و غرور کا شکار ہو جاتی ہیں' مگر عائشہ بنت محمد کو دیکھیے کہ وہ اتنی بڑی عالمہ اور محدثہ ہونے کے باوجود اس مرض سے پاک ہیں اور انتہائی حوصلہ مند اور وسعت قلب کی مالک ہیں- رحمہا اللہ تعالی-

حصول علم کے لیے دمشق بھی گئیں۔اس زمانے میں دمشق بڑے بڑے علماے حدیث کا مرکز تھا۔ آخری دور حیات میں یہ دمشق ہی میں تھیں۔وہاں کے بعض اہل علم سے خود بھی تحصیل کی اور پھر اپنی الگ مسند تدریس آراستہ کی۔ان کے تلامذہ میں جلیل القدر علما شامل ہیں اور یہ وہ علما ہیں جن کا حلقہ تلمذ بڑا وسیع اور سلسلہ اسناد قابل اعتماد ہے۔یہ اپنے دمشق کے زمانہ قیام میں جامع بنوامیہ کے ایک کونے میں درس حدیث کرتی تھیں۔

اس دور میں جو لوگ ان کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہوئے ان میں مشہور سیاح ابن بطوطہ بھی شامل ہیں۔ابن بطوطہ ۷۲۶ھ میں جامع دمشق میں آیا اور ان کے علمی مرتبے سے بہت متاثر ہوا' چنانچہ اس نے ان سے وہ احادیث سماعاً اور قراءۃً حاصل کرنے کا شرف حاصل کیا' جن کا انھوں نے دمشق میں ابن عبدالدائم کی سند سے ابن عرفہ عبدی سے سماع کیا تھا۔علاوہ ازیں ان سے حدیث علی بن حرب کی عمدۃ الوافی سماعت کی اور یہ وہ جز تھا جو عائشہ نے محمد بن ابی بکر بن محمد بلخی سے بطور سماع حاصل کیا تھا۔پھر فوائد علی بن حرب کے بھی اس ایک جز کی تحصیل کی جو عائشہ نے بلخی سے بصورت سماع حاصل کیا تھا۔

عائشہ بنت محمد حرانی جہاں اپنے دور کی عالمہ اور محدثہ تھیں' وہاں بہت بڑی قناعت پسند اور صبر و شکر کی مالک بھی تھیں۔نہ غربت و تنگ دستی میں پریشانی و اضطراب کا اظہار کرتیں اور نہ کشائش رزق اور فراوانی مال کے دور میں کبر و نخوت کا شکار ہوتیں۔نہایت مرنجان مرنج طبیعت کی مالک تھیں۔چہرے پر غربت کے آثار ظاہر نہ ہونے دیتیں۔کبھی کسی امیر کے دروازے پر دستک نہ دیتیں اور کسی کے سامنے اپنی ضروریات و حوائج کا اظہار نہ کرتیں۔تلامذہ کا حلقہ بڑا وسیع تھا اور ان میں بڑے بڑے امراے دولت اور ارکان حکومت شامل تھے' لیکن کسی سے ایک پائی وصول نہ کرتیں' سب کو مفت تعلیم دیتیں۔جامع دمشق کے اصحاب انتظام سے بھی کوئی معاوضہ نہ لیتیں۔ان کا ذریعہ معاش یہ تھا کہ لوگوں کے کپڑے سیتی تھیں' اس سے جو آمدنی ہوتی

اسی سے گزر بسر کرتیں۔ کپڑے سینے پر بہت کم وقت صرف کرتیں، صرف اتنا کہ جس سے قوت لایموت حاصل ہو جائے۔ زیادہ تر وقت تعلیم و تعلم پر خرچ کرتیں۔ اس محدود آمدنی سے شاگردوں اور ضرورت مندوں کی بھی مدد کرتیں۔ دوسروں سے ہم دردی کے جذبے کا یہ عالم تھا کہ کسی کی تکلیف دیکھ کر اپنی تکلیف بھول جاتیں اور جہاں تک ہو سکتا اس کی امداد فرماتیں۔

حضرت عائشہ بنت محمد حرانی رحمتہ اللہ علیہا نے ۸۶ سال عمر پا کر ۷۲۶ھ میں داعی اجل کو لبیک کیا۔

بیرم بنت احمد

بیرم بنت احمد بن محمد دیروطیہ اندلس کی مشہور اہل علم خواتین میں سے تھیں جو سلطان محمد نہم کے زمانے میں ۸۳۲ھ کو غرناطہ کے ایک ذی علم خاندان میں پیدا ہوئیں یہ وہ زمانہ تھا جب اندلس کی مضبوط سلطنت کی دیواریں متزلزل ہو گئی تھیں اور اسلامی حکومت کے خلاف عیسائیوں کی سازشیں اور ریشہ دوانیاں زوروں پر تھیں۔ حکومت کے دروبست پر ایسے لوگ قابض ہو گئے تھے جو اسلامیت سے بھی بے بہرہ تھے اور سلطنت کے بنیادی مقاصد سے بھی نا آشنا تھے۔ لیکن اس شر میں خیر کا پہلو یہ پنہاں تھا کہ اس دور کے اندلس نے بہترین اہل علم اور عظیم دانش ور پیدا کیے اور اس ملک کی کوکھ نے ایسے لوگوں کو جنم دیا جو علم و تحقیق کے میدان میں بہت آگے نکل گئے تھے۔

بیرم کے والد احمد بن محمد' بہت بڑے صاحب علم تھے اور پورے علاقے میں قدر و منزلت رکھتے تھے۔ دینی پیشوا اور مذہبی رہنما کی حیثیت سے مشہور تھے۔ انھوں نے اپنی اس بیٹی کی بہت اچھی تربیت کی اور اس کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی۔ ابتدائی تعلیم خود دی' اس کے بعد ثانوی اور اعلی تعلیم کے لیے اپنی نگرانی میں قابل اساتذہ کو مقرر کیا' جن سے انھوں نے تفسیر' حدیث' فقہ وغیرہ علوم کی تحصیل کی۔ علاوہ ازیں تاریخ اور اس کے متعلقات سے واقفیت بہم پہنچائی۔ کتابت اور اس کے مختلف اسالیب سے بھی یہ آگاہ تھیں۔ بعض علوم میں تو مجتہدانہ بصیرت رکھتی تھیں۔

اندلس کے بہت سے شہروں اور علمی مراکز میں ان کے علم کا چرچا تھا اور لوگ ان کے مقام و مرتبہ کی بلندیوں سے آگاہ تھے۔

انھوں نے فن قرات میں بھی دست گاہ حاصل کی اور اس کی تحصیل کے لیے ان

حضرات قراء سے رابطہ پیدا کیا جو اس موضوع پر عبور رکھتے تھے اور جنھیں اس باب میں یگانہ روزگار مانا جاتا تھا۔

فن قرات میں ان کے اساتذہ میں علامہ شمس بن صائغ کا اسم گرامی خصوصیت سے لائق تذکرہ ہے۔ علامہ موصوف کی بیٹی فاطمہ بھی علم قرات کی ماہر تھیں۔ اس فن کے حصول کے لیے ان کے سامنے بھی انھوں نے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ اس نواح میں علامہ موصوف اور ان کی صاحب زادی فاطمہ سے زیادہ اس فن کا شناور اور کوئی نہ تھا۔ ان دونوں باپ بیٹی نے یہ فن ماہر اساتذہ سے نہایت محنت سے حاصل کیا تھا اور اس میں انھیں مستند مانا جاتا تھا۔

حضرت بیرم بنت احمد رحمتہ اللہ علیہا کا حلقہ شاگردی بھی بڑا وسیع تھا۔ جس طرح خود انھوں نے اپنے دور کی عظیم المرتبت شخصیتوں سے تحصیل کی، اسی طرح ان سے بھی جلیل القدر لوگوں نے اخذ علم کیا۔ انھوں نے اپنے تلامذہ کو دیگر علوم کے علاوہ افتا کے نہج و اسلوب سے بھی آگاہ فرمایا اور انھیں اس مسند بلند کی نزاکتوں اور اہمیتوں سے باخبر کیا اور بتایا کہ مفتی کے فرائض نہایت اہم ہوتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ان کی پوری رعایت رکھے اور اپنی بنیادی ذمہ داریوں کو کسی آن نظر انداز نہ کرے۔ ان کا فرمان ہے کہ جو شخص ناقص العلم، کم فہم، مغلوب الغضب، معاملات سے بے بہرہ، دوستوں اور عزیزوں کے مفاد کی رعایت رکھنے والا، فرائض کی ادائیگی میں کاہل، سنن کا تارک اور جائز و ناجائز کے بارے میں عدم احتیاط کا عادی ہو اسے اس مسند پر فائز نہیں ہونا چاہیے۔ فتوے کے سلسلے میں بے احتیاطی انتہائی غلط نتائج پیدا کرتی ہے اور پھر اس کے اثرات ہمیشہ قائم رہتے ہیں اور مفتی کے بارے میں لوگ سوئے ظن میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جس سے اہل علم اور اصحاب افتا کا وقار مجروح ہو جاتا ہے اور اس کی زد براہ راست اسلام اور اس کے نام لیواؤں پر پڑتی ہے، اس لیے وہ اپنے تلامذہ کو فتوے کے سلسلے میں خصوصیت سے محتاط رہنے کی تلقین کرتیں اور فرماتیں کہ اس مسند سے دور رہنا زیادہ مناسب ہے۔

اپنے وطن اور قرب و جوار کے اساتذہ اور اہل فن سے تکمیل علم کے بعد مزید تعلیم کے لیے اپنے باپ احمد بن محمد دیروطیہ کے ساتھ بیت المقدس کا سفر اختیار کیا۔ وہاں خاصا عرصہ مقیم رہیں اور اس نواح کے علمائے عظام سے تحصیل کی' بیت المقدس اور اس کے گردو پیش کے اہل علم انھیں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان کی تحقیق و کاوش' تعمق و ژرف نگاہی اور علم و اتقا سے بہت متاثر تھے۔

وعظ و نصیحت اور پند و موعظت میں بھی انھیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ قیام بیت المقدس کے زمانے میں یہ عورتوں کے بڑے بڑے مجمعوں میں جاتیں اور ان میں وعظ کہتیں۔ان کے وعظ نہایت اثر انگیز ہوتے۔اپنے وعظ کو قرآن مجید کی آیات' احادیث رسول (ﷺ) آثار صحابہ' اقوال آئمہ اور بزرگان دین کے ارشادات و واقعات سے مزین فرماتیں۔نہایت توجہ اور انہماک سے خواتین ان کا وعظ سنتیں۔

پند و موعظت اور حدیث و شروح احادیث کے سلسلے کی متعدد کتابیں انھوں نے حفظ کر رکھی تھیں۔مثلاً عمدہ القاری' اربعین نبوی' قصیدہ بردہ اور عقیدے وغیرہ سے متعلق امام غزالی اور ابن جوزی کی بعض کتابیں' تاریخی واقعات پر مشتمل اکثر کتب زبانی یاد تھیں اور ان میں منقول بے شمار واقعات وعظ میں پوری سند اور وثوق کے ساتھ بیان فرماتیں۔حافظہ بہت تیز تھا اور ذہن بلا کا پایا تھا۔اظہار و بیان کے انداز سے خوب آگاہ تھیں۔مختلف شعرا کے بہت سے اشعار یاد تھے۔پھر دل اخلاص کے جذبے سے بھرپور تھا۔ان سب چیزوں نے مل کر انھیں بہترین مقرر اور واعظ بنا دیا تھا۔

ان کے مطالعہ میں زیادہ تر ریاض الصالحین' طہارۃ القلوب' رسالہ ابن ابی زیدون وغیرہ کتب رہتیں۔

اس نامور خاتون نے ۸۸۴ھ یا ۸۸۵ھ میں وفات پائی۔ عیسوی حساب سے ۱۴۸۰ یا ۱۴۸۱ بنتا ہے۔

جروہ بنت مرہ تمیمی

حضرت جروہ بنت مرہ بن غالب تمیمی بلند حوصلہ اور بے خوف خاتون تھیں' فصاحت و بلاغت میں یکتا' ادب و شعر میں بے نظیر اور حاضر جوابی میں عدیم المثال تھیں۔ قبائل عرب کے تمام پہلوؤں پر عمیق نظر رکھتی تھیں اور ان کی عادات واطوار سے پوری طرح آگاہ تھیں۔ طیفور نے بلاغات النساء میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور ان کی زندگی کے بعض گوشوں کو نمایاں کیا ہے۔

جروہ بنت مرہ تمیمی' حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں پیدا ہوئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب خلافت' ملوکیت کے قالب میں ڈھل چکی تھی اور مسلمانوں پر ظاہری طمطراق اور ٹھاٹھ باٹھ نے قبضہ کر لیا تھا۔ پرانی قبائلی عصبیتیں جو اسلامی تعلیمات کی وجہ سے ماند پڑ گئی تھیں' پھر سے سر اٹھا رہی تھیں اور مسلمان ایک دوسرے سے دست و گریباں تھے۔ لیکن اس دور کے بعض لوگ اس چیز سے انتہائی نفور تھے اور وہ ان علائق سے کنارہ کش ہو کر اللہ کی یاد میں محو ہو گئے تھے۔ حضرت جروہ بھی انہی خوش بخت لوگوں میں سے تھیں' جنھوں نے یاد خدا کو اپنا شعار بنا لیا تھا اور ذکر الٰہی میں اپنی ذات کو غرق کر لیا تھا۔

ان پر اللہ کی خشیت کا اس درجے غلبہ تھا کہ ایک مرتبہ نماز میں اچانک رونے لگیں اور روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ نماز سے فارغ ہوئیں تو کسی نے رونے کی وجہ پوچھی۔ کہنے لگیں مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا کہ جنت اور دوزخ میرے سامنے آ گئے ہیں اور میں سخت پریشانی کے عالم میں گھر گئی ہوں۔ یہ بات کر ہی رہی تھیں کہ پھر بے ہوش ہو گئیں اور انھیں بڑی مشکل سے ہوش میں لایا گیا۔ فرمایا کرتیں جس دل میں اللہ کا ڈر نہیں ہے وہ انسان کا دل نہیں ہو سکتا۔ انسانیت اور خوف خدا دونوں لازم و

ملزوم ہیں- مصیبت سے بچنے کی صورت صرف اللہ کا ڈر ہے-

ایک مرتبہ فرمایا: آؤ اللہ سے خشیت کا عہد کریں اور یہ فیصلہ کریں کہ کسی کو زبان اور ہاتھ سے کوئی تکلیف نہیں پہنچائیں گے- جو لوگ اللہ کی نافرمانی کے مرتکب ہوتے ہیں' ان کا مقاطعہ کریں گے اور خود کو اللہ کی عبادت کے لیے وقف کر دیں گے-

قرآن مجید کی تلاوت کثرت سے کرتیں- جن آیات میں اللہ کے خوف اور وعید کا ذکر ہے' ان کی تکرار کرتیں- ان کا تلاوت قرآن کا انداز یہ نہ تھا کہ ابتداے قرآن سے سلسلۂ تلاوت چلایا جائے بلکہ ان کا طریق یہ تھا کہ قرآن مجید کھولتیں اور جو آیات سامنے آتیں پڑھنا شروع کر دیتیں- اگر کوئی قریب ہوتا تو اسے بھی ان آیات کے معانی سے آگاہ فرماتیں اور اللہ کے عذاب سے ڈراتیں-

علاوہ ازیں فصاحت و بلاغت میں اپنا جواب نہ رکھتی تھیں- قبائل عرب کی خصوصیات و عادات سے بہت باخبر تھیں- جب ان کا تذکرہ کرتیں تو ایسے الفاظ سے ان کا تعارف کراتیں کہ ان کی خصوصیات نمایاں ہو کر سامنے آجاتیں- جو لوگ ان قبائل سے آگاہ تھے' وہ ان کے تعارفی الفاظ سے لطف اندوز ہوتے- اپنے قبیلے کے بارے میں بالخصوص محتاط الفاظ استعمال کرتیں اور کلام میں کسی قسم کی مبالغہ آرائی کا اظہار نہ فرماتیں-

جروہ بنت مرہ مکہ مکرمہ کی رہنے والی تھیں- ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مکہ گئے تو ان کی صالحیت اور فصاحت و بلاغت کی بات ان کے کانوں میں پہنچی- حضرت معاویہ نے انھیں بلایا- یہ ایک لمبی چادر اوڑھے ہوئے باپردہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئیں- حضرت معاویہ نے ان کے قبیلے اور خاندان کے بارے میں سوال کیا- کہنے لگیں-

میری قوم تعداد کے اعتبار سے لوگوں سے بہت زیادہ ہے' ان کی آبادیاں دور تک پھیلی ہوئی ہیں اور طمع و حرص سے بہت دور ہیں- یہ لوگ خالص اور سرخ سونے کی مانند ہیں اور حسب کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتے ہیں-

حضرت معاویہ نے کہا: تم نے بالکل ٹھیک کہا' تمھاری قوم واقعی انھی اوصاف کی حامل ہے- ذرا ان کی تمام شاخوں کی خصوصیات الگ الگ بیان کرو-

کہا: ان کی شاخ بنو عمرو بن تمیم کا یہ حال ہے کہ وہ مصائب سے دوچار ہوئے' بے شمار لوگوں سے ان کا تصادم ہوا' وہ بارہا میدان جنگ میں اترے اور انھیں انتہائی سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا' لیکن وہ کبھی دشمن کے مقابلے میں میدان دغا سے ذلیل ہو کر واپس نہیں ہوئے- انھیں حریف کبھی مطیع نہیں کر سکا- ان کے نیزے اور تلواریں ہمیشہ دشمن کے سروں پر منڈلاتے رہے اور ان پر ان کا رعب چھایا رہا-

فرمایا: تم نے سچ کہا اور بالکل صحیح کہا- اب اپنے قبیلے کی دوسری شاخ کے بارے میں بتاؤ-

بولیں: بنو سعد بن زید تعداد کے لحاظ سے بہت زیادہ ہیں' نسب کے لحاظ سے انتہائی پاکیزہ ہیں' اگر غصے میں آ جائیں تو نہایت اذیت ناک ثابت ہوتے ہیں اور اگر مدد کے لیے پکارے جائیں تو تیزی کے ساتھ پہنچتے ہیں- ان کے شب و روز تیغ و سناں کی رفاقت میں گزرتے ہیں' لڑائی ان کا پیشہ اور بہادری ان کا شیوہ ہے-

اب آیئے بنو حنظلہ کی طرف- ان کا معاملہ یہ ہے کہ یہ لوگ بلند مکانوں میں رہتے ہیں' اونچی حیثیت کے مالک ہیں' لوگوں میں عزت و اکرام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں- ہمسائے کی تکریم کرتے ہیں' دشمن کے لیے سخت گیر ہیں' مظلوم کی مدد کرنا فرض سمجھتے ہیں اور وعدہ پورا کرتے ہیں- دوست کے سچے دوست اور دشمن کے شدید دشمن ہیں-

معاویہ نے کہا: بنو حنظلہ ایسے درخت کی مانند ہیں جس کی شاخیں پھیل کر لوگوں کو اپنے سایہ عاطفت میں لے لیتی ہیں-

بولیں: امیر المومنین! ان پر یہی مثال صادق آتی ہے- آپ نے بالکل ٹھیک فرمایا-

اب بنو براجم کی سنیے! یہ لوگ یک مشت ہیں' مخالفین کے مقابلے میں ان کی

انگلیاں مجتمع ہیں اور ہتھیلیاں ایک دوسری سے پیوست ہیں۔

بولے: تم نے ٹھیک کہا۔

بنو ربیعہ کا یہ حال ہے کہ وہ پتھر کی طرح سخت اور سانپ کی طرح زہریلے ہیں' غیروں کے ساتھ لڑتے اور اپنے قبیلے پر فخر کرتے ہیں۔

فرمایا: بالکل صحیح ہے۔

کہا: بنو یربوع نیزے لہراتے ہوئے گھوڑوں پر سوار رہتے ہیں' ان کی خصوصیت یہ ہے کہ اپنے ساتھیوں کو دشمن کی دست برد سے محفوظ رکھتے اور ان کی ہر ممکن امداد کرتے ہیں' اور دشمن کے سواروں پر ایک دم ٹوٹ پڑتے ہیں۔

اس طرح وہ اپنے قبیلے سے تعلق رکھنے والی تمام شاخوں کے اوصاف بیان کرتی رہیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان کی تصدیق کرتے رہے۔ آخر میں کہنے لگے تمھاری معلومات کا سلسلہ بہت وسیع ہے اور قبائل عرب کے بارے میں تم نے جو کچھ کہا بالکل صحیح ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ علی کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟

بے ساختہ بولیں: اللہ نے ان کو بے حد شرف سے نوازا ہے' ان کے فکر و فہم کی حدود انتہائی وسیع ہیں' وہ اللہ کے مقدس ترین بندے ہیں۔ پھر گرج کر بولیں

امیر المومنین! میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ علی اس دنیا کے بہترین انسان تھے۔ اخلاص اور شجاعت میں کوئی ان کا حریف نہ تھا اور کسی میں یہ جرات نہیں کہ تقویٰ و تدین کے کسی پہلو میں بھی ان سے برابری کا دعویٰ کر سکے۔

امیر معاویہ نے کہا: تمھاری تمام باتیں سچ ہیں اور تم ہر معاملے میں صادق ہو۔ حضرت علی کے بارے میں بھی تم نے صحیح کہا۔

جب وہ بات ختم کر چکیں تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کو عمدہ ترین لباس عطا کیا اور دس ہزار درہم کے عطیے سے نوازا۔

ام حکیم بنت یحییٰ اموی

ام حکیم بنت یحییٰ اموی' قریش کی خوب رو اور حسین خاتون تھیں- ان کا ذوق شعری بہت بلند تھا اور عرب کی بہترین شاعرات میں سے تھیں- ان کے بہت سے شعر لوگوں کی نوک زبان تھے اور قریش کے متعدد شاعر اپنا کلام درست کرانے کے لیے ان کے پاس آتے تھے- شعرائے جاہلیت کے اشعار بھی انھیں یاد تھے اور وہ تمام اصناف شعر کے اچھے خاصے ذخیرے سے بہرہ ور تھیں-

ام حکیم اموی دور کے انتہائی عروج کے زمانے کی عورت تھیں- بہت سلیقہ شعار' فہیم اور فکر و بصیرت کی مالک---ان کا زمانہ مشہور اموی خلیفہ عبدالملک کا زمانہ ہے جب کہ پرانی بہت سی قدریں نظر انداز ہو چکی تھیں اور نئی قدریں جنم لے رہی تھیں- پردے کی پابندی پہلے کی سی نہیں رہی تھی اور ایک جدید دنیا ابھر رہی تھی جو اسلام کی ابتدائی تعلیمات سے آنکھیں پھیر رہی تھی اور نئے دور سے ناطہ جوڑ رہی تھی- اس دور میں کئی نئے علوم پیدا ہو گئے تھے' جن کی وجہ سے وقت تیزی کے ساتھ نئی سے نئی منزلیں طے کر رہا تھا- اسلام کی روایتی سادگی' عبادت میں دل جمعی' خدا ترسی' دوسروں سے ہمدردی اور للّٰہیت کے وہ جذبات باقی نہ رہے تھے جو اولیں دور کے مسلمانوں کا خاصہ تھے اور جس کی وجہ سے مسلمان دوسروں سے ممتاز تھے- یہ خصوصیت نہ مردوں میں باقی رہی تھی اور نہ عورتوں میں- تاہم بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو اس ماحول میں رہتے ہوئے ان اوصاف سے متصف تھے جن کا ایک سچے مسلمان میں پایا جانا ضروری ہے-

ان لوگوں میں ایک حضرت ام حکیم بنت یحییٰ اموی تھیں جو دنیوی لحاظ سے ایک بلند مرتبت خاندان کی عورت تھیں' مگر بہت نرم طینت اور خوش طبیعت تھیں-

مسکینوں اور غریبوں کی معاون تھیں اور یتیموں کی خیر خواہ- ان کا زیادہ وقت نچلے طبقے کے لوگوں میں گزرتا تھا اور مغرور و متکبر لوگوں سے نفرت کرتی تھیں- بے شک قادر الکلام شاعرہ تھیں لیکن حد درجہ متوازن اور نہایت منکسر المزاج-

کہا کرتی تھیں کہ ایک بہتر ادیب اور عمدہ شاعر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ غریبوں کا مددگار اور مظلوموں کا خیر خواہ ہو- جو شخص ان اوصاف سے تہی ہے' وہ صحیح معنوں میں ادیب اور شاعر کہلانے کا مستحق نہیں- ان کا قول ہے کہ جس ادیب یا شاعر کے دل میں کمزور اور مغلوب و مظلوم انسان کی ہمدردی کا جذبہ نہیں پایا جاتا' وہ اپنے کلام میں بھی صحیح معنوں میں اس جذبے کا اظہار نہیں کر سکتا- ظلم کو دیکھ کر اگر ادیب کا دل تڑپ نہیں اٹھتا اور شاعر اس کی مظلومیت کو الفاظ کے سانچے میں نہیں ڈھالتا تو وہ انسانیت کا دشمن ہے- ایسے شاعر اور ادیب سے دور بھاگنا چاہیے-

ان کا کہنا ہے کہ شاعری انسان کو نرم دل بنا دیتی ہے اور اس کی یہ صفت ہے کہ کدورتوں کے تمام جال توڑ دیتی ہے اور شاعر الفت و مودت کا پیکر بن جاتا ہے- شاعر کا دل اگر محبت کی لطافتوں سے خالی ہے تو وہ شاعر نہیں بہروپیا ہے- شاعر جہاں الفاظ کو ایک خاص ترازو میں تول کر اور بنا سنوار کر پیش کرتا ہے' وہاں اسے اپنے قلب و ضمیر میں بھی اسی کیفیت کو پیدا کرنا چاہیے-

ام حکیم کی شادی مشہور اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے صاحب زادے عبدالعزیز بن ولید سے ہوئی- عبدالعزیز خلافت بنوامیہ کی طرف سے ان دنوں مصر کے گورنر تھے اور بہت مستعد' معاملہ فہم' خوش اطوار' بلند ہمت اور کامیاب گورنر تھے- یہ وہی عبدالعزیز ہیں جو معروف و نامور اموی خلیفہ جنھیں خلیفہ راشد کہا جاتا ہے یعنی حضرت عمر کے والد تھے' جو تاریخ میں خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے نام سے موسوم ہیں- ان کی اس شادی کے موقعے پر ان کے دادا خلیفہ عبدالملک بن مروان نے بدرجہ غایت مسرت کا اظہار کیا تھا اور لوگوں کو انعام و عطایا سے نوازا تھا-

اس شادی کے موقعے پر متعدد شعرا نے تہنیتی اشعار کہے اور مجمع عام میں پڑھے

تھے-علاوہ ازیں بہت سے شعرا نے عبدالملک کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے اس عظیم المرتبت پوتے کی شادی پر ہدیہ تبریک پیش کیا اور جذبات کو اشعار کا جامہ پہنایا- ان شعرا میں جریر اور عدی بن رقاع خصوصیت سے قابل ذکر ہیں- یہ اس دور کے مشہور شعرا میں سے تھے اور فن شاعری میں اپنا حریف نہ رکھتے تھے- سب سے پہلے عدی بن رقاع' عبدالملک کے دربار میں آیا- اس نے مبارک باد پیش کرتے ہوئے جو شعر کہے ان میں سے چند اشعار کا ترجمہ درج ذیل ہے-

اس نے دولہا اور دولہن کی تعریف کرتے ہوئے انھیں سورج اور چاند سے تشبیہ دی اور کہا:

آج کا دن کس درجہ مسرت انگیز ہے کہ چاند اور سورج دونوں بہ یک وقت جمع ہو گئے ہیں- ان کا یہ التقاے شمار سعادتوں کا پیش خیمہ ہے-

اب پوشیدہ چیز مجسم ہو کر سامنے آگئی ہے- وہ بہت ہی بلند بخت شخص ہے جسے ان کی زیارت کا شرف حاصل ہوا-

یہ مسرت افزا گھڑیاں ہمیشہ رہیں اور خدا کرے ان میں زیادہ سے زیادہ سامان برکت پیدا ہو-

اس سے زیادہ خوشی کیا ہو گی کہ اس شادی کی وجہ سے پوری دنیا پر بہجت و نشاط کا شامیانہ تن گیا ہے-

اس کے بعد عرب کا نامور شاعر جریر آیا اور اس نے کہا:

آج امیر نے عزت و شرف کی فراوانیوں کو جمع کر لیا ہے- وہ بہر حال لائق تکریم ہے-

خلیفہ کو مبارک ہو کہ اس نے حکمت و دانائی کو اپنے لیے پسند کر لیا اور فخر و تکریم کے عمامہ سے اپنے سر کو زینت بخشی-

اگر عورت کو شوہر پر فخر کرنے کا حق حاصل ہے تو ام حکیم کو فی الواقع قابل فخر شوہر میسر آیا ہے-

عبدالعزیز بلند مرتبہ انسان ہے اور اخلاق واعمال کے لحاظ سے بے مثال-
میں اسے دل کی گہرائیوں سے اس شادی پر تہنیت پیش کرتا ہوں اور جو کچھ کہہ رہا ہوں اس میں بالکل صادق ہوں-
اس شادی پر میں دونوں خاندانوں کو مبارک باد پیش کرتا ہوں- یہ جوڑا بہت بہتر اور مناسب ترین ہے-

عبدالملک نے ان دونوں شاعروں کو دس دس ہزار درہم عطا کرنے کا حکم دیا اور ان کے تمام خاندان اور اہل خانہ کی سو سو ضرورتیں پوری کیں- علاوہ ازیں عام لوگوں اور محافظین کو دس دس دینار دیے-

بہر حال ام حکیم بنت یحییٰ اموی کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی گئی اور اس پر بے شمار درہم ودینار خرچ کیے گئے-

ام حکیم بڑی خوش گوار زندگی گزار رہی تھیں کہ ان کی شادی سے کچھ عرصہ بعد عبدالعزیز بن ولید نے میمونہ بنت عبدالرحمان بن ابو بکر سے شادی کر لی اور وہ میمونہ کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو گئے اور میمونہ کے کہنے سے ام حکیم کو طلاق دے دی- طلاق کے بعد ام حکیم نے ہشام بن عبدالملک سے شادی کر لی- اسی اثنا میں عبدالعزیز کی وفات ہو گئی تو میمونہ بھی ہشام کے عقد میں آ گئی- لیکن ہشام کو میمونہ کی نسبت ام حکیم سے زیادہ تعلق خاطر تھا- اس لیے اس نے میمونہ کو طلاق دے دی- یہ طلاق خود ام حکیم کی کوشش سے ہوئی' کیونکہ جب یہ دونوں عبدالعزیز کے عقد میں تھیں تو میمونہ نے عبدالعزیز سے ام حکیم کو طلاق دلا دی تھی- اب یہی کچھ ام حکیم نے ہشام کے ذریعے میمونہ کے ساتھ کیا-

دمشق میں ام حکیم کے نام سے اب بھی ایک بازار ہے جسے سوق ام حکیم کہا جاتا ہے- کہتے ہیں یہ بڑا بارونق بازار ہے اور دمشق کی تجارت کا مرکزی مقام-

حمدہ بنت واثق

حمدہ بنت واثق اپنے دور کی معروف خواتین میں سے تھیں۔ ان کے حالات صغدی کی الوافی بالوافیات میں اور محمد ذہبی کی مشاہیر النساء میں بیان کیے گئے ہیں۔ حضرت حمدہ بنت واثق بن علی رحمتہ اللہ علیہا بغداد کی ایک نواحی بستی میں ۴۶۶ھ میں پیدا ہوئیں۔ جس خاندان سے یہ تعلق رکھتی تھیں' وہ علم و فضل اور تدین و تقویٰ کے اعتبار سے عرب میں نہایت بلند مقام رکھتا تھا۔ اس کے تمام افراد پرہیزگاری' حسن اخلاق اور نیکی میں سب سے فائق تھے۔ لڑائی جھگڑوں اور سازشوں سے بالا رہ کر زندگی بسر کرتے تھے۔

حمدہ کا خاندان جن اوصاف سے متصف تھا وہ ان میں بھی منتقل ہوئے۔ بچپن ہی میں بہتر طریقے سے ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا گیا تھا۔ ان کے والد واثق بن علی خود بھی ایک عالم دین اور نیک کردار شخص تھے' اپنی اس لڑکی کی بھی انھوں نے بہتر انداز سے تربیت کی اور ان کی تعلیم کے مسئلے کو خصوصیت سے مرکز توجہ ٹھہرایا۔ والدہ نے بھی اس میں پوری دلچسپی لی۔

ابتدائی تعلیم والد نے گھر پر دی۔ پہلے قرآن حکیم پڑھایا' پھر حدیث و فقہ کی بعض کتابیں پڑھائیں۔ تعلیم کے علاوہ ان میں صالحیت کی روح پیدا کی اور کم سنی میں ہی نیکی کی صاف ستھری راہوں پر لگایا۔

عمر کی مزید منزلیں طے کیں تو انتہائی تعلیم کے لیے دیگر اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ حدیث کے لیے اس زمانے کے نامور محدث ابو بکر احمد بن علی بن بدران حلوانی کی طرف رجوع کیا گیا۔ یہ اس دور کے جلیل القدر عالم تھے اور حدیث اور اس کے متعلقات پر عبور رکھتے تھے۔ فقہ کے لیے مشہور فقیہ امام ابن سمعانی کے سامنے

زانوئے شاگردی تہہ کیا-ابن سمعانی فقہ کے علاوہ حدیث میں بھی اس زمانے کے بہت بڑے عالم تھے- حمدہ بنت واثق نے ان دونوں سے حدیث و فقہ کی کتابیں پڑھیں اور اپنی قابلیت اور ذہانت کی وجہ سے بڑا نام پایا-

وہ عمدہ عادات و خصائل کی مالک تھیں- مسائل کی تحقیق کا بڑا شوق تھا- ہر پیش آئند مسئلے کے حل کے لیے علما کی طرف رجوع فرماتیں- جہاں ان کو اللہ نے علم و فضل کی نعمت بے بہا سے نوازا تھا' وہاں صلہ رحمی' دوسروں کے احترام اور غربا کی امداد و نصرت کے جذبے سے بھی سرشار فرمایا تھا-ان کی عادت تھی کہ ان لوگوں کے پاس ضرور جاتیں جنھیں معاشرے میں کم زور سمجھا جاتا تھا' بیماروں کی عیادت اور ناداروں کی مدد کو فرض گردانتیں اور ان کی دلجوئی کرتیں- بوڑھوں کا انتہائی احترام کرتیں' بچوں سے شفقت سے پیش آتیں-

اپنے گھر کے تمام کام خود کرتیں' کپڑے دھوتیں' کھانا پکاتیں' مہمانوں کی خدمت کرتیں' عورتوں اور بچوں سے اچھی طرح پیش آتیں اور کسی کو شکایت کا موقع نہ دیتیں- سادہ زندگی بسر کرتیں اور ہر معاملے میں عجز و انکسار کا ثبوت دیتیں' والدین کی حد درجہ خدمت گزار تھیں اور وہ ان کے حسن اخلاق اور علمیت پر بہت خوش تھے-

ان کی شادی اپنے خاندان ہی کے ایک شخص سے ہوئی تھی-ان کے شوہر بھی عالم اور عاقل و فہیم تھے-شادی بالکل سادگی سے انجام پائی- نہ جہیز کا تکلف' نہ زیورات کی کثرت اور نہ نوع بنوع کپڑوں کی بھرمار- چند لوگ دولہا کے ساتھ آئے' لڑکی والوں نے اپنی حیثیت کے مطابق انھیں کھانا کھلایا' نکاح ہوا اور قصہ ختم-

تعلیم سے فراغت اور شادی کے بعد مدینہ منورہ میں منتقل ہو گئی تھیں- وہاں کے محدثین اور فقہا سے استفادہ کیا-اس کے بعد بغداد میں بھی عرصے تک مقیم رہیں' وہاں کے علما و فقہا سے بھی تحصیل کی-

مدینہ اور بغداد کے دوران قیام میں انھوں نے معاشرے کی اصلاح کے لیے مجالس وعظ و ارشاد کا آغاز فرمایا- ہر محلے میں اس قسم کی کمیٹیاں قائم کیں جو اچھے لوگوں

پر مشتمل تھیں اور جن کا مقصد محض لوگوں میں اسلام کی تبلیغ اور ان کی اصلاح تھا۔ ان محلّہ وار کمیٹیوں کی طرف سے ہر محلے کی عورتوں میں مجلس وعظ منعقد کرتیں' وعظ کا اسلوب بالکل سادہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بہترین باتیں کہہ دیتیں۔ وعظ میں قرآن کی آیات پڑھتیں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و فرمودات کے حوالے دیتیں' صحابہ کے آثار اور آئمہ کے اقوال سے اپنی بات میں وزن پیدا کرتیں۔ ان کے وعظوں میں کثرت سے عورتیں آتیں اور غور و توجہ سے ان کی باتیں سنتیں۔

ایک مرتبہ عورتوں کے مجمع میں مدینہ منورہ میں دوران وعظ فرمایا' بہنو تمھیں معلوم ہے' یہ کون سا شہر ہے' اس کی تاریخ کیا ہے اور اس کے ساتھ ہمارے کیا جذبات وابستہ ہیں۔ یہ وہی مبارک و مقدس مقام ہے' جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے تشریف لائے تھے۔ یہاں سے انھوں نے اسلام کی نشر و اشاعت اور جنگ و جہاد کے لیے بے شمار قافلے مختلف مقامات کو روانہ کیے اور فوجوں کی فوجیں اس سلسلے میں میدان میں نکلیں۔ یہ وہی مقام ہے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا روضہ اقدس ہے اور جہاں لاتعداد صحابہ کرام استراحت فرما ہیں۔ یہ وہی متبرک خطہ ارض ہے جس میں بڑے بڑے آئمہ اور علمائے حدیث و فقہ پیدا ہوئے اور انھوں نے دین کی خدمت کے لیے بے حد تگ و تاز کی۔ تم اپنے آپ کی اصلاح کرو اور دین کی اشاعت و ترویج کا فرض جو تم پر عائد ہوتا ہے' اسے پورا کرو۔ اٹھو اللہ کے دین کی تبلیغ کے لیے کمربستہ ہو جاؤ۔

حضرت حمدہ بن واثق بہت سی خوبیوں کی مالک تھیں اور ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

حضرت حمدہ بنت واثق بن علی رحمتہ اللہ علیہا نے ۵۶ برس عمر پا کر ۵۲۱ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔

فخر النساء بیگم

فخر النساء بیگم عربی النسل خاتون تھیں' اور مصر کے ایک اونچے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں- اس کی ولادت صحرائے سینا کے ایک گاؤں میں ہوئی تھی- اس کی شادی آٹھ سال کی عمر میں کر دی گئی تھی' جس شخص سے شادی ہوئی وہ قاہرہ کے حکمران خاندان کا ایک دولت مند شہزادہ تھا- جب یہ عمر بلوغ کو پہنچی تو اس شہزادے کی طبیعت کو اپنے موافق اور اپنی طبیعت کو اس کے موافق نہ پایا اور اس کے عقد میں رہنے سے انکار کر دیا- وہ اسکندریہ پہنچی اور وہاں جا کر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا- چند ہفتے مقدمہ چلا' عدالت میں مفصل بیان ہوئے اور فیصلہ اس کے حق میں کر دیا گیا-

اب اس کی زندگی کا دوسرا اور نیا دور شروع ہوا- اس نے اپنی مرضی اور پسند سے ایک اور شخص سے نکاح کر لیا جو اس کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور مصری فوج میں لیفٹیننٹ کے عہدے پر فائز تھا- یہ شخص جوان اور خوب صورت تھا اور اپنی اس بیوی سے انتہائی محبت کرتا تھا- فخر النساء کے بطن سے اس کے تین لڑکے پیدا ہوئے' جن میں سے دو تو شیر خواری کے عالم میں وفات پا گئے اور ایک زندہ رہا- اس اثنا میں اس کے شوہر کو ایک جنگی مہم پر جانے کا حکم ہوا- وہ بچے کو اپنے ساتھ لے گیا- سوئے اتفاق کہ دوران جنگ میں باپ دشمن کے ہاتھوں قتل ہو گیا اور لڑکا ہنگامے میں گم ہو گیا- فخر النساء کو اس حادثے کی اطلاع پہنچی تو سخت پریشان ہوئی- وہ اسکندریہ سے واپس اپنے رشتہ داروں کے ہاں پہنچی' لیکن اطمینان کی دولت یہاں بھی مفقود تھی- بے چینی کے عالم میں وہ وطن سے نکلی اور کراچی' حیدر آباد' ملتان' لاہور ہوتی ہوئی افغانستان پہنچی اور کسی نہ کسی طرح امیر تیمور کے محل میں معمولی خادمہ کی حیثیت سے خدمات انجام دینے لگی-

فخر النساء اگرچہ زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھی اور شاہی محلات کے روایتی آداب و رسوم سے ناواقف تھی، لیکن نہایت سلیقہ شعار، سمجھدار، بیدار مغز اور معاملہ فہم تھی۔ وہ اپنے ان اوصاف کی بنا پر جلد ہی تیموری خاندان کے دوسرے افراد کے علاوہ خود تیمور کے نزدیک بھی بہت اہمیت اختیار کر گئی، مگر سکون قلب کی نعمت اب بھی اسے حاصل نہ تھی اور اس کا دل ہر وقت ماضی کی یادوں میں الجھا رہتا تھا، جس کے آثار اس کے چہرے سے نمایاں تھے اور بارہا تیمور ان آثار کو اس کے چہرے سے پڑھ چکا تھا۔

تیمور انسانی نفسیات کا ماہر تھا۔ ایک روز اس نے فخر النساء کو بلایا اور اس سے ذہنی الجھنوں کے متعلق دریافت کیا۔ پہلے تو اس نے کچھ کہنے اور بتانے سے گریز کیا، لیکن تیمور کا اصرار بڑھا تو تمام تفصیلات بیان کر دیں۔ اس کا حال سن کر تیمور بہت متاثر ہوا اور اسے اپنے عقد میں لے لیا۔

فخر النساء کی کوکھ سے تیمور کے تین لڑکے اور چار لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ میراں شاہ جو تیمور کے انتقال کے بعد تخت حکومت پر متمکن ہوا، اسی عالی مرتبت اور بلند فکر خاتون کے بطن سے تھا۔ فہم و فراست کے علاوہ وہ نہایت نیک اور دین دار خاتون تھی اور مذہبی عقائد اور احکام شریعت کی پابندی میں انتہائی سخت تھی۔ فجر کی نماز کے بعد تلاوت قرآن حکیم اس کا روزانہ کا معمول تھا اور وہ نماز تہجد کی بڑی پابند تھی۔ ماتحتوں اور ملازموں کے ساتھ مشفقانہ سلوک روا رکھتی۔ غریبوں اور ناداروں پر بدرجہ غایت مہربان تھی۔ بے شمار مفلس اور بیوہ عورتیں، یتیم بچے اور نادار لوگ اس کے پاس آتے اور یہ دل کھول کر ان کی مدد کرتی۔ اس نے مستحقین کی ایک فہرست بنا رکھی تھی۔ وہ اپنے متعلقین اور تیمور کے مصاحبوں اور ندیموں کی امداد کرتی تھی۔ تیمور کی وفات ۸۰۷ھ (۱۴۰۵ء) کو ہوئی تھی۔ اس سے چند روز بعد فخر النسا بیگم اللہ کو پیاری ہو گئی۔

امتہ الحبیب

ترکی کی عثمانیہ سلطنت کا حکمران بایزید یلدرم نہایت جری اور بہادر شخص تھا۔ اس کی فوجوں کے جرنیل کا نام سلطان یزدانی تھا۔ وہ ایرانی نسل تھا۔ بعض لوگوں کے نزدیک اس کا سلسلہ نسب کیخسرو سے ملتا ہے اور بعض مورخین اسے ایران کے کاؤس خاندان سے وابستہ کرتے ہیں۔ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں عربوں نے جب ایران کی طرف رخ کیا تو بے شمار خاندان حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے اور لاتعداد بلاد و قصبات کے لوگوں نے اسلام کی حقانیت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تھا' لیکن سلطان یزدانی جس علاقے اور خاندان سے متعلق تھا' وہ اسلام کی روشنی سے محروم تھا۔ یہ شخص مجوسی مذہب کا حامل اور آتش پرست تھا اور زرتشتیوں کی مذہبی کتاب وساتیر کی صداقت پر یقین رکھتا تھا' لیکن اس میں یہ خوبی تھی کہ اس کا دل تعصبات سے خالی اور ضمیر مذہبی عناد سے دور تھا۔ یہ مسلمانوں کی تبلیغی مجلسوں اور ان کی دینی محفلوں میں بھی شریک ہوتا تھا اور اس کے احکام و تعلیمات کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مسلمان ہو گیا اور اپنے قدیم مذہب کو ترک کر دیا۔ اس کے قبول اسلام کے بعد اس کی بیوی بھی حلقہ بگوش اسلام ہو گئی۔

امتہ الحبیب اس کی پیاری بیٹی تھی اور بڑی زیرک اور سمجھدار تھی۔ جب اس کے والدین نے اسلام قبول کیا تو اس وقت اس کی عمر گیارہ برس تھی۔ یہ اگرچہ کم سن تھی مگر فہم و فراست کی دولت سے بہرہ ور تھی۔ اس نے ماں باپ سے متاثر ہو کر اسلام قبول نہ کیا بلکہ اس مسئلے پر برابر غور کرتی رہی۔ دو سال حالت غور و فکر میں گزار دیئے' مشفق والدین بیٹی کی پریشانی اور تذبذب کو گہری نظر سے دیکھ رہے تھے۔ ایک روز دونوں میاں بیوی نے بیٹی کو بلایا اور شفقت بھرے لہجے میں کہا بیٹی ہمیں معلوم ہے تم

ہماری وجہ سے بہت پریشان اور متفکر رہتی ہو' ہم کسی جبر کے قائل نہیں اور نہ اسلام جبر کی اجازت دیتا ہے' ہمیں اسلام کی تعلیمات پسند آئیں' ہم نے اسے بطیب خاطر بغیر کسی جبر واکراہ اور خارجی اثرات کے قبول کر لیا- ہم نے آج تک اس موضوع سے متعلق نہ تمھیں کچھ کہا' نہ آئندہ کہیں گے -ہمارے قبول اسلام پر دو سال گزر چکے ہیں اور ہم اپنے اس عمل پر خوش ہیں' ہمارا قلب مطمئن ہے- تم اگر اس سلسلے میں ہمارا ساتھ نہیں دینا چاہتی تو بے شک نہ دو' ہم قطعاً تمھیں مجبور نہیں کریں گے- مگر تم خوشی سے رہو' تمھیں وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو ایک بیٹی کو حاصل ہونے چاہئیں-

والدین کی اس تقریر سے امتہ الحبیب بہت متاثر ہوئی -ان کی اجازت سے اسلام کے بارے میں اس نے چند باتیں دریافت کیں اور وہ باتیں سمجھنے کے بعد مسلمان ہو گئی -اس وقت اس کی عمر تیرہ برس تھی-

امتہ الحبیب کو والدین نے بہترین طریق سے تعلیم دلائی- اس کا والد سلطان یزدانی اسے مردانہ لباس پہنایا کرتا تھا' اس نے لڑکوں کی طرح اس کی تربیت کی اور سپاہیانہ زندگی کا خوگر بنایا- پہلے اس کو گھڑ سواری سکھائی' پھر فن تیر اندازی میں پختہ کیا اور سپاہ گری کے اصولوں سے آگاہ کیا' یہاں تک کہ اس میں بہادری کے جوہر پیدا ہو گئے اور اس میں اعلیٰ درجے کا فوجی افسر بننے کی صلاحیتیں ابھر آئیں- چونکہ اس کو امرا و شرفا کی مجلسوں میں رہنے کے مواقع میسر تھے' اس لیے اس میں وہ اخلاق و عادات بھی پیدا ہو گئے جو ملوک و خلفا اور امرا و وزرا کے لیے مخصوص ہیں- اس کو خود خلیفہ بایزید یلدرم کے محل میں آمد و رفت کی سہولتیں بھی حاصل تھیں اور اس کی اولاد سے بھی مراسم تھے' لہٰذا اس میں قدرتاً وہ اونچے آداب و اوصاف پیدا ہو گئے تھے جن سے خلفا کی اولاد متصف ہوتی تھی-

امتہ الحبیب کو مدرسہ سلطانیہ حربیہ میں داخل کرا دیا گیا تاکہ فن حرب کے مختلف شعبوں پر عبور حاصل کر لے -اس مدرسے میں یہ سولہ مہینے رہی اور حرب و جنگ کے مروجہ قواعد میں اس درجہ ماہر ہو گئی کہ تمام رفقائے مدرسہ سے آگے بڑھ

گئی- اس دوران میں مختلف شہزادوں اور سرکردہ افراد کی طرف سے نکاح کے پیغام آئے' مگر امتہ الحبیب نے رد کر دیے' کیونکہ اس کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو گئی تھی کہ نکاح کے بعد عورت کی آزادی سلب ہو جاتی ہے اور وہ شوہر کی تابع فرمان ہو کر رہ جاتی ہے' اس کی سرگرمیاں ختم ہو جاتی ہیں اور اسے صرف ایک ہی شخص کے حکم کی پابندی کرنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے- پھر اسے یہ بھی خیال تھا کہ بعض لڑکیوں کے شوہر انتہائی بداخلاق اور بداطوار ہوتے ہیں' جن کی وجہ سے ان کی زندگی کی مسرتیں ختم ہو جاتی ہیں- امتہ الحبیب کی شادی کے بارے میں خود اس کا باپ سلطان یزدانی بھی خاموش تھا اور وہ بیٹی کی مرضی کے سوا کوئی قدم اٹھانے کے لیے تیار نہ تھا-

جب امتہ الحبیب کی عمر انیس برس کو پہنچی تو یزدانی بایزید کی فوج کے سیاہ و سپید کا مالک ہو چکا تھا اور ترکی کے عثمانی خلیفہ کو فوج کے ایرانی نسل حاکم اعلیٰ پر کامل اعتماد تھا- اسے یقین تھا کہ فوج کے سلسلے میں یزدانی جو قدم بھی اٹھائے گا وہ ملک و فوج کی بہتری کا ضامن ہو گا- امتہ الحبیب بھی فوجی معاملات میں باپ کی معاون تھی اور باقاعدہ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے فوج میں بھرتی ہو چکی تھی- خلیفہ کو بھی اس کا علم تھا اور اسے معلوم تھا کہ وہ مردانہ لباس میں رہتی ہے اور فوج کے اصول و قواعد اور ضوابط سے آگاہی رکھتی ہے- بایزید اس کی فوجی اور فنی صلاحیتوں کا لوہا ماننے اور اہم امور میں اس سے بالمشافہ مشورہ کرنے پر مجبور ہو گیا-

بایزید کا یہ معمول تھا کہ جب فوج کو کسی بڑی جنگی مہم پر روانہ کرتا یا اپنی فوج کے درمیان مصنوعی جنگوں کا اہتمام کرتا تو امتہ الحبیب کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دیتا- وہ باقاعدہ مرد سپاہیوں کے ساتھ مردانہ لباس میں آتی اور معرکہ کارزار میں شریک ہوتی- بایزید خوش ہو کر جن فوجیوں کو انعام و اکرام سے نوازتا ان میں امتہ الحبیب کا نام سرفہرست ہوتا- اسی اثنا میں بایزید کو امیر تیمور کے ساتھ معرکہ آرا ہونا پڑا- بایزید نہایت بہادر حکمران تھا- اس کی فتوحات کا دائرہ بہت دور تک پھیل گیا تھا- وہ کسی مسلمان کے ساتھ نبرد آزما نہیں ہونا چاہتا تھا- اس نے بہت کوشش کی کہ تیمور

سے تصادم نہ ہو لیکن تیمور نے ایک نہ مانی اور مقابلے پر اتر آیا- مجبوراً بایزید کو تمام مہمات چھوڑ کر اس کے مقابلے پر آنا پڑا اور بایزید کی جو فوج تیمور کے مقابلے پر آئی اس میں امتہ الحبیب بھی شامل تھی- تیمور اور بایزید کی جنگ کا قصہ طویل بھی ہے اور دردناک بھی' کیونکہ یہ اس وقت کی دنیا کے دو عظیم مسلمان بہادروں کا باہمی مقابلہ تھا- لیکن ہمیں اس کی تفصیلات سے تعلق نہیں- ہمیں دلچسپی صرف اس کردار سے ہے جو اس وقت امتہ الحبیب نے ادا کیا- اسی کردار کے نتیجے میں اس نے زندگی کا نیا موڑ کاٹا- وہ تیمور کے نکاح میں آئی اور امتہ الحبیب کے بجائے حمیدہ بانو بیگم کہلائی- اس وقت وہ زندگی کی چوبیس بہاریں دیکھ چکی تھی-

تیمور اور بایزید کے درمیان خوں ریز جنگ جاری تھی- بہادری و شجاعت کے دو پہاڑ آمنے سامنے کھڑے تھے- بایزید یلدرم شکست کے لفظ سے نا آشنا تھا' مگر یہ اولین موقع تھا کہ بایزید کو تیمور کی خون خوار تلوار کے سامنے جھکنا پڑا اور تاریخ میں پہلی مرتبہ چشم آسمان نے اس کو شکست سے آشنا ہوتے دیکھا- بایزید کے بہت سے فوجی یا تو مارے گئے یا گرفتار کر لیے گئے- گرفتار شدہ فوجیوں میں چوبیس سالہ امتہ الحبیب بھی تھی-

تیمور کی عادت تھی کہ وہ جنگ کے خاتمے پر فریق مخالف کے گرفتار لوگوں کو حاضر ہونے کا حکم دیتا- ان میں معذوروں اور زخمیوں کے ساتھ رحم ولانہ سلوک روا رکھتا اور انھیں رہا کر دیتا- سرکش اور مغرور لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا- سخت دشمنوں کو طویل سزا دے کر حوالہ زنداں کر دیتا' اور بہادر اور جری لوگوں کی قدر کرتا اور ان میں سے اکثر کو رہا کر کے ان کی قابلیت اور تجربے سے فائدہ اٹھاتا-

اس لڑائی کے بعد بھی اس نے یہی کیا- گرفتار شدہ لوگوں کو طلب کیا اور ان سے گفتگو کی- اتفاق کی بات کہ سب سے پہلے اس کی خدمت میں امتہ الحبیب کو پیش کیا گیا- یہ حسب معمول مردانہ لباس پہنے ہوئے تھی- تیمور اس کو دیکھ کر نہایت متاثر ہوا- اس نے دیکھا کہ ایک طویل قامت' تنومند اور حسین و جمیل جوان انتہائی بے نیازی سے سامنے کھڑا ہے اور اپنے مستقبل سے قطعی بے پروا ہے- تیمور نے اسے دیکھتے

ہی حکم دیا کہ اسے اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیا جائے' مگر امتہ الحبیب نے جرات کا ثبوت دیتے ہوئے کہا:

"بادشاہ! مجھے کچھ عرض کرنا ہے"۔

اگرچہ تیمور ایسے عظیم فاتح کے لیے یہ فقرہ زیادہ اثر انگیز نہ تھا مگر نہ معلوم اس کے دل میں کیا بات آئی۔ فوراً کہا:

"کہو کیا بات ہے؟"۔

یہ حوصلہ افزا فقرہ سن کر امتہ الحبیب آگے بڑھی' مودبانہ سلام کیا' آداب شاہی بجا لائی اور دوبارہ اجازت طلب کر کے مردانہ انداز میں بولی:

اے امیر! آپ کے سامنے میں کچھ گزارشات پیش کرنا اور چند حقائق کی نقاب کشائی کرنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کے حضور جو کچھ عرض کروں گا' وہ صحیح واقعات اور صداقت پر مبنی ہو گا۔ نہ میں کسی قسم کے تصنع کا اظہار کروں گا' نہ کسی مصنوعی اور غلط تعریف سننے کے لیے آپ کو مجبور کروں گا' نہ کسی کے بارے میں غلط گوئی اور کذب بیانی سے کام لوں گا۔ میری زبان سے وہی الفاظ نکلیں گے جو صداقت کی میزان پر پورے اتریں گے۔ میری درخواست ہے کہ جب تک میں واقعات کی تمام تفصیلات کا آپ کے سامنے پوری طرح اظہار نہ کر دوں مجھے تقریر کرنے سے روکا نہ جائے۔ میں دنیا کے ایک عظیم فاتح اور اولوالعزم انسان سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ میری اس استدعا کو شرف قبول بخشے گا۔

امتہ الحبیب کے درد میں ڈوبے ہوئے ان الفاظ نے تیمور کو متاثر کیا اور اس کے ارکان دربار اور خود تیمور اس جرات مندانہ انداز کلام سے انتہائی متعجب ہوئے اور بادشاہ نے نہایت متانت سے جواب دیا:

فرمایئے۔

اب دربار میں سناٹا چھایا ہوا ہے اور چاروں طرف خاموشی طاری ہے۔ امتہ

الحبیب کی آواز نے اس سناٹے کو توڑا اور جرات مندانہ لہجے میں تقریر شروع کی :

تو نے بایزید پر حملہ کر کے ہزاروں بندگان خدا کو خاک و خون میں تڑپایا' تیری بے رحم تلوار نے بے شمار بے گناہوں کے سر تن سے جدا کر دیے' لاتعداد معصوم بچوں کو یتیم کر دیا اور ان گنت عورتوں کا سہاگ اجاڑ دیا' تیرا یہ گناہ ہمیشہ تیرے گلے کا طوق بنا رہے گا- یاد رکھ ! تو نے صرف ترکوں کی خون ریزی نہیں کی' ان کی جڑوں کو اکھاڑنے کی کوشش کی ہے- یہی وہ ترک ہیں جنھوں نے سارے یورپ پر یلغار کر کے ان کو عاجز و بے بس کر دیا تھا- یہی وہ بہادر ترک ہیں' جنھوں نے محض اسلام کی خاطر بڑی بڑی سلطنتوں کو تہہ و بالا کر ڈالا- تم مسلمان کہلاتے ہو' کیا بتا سکتے ہو کہ اہل اسلام کو اس بے رحمی سے قتل کرنا اور ان کی جان و مال کو تلف کرنا کہاں جائز ہے ؟ بایزید وہ عظیم الشان فاتح ہے جس نے سارے یورپ کی بنیادوں کو ہلا ڈالا' تم نے اس کی قدر کرنے کی بجائے اسے نشانہ ستم بنایا' اس نے تمھیں عاجزی سے صلح و آشتی کا پیغام بھیجا' لیکن تم نے اس کا پیغام حقارت سے ٹھکرا دیا- تم نے یہ سوچا کہ جب تک بایزید پر فتح نہ حاصل کی جائے' تمھارا نام فاتحین کی فہرست میں درج نہ ہو گا- بتاؤ اس اللہ حکم الحاکمین کے سامنے کیا جواب دو گے' جس کے حضور حاضری کا وقت نہایت قریب ہے اور جس کی سزا انتہائی سخت ہے- کیا تمھیں اپنی موت یاد نہیں ؟ کیا تمھیں اس حقیقت کا علم نہیں کہ تمھیں اللہ کے سامنے اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا- یاد رکھو اس دنیا کی زندگی چند روزہ ہے' آخر کار موت کے منہ میں جانا اور اپنے اعمال کی جزا یا سزا بھگتنا ہے- بتاؤ جب اللہ تم سے مظلوموں پر ظلم کے بارے میں سوال کرے گا تو کیا جواب دو گے ؟ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتاؤ کیا اس شخص پر بہادر اور فاتح کے لفظ کا اطلاق ہو سکتا ہے جو مظلوم اور بے بس قیدیوں پر تلوار اٹھائے اور ان کی زندگی کا خاتمہ کرنے کے درپے ہو ؟ کیا تمھارے

نزدیک یہی شجاعت ہے کہ قیدیوں کو پابہ زنجیر کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے؟ اگر یہ شجاعت ہے تو بتاؤ بزدلی اور بے رحمی کسے کہتے ہیں؟"

امتہ الحبیب نے سلسلۂ تقریر ختم کر کے ہاتھ اوپر کو اٹھایا اور آہنی خود سر سے اتار کر زمین پر رکھ دیا اور نہایت خشم گیں انداز سے کہا:

"تیمور دیکھو میں ایک عورت ہوں' تو اس سے اندازہ کر سکتا ہے کہ جس قوم کی عورتیں اس قسم کی بہادر ہوں' اس کے مرد کتنے بے خوف اور دلیر ہوں گے۔"

امتہ الحبیب نے بے باکانہ اور دلیرانہ انداز میں تیمور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"مجھے معلوم ہے تم نہایت سخت مزاج اور تند خو ہو' تمھارے ظلم کے حدود انتہائی وسعت پذیر ہیں' تمھیں اپنے مظالم کی وجہ سے اللہ کے نزدیک شدید ترین عذاب کا مستوجب گردانا جائے گا۔ تم نے بایزید کے ساتھ جنگ کر کے اسلامی فتوحات کی راہ میں جو رکاوٹیں پیدا کی ہیں اس کی تمھیں بہر حال سزا بھگتنا ہو گی۔

تیمور نے امتہ الحبیب کی یہ باتیں فراخ حوصلگی سے سنیں اور کہا:

"اے جرات مند خاتون! تو نے جو کچھ کہا وہ بالکل بجا اور صحیح ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میں بھی فاتح تھا اور بایزید یلدرم بھی۔ میرے لیے یہ برداشت کرنا مشکل تھا کہ اس دنیا میں دو فاتح ہوں۔ میں نے سوچا کہ دنیا کے باقی ماندہ حصوں کی طرف پیش قدمی کرنے سے پیشتر ہمیں پہلے آپس میں فیصلہ کر لینا چاہیے کہ فاتح کون ہے؟ جو جیت جائے گا وہی فاتح کہلانے اور مزید فتوحات کے لیے آگے بڑھنے کا مستحق ہو گا۔ لیکن اے بہادر خاتون! جو کچھ ہوا اسے اب نظر انداز کر دینا چاہیے۔ میرے دل میں تمھاری انتہائی عزت ہے اور میں بہادروں کی قدر کرنے کا عادی ہوں۔ جاؤ میں نے تجھے اور تیرے بہادر ساتھیوں کو جو تیرے ساتھ گرفتار ہو کر میرے قبضے میں آئے

ہیں' معاف کیا- اس قسم کے جاں بازوں کو قید میں رکھنا یا قتل کرنا بہادری اور شجاعت کی توہین ہے-"

تیمور کے یہ الفاظ سن کر امتہ الحبیب نے اسے سلام کیا اور اپنے گرفتار شدہ ساتھیوں سمیت بایزید کے لشکر سے جا ملی- اس کے جانے کے بعد تیمور کے دل میں کئی قسم کے خیال آئے اور مسئلے کے مختلف پہلوؤں کو موضوع فکر بنایا- آخر سلطان یزدانی کے پاس نکاح کا پیغام بھیجا' جو غور و فکر' کچھ تامل اور امتہ الحبیب سے مشورے کے بعد قبول کر لیا گیا-

دوسرے روز نکاح کی غرض سے تیمور گیارہ ہزار منتخب بہادر فوجیوں کو ساتھ لے کر جبل الطیر کے مقام پر پہنچا' جہاں یزدانی نے ایک بلند مقام پر وسیع خیمہ نصب کر رکھا تھا- قاضی نے نکاح پڑھایا اور تیمور نے چین کا علاقہ امتہ الحبیب کو حق مہر میں عطا کیا- یزدانی نے بھی بیٹی کو جہیز میں بہت کچھ دیا اور چند نصیحتیں کر کے رخصت کیا- امتہ الحبیب جوں ہی تیمور کے شاہی خیمے میں داخل ہوئی' اسے حمیدہ بانو بیگم کے نام سے پکارا جانے لگا-

حمیدہ بانو بیگم سے پہلے تیمور کی تین بیویاں اور تھیں- یہ اس کی چوتھی بیوی تھی- مگر تیمور کا زیادہ پیار اسی سے تھا- اس کی ایک وجہ اس کی بہادری اور جرات تھی- دوسری وجہ اس کا حسن و جمال تھا- تیسری وجہ اس کی اخلاقی پاکیزگی' شائستگی' بیدار مغزی' روشن دماغی اور فہم و فراست تھی- ان اوصاف نے نہ صرف تیمور کو بلکہ اس کی بیگمات اور دوسرے لوگوں کو بھی حمیدہ بانو کا فریفتہ اور مداح بنا دیا تھا- تیمور تمام معاملات میں اس سے مشورہ لیتا اور اس کی ہدایات پر عمل پیرا ہوتا تھا- یہ میدان جنگ میں مسلح ہو کر بڑے بڑے خطرناک مقامات پر اس کے ساتھ رہتی اور دشمن کے مقابلے میں بہادری و شجاعت کے جوہر دکھاتی-

جنگ و حرب اور جرات و شجاعت کے علاوہ حمیدہ بانو بیگم اور بھی متعدد خوبیوں کی مالک تھی- عربی' فارسی اور ترکی زبان پر اسے عبور حاصل تھا- چینی اور زرتشتی زبانوں

سے بھی باخبر تھی' فن موسیقی میں بھی ادراک رکھتی تھی' شعر و شاعری سے بھی لگاؤ تھا- ترکی اور عربی زبان میں اکثر شعر کہا کرتی تھی- الفاظ کی بندش' فقروں کی برجستگی اور مطالب کا خاص خیال رکھتی- اس کے اشعار' جنگ جو لوگوں کے بہادرانہ واقعات پر مشتمل ہوتے-

نظم و شعر کے علاوہ نثر میں بھی اس دور کے لوگوں پر فائق تھی- تیموری علاقوں کے مختلف حاکموں' والیوں اور عہدے داروں کے نام جو احکام اور فرامین جاری کیے جاتے' سب کے مسودے وہی تیار کرتی اور وہی انھیں آخری مشکل میں مرتب کر کے' ارسال کرتی اور سب تحریریں اپنے ہاتھ سے لکھتی- مختلف زبانوں میں حرم سرا کی خط و کتابت اور تیمور کی بیگمات کی تمام تر ڈاک کی ترسیل کی ذمہ داری اسی کے سپرد تھی- علاوہ ازیں تیمور کے حضور جو درخواستیں' عرض داشتیں' استغاثے' پیش ہوتے اور روزانہ حکومتی معاملات سے متعلق مختلف مقامات سے جو رپورٹیں آتیں' ان سب کے بارے میں احکام و تجاویز حمیدہ بانو بیگم ہی لکھتی اور جواب طلب امور کے ضروری جواب بھی وہی تحریر کرتی- اس کا اسلوب کلام اور طرز تحریر نہایت عمدہ تھا اور وہ فصاحت و بلاغت میں بڑی شہرت رکھتی تھی- خوش خلقی' متانت و سنجیدگی اور عقل و خرد میں بھی اس کا ایک مقام تھا- اپنے مفوضہ فرائض نہایت حسن و خوبی سے ادا کرتی اور تمام انتظامی امور بہترین نہج سے انجام دیتی-

کتب بینی اور مختلف علوم کے مطالعہ کا اسے بے حد شوق تھا- روزمرہ کے پیش آمدہ معاملات کو ضبط تحریر میں لانے کی عادی تھی- اس سلسلے میں اس کی تصنیف کردہ دو کتابیں قابل ذکر ہیں' جو اس نے اپنی یادداشت اور نوٹس کی مدد سے امیر تیمور کی وفات کے بعد اپنے زمانۂ قیام قسطنطنیہ کے دوران میں لکھی تھیں- ان کتابوں سے اس کی ذاتی قابلیت اور وسعت معلومات کا پتا چلتا ہے- ایک کتاب کا نام ترکی خواتین ہے اور دوسری کا تیمور کی فتوحات ہندیہ دونوں کتابیں در حقیقت اس کے ذاتی مشاہدات اور کثرت مطالعہ کا نچوڑ ہیں' اور ان میں وہ واقعات بہتر ترتیب کے ساتھ جمع کیے گئے ہیں

جو اسے جنگی اور انتظامی سفر کے دوران مختلف مقامات پر پیش آئے۔

ترکی خواتین کی تاریخ کے موضوع سے متعلق کتاب خاصی ضخیم ہے۔ اس میں شرفا اور مشاہیر ترکوں کی خواتین کی عادات و اطوار' طرز معاشرت' ان کے باہمی تعلقات' شوہروں کے ساتھ روابط' امور خانہ داری میں نظم و نسق' تہذیب و شائستگی' اخلاق و جذبات اور ان کے رسوم و رواج کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں اور وضاحت کی گئی ہے کہ ترک خواتین دوسری عورتوں سے کن کن معاملات میں منفرد اور ممتاز ہیں اور کن خصوصیات کی بنا پر دیگر ممالک کی خواتین پر فوقیت رکھتی ہیں۔

دوسری کتاب جو تیمور کی فتوحات ہند کے نام سے موسوم ہے' ایک عظیم الشان اور دلچسپ تاریخی دستاویز ہے۔ اس کے حصہ اول میں ان مورخین کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جنھوں نے تیمور کی ابتدائی دور کی فتوحات کو ظلم سے تعبیر کیا اور غیر نتیجہ خیز قرار دیا ہے۔ اس کتاب میں تیمور کی عادات' اخلاق' تمدنی و ملکی حالات اور عام طرز زندگی کی وضاحت کی گئی ہے۔ آخری حصے میں حمیدہ بانو بیگم نے مختصر طور پر خود اپنی تاریخ اور واقعات بیان کیے ہیں۔ ان دونوں کتابوں کا ترجمہ سب سے اول فرانسیسی زبان میں ہوا۔ اس کے بعد دوسری زبانوں میں بھی منتقل کی گئیں اور مقبول ہوئیں۔

حمیدہ بانو اور بھی بہت سے اوصاف کی مالک تھی۔ مثلاً زرہ بکتر بنانے میں بڑی ماہر تھی۔ تیمور معرکہ کارزار میں جو زرہ بکتریں استعمال میں لاتا' وہ سب اسی کی تیار کردہ تھیں۔

مذہب اسلام قبول کرنے کے سلسلے میں ایک مکتوب میں وہ زرتشتی مذہب کے ایک پیشوا کو وضاحت اور بے تکلفی سے لکھتی ہے:

"آپ کا مکتوب مجھے ملا۔ آپ نے میری تبدیلی مذہب اور موجودہ حالت کے بارے میں جس انداز سے اظہار خیال اور اظہار افسوس کیا ہے' حیران ہوں کہ اس کا کیا جواب دوں۔ آپ کا یہ لکھنا کہ میں امیر تیمور کی بیگم بننے کے بعد دائرہ اسلام میں داخل ہوئی قطعی غلط ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے

شہنشاہ تیمور کے عقد میں آنے سے پہلے ہی بلا کسی جبر واکراہ اور خوف و طمع کے محض اپنی مرضی سے اسلام قبول کر لیا تھا- البتہ یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ میں کیوں مسلمان ہوئی اور اسلام میں کون سی ایسی خوبی دیکھی جو اس درجہ قابل تعریف تھی کہ مجھے زرتشت کو چھوڑ کر اسلام سے وابستگی اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا- بات یہ ہے کہ یہ سوال بڑا ہی نازک ہے اور میں اس کے جواب میں علاوہ اس کے اور کچھ نہیں کہہ سکتی کہ میرا قلبی میلان خود بخود اسلام کی طرف ہو گیا اور آپ کو خوب معلوم ہے کہ دل پر کسی کا بس نہیں- آپ نے مجھ سے سوال کیا ہے کہ زرتشت کی محبت اور عزت میرے دل میں پہلے کی طرح موجزن ہے یا نہیں اور مذہب آتش پرستی کو میں کس نظر سے دیکھتی ہوں؟-"

"اس سوال کے جواب میں میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی میرے دل میں زرتشت کی عزت اور عظمت موجود ہے- میں مسلمان ضرور ہوں، لیکن کسی مذہب کی توہین اور مذمت کو قطعی غلط سمجھتی ہوں-"

حمیدہ بانو بیگم کے اس قسم کے خیالات کی وجہ سے بعض لوگ اس کے قبول اسلام کو مشتبہ قرار دیتے ہیں اور بعض مورخین اسے الحاد اور نیچری افکار کی حامل بتاتے ہیں لیکن ہمارے خیال میں یہ صحیح نہیں- شاید اس میں عملی کمزوریاں تو ہوں گی، مگر وہ مسلمان بہرحال تھی اور اخلاق و کردار، تواضع وانکسار، شرم وحیا، عفت وپاک دامنی اور شجاعت و بہادری میں وہ ممتاز تھی- علاوہ ازیں علوم وفنون سے بھی اسے انتہائی لگاؤ اور تعلق تھا- کسی مذہب کی عزت کرنے سے اس کے اسلام پر کوئی حرف نہیں آتا، کیونکہ اسلام اپنے ماننے والوں سے یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ وہ دوسرے مذاہب کی توہین کریں-

اس کی زندگی کے بعض واقعات نہایت تعجب خیز اور حیرت انگیز ہیں- یہ واقعات

بتاتے ہیں کہ یہ خاتون بڑی بڑی مشکلات برداشت کرنے کی خوگر تھی- اس ضمن میں ایک بہت بڑا اور انتہائی اہم واقعہ قلعہ اصطخر کی تسخیر کا ہے- یہ واقعہ تیمور کی زندگی میں پیش آیا اور حمیدہ بانو بیگم کے جرات مندانہ اقدام سے تیمور کو اس پریشانی سے نجات ملی- اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ قلعہ اصطخر کا گورنر شریف حسن تھا جو تیمور کی طرف سے اس پر متعین تھا- شروع میں یہ ایک بے ضرر آدمی معلوم ہوتا تھا' مگر اصطخر کا گورنر مقرر ہوتے ہی اس کے دل کی دنیا بدل گئی اور وہ فساد پر آمادہ ہو گیا- اس نے طے کر لیا کہ وہ تیمور کے ماتحت نہیں رہے گا اور اصطخر کے قلعے کو اپنا مستقل ٹھکانا بنا کر تیمور کے تمام مقبوضہ علاقوں کو فتح کرنے اور اپنی تحویل میں لینے کی سعی کرے گا' چنانچہ کچھ لوگوں کو اس نے اپنا ہم نوا بنایا اور تھوڑی سی طاقت فراہم کر کے بغاوت و خودسری پر اتر آیا اور قلعہ اصطخر پر قابض و مسلط ہو گیا-

چند روز کے بعد تیمور کو بھی تمام واقعات کا علم ہو گیا اور اسے پتا چل گیا کہ شریف حسن کی نیت کیا ہے اور اس سلسلے میں کون کون لوگ اس کے ساتھ ہیں- اس کی اس حرکت پر وہ سخت برافروختہ ہوا اور واقعات کی تفصیل سن کر اس کے تن بدن میں غصے کی آگ بھڑک اٹھی اور جنگ کا حکم دے دیا- حمیدہ بانو بیگم کو بھی سخت صدمہ پہنچا اور اس نے تیمور سے درخواست کی کہ وہ خود گورنر اصطخر کے مقابلے پر جائے گی اور شریف حسن کو اس کی سرکشی اور بغاوت کی پوری سزا دے گی- چنانچہ وہ بارہ ہزار تجربہ کار جوانوں کی فوج لے کر روانہ ہوئی اور وہاں پہنچتے ہی قلعے کا محاصرہ کر لیا- محاصرے کے بعد قلم اٹھایا اور شریف حسن کو درج ذیل مضمون پر مشتمل خط لکھا- ملاحظہ کیجیے خط کے الفاظ کتنے زوردار اور فیصلہ کن ہیں:

> ”شریف حسن! میں نے شہر کا محاصر کر لیا ہے' تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم نے بغاوت اور سرکشی کی جو آگ بھڑکائی ہے' وہ تمھارے لیے خطرناک ثابت ہو گی اور اس کے شعلے خود تمھیں اپنی لپیٹ میں لے لیں گے- میں تمھیں یقین دلاتی ہوں کہ اگر تم اب بھی اپنی سرکشی اور خودسری سے باز آ

جاؤ گے تو شہنشاہ تیمور کے نزدیک تمھاری وہی تعظیم و تکریم ہو گی جو اس سے پیشتر وفاداری کے زمانے میں تھی' اور اگر تم نے بعض مغرور اور نخوت پسند اشخاص کی شہ پر اس آگ کے شعلوں پر پانی نہ ڈالا بلکہ اس کو مزید بھڑکانے کی کوشش جاری رکھی تو خوب سمجھ لو کہ اس کا نتیجہ نہایت خوف ناک ہو گا اور تم بہت جلد اس کے تمام پہلوؤں سے باخبر ہو جاؤ گے -میں تمھیں صاف لفظوں میں بتا دینا چاہتی ہوں کہ تمھاری اور تمھارے مغرور ساتھیوں کی اکڑی ہوئی گردنیں توڑ کر زمین پر پھینک دی جائیں گی اور تمھارے بے سر جسم ہمارے بہادروں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے پاش پاش کر دیے جائیں گے- بے شک میں ایک عورت ہوں' جو تمھارے مقابلے کے لیے میدان میں اتری ہوں' لیکن یاد رکھ ارادے کی پکی اور عزم کی پوری ہوں- میں نے حتمی فیصلہ اور قطعی ارادہ کر لیا ہے کہ جب تک جسم میں روح اور تن پر سر باقی ہے لڑائی سے منہ نہ موڑوں گی اور تاوقتیکہ تمھاری اور تمھارے سرکش ساتھیوں کی نعشیں گھوڑوں کے سموں کے تلے کچلی ہوئی نہ دیکھ لوں تم سے بات نہ کروں گی- میں تمھیں یہ بھی بتا دوں کہ جہاں میں سخت دل ہوں وہاں نہایت رحم دل بھی ہوں- میں ہرگز نہیں چاہتی کہ مخلوق خدا کے خون سے اپنی تلوار کو رنگین کروں' اس لیے تم سے کہتی ہوں کہ اپنی اس غلط کاری اور عاقبت نااندیشی پر متنبہ ہو جاؤ اور سرکشی کا جو جال تم نے بچھا رکھا ہے اس کو خود اپنے ہاتھوں سے توڑ دو' کیونکہ تمھارا اور ہمارا اور اللہ کی مخلوق کا بھلا اسی میں ہے- اگر میں نے تلوار کمر سے کھول لی تو اس وقت تک اسے میان میں نہ ڈالوں گی جب تک تمھارے سر قلم نہ کر دوں-

والسلام-"

حمیدہ بانو بیگم کے اس خط سے شریف حسن حواس باختہ ہو گیا اور اس کے پاؤں تلے کی زمین کھسک گئی- اب وہ اس سوچ میں تھا کہ اس خط کا کیا جواب دیا جائے اور حمیدہ

بانو کو کس طرح خوش کیا جائے یا کم از کم حملے سے روکا جائے۔

شریف حسن فطری طور پر دھوکا باز اور فریبی شخص تھا۔اس کے کاروبار حکومت کی پوری عمارت دھوکے اور فریب کی بنیادوں پر استوار تھی۔اسے معلوم تھا کہ حمیدہ بانو بیگم بہادر ہونے کے باوجود بڑی رحم دل اور خدا ترس بھی ہے اور آسانی سے دھوکے کے جال میں پھنس جاتی ہے' چنانچہ اس نے اس خاتون کو فریب دینے کی ٹھانی اور مندرجہ ذیل مضمون پر مشتمل مکتوب لکھا۔اس نے انتہائی لجاجت سے تحریر کیا:

''میں آپ کا ادنیٰ غلام ہوں۔میری تمام ترقیاں آپ کی کرم فرمائیوں کا نتیجہ ہیں۔اگر آپ میری طرف نظر کرم نہ فرمائیں تو میری حیثیت بالکل ختم ہو جاتی ہے' میرا سر حاضر ہے' چاہے اسے تلوار سے کاٹ دیجیے چاہے اس پر تاج حکومت رکھ دیجیے۔خدا شاہد ہے نہ میں باغی ہوں نہ آپ کے خلاف بغاوت کا تصور کر سکتا ہوں اور نہ میں نے کبھی اس کی جرات کی ہے۔بعض اہم معاملات البتہ ایسے پیش آگئے ہیں جنھوں نے میرے متعلق آپ کے دل میں بغاوت کا احساس پیدا کر دیا اور میں حضور کی بارگاہ میں معتوب قرار پایا۔اگر اس عاجز سے کوئی ایسی بات سرزد ہوگئی ہے جو طبع عالی پر ناگوار گزری ہے تو میں بصد عجز معافی کا خواستگار ہوں۔یہ ادنیٰ غلام کبھی آپ کے حکم سے باہر نہ جائے گا اور حضور کے فرمان واجب الاذعان کو تسلیم کرنے سے ہرگز انکار کی جرات نہ کرے گا۔کل آپ کے لیے قلعہ اصطخر کا دروازہ کھول دیا جائے گا اور یہ غلام بھی دست بستہ حاضر خدمت ہوگا۔''

حمیدہ بانو بیگم چونکہ صاف دل کی مالک تھی اور مکر و فریب اور دجل و دغابازی سے اس کی لوح قلب پاک تھی اس لیے اس نے شریف حسن کے خلاف دل سے غصے اور بغض کو قطعی طور سے نکال دیا اور اس کے خط کو ایک صادق اور سچے انسان کے دل کی آواز سمجھا' حالانکہ یہ خط سراسر دھوکا دہی پر مبنی تھا اور شریف حسن نے ایک مکار اور فریبی کا روپ دھار کر یہ خط تحریر کیا تھا۔حمیدہ بانو بیگم یہ خط پڑھ کر نہایت خوش ہوئی

اور اس نے یہ سمجھا کہ یہ مشکل مسئلہ بغیر کسی لڑائی اور خون بہانے کے حل ہو گیا ہے اور اس فتح پر تیمور کے نزدیک میری قدر و منزلت پہلے سے زیادہ ہو جائے گی، لیکن افسوس اس کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی اور مسرت کی یہ گھڑیاں بہت جلد ختم ہو گئیں۔

مورخین نے لکھا ہے کہ حمیدہ بانو بیگم بہت بڑی جنگ جو اور معاملہ فہم و بہادر ہونے کے باوصف بہرحال ایک عورت تھی اور اپنی بے پناہ زیرکی کے باوجود بعض جنگی چالوں سے بے خبر تھی۔ لیکن ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ حمیدہ بانو بیگم حریف کی ان چالوں سے آگاہ تھی جو میدان جنگ میں دشمن کو زیر کرنے اور دھوکا دینے کے لیے عمل میں لائی جاتی ہیں مگر یہاں معاملہ مختلف تھا۔ یہاں کوئی معرکہ کارزار گرم نہ تھا بلکہ ابھی سلسلۂ مراسلت جاری تھا جس کی وجہ سے اسے دشمن کے دھوکے کا شکار ہونا پڑا۔

اب آگے چلیے ---!

رات تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی اور نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہو کا عالم تھا اور ہر سو خاموشی کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ حمیدہ بانو بیگم کے تمام فوجی جو طویل سفر کی وجہ سے تھکاوٹ سے چور تھے گہری نیند سو رہے تھے۔ تنہا حمیدہ بانو بیگم بیدار تھی۔ اس کا خیمہ چاروں طرف سے بند تھا اور وہ تیمور کو اس مضمون کا خط لکھ رہی تھی کہ شریف حسن بغیر کسی مزاحمت اور فوجی کارروائی کے ہار مان گیا ہے اور وہ کل قلعہ اصطخر کی کنجیاں میرے حوالے کر دے گا۔ اتنے میں گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں اسے سنائی دیں۔ اسے شبہ گزرا کہ شریف حسن نے مکاری سے کام لیا ہے اور وہ ہماری فوج پر شب خون مارنے کے لیے آگے بڑھ رہا ہے۔ اس نے تاریکی میں خیمے سے باہر جھانک کر دیکھا تو واقعی بہت بڑی فوج تیز رو گھوڑوں پر سوار اس کی طرف بڑھ رہی تھی اور اس کے پہرے دار بے فکر ہو کر گہری نیند سو رہے تھے۔ اس نے پہرہ داروں کو جگایا اور صورت حال کا پتا لینے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی انھوں نے عرض کیا کہ حضور! شریف حسن

مکار اور دغاباز ثابت ہوا ہے اور اس کی حملہ آور فوج آپ کے خیمے کے قریب پہنچ گئی ہے۔ حمیدہ بانو بیگم اس ناگہانی حملے پر پہلے تو کچھ پریشان ہوئی' لیکن جلد ہی حواس پر قابو پا کر اٹھ کھڑی ہوئی' مگر دشمن کی پیش قدمی اتنی تیز تھی کہ ابھی وہ ہتھیار سنبھالنے اور مسلح ہونے نہ پائی تھی کہ غنیم نے خیمے کا محاصرہ کر لیا اور حمیدہ بانو بے بس ہو کر رہ گئی۔ حمیدہ بانو کے لیے یہ وقت بڑا تشویش ناک تھا اور شدید خطرہ تھا کہ دشمن اس کو گرفتار کر لے گا' مگر اس نے ہمت نہ ہاری اور اسلحہ سے لیس ہو کر خیمے سے باہر نکل آئی۔ وہ بالکل تنہا تھی' کوئی معاون و مددگار نہ تھا۔ ایسے پر خطر وقت میں ہوش و حواس قائم رکھنا اور دشمن سے محفوظ رہنا بڑے سے بڑے بہادر اور شجاع کے لیے بھی انتہائی مشکل ہوتا ہے' لیکن اس جری اور دلیر خاتون کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی اور اس کی روایتی حمیت نے گوارا نہ کیا کہ وہ دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالے یا اپنی شکست کا اعتراف کرے یا کسی طرح اپنی جان بچا کر تو بھاگ جائے اور فوج کو موت کا لقمہ بننے کے لیے دشمن کے حوالے کر دے۔ اس نے پوری جرات سے دشمن کو للکارا۔

"دغاباز اور مکر و فریب کا تھیلا شریف حسن کہاں ہے؟ سامنے آ اور مقابلہ کر۔"

حمیدہ بانو بیگم کی للکار سن کر ایک نوجوان گھڑ سوار جو شریف حسن کا بڑا بیٹا تھا' آگے بڑھا اور گستاخانہ انداز میں بولا۔

"بیگم! تم ہماری دلیر فوج کے گھیرے میں آ چکی ہو۔ اب تمھارا جان بچا کر نکل جانا ممکن نہیں۔ صرف ایک صورت ہے جو تمھاری جان کی حفاظت کی ضامن ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ تم تیمور کے بجائے مجھے اپنا شوہر سمجھو۔ اگر تم اس پر رضامند ہو جاؤ تو ابھی محاصرہ اٹھا لیا جائے گا اور اصطخر کا قلعہ توقیر و تکریم کے ساتھ تمھارے حوالے کر دیا جائے گا۔"

یہ سن کر حمیدہ بانو بیگم غصے سے بے قابو ہو گئی۔ جذبات سے بے تاب ہو کر ترکش کی طرف ہاتھ بڑھایا" تیر نکال کر کمان میں جوڑا اور اس زور سے دشمن کی طرف پھینکا کہ وہ گھوڑے سے نیچے گرا اور مر گیا۔"

اب حمیدہ بانو بیگم کا حوصلہ بڑھ چکا تھا۔ اس نے اپنے حفاظتی دستے کو فاتحانہ شان سے پکارا۔ یہ تعداد میں کل پانچ سو تھے اور پریشانی و حیرانی کے عالم میں ادھر ادھر حمیدہ بانو بیگم کو تلاش کر رہے تھے۔ انھیں کچھ پتا نہ تھا کہ بیگم کہاں ہے اور کس عالم میں ہے۔ شور و ہنگامہ میں بیگم کی آواز ان تک نہ پہنچ سکی۔ دوسری آواز دینے کو تھی کہ شریف حسن بے شمار سپاہیوں کے ساتھ اس پر ٹوٹ پڑا۔ یہ صورت حال بیگم کے لیے نہایت تشویش ناک تھی۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری اور مقابلے کے لیے تیار ہو گئی۔ شریف حسن کا یہ اقدام انتہائی بزدلانہ تھا اور ایک مرد کا اتنی بڑی تعداد کے ساتھ ایک تنہا عورت پر حملہ آور ہونا باعث شرم تھا۔ لیکن شریف حسن دراصل حمیدہ بانو بیگم کو قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ اس کو زندہ گرفتار کرنے کا خواہاں تھا اور اس نے اپنی فوج کو بھی یہی حکم دے رکھا تھا کہ اسے زندہ گرفتار کیا جائے ورنہ اگر ارادہ اس کے قتل کا ہوتا تو اتنی بڑی فوج کے لیے یہ کام مشکل نہ تھا۔

اتنے میں بیگم نے دشمن کی فوج کے ایک دستے کو اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا تو گھوڑے کی باگ روک کر کھڑی ہو گئی' لیکن جب اس نے دیکھا کہ فوج اس پر حملہ نہیں کر رہی ہے تو فوراً سمجھ گئی کہ دشمن کے ارادے خطرناک ہیں اور وہ اسے قتل کرنے کے بجائے گرفتار کرنے کی تدبیریں سوچ رہا ہے۔ حمیدہ بانو اپنے چند ساتھیوں کی مدد سے دشمن پر حملہ کرنا چاہتی تھی کہ اس کے حفاظتی دستے نے آگے بڑھ کر شریف حسن کو گھیرے میں لے لیا' جوں ہی وہ پریشانی کی حالت میں پیچھے ہٹا حمیدہ بانو نے عقب سے دشمن پر حملہ کر دیا اور للکار کر کہا ہوشیار ہو جاؤ' بہت بڑی فوج میری مدد کو پہنچ گئی ہے۔ اب فریقین کے درمیان گھمسان کی جنگ ہونے لگی جو طلوع آفتاب تک جاری رہی۔ طرفین کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ خود حمیدہ بانو بیگم کو بھی کئی زخم آئے۔ مگر جنگ کا نتیجہ شریف حسن کے خلاف اور حمیدہ بانو بیگم کے حق میں نکلا۔

صبح کو جنگ ختم ہوتے ہی حمیدہ بانو بیگم اپنی باقی ماندہ فوج کو ساتھ لے کر وہاں سے چل کھڑی ہوئی اور تیس میل پیچھے ہٹ کر سلطانہ کے مقام پر آ رکی' جہاں زخموں

کا علاج کرایا اور چند روز کے بعد صحت یاب ہو گئی-اس شب خون میں حمیدہ بانو بیگم کے ساڑھے تین ہزار فوجی مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے' لیکن اس کے پاس سامان رسد اتنا زیادہ تھا کہ اب بھی وافر مقدار میں باقی تھا-اس اولوالعزم خاتون نے چند روز کے بعد پھر قلعہ اصطخر کا رخ کیا- قلعے سے سات میل کے فاصلے پر دشمن سے لڑائی ہوئی جو دس روز تک جاری رہی- آخر گیارھویں روز حمیدہ بانو نے قلعہ فتح کر لیا- شریف حسن میدان جنگ میں مارا گیا اور اس کے اہل و عیال گرفتار کر لیے گئے' مگر حمیدہ بانو بیگم نے ان کے ساتھ نہایت رحم دلانہ اور مشفقانہ سلوک کیا اور قلعہ اصطخر اپنی فوج کی تحویل میں دے کر خود تیمور کے پاس جا پہنچی-

حمیدہ بانو بیگم تیمور کی چوتھی بیوی تھی' دو بیویاں تو تیمور کی زندگی میں ہی وفات پا گئی تھیں' دو بیویاں اس کے بعد زندہ رہیں جن میں سے ایک کا نام حمیدہ بانو بیگم اور ایک کا فخر النساء بیگم تھا-

تیمور کا مرض جب زیادہ بڑھ گیا اور اس کی طبیعت بگڑنے لگی تو حمیدہ بانو بیگم گھبرائی ہوئی تیمور کے پاس آئی- اس کی حالت کا غور سے جائزہ لیا اور عرض کیا کہ میرے متعلق کیا حکم ہے؟ تیمور اس وقت عالم نزع میں تھا اور اس کے ہوش و حواس قائم نہ تھے-اس لیے خاموش رہا اور حمیدہ کے سوال کا کوئی جواب نہ دے سکا- تھوڑی دیر بعد جب طبیعت کو کچھ سکون محسوس ہوا اور حواس ٹھیک ہوئے تو اس کی طرف متوجہ ہوا اور کہا:

> ''حمیدہ بانو! میں اس وقت نزع کی حالت میں ہوں-یہ میری زندگی کا آخری وقت ہے- میں وصیت کرتا ہوں کہ میرے بعد تمھیں میری جگہ تخت حکومت پر متمکن کیا جائے-''

لیکن ہوا یہ کہ جب تیمور وفات پا گیا تو اس کا لڑکا میران شاہ (جو حمیدہ بانو بیگم کا سوتیلا بیٹا تھا) حکومت کے دعوے دار کی صورت میں میدان میں نکل آیا اور حمیدہ بانو کے ساتھ معرکہ آرا ہو' فریقین کے درمیان خوں ریز جنگ ہوئی جس کا نتیجہ میران

شاہ کے حق میں نکلا اور اسے بادشاہ بنالیا گیا' مگر اس کے بعد یہ خاتون وہاں سے چلی گئی اور شہر طفلس میں اقامت گزیں ہو گئی' جاتے ہوئے بہت سا مال و زر اور ساز و سامان ساتھ لے گئی۔

تیمور کا انتقال انزار نامی شہر میں ہوا تھا جو سمرقند سے چھتیس میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ وہ اسی شہر میں بیمار ہوا اور اسی میں وفات پائی۔ اس کا مقبرہ سمرقند میں ہے۔ تیمور نے ۳۶ برس حکومت کی اور وہ ۸۰۷ھ (۱۴۰۵ء) میں ۷۱ برس عمر پا کر فوت ہوا۔ اس کی تاریخ ولادت' تاریخ حکومت اور تاریخ وفات درج ذیل رباعی میں بیان کی گئی ہے۔

سلطان تمر آنکہ مثل اوشاہ نبود
در ہفت صدوسی و شش آمد بوجود
در ہفت صد و ہفتا دو یکے کرد جلوس
در ہشت صد و ہفت کرد عالم پدرد

حمیدہ بانو بیگم کے بطن سے تیمور کے سات بچے پیدا ہوئے' لیکن ان میں سے زندہ کوئی بھی نہ رہا اور وہ سب شیر خواری کی حالت میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ تیمور کی وفات کے بعد وہ بالکل تنہا تھی۔ اس کا ایک بچہ بھی نہ تھا جس سے دل بہلا سکتی اور نہ کوئی ایسا مشغلہ ہی تھا جو اسے اپنی طرف متوجہ کیے رکھتا۔ چند مہینے پہلے وہ دنیا کے عظیم بادشاہ کی ملکہ تھی اور تمام کاروبار حکومت اس کے اشاروں پر چلتا تھا۔ لیکن اب اس کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ اس وحشت انگیز تنہائی میں اس نے کتابوں کو اپنا رفیق بنایا۔ وہ اس دور کے علم و فن کی تمام اصناف میں ماہر تھی اور اس عہد کا کوئی شخص اس باب میں اس کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا' لیکن حکومت و سلطنت کی مصروفیات نے اس کی توجہ دوسری طرف مبذول کرا دی تھی۔ تیمور کی وفات کے بعد اس نے کتابوں کے مطالعہ کو اپنی دلچسپیوں کا مرکز بنالیا تھا۔

حمیدہ بانو جس طرح تیمور کی زندگی میں پردہ نہیں کرتی تھی اور کھلے چہرے ہر

جگہ آتی جاتی تھی' اس کی وفات کے بعد بھی اس نے یہی انداز قائم رکھا اور پردے کو غیر اہم سمجھا-وہ گھوڑے پر سوار ہوتی اور بلا تکلف پوری آزادی کے ساتھ باغوں' جنگلوں اور بازاروں کی سیر کرتی اور اس ضمن میں لوگوں کی چہ میگوئیوں کو کوئی اہمیت نہ دیتی-

وہ بہت بڑی خاتون تھی-اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ متعدد بڑے لوگوں نے جو میران شاہ کی حکومت سے مطمئن نہ تھے' اس کو پیغام بھیجے کہ آپ حکم دیں تو ہم میران شاہ کے خلاف بغاوت کر کے اور اسے قتل کر کے تیمور کی وصیت کے مطابق آپ کو سربراہ سلطنت بنانے کو تیار ہیں-ملک کی اہم شخصیتیں میران شاہ کو پسند نہیں کرتیں اور وہ اس سے بیزار ہیں' آپ کا ادنیٰ اشارہ ہمارے لیے کافی ہے اور آپ کی بادشاہت کے لیے میدان صاف ہے-

مگر حمیدہ بانو بیگم نے ان کو صاف لفظوں میں جواب دیا کہ میں حکومت و سلطنت کے معاملات کو ترک کر کے مطالعہ کتب کو ترجیح دیتی ہوں- آپ لوگ اگر دین اور دنیا کی کامیابی کے متمنی ہیں تو اس شر و فساد کو دل سے نکال دیں اور وفاداری اور دیانت کے ساتھ اپنے موجودہ حکمران کی اطاعت کریں-

حمیدہ بانو بیگم کئی سال طفلس میں مقیم رہی-وہاں کا ماحول اسے بہت پسند تھا اور وہ وہیں زندگی بسر کرنا چاہتی تھی-وہاں اس نے مستقل رہائش کی غرض سے کوہ کری پر ایک رفیع الشان اور خوشنما عمارت بھی بنالی تھی- مگر اچانک حالات نے پلٹا کھایا اور اس کے متعلق بعض ایسی نفرت انگیز خبریں مشہور ہوئیں کہ جنھوں نے اس کے ذہنی سکون کو تہہ و بالا کر ڈالا اور اس کے لیے وہاں رہائش رکھنا ناممکن ہو گیا' چنانچہ اس نے طفلس کو خیر باد کہا اور بالحوم کو اپنا مسکن بنالیا- بالحوم میں بھی ایسے حالات پیدا ہوئے کہ وہ وہاں بھی قیام نہ کر سکی اور قسطنطنیہ چلی گئی اور وہیں اس کا انتقال ہوا-

حمیدہ بانو بیگم نویں صدی ہجری اور پندرھویں صدی عیسوی کی بہادر خاتون تھی-اس کا انتقال ۶۱ برس کی عمر میں ہوا-وفات کے وقت وہ بالکل خالی ہاتھ تھی-مال وزر اور نقد و جنس میں سے کچھ بھی اس کے پاس نہ تھا-اس نے اپنی تمام دولت جمع کتب

پر صرف کردی تھی' چنانچہ جب وہ فوت ہوئی تو اس کے پاس ایک بہت بڑا کتب خانہ تھا جو مرتے وقت اس نے وقف کر دیا تھا- یہ کتب خانہ اگرچہ مختلف علوم کی بے شمار کتابوں پر مشتمل تھا' تاہم اس میں علم ہیئت اور تاریخ کے موضوع سے متعلق کتابیں زیادہ تھیں-

حمیدہ بانو بیگم زیادہ عرصہ بیمار نہیں رہی- اسے صرف تین روز معمولی بخار ہوا اور چوتھے روز روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی- انا للہ وانا الیہ راجعون-

آغا بیگی

امیر تیمور کی پوتی اور مرزا میران شاہ کی بیٹی آغا بیگی نہایت روشن دماغ، عالی ہمت اور پر مغز خاتون تھی، عمل و کردار اور عادات و اطوار کے لحاظ سے مستورات میں اس کا بڑا شہرہ تھا۔ اسے علوم سے غیر معمولی تعلق تھا اور فطرتاً بڑی نیک، متین اور حلیم الطبع تھی۔ اس میں ایک خوبی یہ تھی کہ دنیا کے عظیم الشان بادشاہ کی پوتی اور بہت بڑے حکمران کی بیٹی ہونے کے باوجود فخر اور غرور سے اس کا دل خالی تھا، شوخی اور بے باکی اس میں نام کو نہ تھی۔ اس کا زیادہ وقت خاموشی میں گزرتا تھا۔ اس کی تمام سہیلیاں اور ملازمائیں اس کے اثر اور تربیت کی وجہ سے خاموشی کو ترجیح دیتی تھیں۔ اس کی مجلس میں کسی کو ضرورت سے زیادہ بات کرنے اور اونچا بولنے کی اجازت نہ تھی۔

آغا بیگی انتہا درجہ کی مخیر اور فیاض بھی تھی۔ اس کا معمول تھا کہ صبح و شام کنیزوں اور ملازموں کے ذریعے محتاجوں، غریبوں، مسکینوں، بیواؤں، یتیموں اور مسافروں کو بلاتی اور دل کھول کر خیرات کرتی۔ کہتے ہیں کئی ہزار روپے روزانہ اسے اپنے باپ مرزا میران شاہ کی طرف سے ملتے تھے اور وہ سب اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتی تھی۔ اس میں ایک خوبی یہ تھی کہ کثرت سے قرآن پاک کی تلاوت کرتی، ملازموں اور خادماؤں کو بھی تاکید کرتی کہ وہ بہ کثرت قرآن پڑھا کریں۔

آغا بیگی عہد طفولیت سے نکل کر عالم شباب میں داخل ہوئی اور انیس سال کی عمر میں پہنچی تو بہت سے شہزادوں اور امیروں نے نکاح کے پیغام بھیجے، لیکن اس نے سب کے پیغام رد کر دیے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی ایسے شخص کے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جائے جو اس کی طبیعت سے واقف نہ ہو اور خطرہ ہو کہ وہ اس کے عمل کی متعین کردہ راہ میں رکاوٹ پیدا کرے گا۔

خاندان تیموریہ اور شرفائے جرجانیہ میں سے ایک شخص سعد وقاص تھا' جو نہایت باوقار' بلند حوصلہ اور شریف النفس تھا اور امرائے جرجانیہ میں بدرجہ غایت عزت واحترام کا مالک تھا۔ اس خاندان میں یہ شخص عدیم النظیر تھا۔ عالم وفاضل بھی تھا اور فصیح وبلیغ بھی' فیاض وغنی بھی تھا اور بہادر وجری بھی۔ کئی خوبیوں کا جامع اور بہت سے فضائل وکمالات کا حامل تھا۔ اس نے بھی آغا بیگی کو نکاح کا پیغام بھیجا اور اس نے فوراً منظور کر لیا' کیونکہ اس کے اوصاف ومحاسن سے آغا بیگی اچھی طرح آگاہ تھی اور وہ اسی قسم کے شخص کے عقد میں آنے کی خواہاں تھی۔ سعد وقاص سے اس کی شادی اگرچہ دھوم دھام سے ہوئی اور لڑکے اور لڑکی والوں نے انتہائی مسرت اور خوشی کا اظہار کیا' تاہم شادی کی یہ تقریب خاندان کی دوسری شادیوں کی بہ نسبت سادہ طریق سے ادا کی گئی تھی۔

آغا بیگی کی شادی کے تھوڑے عرصے بعد اس کا باپ مرزا میران شاہ جوانی کے عالم میں یعنی کل اکتالیس برس کی عمر میں وفات پا گیا۔ آغا بیگی کو اس کا نہایت صدمہ ہوا اور وہ رنج وغم کی شدت سے بے حال ہو گئی۔ زندگی میں اس کو یہ پہلا صدمہ پہنچا تھا جو انتہائی شدید تھا۔ اس صدمے نے اس کی حالت پر بڑا اثر ڈالا اور وہ بے حد مغموم رہنے لگی۔ مرزا میران شاہ کی موت کا باعث یہ ہوا کہ جب اس نے تبریز کے اطراف وجوانب پر حملہ کیا تو ایک شخص قرہ یوسف ترکمان اس کے مقابلے پر اترا اور اس نے اس کے حملے کو روکا۔ فریقین کے درمیان شدید جنگ ہوئی اور سخت خوں ریزی کے بعد مرزا میران شاہ جو خود میدان جنگ میں موجود اور لڑائی میں شریک تھا' قرہ یوسف ترکمان کے ایک فوجی کی تلوار سے مارا گیا۔

۸۱۸ھ (۱۴۰۶ء) میں جب قرہ یوسف ترکمان نے تیموری سرحدات پر یلغار کی اور تیمور کے بعض علاقوں کو غارت گری سے نیست ونابود کر دیا تو ایک شخص جس کا نام بسطام تھا اور مرزا شاہ رخ کی طرف سے قلعے کا حکمران تھا' قلعہ چھوڑ کر بھاگ گیا اور قرہ یوسف ترکمان کے خوف سے فرار ہو کر پناہ کی غرض سے سعد وقاص کے پاس چلا

گیا' لیکن سعد وقاص کو اس پر شبہ گزرا اور اسے گرفتار کر کے قید خانے میں بھیج دیا۔ جب مرزا شاہ رخ کو اس کا پتا چلا تو وہ غصے سے آگ بگولا ہو گیا اور اس نے اسی وقت سعد وقاص کے نام فرمان جاری کیا کہ بسطام کو فوراً قید خانے سے باہر نکال دو اور سرکشی و بغاوت کی اس آگ کو جو تم میرے امیر کو گرفتار کر کے بھڑکانا چاہتے ہو' یہیں دبا دو ورنہ اس کا انجام اچھا نہ ہو گا اور تمھیں وہی سزا دی جائے گی جو ایک باغی اور سرکش کو دی جاتی ہے۔ یہ فرمان نہایت سخت تھا اور سعد وقاص ایک تیموری حکمران سے جس کی بھتیجی اس کے عقد میں تھی' اس کی ہرگز توقع نہیں رکھتا تھا' اس نے شاہ رخ کے اس فرمان پر عمل کرنے کے بجائے یہ کیا کہ بسطام کو ساتھ لیا اور تبریز روانہ ہو گیا۔ اس واقعہ پر تھوڑے دن گزرے تھے کہ قرہ یوسف نے عراق عجم پر حملہ کر دیا' وہاں بسطام قید میں تھا' اسے بھی رہا کیا اور اس کے علاوہ بہت حد تک غارت گری بھی کی۔

قرہ یوسف نے اس موقعے پر ایک گہری چال چلی اور وہ یہ کہ بسطام کے لڑکے کو جس کا نام اخی فرخ تھا' ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ حتم روانہ کیا تاکہ وہ آغا بیگی کو تبریز لے کر آئے۔ آغا بیگی ان دنوں حتم کے مقام پر قیام پذیر تھی۔ قرہ یوسف نے اخی فرخ سے کہا تھا کہ وہ آغا بیگی سے کہے کہ سعد وقاص نے اسے بلایا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ تم فوراً تبریز پہنچ جاؤ۔ اس سے اس کا مقصد آغا بیگی کو پریشان کرنا اور اس سزا کا بدلہ لینا تھا جو سعد وقاص نے بسطام کو گرفتار کر کے دی تھی' لیکن آغا بیگی نہایت زیرک اور عالی فہم خاتون تھی' وہ بہت جلد اصل معاملے کی تہہ تک پہنچ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ قرہ یوسف اس کے خاندان کا دشمن ہے اور اس کے شوہر سے شدید عداوت رکھتا ہے' اس نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی ہے' بسطام کو چونکہ میرے شوہر نے گرفتار کیا تھا' اب اس کو موقع ملا ہے اور اس نے مجھے ذلیل کرنے کی ٹھان لی ہے' لہٰذا مجھے اس کے لڑکے کی بات نہیں ماننی چاہیے اور اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے یہیں رہنا چاہیے' چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے والد مرزا میران شاہ کے قتل کا باعث بھی یہی شخص ہے۔

آغا بیگی جو نہایت دانش مند عورت تھی' اس مسئلے پر لڑائی کے لیے تیار ہو گئی اور اس نے اخی فرخ کے ساتھ جانے سے قطعی انکار کر دیا اور ساتھ ہی اپنے غلاموں' ملازموں اور کنیزوں کو حکم دیا کہ ان لوگوں کے ساتھ نبرد آزما ہونے کے لیے مسلح ہو جائیں' چنانچہ چند ثانیوں کے بعد معرکہ کارزار گرم ہو گیا اور آغا بیگی اس بدنیت فوج کے ساتھ لڑنے لگی- کافی دیر تک پہلے دونوں فریق ایک دوسرے پر تیر برساتے رہے' پھر معاملہ تلوار اور نیزے تک پہنچ گیا- دوسرا فریق پوری طرح مسلح تھا اور لڑائی کے لیے تیار ہو کر آیا تھا' مگر آغا بیگی اس سے بے خبر تھی اور پہلے سے جنگ کے لیے تیار نہ تھی- مگر اپنے باپ کے ساتھ کئی معرکوں میں شریک رہ چکی تھی اور لڑائی کے نشیب و فراز سے آگاہ تھی' اس نے اس اچانک لڑائی کا خیر مقدم کیا اور پوری قوت سے بغیر کسی بیرونی امداد کے دشمن پر ٹوٹ پڑی' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے اخی فرخ اور اس کے لشکر پر فتح پائی اور نہایت کامیاب رہی- اخی فرخ مقابلے سے عاجز آگیا اور میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا-

کئی دنوں کے بعد مرزا شاہ رخ کو اس جنگ اور اس کے انجام کی اطلاع ہوئی تو اس نے انتہائی مسرت کا اظہار کیا- ادھر آغا بیگی نے دشمن کے بڑے بڑے بہادروں اور جنگ آزماؤں کے سر قلم کر کے مرزا شاہ رخ کی خدمت میں بھیجے اور خط کے ذریعے جنگ کی تفصیلات سے مطلع کیا- مرزا شاہ رخ نے آغا بیگی کے خط کا بہترین الفاظ میں جواب دیا اور اس کی شجاعت و دلیری کی ازحد تعریف کی-

کہتے ہیں مرزا شاہ رخ نے اس جنگ میں فتح کی خوشی میں آغا بیگی کو مبارک باد کا جو خط تحریر کیا تھا' اس کا عنوان عربی کا یہ شعر تھا-

ولو کان النساء بمثلها
لفضلت النساء علی الرجال

یعنی اگر تمام عورتیں اس عورت جیسی ہوں تو عورتیں مردوں پر فوقیت حاصل کر لیں-

بادشاہ بیگم

اورنگ زیب عالم گیر کی بیٹی اور محمد اعظم کی حقیقی بہن بادشاہ بیگم قرآن' حدیث فقہ اور دیگر علوم مروجہ پر عبور رکھتی تھی -اس کا زیادہ وقت تلاوت قرآن اور زہد و عبادت میں صرف ہوتا تھا- حلم و بردباری' عقل و دانائی' عزم و ہمت' عالی حوصلگی' فیاضی' فہم و فراست اور حزم و احتیاط اس کے اہم اوصاف تھے- سادہ مزاجی' عجز و انکساری اور غربا پروری' اس کے وہ جوہر تھے' جنھوں نے اس کو سب سے ممتاز کر دیا تھا-

بادشاہ بیگم دلرس بانو کے بطن سے پیدا ہوئی تھی-اورنگ عالم گیر ہندوستان کا وہ بادشاہ تھا جو مذہب سے بدرجہ غایت تعلق رکھتا تھا-اس نے اپنی اولاد کو بھی مذہبی تعلیم دلائی اور ان کی تربیت کی طرف کامل اعتنا کیا-اس نے بادشاہ بیگم کو بھی مذہبی اور دینی تعلیم سے روشناس کرایا' اس نے پانچ برس کی عمر میں حصول تعلیم کا سلسلہ شروع کیا- چونکہ حد درجہ ذہین اور طباع تھی لہذا بہت کم عرصے میں بہت کچھ پڑھ لیا اور تہذیب و شائستگی کے فرازوں پر پہنچ گئی' کم سن بچی کی ذہانت و فطانت سے عالم گیر خوش بھی ہوتا تھا اور انتہائی تعجب کا اظہار بھی کرتا تھا-اس نے اس کے اتالیق کو بے پناہ انعام و اکرام سے نوازا-

بادشاہ بیگم جب کچھ بڑی ہوئی اور تعلیم کے میدان میں آگے بڑھی تو ایک معلم کو جو خاصا عمر رسیدہ تھا اس کی اعلیٰ تعلیم پر مقرر کیا گیا-اس عالم نے محنت اور توجہ سے اس کو تعلیم دینے کا فریضہ سرانجام دیا-اس دوران میں عربی زبان اور بہت سے علوم و فنون میں اس نے مہارت پیدا کر لی-

قرآن و حدیث اور فقہ کی تکمیل کے بعد شہزادی نے ہیئت' ریاضی اور فلسفہ وغیرہ علوم کی طرف عنان توجہ مبذول کی اور ان میں کمال حاصل کیا- یہ وہ خشک اور

مشکل علوم ہیں۔ جن کے اہم اور دقیق مقامات کو سمجھنے کے لیے بڑے بڑے علما اور ماہرین فن اس کی طرف رجوع کرتے اور وہ تمام مشکل مقامات کی گرہیں نہایت آسانی سے کھول دیتی۔

شعر و شاعری سے بھی اسے لگاؤ تھا اور اس باب میں طبیعت موزوں پائی تھی۔ عربی اور فارسی اشعار اور قصائد کہنے میں بہت تیز تھی۔ زبان شعر بہت عمدہ تھی۔ اس میں کمال یہ تھا کہ سنگلاخ زمین میں روانی سے شعر کہتی تھی۔ ایک مرتبہ عالم گیر کسی مہم سے فتح یاب ہو کر واپس آیا تو تمام شعرائے دربار نے تہنیت و تبریک کے قصائد لکھے' قصر بادشاہی کی خواتین و بیگمات کے اصرار پر بادشاہ بیگم نے بھی چند اشعار پر مشتمل ایک قصیدہ لکھا جو بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ بادشاہ نے یہ قصیدہ پڑھا تو بہت خوش ہوا اور اسے بڑی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا' لیکن جس کاغذ پر یہ قصیدہ تہنیت مرقوم تھا اس کی پشت پر یہ الفاظ لکھ کر بیٹی کو واپس کر دیا۔

پیاری بیٹی میں نے تمھارا قصیدہ غور سے پڑھا' تم مبارک باد کی مستحق ہو کہ اس درجہ بہتر اور عمدہ شعر کہتی ہو' تمھاری زبان بہت اچھی ہے اور حشو و زوائد سے پاک ہے' لیکن میں نصیحت کرتا ہوں کہ شعر و شاعری کا دھندا چھوڑ دو۔ یہ اگرچہ مایہ ناز فن ہے اور میں جانتا ہوں کہ اشعار بعض مواقع پر وہ کام کر جاتے ہیں جو اور کسی طریقے سے نہیں ہو سکتا' لیکن یہ موضوع معزز اور اصحاب احترام لوگوں کو زیب نہیں دیتا۔ اس میں ایک قباحت یہ ہے کہ اس سے تعلق رکھنے والا عام طور پر اسی کو اپنی دلچسپیوں کا مرکز بنا لیتا ہے اور دیگر ضروری امور کو نظر انداز کر کے شب و روز اسی میں مشغول رہتا ہے۔ تم قرآن و حدیث اور فقہ سے تعلق رکھو' باقی چیزوں کو ترک کر دو۔

اس کے بعد بادشاہ بیگم نے شعر و شاعری سے توبہ کی اور علوم دینیہ سے وابستگی اختیار کر لی۔ اس نے ہیئت' ریاضی اور دوسرے علوم سے بھی قطع علائق کر لیا' کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ ان علوم میں انہماک دینی علوم سے انقطاع کا باعث بنے گا۔

عالم گیر کی ایک اور بیوی نواب بائی تھی۔ اس کے بطن سے اس کی لڑکی بدر النسا

تھی جو قریب قریب بادشاہ بیگم کی ہم عمر تھی- عالم گیر نے دوسری لڑکیوں کی طرح اس کی تعلیم و تربیت کا بھی پورا اہتمام کیا' لیکن یہ ذہانت و فطانت اور تعلیم میں بادشاہ بیگم سے کم تر تھی- بادشاہ کبھی کبھی دونوں لڑکیوں کو بلا کر ان کا امتحان لیتا تو بادشاہ بیگم اس کی نسبت کامیاب رہتی اور اسے انعام و اکرام سے نوازتا اور اس کی تعریف کرتا- اس سے قدرتاً نواب بائی کو ذہنی کوفت ہوتی اور وہ بادشاہ سے شکوہ کرتی کہ آپ میری اولاد کے مقابلے میں دلرس بیگم کی اولاد کو ترجیح دیتے ہیں اور اس کی تعریف میں بہتر الفاظ استعمال فرماتے ہیں- لیکن عالم گیر چونکہ مذہبی خیالات کا حامل تھا اور تمام بیویوں اور ان کی اولاد کو برابر سمجھتا تھا لہٰذا نواب بائی کے اس شکوے سے اسے ٹھیس پہنچتی- اس سے بچنے کے لیے وہ دونوں ہم عمر بیٹیوں کو جو دو مختلف بیویوں کے بطن سے تھیں' نواب بائی کی موجودگی میں بلاتا اور ان سے مختلف علمی سوالات کرتا' لیکن ہر مرتبہ بادشاہ بیگم فائق رہتی اور باپ سے انعام پاتی-

بادشاہ بیگم جس طرح علوم و فنون میں درجہ کمال پر فائز تھی' اسی طرح عادات و اخلاق میں بھی اس دور کے شاہی خاندان کی کوئی خاتون اس کی ہم پایہ نہ تھی- وہ باقاعدگی سے تہجد پڑھتی تھی اور عبادت و ریاضت میں مصروف رہتی تھی- عفو و کرم' غربا و مساکین کا خیال' تیموں کی خبر گیری' بیوگان کا احترام' اہل علم کا اکرام اور معاشرے کے کم حیثیت لوگوں کی دیکھ بھال اس کے وہ اوصاف تھے جن میں دیگر خواتین اس سے پیچھے تھیں- علاوہ ازیں وہ سادہ زندگی بسر کرتی اور اسراف و تبذیر اور فضول خرچی سے دامن بچا کر رکھتی تھی- اس کے لباس اور عام معاشرت کا انداز ایک عام عورت کا سا تھا- وہ شوخی و طراری اور فخر و غرور سے متنفر تھی اور اس کے یہی خصائل و اطوار تھے جن کی بنا پر اسے قبولیت عامہ کی سند حاصل ہو چکی تھی- اس کے گفتار و معمولات اور رہن سہن سے قطعاً اندازہ نہ ہوتا تھا کہ یہ دنیا کے عظیم الشان بادشاہ کی بیٹی ہے' بلکہ یہی مترشح ہوتا تھا کہ یہ دنیا کے علائق و لوازم سے پاک' خدا ترس اور نیک و متدین خاتون ہے-

بادشاہ بیگم چونکہ علم و فضل کی گود میں پلی بڑھی تھی اور خود بھی عالمہ تھی' اس لیے علما و زہاد کی خصوصیت سے قدر کرتی اور انھیں عطیات و تحائف سے نوازتی تھی۔ عالم گیر کے قریبی حلقے کے ایک شخص زاہد خاں کا بیٹا فیض اللہ خاں اس دور کا بہت بڑا عالم و فاضل تھا' اور ساتھ ہی زہد و اتقا میں عدیم المثال تھا' اس کے علم کی وجہ سے بادشاہ بیگم اس کا بہت احترام کرتی تھی۔۔ اپنے عطاے غیر مجذود سے اس کو اس نے مالا مال کر دیا تھا۔

فیض اللہ خاں پر ایک دور آیا کہ بالکل تارک الدنیا ہو گیا اور آبادیوں سے منہ موڑ کر جنگلوں اور صحراؤں میں گھومنے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی جنگلی اور صحرائی جانوروں اور پرندوں سے محبت ہو گئی۔ بڑے بڑے سرکش اور خودسر جانور اس کے سامنے رام ہو گئے' جس جانور کو جی چاہتا پکڑ لیتا اور جہاں چاہتا لے جاتا۔ ایک مرتبہ بادشاہ بیگم نے اس کا دل بہلانے کے لیے بے شمار روپیہ خرچ کر کے بہت سے جانور فراہم کیے جو اس کے سامنے پیش کیے گئے۔ اس پر مجذوبانہ سی کیفیت طاری ہو گئی تھی' جس نے آخر میں مخبوط الحواسی کی شکل اختیار کر لی اور پھر اسی حالت میں وفات پا گیا۔ بادشاہ بیگم نے اس کی قبر پر شان دار مقبرہ تعمیر کیا اور اس کے ایصال ثواب کے لیے بہت سا روپیہ غربا اور مستحقین میں تقسیم کیا۔

روشن آرا بیگم

مغلیہ خاندان میں روشن آرا بیگم کو بعض خصوصیات کی بنا پر نہایت عزت واکرام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا-یہ ہندوستان کے مشہور بادشاہ شاہ جہان کی بیٹی اور اورنگ زیب عالم گیر کی بہن تھی-یکم رمضان المبارک ۱۰۲۶ھ (ستمبر ۱۶۱۷) کو پیدا ہوئی-یہ خاتون خصائل حمیدہ اور شمائل پسندیدہ کی حامل تھی-اس کے باپ شاہ جہان کا سلسلہ نسب دس واسطوں سے امیر تیمور تک پہنچتا ہے-روشن آرا بیگم اپنی معاملہ فہمی اور روشن ضمیری کے باعث اورنگ زیب کے نزدیک بہت وقعت رکھتی تھی اور وہ تمام اعزہ واقارب پر اسے فوقیت دیتا تھا-سلطنت کے بہت سے بنیادی امور میں اس کے مشورے کو اہمیت دی جاتی تھی-یہ حسن ظاہری سے بھی متصف تھی اور حسن باطنی سے بھی-

شاہ جہان ملکی و خاندانی معاملات میں اس سے مشورے لیتا تھا-اس سلسلے میں اورنگ زیب عالم گیر بھی باپ کے نقش قدم پر چلا-اس نے روشن آرا کو وہی مقام عطا کیا جو اسے باپ کے زمانے میں حاصل تھا-

۱۰۷۰ھ (۱۶۶۰) کا زمانہ اورنگ زیب عالم گیر کے لیے پریشانی اور ذہنی کوفت کا زمانہ تھا-اس سال وہ راجہ کرن کی مہم پر روانہ ہونے کے لیے پر تول رہا تھا-اس مہم پر روانہ ہونے سے پہلے اس نے حسب معمول امراو وزرا اور فوجی افسروں کا دل بڑھانے کے لیے بہت بڑی تقریب کے انعقاد کا اہتمام کیا-مہم کی اہمیت کے پیش نظر مدعوین کی فہرست بڑی وسیع تھی اور اس میں تمام جان نثاران سلطنت اور بہی خواہان مملکت کو دعوت شرکت دی گئی تھی-جب اس عظیم الشان تقریب کے انتظامات مکمل ہوگئے اور سامان جشن کلی طور پر فراہم کر لیا گیا تو اورنگ زیب تخت حکومت پر جلوہ افروز ہوا

اور تمام ارکان دولت' اصحاب منصب اور اہل دربار حسب مراتب اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے- سب نے شاہانہ طریق سے بادشاہ کو ہدیہ تبریک پیش کیا اور بادشاہ کی درازی عمر کے لیے دست بدعا ہوئے اور اللہ کے حضور فتح و کامرانی کی التجا کی- بادشاہ نے جواب میں حاضرین کو ان کے منصب کے مطابق خلعت خاص اور انعامات گراں بہا سے نوازا- اس موقعے پر اس کی یہ بہن بھی جو ظاہر ہے بہن ہونے کی وجہ سے بادشاہ کی سب سے زیادہ خیر خواہ اور اس کی فتح کے لیے مخلص تھی' حاضر دربار ہوئی اور اللہ کے حضور دعاے خیر کے لیے ہاتھ اٹھائے- بادشاہ بہن کی دعا اور دربار میں تشریف آوری سے نہایت خوش ہوا اور دو ہزار اشرفیاں نذر کیں جو اس سراپا سخاوت خاتون نے اسی وقت غربا و مساکین میں تقسیم کر دیں اور ان غربا سے بھی جو اپنی خستہ حالی اور غربت و مسکنت کی وجہ سے دربار میں نہیں جا سکتے تھے' اس مہم میں بھائی کی فتح کے لیے درخواست دعا کی- چنانچہ ان لوگوں نے نہایت عاجزی سے دعا کی اور اورنگ زیب کے لیے اللہ کی نصرت و اعانت کے لیے ملتجی ہوئے- اس موقعے پر روشن آرا بیگم نے جو الفاظ ہندوستان کے رفیع المرتبت حکمران سے کہے وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں- فرمایا:

> اے شہ ہند' میں اس لیے آپ کی خیر خواہ اور ہم درد ہوں کہ آپ میرے بھائی ہیں اور آپ کا اور میرا رشتہ نہایت گہرا اور قریب کا ہے- میں اپنے خونی رشتے کی بنا پر قدرتاً آپ کی حامی ہوں- آپ کی بد خواہی کا کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی- یہ لوگ جن کو آپ نے خلعت و انعامات سے نوازا ہے' آپ کے امرا' وزرا' منصب دار' اصحاب عز و جاہ' اہل حکومت اور ذی اقتدار لوگ ہیں- ان کی خیر خواہی اور ہم دردی کے پیچھے گوناگوں مفادات کار فرما ہیں- لیکن یہ لوگ جنھیں عوام کہا جاتا ہے' نہ ارباب عساکر میں شامل ہیں' نہ حکومت و فرماں روائی میں ان کا کوئی حصہ ہے اور نہ عہدہ و منصب سے ان کا کوئی تعلق ہے- آپ کے لیے ان کی دعا محض اخلاص پر مبنی ہے اور اس قسم کی دعا اللہ کے

حضور درجہ قبولیت حاصل کرتی ہے۔اگر آپ اللہ سے حقیقی نصرت و اعانت کے خواہاں ہیں تو غربا و مساکین کی خبر گیری اور ان کی معاونت کو اپنی زندگی کا جزو بنالیجیے۔ یہ لوگ مستجاب الدعوات ہیں اور دنیا میں بے وسیلہ و ناتواں ہونے کی وجہ سے اللہ کے نزدیک خاص قدر و منزلت کے حامل ہیں۔

اورنگ زیب بہن کی اس نصیحت سے نہایت خوش ہوا اور عہد کیا کہ ہمیشہ غربا اور مستحقین کا خیال رکھے گا اور کوئی ایسا اقدام نہیں کرے گا جو معاشرے کے کم زور اور ضعیف افراد کے خلاف جاتا ہو۔

بادشاہ شاہ جہان جب مسند آرائے حکومت ہوا تو پورے ملک میں مسرت کا اظہار کیا گیا تھا اور ہندوستان کا گوشہ گوشہ بہجت و شادمانی کا مرقع بن گیا تھا۔ شعرا نے اس قسم کے شعر کہہ کر اس کی تخت نشینی پر ہدیہ تبریک پیش کیا تھا۔

شہ گیتی ستاں جمشید ثانی
سرافرازی و تاج کیانی
خدا خواندہ ازاں شاہ جہانش
مسخر شد زمین و آسمانش

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر شے فرط مسرت سے رقصاں اور ہر متنفس محو نشاط ہے۔ تاج پوشی کی ان ساعتوں میں سب لوگ خوش تھے۔

وزاں جشن فرح بخش و طرب خیز
ہماناں شد زمین از عیش لبریز
نہ تنہا ساز عشرت شد طرب ساز
کہ برگ عیش عالم شد خدا ساز
جہان امروز داد خورمی داد
زمادر گوئے اندم خورمی داد

خوشی کی ان گھڑیوں میں دربار سے فارغ ہو کر شاہ جہان حرم سرائے میں آیا تو جن خواتین نے اسے مبارک باد دی' ان میں اس کی بیٹی روشن آرا بیگم بھی شامل تھی۔ بادشاہ نے اس موقعے پر خواتین قصر شاہی کو کئی لاکھ اشرفیاں عطا کیں۔ روشن آرا بیگم کو ایک لاکھ اشرفی سے نوازا۔ لیکن اس مخیّر خاتون نے یہ تمام اشرفیاں اسی وقت حسب معمول غربا و مساکین میں تقسیم کر دیں۔ اس نے مستحقین کی ایک فہرست بنا رکھی تھی۔ مہینے میں جو رقم اسے خرچ کے لیے باپ اور بھائی کی طرف سے ملتی' سب تقسیم کر دیتی۔ یہ فراخ حوصلہ اور وسیع القلب خاتون تھی۔ سب سے خندہ پیشانی سے ملتی اور ان کے کام آتی۔ خود بادشاہ کے لیے جیسا کہ عرض کیا گیا' بہت بڑا سہارا تھی۔ ہر مشکل موقعے پر بادشاہ اس سے مشورہ لیتا اور اس کی رائے پر عمل کرتا۔

عبادت گزار اور عابدہ وزاہدہ خاتون تھی۔ غیبت اور بدگوئی سے متنفر تھی۔ اس کی انہی خوبیوں کی بنا پر شاہ جہان اس پر اعتماد کرتا تھا اور اس کے بعد اورنگ زیب عالم گیر کی بھی یہ مشیر تھی اور وہ اس کی رائے کو صائب قرار دیتا تھا۔

روشن آرا بیگم نے جمعرات کے روز ۷ جمادی الاولیٰ ۱۰۸۲ھ (ستمبر ۱۶۷۱ء) کو انتقال کیا۔ اس کی موت سے عالم گیر کو بے حد صدمہ ہوا۔ اس نے پہلے تو ضبط و صبر سے کام لینے کی کوشش کی' لیکن جب تجہیز و تکفین کا وقت آیا تو ضبط کے بند ٹوٹ گئے اور زار و قطار رونے لگا۔ آخر صبر کے سوا چارہ نہ تھا۔ دوبارہ دل پر قابو پایا اور بہن کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ اس کو زیادہ تکلیف اس بات کی تھی کہ روشن آرا بیگم زندگی میں اس کا عظیم سہارا تھی اور اس کے مشوروں کو وہ بہت اہمیت دیتا تھا۔ غریبوں اور ناداروں کو اس کی موت سے بالخصوص دکھ ہوا' کیونکہ یہ ان کی مددگار تھی اور اس طبقے سے اس کو خاص تعلق خاطر تھا۔

جاناں بیگم

مرزا عبدالرحیم خان خاناں کو اکبری دربار میں نہایت عزت ووقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور اس عہد کا یہ ایک نامور اور معزز فرد تھا۔ ارکان دولت اور امرائے سلطنت میں اس کا مرتبہ سب سے بلند تھا۔ اس کی شجاعت اور بہادری کا یہ عالم تھا کہ اس نے دکن کی بڑی بڑی جنگوں اور چتوڑ کی سنگین معرکہ آرائیوں میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جو ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ نقش رہیں گے۔ یہی وہ جاں باز اور دلیر شخص تھا جس کی وجہ سے یہ فتوحات حاصل ہوئیں اور سلطنت مغلیہ کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوا۔ خان خاناں جس طرح بہادری اور جرات میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا' اسی طرح فہم و فراست اور عقل و دانش میں بھی بے مثل تھا۔ جاناں بیگم اسی عظیم المرتبت باپ کی بیٹی تھی اور اپنے حسن و جمال اور علم و فضل کی وجہ سے تمام ملک میں مشہور تھی۔ علاوہ ازیں اپنی فطری نیکی' طبعی متانت اور معاملہ فہمی کی بنا پر ہندوستان بھر میں ممتاز تھی۔

جاناں بیگم والدین کی اکلوتی بیٹی تھی اور اس کی رعنائی وزیبائی اور علمیت کا شہرہ دور دور تک پہنچ گیا تھا۔ اسے علوم دینیہ سے از حد لگاؤ تھا اور وہ اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا اسی کو سمجھتی تھی۔ گویا قدرت نے اس کو خدمت دین کے لیے ہی پیدا کیا تھا اور یہی اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ امور دینیہ سے اس کی دلچسپیوں کا اندازہ اس سے کیجیے کہ اس نے فارسی میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی جو اس وقت مضامین و مندرجات کی خوبی و ندرت کی بنا پر قبولیت عامہ کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ شہنشاہ اکبر نے اس تفسیر کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا اور جاناں بیگم کے اس علمی کارنامے کے صلے میں اسے پچاس ہزار دینار عطا کیے اور انتہائی مسرت کے ساتھ اسے اپنے ذاتی کتب خانے میں ممتاز جگہ

دی۔

جاناں بیگم اچھی شاعرہ اور سخن ور بھی تھی۔ منقول ہے کہ جاناں بیگم نے حج بیت اللہ بھی کیا تھا۔

وہ برجستگی' قادر الکلامی اور شیوا بیانی کے لیے اہل سخن میں مشہور تھی اور اس باب میں عمدہ ذوق رکھتی تھی۔ جاناں بیگم سن بلوغ کو پہنچی تو اکبر نے شہزادہ دانیال کے ساتھ اس کی شادی کا خیال ظاہر کیا اور باقاعدہ چند افراد کے ذریعے درخواست کی جو خان خاناں نے منظور کر لی۔ نسبت و نکاح کی یہ تقریب ۱۰۰۶ھ (۱۵۹۸ء) کو تزک و احتشام سے انعقاد پذیر ہوئی۔ اس موقعے پر پورے شہر میں چراغاں کیا گیا۔ تمام بازار آراستہ کیے گئے' لوگوں میں دل کھول کر دولت تقسیم کی گئی اور فریقین کی طرف سے ایک دوسرے کی انتہائی خدمت کی گئی۔ شادی کی اس تقریب میں جو چیز لائق تعریف ہے' وہ یہ ہے کہ لڑکی چونکہ عالمہ تھی اور علوم دینیہ سے وابستگی رکھتی تھی' لہٰذا اس نے اپنے طور پر قصر شاہی کی مستورات کو ان بے شمار رسوم سے باز رکھا جو اس زمانے میں رائج تھیں۔ اس نے پوری کوشش کی کہ ان فضول اور بے مقصد رسوم سے اجتناب کیا جائے اور کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہونے پائے جو شریعت اسلامی کے منافی ہو۔

کہتے ہیں جاناں بیگم کی احتیاط اور غلط رسوم سے پہلو تہی کے باوجود بے حد سیم وزر لٹایا گیا اور بے شمار مسرفانہ اقدام کیے گئے' مثلاً شہزادہ دانیال' تمام خاندان شاہی' فوج و انتظامیہ کے اہل کاروں اور وزرا کے ساتھ مسلسل آٹھ روز عبدالرحیم خانِ خاناں کا مہمان رہا اور اس مہمان نوازی پر لڑکی والوں کی طرف سے جو مصارف ہوئے ان کا تخمینہ دو کروڑ پچاس لاکھ روپے لگایا گیا ہے۔ اسراف و تبذیر کے یہ مظاہرے بادشاہوں اور امرا وارکان دولت کے ساتھ مختص ہو چکے تھے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود جاناں بیگم نہایت نیک اور باوقار خاتون تھی ---- اس سلسلے میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔

شہزادہ دانیال کے انتقال کے بعد جاناں بیگم اکثر مغموم وملول رہتی تھی اور ظاہر

ہے وہ بہت بڑے صدمے سے دوچار تھی۔ بھرے گھر کا اجڑ جانا اور شوہر کا مر جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے' انتہائی دکھ اور تکلیف کی بات ہے۔ وانیال کے انتقال کے بعد نورالدین جہاں گیر کو تخت ہند کا وارث قرار دے دیا گیا تھا۔ مسند حکومت پر متمکن ہونے کے کچھ روز بعد جہاں گیر نے چند معتبر اشخاص اور بعض عمائد سلطنت کو جاناں بیگم کے پاس درخواست نکاح دے کر بھیجا اور کہا کہ وہ حسن و جمال اور علم و عرفان کی مالک ہے' یہ بیوگی اس کے لیے سوہان روح کی حیثیت رکھتی ہے' بہتر ہو گا کہ وہ میرے ساتھ شادی کر لے' اسے دنیا میں کوئی تکلیف نہیں ہو گی اور عزت و آبرو اور شوکت و حشمت سے زندگی بسر کرے گی۔

جہاں گیر کے ان فرستادگان نے جاناں بیگم کو بادشاہ سے عقد کرنے کو کہا تو اس نے اس درخواست کو ٹھکرا دیا اور شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ جاناں بیگم نے کہا میں اب شادی نہیں کروں گی اور بقیہ زندگی بیوگی کے عالم میں گزار دوں گی۔ آئندہ جہاں گیر کی طرف سے اس قسم کی کوئی درخواست نہیں آنی چاہیے۔

اس صاف انکار پر بھی جہاں گیر نے خاموشی سے بیٹھنا گوارا نہ کیا۔ دوبارہ لوگوں کو بھیجا اور اس مرتبہ زیادہ اصرار کیا گیا تو جاناں بیگم نے دوسرے روز خود ہی بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا وعدہ کیا۔ یہ رات اس نے نہایت تذبذب اور بے چینی کی حالت میں گزاری۔ صبح ہوئی تو انتہائی جرات اور دلیری کا ثبوت دیتے ہوئے تمام دانت اکھڑوا ڈالے اور سر کے بال کٹوا دیے۔ اگلی صبح وہ حسب وعدہ اس حالت میں جہاں گیر کے پاس پہنچی کہ منہ دانتوں سے خالی ہے اور سر بالوں سے صاف۔ جہاں گیر اسے اس حالت میں دیکھ کر بہت نادم ہوا اور اس کے ساتھ انتہائی تعظیم سے پیش آیا۔

جاناں بیگم شوہر کی وفات سے کافی عرصہ بعد تک زندہ رہی اور وقار اور عزت سے زندگی بسر کی۔

وہ ہندوستان کے ممتاز ترین خاندان کی فرد ہونے کے باوصف دوسروں کے مقابلے میں خود کو حقیر جانتی تھی اور کوئی ایسا قدم نہ اٹھاتی تھی جس سے کسی کو تکلیف

پہنچنے کا احتمال ہو - اقتصاد و میانہ روی اس کا معمول تھا اور اسی صفت کی بنا پر ہر حلقے میں اسے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا - قصر شاہی کی کسی خاتون سے اس کا کبھی جھگڑا نہیں ہوا - وہ غیبت سے مجتنب رہتی اور دوسرے کی برائی بیان کرنے سے احتراز کرتی - کسی کو مطعون ٹھہرانا اور کسی کی عیب جوئی کرنا اس کا شیوہ نہ تھا - اس خاتون نے ۱۰۷۰ھ (۱۶۵۹) میں وفات پائی -

پھمنی بیگم

پھمنی بیگم عقل مند' سلیقہ شعار' حسین و جمیل' جفاکش اور نیک خاتون تھی۔ یہ اورنگ زیب عالم گیر کے بھتیجے سلطان بلند اختر کی بیٹی اور سلطان محمد شجاع بن شاہ جہان کی پوتی تھی۔ مغلیہ خاندان کی یہ وہ خاتون تھی جو اپنے کام اپنے ہاتھ سے سرانجام دیتی تھی۔ اس قدر نرم خو تھی کہ کسی نوکر کو کوئی حکم نہ دیتی۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اسے غلاموں اور کنیزوں کو کوئی کام کہتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جہاں تک ہو سکے اپنا کام خود کرنا چاہیے۔ اپنے آرام کے لیے کسی کو تکلیف دینا اپنے آپ پر عدم اعتماد کے مترادف ہے۔ یہ کیا تک ہے کہ کام اپنا ہو اور اس کی تکمیل کے لیے دوسرے کے دروازے پر دستک دی جائے۔

اسے اپنے دست و بازو پر بڑا اعتماد تھا اور وہ ایک متحرک خاتون تھی۔ اس کا روزانہ کا معمول تھا کہ صبح سویرے بیدار ہوتی' نماز تہجد ادا کرتی' اس کے بعد وظائف میں مشغول ہو جاتی' فجر کی اذان کے بعد نماز فجر پڑھتی۔ پھر قرآن مجید کی تلاوت کرتی' بعد ازاں محل کے باغ میں جاتی۔ اپنے ہاتھ سے چھوٹے چھوٹے خوشنما پودے لگاتی' درختوں کو موزونیت کے ساتھ درست کرتی۔ باغ کو ضرورت سے زائد گھاس وغیرہ سے صاف کرتی اور چمن کے چاروں طرف خود آب یاری کرتی۔

اس سے بارہا لوگوں نے کہا کہ اس قسم کے کام ملازموں اور خادموں سے کرائے جائیں' مگر اس نے یہی جواب دیا کہ دوسرے کو کام سمجھانے اور اپنا مدعا اس کے ذہن نشین کرنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ خود ہی سب کچھ کر لیا جائے۔ اس کا قول تھا کہ نگرانی سے عمل بہتر ہے۔

لیکن چھوٹی عمر ہی میں اس نیک بخت خاتون کو وقت کی سخت ترین مصیبت سے دو

چار ہونا پڑا- اپنے مہربان باپ سلطان بلند اختر کی وفات کی خبر اسے پہنچی تو وہ بنایت غم گین ہوئی- وہ سلطان اورنگ زیب عالم گیر کا بھتیجا اور سلطان شجاع بن شاہ جہان کا بیٹا تھا- اگرچہ عالم گیر کا یہ سخت مخالف تھا اور یہ بہادر شہزادہ اس سے برسر پیکار تھا- لیکن عالم گیر کو اس کی وفات سے انتہائی صدمہ پہنچا- اس نے خواجہ مسعود کو حکم دیا کہ سلطان بلند اختر کے تینوں بیٹوں اور محل سرا کی تمام بیگمات کو احترام و احتیاط کے ساتھ قلعہ احمد نگر میں پہنچا دیا جائے اور مرحوم سلطان کی بیٹی چمنی بیگم کو تعظیم اور اکرام کے ساتھ محل خاص میں لایا جائے اور اس کی تسکین کے سامان فراہم کیے جائیں-

عالم گیر کے حکم و ارشاد کے مطابق چمنی بیگم کو محل میں لایا گیا تو بادشاہ دربار سے اٹھ کر اس کے پاس تعزیت کے لیے گیا- سر پر دست شفقت پھیرا' و فور جذبات اور شدت ترحم سے آنکھیں اشک بار ہو گئیں اور لرزتی زبان سے مشفقانہ لہجے میں کہا :

بیٹا! آج تم سخت مصیبت میں مبتلا ہو گئی ہو- موت اللہ کے ہاتھ میں ہے' جسے کوئی روک نہیں سکتا- تم اگرچہ اپنے مہربان اور بہادر باپ کے سایۂ شفقت سے محروم ہو گئی ہو' لیکن جب تک میں زندہ ہوں' تمھیں کسی قسم کی پریشانی لاحق نہیں ہو گی اور تمھیں اسی طرح آرام و آسائش سے رکھا جائے گا جس طرح تم باپ کے زمانے میں رہتی تھی- میں تمھیں وہی حقوق دوں گا جو اپنی اولاد کو دیتا ہوں- تم انہی مفاد سے بہرہ مند ہو گی جس سے خود میری بیٹیاں بہرہ مند ہیں- تم بہادر باپ کی لائق ترین بیٹی ہو' اس کی روایات زندہ رکھو اور بہادروں کی طرح زندگی بسر کرو-

عالم گیر کی زبان سے جب یہ الفاظ نکل رہے تھے' وہ خود بھی رو رہا تھا اور چمنی بیگم بھی رو رہی تھی اور اس کے دل کی دنیا تاریک ہو چکی تھی' مگر اس نے اپنے آپ پر قابو پایا اور بولی :

اللہ آپ کو تادیر سلامت رکھے اور ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم ہمیشہ آپ کے حکم و ارشاد کی تعمیل کرتے رہیں' بے شک ہمیں اپنے باپ کی موت سے

شدید صدمہ پہنچا ہے' لیکن آپ کا تسلی آمیز خطاب اور مشفقانہ انداز کلام ہم غم زدہ لوگوں کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتا ہے۔

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا اورنگ زیب عالم گیر اور سلطان بلند اختر کے درمیان شدید مخاصمت تھی اور دونوں سخت مخالف تھے۔ بارہا ایک دوسرے کے مقابلے میں میدان کارزار میں اتر چکے تھے۔ سلطان بلند اختر بڑا بہادر اور جنگ جو تھا۔ اس کا اعتراف خود عالم گیر بھی متعدد بار کر چکا تھا۔ لیکن اس کے پاؤں عالم گیر کے مقابلے میں اکھڑ جاتے تھے۔ ظاہر ہے' اس کی اولاد بھی عالم گیر کی حامی نہ تھی' مگر جو چیز یہاں لائق تذکرہ ہے' وہ یہ ہے کہ عالم گیر نے اس موقعے پر کمال محبت کا ثبوت دیا۔ اس نے اپنے حریف کی موت کو ایک عظیم المیہ سے تعبیر کیا اور اس کی اولاد اور بیگمات سے بدرجہ غایت الفت سے پیش آیا۔

والد کی وفات سے بہت عرصہ بعد تک چمنی بیگم عالم گیر کے پاس رہی اور عالم گیر نے باپ کی طرح اس سے شفقت کا برتاؤ کیا اور اس کی ضروریات کی ہر طرح کفالت کی۔

یہ خاتون یوں تو بچپن ہی سے عمدہ اوصاف سے متصف تھی' غریب پرور اور مسکین نواز تھی' تواضع اور انکسار سے زندگی بسر کرتی تھی اور معاشرے کے کم زور وضعیف طبقے کی ضروریات کا پورا خیال رکھتی تھی۔ لیکن والد کی وفات کے بعد تو اس کی ان خوبیوں میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ جتنا عرصہ عالم گیر کے پاس رہی' نہایت خاموشی سے رہی' اس نے عبادت' یاد الٰہی اور وظائف و اوراد کو اپنا مستقل مشغلہ بنا لیا تھا۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس کی شادی کہاں ہوئی؟ انتقال کب ہوا؟ کتنی عمر پائی اور زندگی کے آخری لمحات کہاں اور کس طرح بسر ہوئے؟

قدسیہ بیگم

قدسیہ بیگم کا اصل نام اودھم بائی تھا- یہ مغل حکمران فرخ سیر کی بیٹی تھی- اس کی شادی محمد شاہ سے ہوئی تھی جو ۱۱۳۱ھ سے ۱۱۶۱ھ (۱۷۱۹ سے ۱۷۴۸) تک ہندوستان کا بادشاہ رہا- شادی کے بعد اسے نواب قدسیہ زمانی کا لقب دیا گیا تھا- یہ خاتون نہایت سمجھ دار اور بے حد عقل و فراست کی مالک تھی- اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب محمد شاہ بتیس برس حکومت کرنے کے بعد ۲۷- ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ (۱۶- اپریل ۱۷۴۸ء) کو اچانک فوت ہوا تو نہایت راز داری سے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی اور سات روز تک کسی کو اس کی موت کی اطلاع نہیں دی- یہ راز داری اس لیے اختیار کی گئی کہ وہ ملک میں نہایت افراتفری اور شدید فتنے کا زمانہ تھا اور خطرہ تھا کہ معلوم نہیں حالات کیا رخ اختیار کر لیں اور پھر انھیں قابو میں رکھنا مشکل ہو جائے-

مغلیہ خاندان میں تعمیر و تزیین اور آرائش کا جو ذوق پایا جاتا تھا' قدسیہ بیگم اس سے خوب بہرہ مند تھی- چنانچہ اس کے شوہر محمد شاہ کے بعد جب اس کا بیٹا احمد شاہ تخت حکومت پر متمکن ہوا تو اس نے بعض عمارتیں بنوائیں اور باغ لگوائے-

اپنے نام سے اس نے دہلی میں "قدسیہ باغ" لگوایا- بیان کیا جاتا ہے کہ یہ باغ رعنائی و خوب صورتی میں پورے ہندوستان میں اپنی مثال نہ رکھتا تھا- باغ دہلی میں کشمیری دروازے کے باہر تھا- اس باغ میں بارہ دری اور شان دار مسجد تھی- لوگ دور دور سے سیر کے لیے اس میں جاتے تھے- مغلوں کی حکومت ختم ہونے کے کچھ عرصہ بعد تک بھی یہ باغ رہا اور اس کی عمارتیں بھی رہیں- بعد میں سب کچھ کھنڈروں میں تبدیل ہو گیا- البتہ کہا جاتا ہے کہ اس کی چار دیواری کافی دیر باقی رہی- پھر ایک وقت

آیا کہ یہ سب چیزیں ماضی کا قصہ بن گئیں اور اس کی ٹوٹی ہوئی دیواریں' شکستہ چھتیں اور بے ترتیب بکھرے ہوئے پتھر اس کی وسعت کی شہادت دیتے رہے۔

قدسیہ باغ کے وسط میں ایک پختہ نہر تھی جو دریائے جمنا سے نکلتی تھی اور باغ کے سایہ دار درختوں کی دورویہ قطاروں کو سیراب کرتی تھی- یہ نہر بھی امتداد زمانہ اور حالات کے تغیر سے خشک ہو گئی تھی' تاہم اس کے آثار بہت عرصے تک باقی رہے-

دہلی میں قلعے سے متصل اپنے بیٹے احمد شاہ کو حکم دے کر ۱۱۶۴ھ (۱۷۵۱) میں اس نے سنہری مسجد کے نام سے ایک مسجد تعمیر کرائی تھی- مسجد کے دروازے پر مرمر کے پتھر میں یہ اشعار کندہ تھے-

شکر حق در عہد احمد شاہ غازی بادشاہ
خلق پرور دادگر شاہان عالم را پناہ
مسجدے کردہ بنا نواب قدسی مرتبت
باد دائم فیض عام آں ملائک سجدہ گاہ
سعی نواب بہادر صاحب لطف و کرم
ساخت تعمیر چنیں جاوید عالی دست گاہ
چاہ و حوض و صاف صحنش آبروے زمزم است
ہر کہ از آبش طہارت کرد شد پاک از گناہ
سال تاریخش چو خورم یافت از الہام غیب
مسجد بیت مقدس مطلع نور الٰہ

منقول ہے کہ تیسرے شعر کے دوسرے مصرعے میں جس "نواب بہادر" کا ذکر کیا گیا ہے' اس سے جاوید خاں خواجہ سرا مراد ہے- قدسیہ بیگم کی سفارش سے بادشاہ نے اسے "نواب بہادر" کا خطاب دیا تھا-

کہا جاتا ہے کہ نواب قدسیہ بیگم نے دہلی میں ایک اور عمارت تعمیر کرائی تھی- یہ عمارت ۱۱۶۲ھ (۱۷۴۹) میں نواب بہادر جاوید خاں سے کہہ کر تعمیر کرائی گئی تھی-

اس عمارت کا نام "شاہ مرداں" رکھا گیا تھا۔

قدسیہ بیگم نہایت مخیر اور سلیم الطبع خاتون تھی۔ چھوٹے پر شفقت، کمزور کی اعانت، غریب پروری اس کی زندگی کے لازمی اجزا تھے۔ تلاوت قرآن اور عبادت الٰہی کو اس نے اپنے لیے ضروری ٹھہرالیا تھا۔ اس کی ایک عجیب وجہ بیان کی جاتی ہے۔

کہتے ہیں ایک روز یہ محل کی کھڑکی میں بیٹھی کسی کتاب کے مطالعہ میں محو تھی کہ نیچے سے ایک فقیر نما شخص نے زور سے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا جو اس کے کانوں سے ٹکرایا۔ اس نعرے میں ایک خاص اثر و رعب کی کیفیت پائی جاتی تھی۔ اس اثر انگیز اور مرعوب کن صدا نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ نیچے دیکھا تو ایک گلیم پوش فقیر ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا لیے کھڑا تھا۔ اس نے نگاہیں اس فقیر پر گاڑ دیں۔ فقیر نے فارسی کے چند نصیحت آموز اشعار پڑھے اور چلتا بنا۔

اب قدسیہ بانو بیگم کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ غسل خانے میں گئی، غسل کیا، کپڑے بدلے اور تلاوت قرآن میں مشغول ہو گئی۔ اس کنیز نے جو ہر وقت اس کی خدمت میں مصروف رہتی تھی، ملکہ کی یہ کیفیت دیکھی تو دست بستہ عرض کیا:

اے ملکہ ہند! آج یہ کیفیت آپ پر یکایک کیوں طاری ہو گئی؟

جواب دیا: مجھے اپنی حالت پر رہنے دو، دخل اندازی نہ کرو؟

کنیز نے عرض کیا: حضور! میں آپ کے تغیر احوال سے خوش ہوئی ہوں۔ صرف یہ دریافت کرنے کی اجازت چاہتی ہوں کہ یہ کس مرد خدا کی دعا کا اثر ہے، جس سے یکایک طبیعت بدل گئی۔

بولیں: اس راز سے تم پردہ اٹھانے کی اتنی ہی متمنی بھی قیمتی ہو تو جاؤ اس مرد درویش کی تلاش کرو، جس نے چند ساعتیں قبل محل کے نیچے کھڑے ہو کر اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا تھا۔ وہ نعرہ میرے لیے نہایت اثر انگیز تھا۔ میرے دل کی دنیا کو بدلنے کا باعث وہی نعرہ ہوا ہے۔

مگر وہ درویش اب اتنی دور جا چکا تھا کہ اسے تلاش کرنا ممکن نہ تھا۔ اس کے بعد وہ

کبھی ادھر نہ آیا لیکن قدسیہ بانو بیگم کی زندگی کا رخ بالکل بدل گیا۔

قدسیہ بانو بیگم شعر بھی کہتی تھی اور اس سلسلے میں اس نے بڑی موزوں طبع پائی تھی۔

مرقوم ہے کہ اس فقیر کے جانے کے بعد یہ بہت بے چین رہنے لگی تھی۔اس بے چینی کو رفع کرنے غرض سے اس نے مختلف ملازموں اور کنیزوں کے ذریعے اس فقیر کو تلاش کیا' مگر وہ نہیں ملا۔اس اثنا میں اس نے بہت سے شعر کہے جو اس کے دل کی بے تابی پر دلالت کناں ہیں۔ایک اردو شعر بھی اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جو یہ ہے:

ہم جانتے تھے آنکھ لگی دل کو سکھ ہوا
کم بخت کیسی آنکھ لگی' اور دکھ ہوا

کہتے ہیں' یہ شعر وہ اکثر پڑھتی اور دل کو تسکین دینے کی سعی کرتی۔ لیکن اس کی بے چینی دور نہ ہوئی اور دل کی دنیا میں جو آگ ایک مرتبہ سلگ چکی تھی' وہ بجھ نہ سکی۔

ہندوستان کے سیاسی اور حکومتی حالات اس وقت نہایت ابتر تھے۔اس کا بیٹا احمد شاہ باپ کے مرنے کے بعد ۲۔جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ (مئی ۱۷۴۸) کو وارث تخت ہند ہوا تھا۔ لیکن چھے سال کے بعد جمادی الاولیٰ ۱۱۶۷ھ (مارچ ۱۷۵۴) کو اس کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی اور معدوم البصارت کر کے اسے سلیم گڑھ میں قید کر دیا گیا۔ایک روایت کے مطابق اس واقعہ سے بیس سال بعد ۲۷۔شوال ۱۱۸۸ (جنوری ۱۷۷۵ء) کو قید خانے میں اس کی موت واقع ہوئی اور دہلی میں ہمایوں کے مقبرے میں اسے دفن کیا گیا۔

یہ بھی روایت بیان کی جاتی ہے کہ بیٹے کی معزولی اور قید کے بعد نواب قدسیہ بانو کا ہندوستان میں رہنے کو جی نہیں چاہا۔ اس نے اپنی بھانجی صاحبہ محل کی شادی افغانستان کے بادشاہ احمد شاہ ابدالی سے کر دی تھی۔وہ اس کے ساتھ ہی افغانستان چلی گئی تھی۔وہیں ۱۱۹۹ھ (۱۷۸۵ء) میں فوت ہوئی۔

جمیلہ بوحیرہ

"میں مسلمان ہوں- اسلام ہماری ہڈیوں میں رچا ہوا ہے اور ہمیں باطل سے ٹکرا جانے کا سبق سکھاتا ہے- یاد رکھو میں مسلمانوں سے نہ کسی صورت میں غداری کر سکتی ہوں اور نہ انھیں دھوکا دے سکتی ہوں- میں غیر ملکی حکومت کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتی اور نہ اس کے کسی اقدام کی تائید کر سکتی ہوں- میرے مذہب کی رُو سے غیر قوم کی غلامی اللہ کا بہت بڑا عذاب ہے- میں اس عذاب سے اپنی قوم کو نجات دلانے کی ہر ممکن کوشش کروں گی- اس وقت تک اپنی جدوجہد جاری رکھوں گی جب تک میری قوم غیر ملکی تسلط سے نجات نہیں حاصل کر لیتی- تم مجھے جو جی چاہے سزا دو میں اپنے فرض منصبی کو ترک نہیں کروں گی اور جس راہ پر قدم زن ہوں' اس سے ذرہ بھی ادھر ادھر نہیں ہوں گی-"

یہ الفاظ جمیلہ بوحیرہ نے فرانس کی فوجی عدالت کو بیان دیتے ہوئے کہے-

جمیلہ بوحیرہ کا شمار الجزائر کی ان خواتین میں ہوتا ہے جنھوں نے ملک کی آزادی کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور نہایت استقلال سے یہ خدمت انجام دی- وہ بائیس سال کی عمر میں تحریک آزادیٔ الجزائر میں شامل ہوئی اور اس وقت تک اس میں حصہ لیتی رہی جب تک ملک آزادی کی نعمت سے ہم کنار نہیں ہو گیا-

حقیقت یہ ہے کہ الجزائر کی تحریک آزادی میں خواتین کے شامل ہونے کا ایک خاص پس منظر ہے جو انھیں کھینچ کر اس میدان میں لایا' ورنہ اس ملک کی عورتیں خالص گھریلو قسم کی تھیں اور ان کے ذہن اس نوع کی جدوجہد کے بارے میں غور کرنے سے بالکل عاری تھے' کیونکہ نہ ان کی تعلیم کا معیار اتنا اونچا تھا اور نہ ان کی

معاشرتی زندگی اس ڈھب کی تھی جو اس راہ پر لگانے میں ان کی معاون ہوتی - انھیں جو چیز جدوجہد کے وسیع میدان میں لائی' وہ غیر ملکی حکومت کے بے پناہ مظالم تھے - فرانس نے الجزائریوں پر اس درجہ ستم ڈھائے اور انھیں اس قدر گوناگوں مصائب کا تختہ مشق بنایا کہ وہاں کے باشندے فرانس کے خلاف ایک زبردست اور ہمہ گیر تحریک شروع کرنے پر مجبور ہو گئے اور پھر اس کے نتیجے میں فرانس نے ان کا جو قتل عام کیا اس کا ان پر شدید ردعمل ہوا' اور وہ فرانس کے خلاف نفیر عام پر مجبور ہو گئے - اس نفیر عام میں الجزائری خواتین بھی شامل تھیں' کیوں کہ جب ان کے بھائی' باپ' بیٹے' شوہر اور عزیز میدان میں کودے اور فرانسیسی فوج کی گولیوں کا نشانہ بنے تو ان کی غیرت جوش میں آ گئی اور وہ شمشیر بکف ہو کر دشمن کے مقابلے میں آ کھڑی ہوئیں - انھوں نے یہ سوچا کہ ایک تو پورا ملک غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے - دوسرے ان کے عزیز و اقارب کو چن چن کر صرف اس بنا پر توپ کے سامنے رکھ کر اڑا دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے لیے حریت و آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں جو ان کا بنیادی حق ہے - اب ہماری زندگی کس کام کی اور جینے سے کیا حاصل ؟

اتفاق سے جمیلہ بوحیرہ کا شمار بھی الجزائر کی ان خواتین میں ہوتا تھا جن کے عزیز اور قریبی رشتے دار یا تو فرانسیسی فوج کے ہاتھوں موت کا لقمہ بن چکے تھے اور یا تحریک آزادی وطن میں حصہ لینے کی پاداش میں قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے تھے' لہٰذا اس غیرت مند نوجوان خاتون کا خون کھول اٹھا اور وہ مجاہدین میں شامل ہو گئی - مجاہدین میں شامل ہونے کے بعد اسے انتہائی کٹھن مراحل سے گزرنا پڑا - اس کا دائرہ کار نہایت وسیع تھا - یہ ہر اس مقام پر پہنچی جہاں دشمن کو تنگ کیا جا سکتا تھا - اس نے مجاہدین کے ٹھکانوں کو مضبوط کیا اور انھیں باقاعدہ فوجی چھاؤنیوں کی حیثیت دی - یہ مجاہدین کی امداد کے سلسلے میں گھر گھر چندے کے لیے پہنچی - ان کے لیے اسلحہ فراہم کیا' ادویات اکٹھی کیں' موسم کے لحاظ سے مختلف قسم کے کپڑے جمع کیے اور مجاہدین کو پہنچائے - پھر مجاہدین کے گھروں میں گئی' ان کے بیوی بچوں اور اہل خانہ کے لیے

ضروریات کا انتظام کیا اور اس قسم کی کوششیں کیں کہ جن سے ان کی خانگی گاڑی تسلسل اور باقاعدگی سے چلتی رہے۔ علاوہ ازیں اس نے تلوار ہاتھ میں پکڑی اور مخالفین کے فوجی ٹھکانوں' اسلحہ خانوں اور سامان رسد کے ذخیروں کو نشانہ بنایا اور انھیں تباہ کیا۔

یہ بڑی بہادر اور مستقل مزاج اور نڈر خاتون تھی۔ گوریلا جنگ کے تمام طریقوں سے آگاہ تھی۔ گوریلا جنگ کی منصوبہ بندی نہایت حسن وخوبی سے تیار کرتی اور اس انداز سے کرتی جس سے فرانسیسی حکومت بہت پریشان ہوتی اور اس اسلوب سے حملہ آور ہوتی کہ دشمن کے لیے سنبھلنا مشکل ہو جاتا۔ حکومت نے اس کی گرفتار کے لیے خاص عملہ مقرر کیا تھا' مگر اس میں کامیابی بہت مشکل تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ پولیس کا عملہ گرفتاری کے لیے عین اس مقام پر پہنچا جہاں یہ چھپی ہوئی تھی' لیکن یہ اس کی دست رس سے محفوظ رہی۔ آخر ایک وقت آیا کہ گرفتار ہو گئی اور فوج کی نگرانی میں چلی گئی۔ گرفتاری سے چند روز بعد اسے فوجی عدالت میں پیش کیا گیا تو اس نے ایک ولولہ انگیز بیان دیا' جسے الجزائر کی تاریخ آزادی میں ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔ اس بیان میں اس نے یہ واضح کیا کہ اسلام میں کسی کی غلامی کو قبول کرنے کا کوئی تصور نہیں اور مسلمان کے لیے غلامی پر قائع رہنا انتہائی بزدلی کی علامت ہے اور اسلامی تعلیمات کے سراسر منافی ہے۔ میں خود بھی غلامی کو قبول کرنے سے انکار کرتی ہوں اور اپنے ملک کو بھی غلامی کی زنجیر سے نجات دلانے کی خواہاں ہوں۔ گرفتاری کے بعد اس بہادر خاتون کو سخت سزائیں دی گئیں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی کہ گوریلا مجاہدین کے ٹھکانے کہاں کہاں ہیں۔ مگر اس نے کسی سزا کی پروا نہیں کی اور گوریلوں کے بارے میں کسی قسم کا راز ظاہر نہیں کیا۔ اس کو بجلی کے کرنٹ لگائے گئے' تنگ وتاریک کوٹھڑیوں میں بند کیا گیا' کھانے پینے کی چیزوں سے محروم رکھا گیا' لیکن اس پیکر استقلال نے کسی سزا کو کوئی اہمیت نہیں دی اور اپنے موقف پر ڈٹی رہی۔

فروزہوا

سر زمین الجزائر بیس لاکھ انسانوں کے خون سے رنگین ہے' جن میں مرد بھی شامل ہیں اور عورتیں بھی- فرانس نے وہاں جو ظلم و ستم روا رکھے' باشندگان الجزائر کی روح آزادی کو کچلنے کے لیے جس سفاکی وخوں ریزی کا مظاہرہ کیا اور اسلامی شعائر کو ختم کرنے کے لیے جو سنگین اقدام کیے وہ کسی سے مخفی نہیں- وہاں جو کچھ ہوا دنیا کی تحریکات آزادی میں اس کی مثال کم ہی ملے گی- لیکن اس کے مقابلے میں الجزائریوں نے جس جرات و بے باکی سے فرانسیسی حکومت سے ٹکر لی اور جس بہادری و استقلال سے جہاد حریت میں حصہ لیا' وہ بھی اپنی نظیر آپ ہے- چمکتی ہوئی برہنہ شمشیروں' اچھلتے ہوئے نیزوں اور انتہائی خوف ناک آتشیں بموں کے باوجود کسی مسلمان مرد اور کلمہ گو عورت نے اپنے فرائض کی انجام دہی سے پہلو تہی نہیں کی' کسی نے غداری کا ارتکاب نہیں کیا' کسی نے اپنے آپ کو بچانے اور دوسرے کو ہدف ستم بنانے کی کوشش نہیں کی- سب نے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ظلم سے پنجہ آزمائی کی اور نتائج سے بے پروا ہو کر جنگ آزادی میں حصہ لیا- الجزائر کی اس جنگ میں مردوں کے ساتھ ہزاروں مسلمان عورتیں دشمن سے معرکہ آرا ہوئیں اور اپنے وطن عزیز کو آزادی کی نعمت سے ہم کنار کرنے اور غیر ملکی تسلط سے نجات دلانے کے لیے میدان کارزار میں اتریں-

ان مجاہد خواتین میں سے ایک خاتون کا نام فروزہوا ہے- ان کا خود اپنا بیان ہے کہ

الجزائر نے جو آزادی حاصل کی ہے' وہ فقط مردوں کی رہین منت نہیں' اس میں الجزائر کی عورتوں کا بھی بڑا حصہ ہے اور ان دونوں طبقوں نے باہمی جدوجہد سے غلامی و عبودیت کی مضبوط زنجیر کو توڑا ہے' اور اس جہاد حریت

میں عورتوں کی شمولیت اس بنا پر اور بھی لائق تحسین ہے کہ یہاں کی عورتیں قدامت پسند تھیں' سیاسی تگ و تاز میں انھوں نے کبھی حصہ نہیں لیا تھا- ۱۹۵۵ء میں الجزائر کی تحریک آزادی کی جنگ تیز ہوئی تو فرانسیسی فوج نے نہایت بے دردی سے لوگوں کو قتل کیا اور آبادیوں کی آبادیوں کو تہہ تیغ کر دیا' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورتوں کے خون نے جوش مارا اور وہ مردوں کے ساتھ وطن عزیز کو آزاد کرانے کے لیے میدان میں اتر پڑیں' جب تک ملک آزادی کی نعمت سے بہرہ ور نہیں ہو گیا ان کی جنگ جاری رہی-

فروز ہوا پہلی لڑکی ہے جو ۱۹۵۵ء کی جنگ میں شریک ہوئی- اب تک اس خاندان میں سے کسی نے جنگ آزادی میں شرکت نہیں کی تھی- پہلے اس کا بھائی مجاہدین کی مساعی سے متاثر ہوا' اس کے بعد خود اس نے تلوار ہاتھ میں پکڑی- فروز ہوا کہتی ہے کہ در حقیقت میرا بھائی ہی مجھے میدان جنگ میں لایا- وہ ظالموں اور مظلوموں کے واقعات کچھ اس انداز سے میرے سامنے بیان کرتا کہ میں تڑپ اٹھتی اور میرا خون کھولنے لگتا' آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں گھر کی چار دیواری سے باہر نکل کر میدان کارزار میں آ گئی-

فروز ہوا مزید کہتی ہے :

الجزائر کی جنگ عام جنگوں سے بالکل مختلف تھی' ہر طرف آگ بھڑک رہی تھی' قتل و غارت کی انتہا ہو چکی تھی' کوئی شخص گھر میں آرام و سکون سے نہیں بیٹھ سکتا تھا' عورتیں ہر آن ہراساں رہتی تھیں اور کوئی کام اطمینان سے نہیں کر سکتی تھیں- بارہا ایسا ہوا کہ ایک خاتون باورچی خانے میں کھانا تیار کر رہی ہے اور ناگہاں آتشیں بم آ گرتا ہے' کسی کے گھر میں مہمان گئی ہے اور موت کی نذر ہو گئی ہے- کسی شادی پر گئی ہے اور اس کے سامنے ہی اس کے بچے ہلاک کر دیئے گئے ہیں- مکان کی آرائش کی

ہے اور تھوڑی دیر بعد دیکھتی ہے کہ ادھر سے توپ کا گولہ آیا اور مکان خاک کا ڈھیر ہو گیا۔ ریل میں بیٹھی ہے اور پٹری ایک دھماکے سے اڑا دی گئی ہے۔ بس میں سوار ہے اور گولی مار کر اس کے پہیے ناکارہ کر دیے گئے ہیں۔ کافی تیار ہے مگر پیالی لبوں پر لگانے کا حکم نہیں۔ گوشت پکایا ہے مگر دشمنوں نے اس کو ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ غرض انتہائی بے بسی کا عالم تھا اور مرد تو مرد خود خواتین بھی اس سے بہ درجہ غایت تنگ تھیں اور وہ زندگی پر موت کو ترجیح دینے لگی تھیں۔

عورتیں سوالیہ انداز میں کہتی ہیں کہ جس زندگی کا کوئی بھروسا نہ ہو اور موت کے بادل ہر وقت سر پر منڈلا رہے ہوں' اور موت بھی مظلومیت اور بے بسی کی ہو تو اس زندگی سے کیا حاصل ؟ کیوں نہ ایسی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دی جائے اور کیوں نہ ان حالات کا سختی سے مقابلہ کیا جائے جو اس قسم کا غیر یقینی ماحول پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں ؟ جب موت کو آنا ہی ہے تو میدان جنگ ہی میں کیوں اس کا انتظار نہ کیا جائے ؟

فروز ہوا کہتی ہے :

میں غریب گھر کی لڑکی ہوں' میرے والدین مجھے اعلیٰ تعلیم دلانے کی سکت نہ تھی' والدہ چاہتی تھیں کہ گھریلو کام کاج میں ان کا ہاتھ بٹاؤں اور سینے پرونے میں مشغول رہوں' کیوں کہ یہ آمدنی کا ایک ذریعہ ہے۔ میرے والد ایک چھوٹے سے کارخانے میں ملازم تھے اور معمولی تنخواہ پاتے تھے' جو گھر کے پورے کنبے کے لیے کافی نہ تھی' لہٰذا ان سب کا یہی ارادہ تھا کہ میں بھی کچھ نہ کچھ کام کروں۔ مگر جب میں نے غیر ملکی طاقت کے ظلم و ستم کو دیکھا اور فرانسیسی جبر و قہر کی داستانوں کو سنا تو میرے خیالات کی دنیا بدل گئی اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں مجاہدین کا ساتھ دوں گی اور اس جنگ میں بھرپور حصہ لوں گی۔ چنانچہ میدان میں کود پڑی اور وطن عزیز کی آزادی کو

اپنا مقصود اصلی ٹھہرالیا۔

وہ اپنی مساعی کی حدود بیان کرتی ہوئی کہتی ہے :

میں یہ نہیں کہتی کہ میں نے ہر موقعے پر مجاہدین آزادی کا ساتھ دیا اور ہر میدان میں اپنی خدمات پیش کیں' بلکہ میرا دائرۂ جدوجہد محدود تھا۔ میرا کام یہ تھا کہ میں اسلحہ کی فراہمی میں مجاہدین کی مدد کروں۔ میں اس سلسلے میں گھر گھر جاتی اور مجاہدین کے لیے اسلحہ تیار کرنے کی غرض سے روپے پیسے جمع کرتی' عورتوں کو آزادی کی نعمت اور اس کے فوائد سے باخبر کرتی اور بتاتی کہ غلام قومیں کبھی کسی قسم کی ترقی نہیں کر سکتیں' نہ وہ علم کے میدان میں آگے بڑھ سکتی ہیں' نہ اقتصادی اور معاشی معاملات میں ارتقا کی منزلیں طے کر سکتی ہیں' نہ تجارتی سلسلوں کو آگے بڑھا سکتی ہیں اور نہ ان کے غور و فکر کی دنیا وسیع ہو سکتی ہے۔ وہ لوگ غلام پیدا ہوتے ہیں اور ہمیشہ غلام ہی رہتے ہیں۔ یہ باتیں عورتوں پر اثر ڈالتیں اور وہ اپنے اور اپنی اولاد کے مستقبل کو سدھارنے کی غرض سے ہماری مدد کرتیں۔

فروز ہوا بیان کرتی ہے :

میں نے لاکھوں درہم و دینار جمع کیے' جن سے اسلحہ خریدا اور ہمارے ملک کے کاری گروں سے بنوایا گیا۔ میری جمع شدہ رقم سے مجاہدین کے لیے بے شمار کپڑے بھی خریدے گئے' نیز میں نے بہت سے لوگوں سے چندے کی صورت میں بھی کپڑے لیے' خواتین گرم موسم کے کپڑے بھی دیتی تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ الجزائر کی خواتین بہت ہی فراخ حوصلہ اور کشادہ دل ہیں' روزانہ کی پیہم اور مسلسل بم باری نے ان کے فکر و قلب کی دنیا بالکل بدل دی ہے اور وہ دوسرے ملکوں کی عورتوں سے بہت مختلف ہیں' وہ جفاکش اور مستعد خواتین ہیں اور اپنے مردوں کے ساتھ کام کرنے کے اصولوں سے آگاہ ہو گئی ہیں' فرانس کی محکومی اور مظالم نے ان کو ملک کی

ہمدرد اور مظلوموں کی بہی خواہ بنادیا ہے۔ فروز ہوا ایک گوشہ نشین اور کم گو خاتون تھی جو الجزائر کی بہت بڑی مجاہدہ بنی۔ الجزائر کی جنگ آزادی میں اس نے بھرپور حصہ لیا اور مجاہدین کی پوری امداد کی۔

زینت

"میری پھوپھی کا نام نجیبہ تھا- اس کا قافلہ عمر ستر سال سے متجاوز ہو چکا تھا- وہ ایک کم زور اور نحیف عورت تھی' مگر اس کے باوجود فرانسیسیوں نے اس کو قابل رحم نہیں سمجھا' اس کے گھر کو آگ لگا دی' اس کا ساز و سامان ضبط کر لیا' اس کی بھیڑ بکریوں کو ذبح کر ڈالا اور خود اسے گرفتار کر کے جیل کی انتہائی خوف ناک کوٹھڑی میں بند کر دیا- اسے اتنی شدید اور اذیت ناک سزائیں دیں کہ وہ بوڑھی عورت ان سزاؤں کو برداشت نہ کر سکی اور جیل ہی میں موت کی آغوش میں چلی گئی-"

یہ واقعہ الجزائر کی ایک نوجوان مجاہدہ زینت نے اس وقت بیان کیا جب اسے گرفتار کر کے فرانس کی اس فوجی عدالت میں پیش کیا گیا جو حکومت نے الجزائری مجاہدین کے لیے مقرر کی تھی- زینت عدالت میں بیان دیتی ہوئی کہتی ہے:

"کس درجہ افسوس کا مقام ہے کہ حکومت نے تہذیب و متانت کی تمام انسانی اور بین الاقوامی اقدار کو فراموش کر دیا ہے اور ان اخلاق کو گلدستہ طاق نسیاں بنا دیا ہے جن کا ایک انسان کو دوسرے انسان کے بارے میں مظاہرہ کرنا ضروری ہے- آخر میری پھوپھی کو اتنی سخت سزائیں کیوں دی گئیں؟ صرف اس لیے کہ اس نے الجزائری مجاہدین کو پناہ دی تھی؟ کیا ان لوگوں کو پناہ دینا جرم ہے جو اپنے وطن کی آزادی کے لیے کوشاں ہوں؟ کیا ملک کی آزادی کے لیے ساعی ہونا جرم ہے؟ کیا کسی صادق و مخلص انسان کی جان بچانے کے لیے تگ و دو کرنا معصیت ہے؟ تم نے اس کا مکان مسمار کر دیا اور اسے گرفتار کر لیا' تمھارے ضمیر نے اس ناروا اقدام پر تمھیں ملامت نہ کی؟ کیا تم اپنے اندر دل رکھتے ہو اور رکھتے ہو تو کیا اس دل میں رحم اور نرمی کی کوئی مقدار پاتے ہو؟ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ تمھاری حکومت ان اوصاف سے محروم ہے'

اس نے ظلم کو اپنا شعار بنا لیا ہے اور انسانیت کی تمام ضروری بنیادوں کو قطعی طور سے ڈھا دیا ہے۔ اگر اخلاقی طور سے زندہ رہنا چاہتے ہو اور اپنے بچاؤ کی ضرورت محسوس کرتے ہو تو مظالم سے باز آجاؤ۔"

وہ عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے پوری تحدی کے ساتھ کہتی ہے:

"الجزائر لازماً آزاد ہوگا' اس کی غلامی کی طویل اور سیاہ راتیں ختم ہو رہی ہیں' حریت و آزادی کا سورج طلوع ہونے کو ہے' الجزائری مجاہد یقیناً اپنی مساعی میں کامیاب ہوں گے' بہت جلد ان کی اپنی حکومت قائم ہوگی اور وہ کامل آزادی سے زندگی بسر کریں گے۔ یہ قوموں کی آزادی کا دور ہے۔ الجزائر جاگ اٹھا ہے' جو طاقت اس کی غلامی کو طول دینا چاہے گی وہ اپنے اس غلط مقصد میں ناکام رہے گی۔ ہم نے اللہ پر بھروسا کر کے اپنی تمام کوششیں میدان عمل میں جھونک دی ہیں۔ اب تمھاری فوجیں ہمارا زیادہ دیر تک مقابلہ نہیں کر سکتیں اور تمھارے مہلک ہتھیار ہمارے مخلصانہ جذبات کا راستہ نہیں روک سکتے۔"

زینت' الجزائر کے جس خاندان سے تعلق رکھتی تھی اس کے تمام ارکان مجاہدین میں شامل تھے اور ملک کی آزادی کو انھوں نے اپنا نصب العین ٹھہرا رکھا تھا۔ یہ ایک نوجوان خاتون تھی اور بڑے عزم و ہمت کی مالک تھی۔ اس کے شوہر کا نام خلود تھا۔ یہ ایک بہادر نوجوان تھا اور مجاہدین میں اپنی شجاعت و جرأت کے اعتبار سے بہت ممتاز تھا۔ اس نے ہر مقام پر مجاہدین کی ہر تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا' اس نے ان تمام گوریلا جنگوں میں شمولیت کی جو فرانسیسی استعمار کے خلاف سرزمین الجزائر میں لڑی گئیں۔ ایک مرتبہ یہ ایک چھاپا مار پارٹی کے ساتھ شب کی تاریکی میں فرانس کے ایک فوجی ٹھکانے پر دستی بم پھینک رہا تھا کہ مخالف سمت سے توپ کا گولا آکر گرا اور یہ شہید ہو گیا۔ اس کی شہادت سے ایک طرف مجاہدین کو سخت نقصان پہنچا اور دوسری طرف اس کے خاندان میں کہرام برپا ہو گیا۔ مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی بیوی اور خاندان کی

دیگر خواتین کے دل میں فرانسیسی استعمار کے خلاف انتقام کی آگ بھڑک اٹھی اور وہ کھلم کھلا میدان میں نکل آئیں' یہاں تک کہ خلود کی بیوی کی ستر سالہ پھوپھی بھی اس عظیم صدمے کو برداشت نہ کر سکی اور وہ اپنی جسمانی کمزوری کے باوجود میدان کارزار میں اتر آئی- اس نے مجاہدین کی بھرپور مدد کی' ان کو اپنے گھر میں پناہ دی اور اسی جرم میں گرفتار ہو کر موت کے منہ میں چلی گئی-

اس کے علاوہ زینت کی بہن خدیجہ نے بھی مجاہدین کی اعانت کو اپنے لیے لازمی قرار دے لیا اور وہ برملا آزادیٔ وطن کی تحریک میں حصہ لینے لگی- خدیجہ مجاہدین میں نرس کے فرائض سرانجام دیتی تھی اور مجاہدین کے گھروں میں جا کر ان کے بچوں' عورتوں اور بوڑھے افراد کی حوصلہ افزائی کرتی تھی- خدیجہ نہایت باہمت عورت تھی' اس کا شوہر ایک کاروباری آدمی تھا جو مجاہدین کی مالی امداد کرتا تھا- خدیجہ کے چار بچے تھے' اتفاق ملاحظہ ہو کہ یہ بھی فرانسیسی فوج کے ہاتھوں ماری گئی- اب زینت سخت پریشان تھی اور کئی قسم کے مصائب و مشکلات میں گھر گئی تھی- اسے متعدد نوع کی ذمہ داریوں نے اپنی گرفت میں لے لیا تھا- یہ مجاہدین کی مدد بھی کرتی تھی اور مرحومہ بہن کے بچوں کی نگاہ داشت و پرورش کا فریضہ بھی انجام دیتی تھی-

اس کے بعد الجزائر پر ایک اور دور آیا جس میں مجاہدین کو سخت مشکلات میں سے گزرنا پڑا- اس دور میں جہاں مجاہدین نے اپنی سرگرمیاں تیز اور وسیع کر دیں' وہاں فرانسیسی فوج نے بھی ان کے خلاف ایک ہمہ گیر مہم کا آغاز کر دیا- اس نے مجاہدین کے تمام ٹھکانوں کو مہلک بموں کا نشانہ بنایا اور ان کے گھروں اور آبادیوں میں گھس کر انھیں ہلاک کرنا شروع کیا- اس کے ساتھ ساتھ گرفتاریوں کے سلسلے کو تیز تر کر دیا گیا- جہاں کوئی الجزائری نظر آیا یا تو اسے مار دیا گیا اور یا گرفتار کر لیا گیا اور پھر مختلف مقامات پر فوجی عدالتیں قائم کر کے انھیں سخت سزائیں دی گئیں- گرفتاریوں اور پکڑ دھکڑ کے اس وسعت پذیر ریلے میں زینت نے جو بیان دیا' اس میں اس نے صاف الفاظ میں فرانسیسی حکام کی مذمت اور مجاہدین کے موقف کی حمایت کی اور واضح انداز میں کہا

کہ اپنے ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد کرنا اور اس میں حصہ لینا نہ صرف یہ کہ کوئی جرم نہیں ہے، بلکہ نہایت ضروری ہے۔ جو شخص آزادی کی تحریکوں کی مخالفت کرتا ہے، وہ ملک کا غدار ہے، اور جو حکومت مجاہدین آزادی کو کچلنے کی کوشش کرتی ہے، وہ مستعمرانہ رویہ اختیار کرتی ہے اور اس کی مخالفت کرنا وطن کے ہر بہی خواہ کے لیے ضروری ہے۔

اس نے کہا:

> ہم مر جائیں گے لیکن اپنے موقف سے ایک قدم پیچھے نہیں ہٹیں گے، جو طاقت اس راہ میں ہمارے آڑے آئے گی، ہم اس کا پوری قوت سے مقابلہ کریں گے۔ یہ وطن ہمارا ہے اور اس کو آزادی سے ہم کنار کرنے کی غرض سے میدان میں اترنا ہمارا فرض ہے۔ ہم ہر صورت میں استعمار کے خلاف لڑیں گے اور ہر میدان میں لڑیں گے۔

زینت کو انتہائی تکلیفیں پہنچائی گئیں، مگر اس کے عزم وہمت میں کوئی لچک پیدا نہ ہوئی اور یہ بہادر خاتون برابر اپنے موقف پر اڑی رہی۔ الجزائر کی آزادی میں زینت کا بہت بڑا حصہ ہے اور اس کٹھن راہ میں اس کے نقش پا بالکل نمایاں ہیں۔ الجزائر کی زمین کا چپہ چپہ اس کی قربانیوں اور ان تھک مساعی کی شہادت دیتا ہے۔ اس نے فوجی عدالت میں بلا جھجک آزادی وطن کی حمایت کی اور اس راہ میں زندگی پر موت کو ترجیح دی۔

حوریہ

"الجزائر کی خواتین نے اپنا وقت لباس کے فیشن ایبل ڈیزائنوں' آرام وراحت کی راہوں' حسن و عشق کے جھمیلوں اور عیش و سکون میں نہیں گزارا' اور یہ ایسے دھندوں میں نہیں پڑیں جن کا اچھائی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ وہ اپنے حالات سے کامل آگاہی رکھتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ حصول آزادی کی غرض سے دنیا کی بہت بڑی طاقت سے نبرد آزما ہوئیں اور اپنے وقت کی عظیم حکومت سے پنجہ آزمائی کی۔ یہ خواتین پوری ہمت کے ساتھ اپنے مردوں کے دوش بدوش جنگ آزادی میں کود پڑیں' خاک وخون میں لوٹیں' انھوں نے موت کے دروازے پر دستک دی' پھانسی کے تختے پر پہنچ کر واپس آئیں' یہ عظیم قوم کی بہادر خواتین تھیں جنھوں نے زندگی پر موت کو ترجیح دی' اپنے وطن اور ہم وطنوں سے پوری وفاداری کا اظہار کیا۔ اپنے بچوں میں بھی مجاہدانہ روح پھونکی' انھیں حریت وطن و ملت کا درس دیا' ان کے سامنے وہ باتیں کیں جو ان کے مستقبل کو تاب ناک بنا سکیں اور ان کی آئندہ زندگیوں کا دھارا بدل دیں۔ ان خواتین نے شیروں کا سا انداز اختیار کیا اور خود کو تعمیر وطن کے لیے وقف کر دیا۔"

یہ الفاظ الجزائر کی ایک مجاہدہ حوریہ نے آزادی وطن کے بعد خواتین کی ایک مجلس میں کہے۔

حوریہ صرف چودہ سال کی نوعمر لڑکی تھی جو فرانسیسی فوج میں بطور نرس کے کام کرتی تھی' لیکن اسے صلیب احمر کے سائے میں فرانس کی فوج میں نرس کے فرائض انجام دینا پسند نہ تھا۔ یہ بڑی حوصلہ مند اور جی دار لڑکی تھی' جو در پردہ مجاہدین کی مدد کرتی تھی۔ مرہم پٹی کا سامان' دوائیں اور علاج معالجے کی تمام سہولتیں مجاہدین کو بہم پہنچاتی

تھی- یہ اگرچہ فرانسیسی فوج میں ملازم تھی' مگر مجاہدین کی مدد و اعانت اس کا اصل کام تھا- لیکن یہ بات راز نہ رہ سکی اور فرانسیسی حکومت کو اس کے اس کردار کا علم ہو گیا- اب حوریہ کے سامنے دو راستے تھے یا تو مجاہدین سے تعلقات منقطع کر کے صرف فرانسیسی حکومت کی مدد کرے یا پھر فرانسیسی فوج کی ملازمت ترک کر کے اپنے آپ کو مجاہدین الجزائر کی اعانت کے لیے وقف کر دے- اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا- یعنی فرانسیسی فوج کی ملازمت ترک کر کے صرف مجاہدین کی امداد کو اپنا مقصد زندگی قرار دے لیا- اس راہ میں اسے بڑی تکلیفیں اٹھانا پڑیں اور کئی قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا' مگر یہ اس سے باز نہ آئی اور کام کی جو راہ ایک مرتبہ اختیار کر لی' اس پر پوری جرات اور کامل استقلال سے محو سفر رہی- اس سلسلے کے چند واقعات ملاحظہ ہوں-

ایک مرتبہ یہ ایک صحرائی علاقے میں چھاپہ مار مجاہدین کے ایک دستے کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہی تھی- اس صحرا میں کم و بیش دو مہینے سے یہ لوگ فرانسیسی فوج کے خلاف مصروف جنگ تھے- یہ لوگ ایسی جگہ چھپے ہوئے تھے کہ ان کے ٹھکانے کا کسی کو پتا نہ چلتا تھا- ان کے حملے نہایت تیز اور مسلسل ہو رہے تھے اور فرانس کی وہ فوج جو اس علاقے میں ان کو ناکام بنانے کے لیے متعین تھی' سخت پریشان تھی' کسی کو کچھ پتا نہ چلتا تھا کہ ان کا ٹھکانا کہاں ہے اور یہ لوگ کس سمت سے حملہ آور ہوتے ہیں- چھاپہ ماروں کے اس دستے میں حوریہ نے بڑی جرات کا ثبوت دیا اور کئی بار خطرناک حالات سے دوچار ہوئی' مگر کسی قسم کی گھبراہٹ کا اظہار نہیں کیا- ایک مرتبہ فرانسیسی فوج کا ایک بم اس کے قدموں کے قریب گرا اور اچانک دھماکے سے اس کا دل دہل گیا' لیکن اس نے اپنے آپ پر قابو رکھا-

ایک مرتبہ کا واقعہ یہ خود بیان کرتی ہے کہ میں اٹھائیس چھاپہ ماروں کے ساتھ ایک نہر کے کنارے اپنے فرائض انجام دے رہی تھی- جس نہر پر ہم پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے' وہ کم و بیش ستر فٹ چوڑی تھی- اس کے پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا' اس نہر میں فرانسیسی فوج کی چھوٹی چھوٹی جنگی کشتیاں چلتی تھیں- ہمارے چھاپہ مار غوطہ خوران

کشتیوں پر اچانک حملہ آور ہوتے تھے- ایک شام ہمیں اطلاع ملی کہ آج رات ڈھلے ہمارے کیمپ کو نشانہ بنایا جائے گا- ہم نے تیزی سے اپنا کیمپ اٹھایا اور تقریباً ایک میل پیچھے ہٹ گئے اور دس چھاپہ مار جن میں میں بھی شامل تھی' نہر کے کنارے درختوں کے جھنڈ میں مسلح ہو کر بیٹھ گئے- ٹھیک نصف شب کو ہم نے دوربین کے ذریعے دیکھا کہ نہر کے وسط میں ایک کشتی تیز آبی لہروں کو چیرتی ہوئی آ رہی ہے- ہم مستعد اور چوکنا ہو کر کشتی کا انتظار کرنے اور اس کی سرگرمیوں کا جائزہ لینے لگے- کشتی عین اس مقام پر آ کر رکی جہاں چند گھنٹے پیشتر ہمارا پڑاؤ تھا- کشتی نہر کے دائیں کنارے کھڑی تھی اور تین سوار باہر نکل آئے تھے جو آہستہ آہستہ ہمارے پہلے ٹھکانے کی طرف قدم زن تھے- اتنے میں پانچ ملاح کشتی میں سے اور نمودار ہوئے- فوراً ہم نے دیکھا کہ اس کے پیچھے اس قسم کی ایک اور کشتی آ رہی ہے- ہم نے تیزی سے اپنے آدمیوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا- پانچ آدمی آنے والی کشتی کی طرف بڑھے جو دو فرلانگ پیچھے رک گئی تھی اور پانچ پہلی کشتی کی طرف روانہ ہوئے' اور دونوں کشتیوں پر پانچ پانچ کے دونوں گروپ اس تیزی سے بہ یک وقت حملہ آور ہوئے کہ فوجیوں کو بھی ڈھیر کر دیا اور کشتیاں بھی آن واحد میں گہرے پانی میں غرق ہو گئیں-

اپنے واقعات بیان کرتی ہوئی حوریہ کہتی ہے: ایک مرتبہ چھاپہ ماروں کے کمانڈر نے ایک ایسے مقام پر ہماری ڈیوٹی لگائی' جہاں چاروں طرف دشمن کی فوج کثیر تعداد میں پڑی ہوئی تھی اور موت کے سوا ہمیں کچھ نظر نہ آتا تھا- تقریباً ایک سو تیس فٹ کے اونچے ٹیلے کی اوٹ میں ہم اڑتالیس چھاپہ ماروں نے ڈیرے ڈال لیے اور تین حصوں میں تقسیم ہو گئے- میں سولہ مجاہدین کے جس گروپ میں شامل تھی وہ دشمن کی فوج کے ایک جرنیل کے خیمے سے بہ نسبت دوسروں کے قریب تر تھا- ہمارے ذمے یہ فرض عائد کیا گیا تھا کہ جرنیل کے خیمے پر اس تیزی سے حملہ کرنا ہے کہ جرنیل تو وہیں موت کا لقمہ بن جائے اور باقی فوج میں بھگدڑ مچ جائے- چنانچہ نصف شب کے بعد جب دشمن مزے کی نیند سو رہے تھے' ہم نے ہلہ بول دیا اور اپنے مقصد میں کامیاب رہے-

حوریہ اسی قسم کا ایک اور واقعہ بیان کرتی ہے : میرے والد نے مجھے حکم دیا کہ فرانس کی فوج کے جس دستے نے میرے ماموں کے گھر کو ڈائنامیٹ سے اڑایا ہے' اس دستے کا پتا کرو کہ کن کن لوگوں پر مشتمل ہے' پھر اس کو ختم کر دو۔ ظاہر ہے یہ کام بہت مشکل تھا۔ لیکن میں نے والد کے حکم کی تعمیل کی اور یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئی کہ اس دستے میں کون کون افراد شامل تھے اور آج کل کہاں ہیں۔ میں نے اپنے کمانڈو سے بات کی اور رات کی تاریکی میں اس دستے پر حملہ کر کے اس کا صفایا کر دیا۔

حوریہ ایک پڑھی لکھی لڑکی تھی اور کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ ابتدا میں اس کے باپ کا رجحان یہ تھا کہ الجزائریوں کو فرانس کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے اور اگر آزادی کی تحریک جاری رکھنا ضروری ہے تو بھی آئینی حدود سے باہر قدم رکھنا مناسب نہیں' کیونکہ اس سے دلوں میں عداوت پیدا ہو گی اور نوبت سختی اور تشدد تک پہنچے گی' جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ معاملہ پکڑ دھکڑ سے آگے نکل جائے گا اور خوں ریزی اور قتل و غارت کا عام سلسلہ شروع ہو جائے گا' لیکن جیسے جیسے حالات بدلتے گئے' حوریہ کے والد کی سوچ میں تبدیلی ہوتی گئی۔ پھر ایک وقت آیا کہ وہ فرانسیسی حکومت کے شدید مخالف ہو گئے اور اعلانیہ مجاہدین کی حمایت کرنے لگے۔ انھوں نے اس ضمن میں ایک قدم یہ اٹھایا کہ اپنی اس لڑکی حوریہ کو جو فرانسیسی فوج میں نرس کی حیثیت سے کام کرتی تھی' ملازمت سے سبک دوش کرا لیا اور حکم دیا کہ وہ مجاہدین سے وابستگی اختیار کر لے اور یہی فرائض چھاپہ ماروں کے ساتھ مل کر انجام دے۔

حوریہ طبعاً نہایت منکسر اور متواضع خاتون تھی اور غیر ملکی حکومت کے متشددانہ رویے کو انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ اس نے آرام و سکون کی زندگی کو خیر باد کہہ کر کانٹوں سے بھرپور راہ پر قدم رکھا اور حریت و آزادی کے سفر میں ایسی ایسی کٹھن منزلیں طے کیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا بھائی بھی مجاہدین کے ساتھ تھا اور باپ نے ان کی مالی امداد کے لیے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیئے تھے۔ حوریہ کہتی ہے' میرے باپ امیر آدمی تھے۔ انھوں نے مجاہدین کو پیش کش کی کہ اس جنگ میں جس قدر سرمایہ کی ضرورت ہو گی پوری کی جائے گی' چنانچہ انھوں نے ہمیشہ اور ہر موقعے پر مجاہدین کی مالی امداد کی اور انھیں روپے پیسے سے بے نیاز کر دیا۔

فلاہ داوٗد

"آپ کا اصل نام کیا ہے؟"

"میرا نام فلاہ ہے اور مجھے فلاہ داوٗد کہتے ہیں۔"

"داوٗد آپ کے نام کا جزو کیوں ہے"؟

"داوٗد میرے پردادا کا نام تھا' اب ہمارے خاندان کے تمام افراد کے نام کے ساتھ داوٗد کے لفظ کا اضافہ کیا جاتا ہے۔"

"آپ فرانسیسی' انگریزی اور عربی بہت عمدگی اور صفائی سے بولتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے' آپ پڑھے لکھے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں"؟

"آپ نے ٹھیک کہا' میں واقعی ایسے خاندان سے تعلق رکھتی ہوں جو تعلیم کے اعتبار سے الجزائر میں ممتاز مقام کا مالک ہے۔ میں نے فرانسیسی زبان سکول میں پڑھی اور چونکہ فرانس بہت عرصے تک الجزائر پر حکومت کرتا رہا ہے' اس لیے ہمارے ملک میں حکمران قوم کی زبان رغبت اور شوق سے سیکھی جاتی تھی۔ انگریزی زبان میں نے اپنے ماموں سے پڑھی جو کئی سال انگلستان میں رہے ہیں' عربی میں نے قاہرہ میں سیکھی۔ ہمارے ہاں الجزائر میں عربی باقاعدہ نہیں پڑھائی جاتی تھی اور حکمران قوم ہمیں اپنی مادری اور ملکی زبان اور تہذیب و ثقافت سے روشناس نہیں ہونے دیتی تھی' لہٰذا جن لوگوں کو عربی زبان اور عربی علوم حاصل کرنے کا شوق ہوتا تھا' وہ قاہرہ جاتے تھے۔ ہمارے ملک کے طلبا انگریزی بھی قاہرہ کی درس گاہوں میں پڑھتے تھے' چنانچہ اپنے ماموں سے پڑھنے کے علاوہ میں نے باقاعدہ انگریزی بھی قاہرہ ہی میں پڑھی۔"

"قاہرہ کے علاوہ الجزائریوں کے لیے تعلیم کا اور کہیں انتظام نہیں ہے"؟

"تعلیم کا انتظام تو ہے مگر معقول انتظام نہیں ہے۔ قاہرہ ایسی جگہ ہے جہاں

انگریزی بھی بہتر طریقے سے پڑھائی جاتی ہے اور عربی علوم وفنون کی تعلیم بھی اچھے انداز سے دی جاتی ہے۔ مصر میں مختلف اسلامی علوم پر بے شمار کتابیں چھپی ہیں جن سے لاتعداد لوگ مستفید ہوتے ہیں۔ علمائے مصر کا درجہ بہت بلند ہے اور علوم اسلامی پر ان کی نظر بہت گہری ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں وہاں کی حکومت ان کی پوری مدد کرتی ہے اور اشاعت اسلام میں بڑی دلچسپی لیتی ہے۔ میں مصر گئی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ دنیا کے تمام علما سمٹ کر یہیں آگئے ہیں اور علوم اسلامی کا اصل مرکز یہی خطہ ارضی ہے۔ جامعہ ازہر میں جس انداز سے تعلیم دی جاتی ہے اور کسی ملک میں اس انداز سے نہیں دی جاتی۔"

"آپ نے عربی بھی وہیں پڑھی"؟

"ہمارا ملک الجزائر فرانس کا محکوم ہونے کی وجہ سے چونکہ فرانسیسی زبان سے متاثر تھا اس لیے وہاں عربی کی تعلیم کا بہت کم انتظام تھا' حالانکہ الجزائر ایک عرب ملک ہے۔ مگر علوم عربی کی تحصیل سے حکمرانوں نے اس کے باشندوں کو دور رکھنے کی کوشش کی تھی تاکہ یہ لوگ اپنی تہذیب و ثقافت کے ذخیرہ علمی اور اصلی تاریخ سے بے بہرہ رہیں' لیکن مصر میں یہ بات نہیں ہے' للہٰذا الجزائری شائقین علوم قدرتاً مصر کا رخ کرتے ہیں اور وہاں سے پورے عالم ہو کر واپس ہوتے ہیں۔ میں جب مصر گئی تو عربی علوم سے قطعی طور پر ناواقف تھی' لیکن اب میں اپنی استعداد کے مطابق ان علوم سے بہت حد تک آگاہی رکھتی ہوں اور اسلام کی جو اصل روح ہے اور وہ جس قسم کا معاشرہ پیدا کرنا چاہتا ہے' اس سے باخبر ہوں۔"

یہ تمام تر مضمون ایک انٹرویو کی صورت میں شائع ہوا ہے جو فلاہ داؤد نے الجزائر کی آزادی کے بعد ایک امریکی اخبار نویس کو دیا۔ مزید سوال وجواب یہ ہیں۔

"آپ الجزائری مجاہدین کے ساتھ کب شامل ہوئیں"؟

ابتدا میں میں فرانسیسی فوج میں ملازم تھی اور فوج کے محکمہ صحت میں خدمت انجام دیتی تھی' لیکن جب الجزائر کی جنگ آزادی تیز ہوئی اور مجاہدین سر پر

کفن باندھ کر میدان جنگ میں کود پڑے تو میرے ضمیر نے مجھے سخت ملامت کی اور میرے لیے فرانسیسی فوج میں بطور ملازم کے رہنا ناممکن ہو گیا' چنانچہ میں اس خدمت سے الگ ہو گئی اور اپنے ان الجزائری بھائیوں سے آملی جنھوں نے آزادی وطن کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی تھی۔ میرے نزدیک اس وقت ملک اور اسلام کی خدمت کی اصل شکل یہی تھی۔"

"اس وقت اور خواتین بھی اس جنگ میں شامل تھیں"؟

"کیوں نہیں! بہت سی الجزائری خواتین مجاہدین میں شامل تھیں اور نہایت ہمت اور کوشش سے آزادی کی جنگ لڑ رہی تھیں۔ اس وقت میری کیفیت ہر اس الجزائری خاتون کی سی تھی جو اپنے آپ کو مجاہدین کے ساتھ مل کر دشمن کے ساتھ لڑنے پر مجبور پاتی تھی۔"

"آپ کی شادی کب ہوئی"؟

"میری شادی اس زمانے میں ہوئی تھی جب میں فرانسیسی فوج کے محکمہ صحت میں ملازم تھی۔ میرا شوہر کاروبار کرتا تھا اور اس کا شمار اپنے علاقے کے معززین میں ہوتا تھا۔ بعد میں وہ مجاہدین کے ساتھ مل گیا تھا کیونکہ کسی غیرت مند شخص کے لیے ملک کی تحریک آزادی سے کنارہ کش رہنا ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ انتہائی مستعد اور تیز آدمی تھا۔"

"اس نے فرانسیسی فوج کے ہاتھوں اس وقت جام شہادت نوش کیا جب ایک صحرا میں اس نے چند مجاہدین کے ساتھ فرانس کی فوج کے ایک بڑے ٹھکانے کو نشانہ بنایا۔ ان مجاہدین نے دشمن کے بہت سے آدمیوں کو ختم کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنے جسموں کے ساتھ خطرناک قسم کے بم باندھ رکھے تھے۔ ان بموں کی وجہ سے دشمن کی فوج کا بھی بھاری نقصان ہوا اور مجاہدین بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔"

"شوہر کی شہادت کا مجھ پر شدید رد عمل ہوا اور میرے دل میں دشمن کے خلاف نہایت نفرت اور حقارت کے جذبات ابھر آئے۔ اب میں نے تمام علائق سے الگ ہو کر خود کو مجاہدین کی خدمت اور حکمران قوم کی مخالفت

کے لیے وقف کر دیا"

"الجزائر کی مجاہد خواتین نے آزادی وطن کی تحریک میں کس نوعیت کی خدمات انجام دیں"؟

"انھوں نے دشمن کی جاسوسی کی اور اس کی طاقت کا اندازہ لگایا اور یہ معلوم کرنے کی کامیاب کوشش کی کہ اس کے خفیہ فوجی ٹھکانے کہاں کہاں ہیں اور اسلحہ کے مراکز کس نوعیت کے ہیں- پھر مجاہدین کو ایک دوسرے سے مربوط اور آپس کی کوششوں سے باخبر رکھنے کے لیے ڈاک کی ترسیل کا بہتر انتظام کیا- عورتوں سے چندہ جمع کر کے مجاہدین کو امداد پہنچانے کی خدمت انجام دی- مجاہدین کے گھروں میں جا کر ان کی خواتین کو صورت حال کی تفصیلات سے آگاہ رکھا اور ان کو تسلی دی- مجاہدوں اور چھاپہ ماروں کو ادویات مہیا کیں اور ان میں نرسوں کی حیثیت سے کام کیا- ان کے لیے موسم کے مطابق کپڑے جمع کیے' غرض مجاہد خواتین نے کئی قسم کی خدمات انجام دیں اور اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر جنگ آزادی کی مہم میں حصہ لیا-"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ الجزائری خواتین نے عیش و آرام کی زندگی چھوڑ کر جفاکش اور اولوالعزم مردوں کی طرح خطرات کا مقابلہ کیا-"

"جی ہاں! واقعہ یہی ہے- میں آپ سے سچ کہتی ہوں اور الجزائر کی سرزمین کا چپہ چپہ اس پر گواہ ہے کہ ہمارے ملک کی خواتین نے بے شمار قربانیاں دیں' عیش و آرام کی زندگی کو خیرباد کہہ کر صحراؤں کی خاک چھانی' جن جنگلوں اور ریگ زاروں میں ہم نے اپنے مراکز بنائے وہاں عام طور سے ۱۲۰ سے لے کر ۱۲۶ تک درجہ حرارت رہتا تھا- الجزائر کے صحراؤں نے الجزائری خواتین کے ان نقوش پا کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا ہے جو انھوں نے آزادی کی راہ میں وہاں چھوڑے ہیں- میں سچ کہتی ہوں کہ حصول آزادی کے لیے جو قربانیاں الجزائری خواتین نے دیں' بہت سے ملکوں کے مرد بھی اتنی قربانیاں دینے کی اپنے اندر ہمت نہیں پاتے-"

مآخذ و مصادر

مختلف کتب حدیث کے علاوہ اس کتاب کی تدوین و تصنیف کے لیے مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔

۱۔ طبقات — ابن سعد
۲۔ تہذیب التہذیب — حافظ ابن حجر عسقلانی
۳۔ الاصابہ فی تمیز الصحابہ — حافظ ابن حجر عسقلانی
۴۔ اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ — علامہ ابن اثیر
۵۔ الاستیعاب — حافظ ابن عبدالبر
۶۔ تذکرۃ الحفاظ — حافظ ذہبی
۷۔ وفیات الاعیان — ابن خلکان
۸۔ صفۃ الصفوہ — حافظ ابن جوزی
۹۔ الاکمال فی اسماء الرجال — ولی الدین محمد بن عبداللہ خطیب عمری
۱۰۔ سفینۃ الاولیاء — دارا شکوہ
۱۱۔ سکینۃ الاولیاء — دارا شکوہ
۱۲۔ اعلام النساء — عمر رضا کحالہ
۱۳۔ تذکرہ نسوان ہند — فصیح الدین بلخی
۱۴۔ مشاہیر نسواں — محمد عباس
۱۵۔ رحمۃ للعالمین — قاضی محمد سلیمان منصور پوری
۱۶۔ مخدرات تیموریہ
۱۷۔ تذکرۃ الخواتین — عبدالباری آسی
۱۸۔ تذکرۃ النساء نادری — منشی درگا پرشاد نادر کھتری

۱۹-	مشاہیر النساء	ذہنی آفندی
۲۰-	بیگمات اودھ	تصدق حسین
۲۱-	بیگمات شاہان اودھ	خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی
۲۲-	۱۸۵۷ کے مجاہد	غلام رسول مہر
۲۳-	خلافت اندلس	نواب والقدر جنگ
۲۴-	سیرت عائشہ	سید سلمان ندوی
۲۵-	خواتین اسلام کی بہادری	سید سلیمان ندوی
۲۶-	باکمال مسلمان عورتیں	عبدالقیوم ندوی
۲۷-	مسلمان خواتین کی دینی اور علمی خدمات	سید محمد سلیم
۲۸-	خواتین کشمیر	محمد الدین فوق
۲۹-	اسوہ صحابیات	عبدالسلام ندوی
۳۰-	سیر الصحابیات	سعید انصاری
۳۱-	تذکار صحابیات	طالب ہاشمی
۳۲-	چار سو باکمال خواتین	طالب ہاشمی
۳۳-	خالدہ ادیب خانم	حکیم عبدالمجید عتیقی
۳۴-	خواتین اسلام اور دین کی خدمت	ابوالحسن علی ندوی
۳۵-	البرامکہ	عبدالرزاق کانپوری
۳۶-	صحابیات مبشرات	محمود احمد غضنفر
۳۷-	یادرفتگان	سید سلیمان ندوی
۳۸-	نیک بیبیاں	شائستہ اکرام اللہ سہروردی
۳۹-	تذکرہ اولیائے ہند	محمد احمد
۴۰-	صحابیات	نیاز فتح پوری
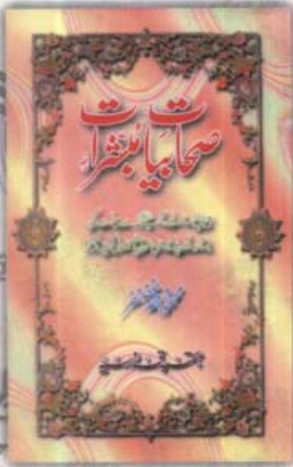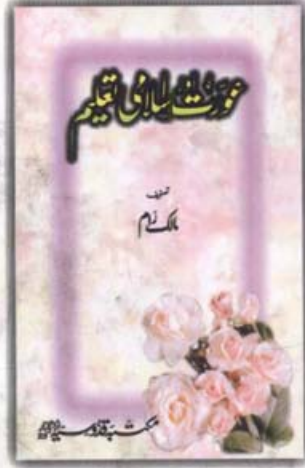
خواتین کے موضوع پر ہماری بہترین کتب
خاتونِ اسلام
عورت کی اسلامی تعلیم
صحابیات مبشرات
تحفۃ العروس
مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور
رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
Ph:7351124 - 7230585